وقت گواہی دے
راحت جبیں
WWW.PAKSOCIETY.COM

راحت جبیں

ناولٹ

پریولیس کی کلاسز شروع ہونے کے دن سے لے کر آج تک وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ نوجوان مسلسل اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ شروع میں تو زارا عمیر نے اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کی کہ یونیورسٹی تھی جہاں تعلیم کے لیے سنجیدہ نوجوانوں کے ساتھ ساتھ ان جیسوں کی بھی کمی نہ تھی' جن کا مقصد محض وقت گزاری کے لیے جامعہ کا ماحول خراب کرنا تھا۔ مگر اب اتنے دن گزر جانے کے بعد وہ اسے نظرانداز نہیں کر سکتی تھی' سو لاشعوری طور پر اس کی نگاہیں اپنے اردگرد اسے تلاش کرنے لگتیں اور زارا عمیر کو کبھی کوئی خاص مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کے آس پاس ہی موجود ہوتا۔ لائبریری میں عین سامنے والی ٹیبل پر' ڈپارٹمنٹ کے باغیچے میں پڑے بینچ پر۔ سیمینار روم میں اس کے عقب والی سیٹ پر اور کینٹین میں' وہ ہمیشہ اس سے پہلے ہی موجود ہوتا۔ حالانکہ اس نے زارا سے کبھی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی۔ مگر زارا کو اس کا ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا ناگوار گزرتا' ایک الجھن کا شکار کر دیتا تھا۔ وہ کم میں بھی جھنجلاہٹ کا شکار رہتی کہ ہمہ وقت اعصاب پر تو وہ سوار رہنے لگا تھا۔

زارا نے اپنے عین سامنے دیکھا۔ وہ سامنے بینچ پر بظاہر کتاب کھولے مگر اسی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا مگر وقفے وقفے سے نظریں زارا پر ٹھہر جاتیں اور جو کبھی اتفاقاً" زارا کی نگاہیں اس سے مل جاتیں تو وہ گھبرا کر دوبارہ سے کتاب پر جھک جاتا۔

"کیا احمقانہ حرکت ہے؟" زارا نے شاید کچھ اونچا بڑبڑائے تھے' جب انعم نے چونک کر اس سے پوچھا۔

"تم کہیں پہنچ گئی ہو۔۔۔"

"ہاں؟۔۔۔" وہ چونک کر زارا کی طرف متوجہ ہوئی۔

"بھئی یوں چھپکے چھپکے سرگوشیاں کرنے والے کہیں نہ کہیں تو پہنچے ہی ہوتے ہیں۔ بائی داوے کتنے جنات قابو میں کر رکھے ہیں اور اس وقت ہماری زارا کے

ساتھ کون چھیڑ خانی کر رہا ہے۔" لمبی چٹیا گندمی سنہری رنگت' بڑی بڑی تاثر انگیز آنکھیں۔ چہرے پر بے تحاشا نمک اور معصومیت' یہ تھی انعم' بظاہر خاموش اپنی کتابوں کی دنیا میں مگن مگر ایک ہلکی سی چھیڑ اور شرارت جو محض اپنی فرینڈز کے سامنے ہی ظاہر ہوتی تھی۔

"کہیں پہنچوں نہ پہنچوں۔ مگر پاگل خانے ضرور پہنچوں گی۔" زارا نے چڑ کر کتاب بند کر دی۔

"کون جا رہا ہے پاگل خانے۔" عظمیٰ نے اپنی ناک کی پھننگ پر کھسک آنے والی عینک کو شہادت کی انگلی سے اوپر کیا اور بے حد چونک کر اسے دیکھا۔ عظمیٰ ایک عام سے نقوش کی مالک ذہین لڑکی تھی۔ رنگت ذرا صاف تھی۔ پڑھائی میں سب سے آگے' ڈپارٹمنٹ میں کوئی بھی تو اس کے مقابلے پر نہ تھا۔

انعم اور عظمیٰ میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا۔ دونوں ہی اپنا کیریئر بنانے کے بارے میں سنجیدہ تھیں۔ دونوں ہی کے والدین کو ان کے لیے اچھے رشتوں کا انتظار تھا اور سب سے بڑی بات وہ دونوں ایک ہی کالونی میں رہتی تھیں اور اسکول سے ہی ایک دوسرے کے ساتھ تھیں۔ زارا عمیر کو ان لوگوں کا اپنی اسٹڈی کے بارے میں سیریس رویہ ہی ان کے قریب لایا تھا۔ ورنہ ان کے خاندانوں میں کوئی مشترک بات نہ تھی۔ زارا عمیر کا تعلق رائے فیملی سے تھا اور اس کا خاندان ایک عرصے سے سیاست سے وابستہ تھا اور ایک وسیع جاگیر کا مالک تھا۔

"تم۔" انعم نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"اگر وہاں سب نے پوچھا کہ باقی دو کہاں ہیں تو۔"

"کہہ دینا پیچھے پیچھے آ رہی ہیں۔" انعم خود ہی ہنسنے لگی۔

"مسئلہ کیا ہے؟۔" اس نے کتاب بند کر کے بیگ میں ڈالی۔

"زارا سے پوچھو۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" زارا نے بے زاری سے کہا اور گھاس کی پتیاں نوچنے لگی۔

"کیوں نہیں ہے۔ مسئلہ تو عین سامنے موجود ہے۔" عظمیٰ کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ بکھری۔ زارا نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"تو تمہیں بھی معلوم ہے۔"

"ہم بھی دو آنکھیں رکھتے ہیں جناب۔ میں تو بس منتظر تھی ہماری زارا بی بی کا ضبط کب جواب دیتا ہے۔"

"اوفوہ کیا کہہ رہے ہو تم لوگ۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" انعم جھنجھلائی۔

"تو اس میں سارا قصور تمہاری سمجھ کا ہے نا۔" عظمیٰ آج بڑے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔

"کس مسئلے کی بات کر رہے ہو۔ مجھے تو دور دور تک کوئی مسئلہ نظر نہیں آ رہا۔"

"دور دور تک واقعی کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر نزدیک۔"

"عظمیٰ پلیز!" زارا نے بے اختیار اسے ٹوکا۔ تو عظمیٰ نے ہنستے ہوئے انعم کو دیکھا جو ہونقوں کی طرح انہیں دیکھ رہی تھی۔

"کمال ہے تمہیں اتنا نزدیک چھ فٹ کا مسئلہ نظر نہیں آ رہا۔"

"مسئلے کی تسبیح جپتی رہنا۔" انعم نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔ "میرے نزدیک تو تم دونوں ہو یا پھر درخت۔ اب تم چھ فٹ سے کم ہو اور درخت چھ فٹ سے زیادہ۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا یہ شخص یوں میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔" زارا بڑبڑائی۔

"حالانکہ دیکھنے میں خاصا معقول نظر آتا ہے۔" عظمیٰ نے ذرا سی گردن موڑ کر عینک کے پیچھے سے اس کا جائزہ لیا۔

"پہلے میرا خیال تھا کہ شاید تم لوگوں میں سے کوئی۔ مگر۔"

"کون۔ کون؟۔" انعم نے زرافے کی طرح گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

"اپنے عین پیچھے بینچ پر گرے شرٹ میں ملبوس پرولیس کے زین العابدین کو دیکھ لو۔" عظمیٰ نے کہا تو انعم نے فوراً گردن گھمائی۔ زین العابدین نے جو یوں خود کو گھورتے پایا تو گھبرا کر اٹھ گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا غائب ہو گیا۔

"یہ زارا کا پیچھا کرتا ہے۔ مگر کیوں؟"

"یہ تو زارا کو پتا ہو گا۔" عظمیٰ مائل بہ شرارت تھی۔ زارا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"حالانکہ وہ خاصا شریف انسان ہے۔ ڈپارٹمنٹ کی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔"

"ہاں۔ کسی لڑکی کی طرف نہیں دیکھتا اور مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہے۔ خاصا شریف انسان ہے۔" زارا طنزیہ بولی۔

"یہ تو وہی بات ہوئی۔ یعنی ایک کڑی نوں چھڈ کے باقی سب نوں اے شرماندا۔ زارا۔ اسے کہیں تجھ سے محبت تو نہیں ہو گئی۔" انعم ایکدم پرجوش ہوئی۔ زارا سر تھام کر رہ گئی۔

"اسے صرف عنوان دے دو۔ پورا مضمون یہ خود لکھ لے گی۔"

"ہاں تو اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اسے ضرور ہی تم سے محبت ہو گئی ہے۔" انعم ڈھٹائی کے ساتھ اپنے بیان پر قائم تھی۔ زارا نے ادھر ادھر سے چیزیں سمیٹ کر اپنے بیگ میں ڈالیں اور کھڑی ہو گئی۔

"کہاں؟۔" عظمیٰ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"گھر۔" وہ مختصراً بولی۔

"ارے' سر رضا ابراہیم کا انٹرویو نہیں لینا۔"

"میرا موڈ نہیں ہے۔" وہ سچ مچ اکتا گئی تھی۔ سوان کے روکنے کے باوجود گھر چلی آئی۔

مما لان میں کھڑی مالی سے گملوں کی ترتیب بدلوا رہی تھیں۔

"اتنی جلدی واپس آ گئیں۔؟" مما نے حیرت سے پوچھا۔

"بس مما کوئی خاص کلاسز نہیں تھیں آج۔" وہ اندر چلی آئی۔ بیگ رکھنے اور فریش ہونے تک بھی اس کا ذہن زین العابدین میں ہی اٹکا رہا تھا۔ اگرچہ زارا عمیر کے لیے یہ نئی بات نہ تھی کہ کوئی اسے دیکھے اور ٹھٹھک جائے یا ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ وہ تھی ہی ایسی۔ مگر زین میں کچھ ایسا ضرور تھا جو اسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ایک دم سوچتی اور جھجکتی ہوئی نگاہ ہوتی تھی اس کی۔ جیسے وہ اس کے چہرے کے عقب میں کسی کھو جانے والے چہرے کو ڈھونڈ تا ہو۔

"مگر وہ کھوجتا کیوں ہے۔ آگے بڑھ کر پوچھ کیوں نہیں لیتا۔"

"آج شیراز کا فون آیا تھا زارا!" ممی کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ جو گلاس ونڈو کھول رہی تھی۔ چونک کر پلٹی۔

"ہوں۔!"

"شیراز کا فون آیا تھا۔" مما نے دوبارہ بتایا۔

"کیا کہہ رہے تھے بھائی۔ بھابھی کیسی ہیں اور میرا بھتیجا۔ کیا نام رکھا ہے اس کا۔" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

"سب ٹھیک ہیں۔ اور نام رائے فہد شیراز رکھا ہے۔"

"اچھا ہے' لیکن وہ آئیں گے کب۔"

"ابھی تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔" مما کچھ افسردہ دکھائی دیں۔ شیراز ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ امریکہ پڑھنے گیا تو پھر واپس نہیں آیا۔ وہیں ایک مسلمان لڑکی رابعہ سے شادی کر لی۔ مما' پاپا کو دکھ تو بہت ہوا تھا۔ مگر انہوں نے رابعہ کو قبول کر کے پاکستان آنے کی دعوت دی۔ اچھی خوبصورت اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ ان سب کو اس بات کا افسوس تو تھا کہ شیراز نے انہیں بغیر بتائے شادی کی مگر رابعہ سے مل کر وہ سب ہی بہت خوش ہوئے تھے۔ پاپا نے ولیمہ "رائے ہاؤس" میں

بڑی دھوم دھام سے کیا تھا اور اب چند دن قبل بذریعہ ای میل انہیں پوتے کی اطلاع اور تصویر ملی تھی۔

"ہمیں بلا رہا ہے کہ کچھ عرصہ ہمارے پاس آکر رہیں۔ اب تو اس نے اپنا ذاتی اپارٹمنٹ بھی خرید لیا ہے۔"

"تو چلی جائیں نا۔ بھائی کب سے تو بلا رہے ہیں۔"

"تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤں۔" مما نے گھورا۔

"میرا کیا ہے۔ کچھ عرصہ رائے ہاؤس میں رہ لوں گی۔"

"بنا رخصتی کے ہی۔" مما نے چھیڑا۔

"ممی۔۔۔" وہ جھینپ گئی۔

"ایک تو یہ رائے رضوان حیدر امریکہ جا کر ہی بیٹھ گیا ہے۔" مما مسکرائیں۔

"بہت جلدی ہے آپ کو مجھے رخصت کرنے کی۔" وہ ہلکی سی خفگی کے ساتھ بولی۔

"ہر ماں کو ہوتی ہے۔"

"کبھی کبھی آپ بھی انعم اور عظمٰی کی ماؤں جیسی باتیں کرتی ہیں۔"

"مائیں ساری ایک جیسی ہوتی ہیں خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔"

"اور جو امریکہ میں وہ بھی شادی رچا بیٹھا ہو بھائی کی طرح تو۔۔۔" زارا نے مسکراتے ہوئے کہا تو مما نے اسے گھور کر دیکھا۔

"فضول باتیں مت کیا کرو۔ امریکہ میں تمہارے اتنے رشتے دار تو موجود ہی ہیں کہ اگر ایسی کوئی بات ہو تو فوراً معلوم ہو جائے۔"

"اچھا خفا تو مت ہوں۔ میں نے تو یونہی ایک امکان ظاہر کیا تھا۔" اس نے لاڈ سے مما کے کندھے پر سر ٹکایا۔

"ایسے برے برے امکان مت ظاہر کیا کرو۔ مما کا دل دہل جاتا ہے۔ شیراز کے بعد تم ہی تو ہو۔ جس کی خوشیاں دیکھنے کے ہم منتظر ہیں۔" انہوں نے زارا کے سر پر بوسہ دیا۔

"اور آپ کے خیال میں یہ ساری خوشیاں رضوان حیدر سے وابستہ ہیں۔"

"خدا کرے کہ تمہاری ساری خوشیاں اسی کے ساتھ وابستہ رہیں۔" مما نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"اور اس کی مجھ سے۔۔۔" زارا متبسم لہجے میں بولی تو مما مسکرا دیں۔

"ہاں ۔۔۔ آؤ۔ اب کچھ کھا پی لو۔"

"میں آرہی ہوں۔۔۔" مما چلی گئیں تو زارا کا دھیان پھر سے بھٹک کر زین العابدین کی طرف چلا گیا۔ جسے جھٹک کر وہ ڈائننگ روم میں چلی آئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ہلکی رم جھم نے یونیورسٹی کے سبزہ زاروں کو عجب سا نکھار بخش دیا تھا۔ سرخ در و دیوار پر پھسلتی بارش کی بوندوں نے ان کے دلوں میں ایک نئی امنگ بھر دی تھی۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر موسم کے رنگ انجوائے کر رہے تھے۔ افتخار کھوکھر اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں منیر نیازی کی پنجابی نظم سنا رہا تھا۔

توں ہیں تے فیر میں وی ہاں
میں جے نہ ہوواں
میری طراں فیر کون ایس جگ دے
سارے زہر نوں پیوے
دل وچ بلدے بھانبڑ لے کے
ہسدیاں ہسدیاں جیوے

(تم ہو تو میں بھی ہوں۔ اگر میں نہ ہوں تو کون ہے جو میرے طرح اس جگ کا سارا زہر پیے اور دل میں جلتی آگ بسائے ہنس ہنس کر جیے۔)

افتخار کھوکھر کی نگاہیں عظمٰی کے آس پاس بھٹک رہی تھیں اور وہ اس سے یکسر بے نیاز آسمان پر چھائے سرمئی بادلوں سے برستی بوندیں گن رہی تھی۔

"کچھ تو ترس کھاؤ اس بے چارے پر۔" انعم نے سرگوشی کی۔

"جس گاؤں جانا نہیں اس کے کوس گننے کا کیا فائدہ۔" وہ نظروں کا زاویہ بدلے بغیر اطمینان سے بولی۔ اس کے گلاسز گود میں رکھی فائل پر دھرے

تھے۔ لمبے چوٹی میں سے نکلے بال چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ سفید کلف لگے دوپٹے میں وہ انتہائی نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔

"انتہائی سنگدل ہو تم۔۔۔" زارا نے کہا اور پھر سے افتخار کھوکھر کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ اندرون لاہور کی گلیوں میں دودھ، مکھن پر پلنے والا صحت مند و توانا نوجوان تھا۔ اس کے مضبوط بازو اور چوڑی چھاتی بتاتی تھی کہ اس نے پیچھے حلوائی کی دکان پر اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ کر لسی میں مکھن کے پیڑے "رڑک" کر پیے ہیں۔ پھر اس کے انداز میں بڑی بے نیازی اور جرات تھی۔ وہ آصف، ارقم، ماجد اور فیروز کے کہنے پر اگلی نظم سنا رہا تھا۔

بھید نئیں کھلا آخری اے
ایس کڑی دی چال
کلیاں ورگا رنگ اے جس دا
بدلاں ورگے وال
کلی ہووے تے اج ملدی
جیویں گوڑھے یار
جے کوئی نال سہیلی ہووے
اکھاں نہ کردی چار

"تم اس سے تنہا کب ملی تھیں۔" انعم بے اختیار بول اٹھی۔ عظمٰی تپ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلو یہاں سے۔۔۔"

ان دونوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ مگر سر رضا کو دیکھ کر رک گئیں۔

"آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔" ساری کلاس ہی باہر تھی۔

"سر! آج ہمیں نہیں پڑھنا۔" افتخار کھوکھر بول اٹھا۔

"کیوں؟۔۔۔"

"سر! ہمارا موڈ نہیں ہے۔" بڑی لاپروائی سے فرمایا۔ سر رضا نے سب پر ایک نگاہ دوڑائی۔ موڈ کسی کا بھی نہ تھا۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھری۔

"تو پھر کیا ارادے ہیں۔۔۔؟"

"سر جی! آم کھاتے ہیں۔ میں آپ کو پنجابی شاعری بھی سناؤں گا۔" افتخار کھوکھر نے تجویز دی۔ جس پر سر رضا نے کچھ لمحے غور کیا۔ پھر بولے۔

"ٹھیک ہے چندہ کرو۔"

"سر! ہمارا تو خیال تھا یہ پارٹی آپ کی طرف سے ہوگی۔" آصف نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

"میں فیاض ہوں برخوردار۔۔۔ بے وقوف نہیں۔"

افتخار کھوکھر سب سے پیسے لینے لگا۔ عظمٰی کے پاس آیا تو مسکرا کر ہاتھ پیچھے کیا۔

"اب میں آپ سے پیسے لوں گا۔؟"

عظمٰی جز بز ہو گئی۔ افتخار کھوکھر آگے بڑھ گیا تھا۔

"ایڈیٹ۔" عظمٰی دانت پیس کر رہ گئی۔

"اس نے تمہارے پیسے بچا دیے۔ تم خوامخواہ خفا ہو رہی ہو۔" انعم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ جو غصے میں لال پیلی ہوتی ۔ ان دونوں کے روکنے کے باوجود وہاں سے چلی گئی۔

ڈپارٹمنٹ میں فائنل کے طلبا نے ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا۔ آموں کا کریٹ درمیان میں پڑا تھا اور لڑکے اس کے گرد بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ لڑکوں کی تجویز تھی کہ دو ٹیمیں بنائی جائیں۔ لڑکے الگ لڑکیاں الگ مگر لڑکیاں انکاری تھیں کہ اس صورت میں ہارنا تو ایک طرف وہ لوگ آموں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتیں۔

پریویس کے اسٹوڈنٹ دور کھڑے اس ہنگامے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں وہ بھی تھا۔ "زین العابدین" اس کے لبوں پر ایک خوبصورت اور معصوم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی مگر زارا کو دیکھتے ہی وہ سنجیدہ ہو گیا۔ زارا اسے نظر انداز کر کے افتخار کی طرف متوجہ ہو گئی جو عظمٰی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"وہ خفا ہو گئی ہے۔" انعم نے بتایا۔

"کس سے، مجھ سے۔۔۔؟" حد درجہ حیرت تھی اس کے لہجے میں۔

"تم نے اس سے پیسے جو نہیں لیے تھے۔۔۔"

"بس اتنی سی بات سے خفا ہو گئی۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں۔ کیونکہ اسے اپنے پیسوں کا کھانے کی عادت

ہے۔"

"خیر کھلائیں گے تو اسے ہم اپنے ہی پیسوں کا۔ ورنہ ہمارا نام بھی افتخار کھوکھر نہیں۔" اپنی مونچھیں سنوارتے ہوئے وہ بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

اور اگلے دن عظمیٰ تپی ہوئی افتخار کھوکھر کو ساری یونیورسٹی میں ڈھونڈ رہی تھی۔

"یا اللہ! ایک ہی رات میں ایسی کایا پلٹی کہ وہ جو اس کا نام سننے کی روادار نہ تھی۔ اب اسی کو دیوانہ وار ڈھونڈ رہی ہے۔" مارے حیرت کے انعم کا منہ بند نہ ہو رہا تھا۔

"میں اسے قتل کر دوں گی۔" عظمیٰ دانت پیس کر بولی۔

"گھائل تو وہ پہلے ہی ہو چکا۔ اب جان بھی لوگی تو وہ اف نہیں کرے گا۔" زارا مسکرائی۔

"جانتی ہو اس نے کیا کیا ہے۔"

"نہیں، میں نہیں جانتی۔"

"وہ کل آموں کا کریٹ لے کر میرے گھر پہنچ گیا۔" اس نے دانت پیس کر بتایا۔ وہ دونوں چیخ اٹھیں۔

"کیا؟۔۔۔"

"ہاں۔ باقاعدہ اپنا تعارف میرے کلاس فیلو کی حیثیت سے کرایا اور کہا کہ اس کے باغ کے آم ہیں اور وہ اپنے سارے دوستوں کے ہاں دے کر آیا ہے۔ بہن بھائیوں نے کل سے جان کھا رکھی ہے کہ آپی تم لڑکوں کے ساتھ بھی دوستی کرتی ہو۔ اللہ ابا جی کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔" دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ روہانسی ہو گئی۔

"کیا انہوں نے کچھ کہا تم سے۔" زارا نے تفکر سے پوچھا۔

"نہیں کہا تو کچھ نہیں۔ بس خاموشی سے حقہ گڑگڑاتے رہے۔"

"اور افتخار سے۔۔۔"

"بہت خوش ہو کر ملے۔ چائے بھی پلوائی اور آموں کا شکریہ ادا کر کے واپس بھیجا۔" وہ جل کر بولی۔ زارا اور انعم بے اختیار مسکرائی تھیں۔

"تو پھر تم کیوں ٹینس ہو رہی ہو۔"

"کیوں، بہت اچھا کام کیا ہے اس نے۔ انتہائی ذلیل اور گھٹیا حرکت ہے یہ۔"

"اچھا ٹھیک ہے، وہ ملے گا تو اس سے پوچھ لیں گے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔" زارا نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔"

"ہرگز مت چھوڑنا۔۔۔" انعم فوراً بول اٹھی۔ اس سے قبل کہ عظمیٰ اس کے جملے میں چھپے معنی ڈھونڈ کر اس کی گردن دبا دیتی۔ زارا جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"آؤ تمہیں ٹھنڈا جوس پلواؤں۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟۔۔۔" عظمیٰ فوراً اس سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتی تھی کہ آج وہ آئی ہی اس لیے تھی۔

"پتا نہیں۔ صبح سے دیکھا نہیں کہیں۔" زارا نے کہا وہ تینوں کیفے ٹیریا کی طرف چل دیں اور وہاں افتخار بہت سے دوستوں میں گھرا کہہ رہا تھا۔

کرم کرو یا ستم ۔۔۔ گلہ نہیں کرتے
خزاں میں پھول یقیناً" کھلا نہیں کرتے
ملاؤ خاک میں ہم کو مگر خیال رہے
ہم ایسے لوگ دوبارہ ملا نہیں کرتے

اس کی نگاہوں میں شوخی سی امڈ آئی تھی۔

"انتہائی گھٹیا اور ذلیل انسان ہے۔" ظاہر ہے وہ اتنے سارے لوگوں میں اسے اٹھا کر یہ تو نہیں پوچھ سکتی تھی کہ تم میرے گھر آم کیوں لے کر آئے۔ سو چڑ کر دروازے کے پاس ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد افتخار اٹھ کر خود ہی ان کے قریب آ گیا۔

"السلام علیکم اور سنائیں کیا حال چال ہیں آپ کے۔۔۔" خالی کرسی کی پشت پر اپنی ہتھیلیاں ٹکاتے ہوئے وہ بظاہر سب سے پوچھ رہا تھا۔

"ہمارا حال اور چال تو ٹھیک ہیں، تم اپنی فکر کرو۔" زارا نے ٹیبل پر انگلی بجاتے ہوئے کہا۔

"ہم سے کون قصور سرزد ہو گیا جی۔" مخصوص لب و لہجہ نگاہوں میں بلا کی شرارت۔ عظمیٰ تاؤ کھا کر پلٹی۔ عینک کو شہادت کی انگلی سے ٹھکانے پر کیا اور اس کے عقب سے کھا جانے والی نظروں سے افتخار کو دیکھا۔ جو پورے کا پورا اس کی طرف متوجہ تھا۔ وہ ایک پل کو گڑبڑائی۔ (اور اسی ایک پل کو افتخار کی نگاہوں نے قید کیا تھا) پھر سنبھل کر بولی۔

"تم نے میرے گھر آنے کی جرات کیسے کی؟"

"کیا پھر آ کر دکھاؤں کہ کیسے ہمت کی۔" افتخار نے معصومیت سے پوچھا۔ انعم نے اپنی مسکراہٹ روکنے کو منہ پر ہاتھ رکھا۔

"تم آم کیوں لائے؟۔" وہ دبے دبے لہجے میں چیخی۔

"اچھے نہیں نکلے؟ خفا مت ہو اور بھجوا دوں گا۔" بلا کا اطمینان تھا اس کے لہجے میں۔

انعم کا قہقہہ آؤٹ آف کنٹرول ہوا تھا۔ عظمیٰ غصے میں افتخار کی ڈھٹائی اور دوستوں کی بے وفائی پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ باہر بھاگی۔ وہ دونوں اس کے پیچھے تھیں۔ جبکہ افتخار کھوکھر اسی اطمینان سے پلٹ کر اپنے دوستوں میں جا بیٹھا تھا۔

"ہاں تو میں کیا سنا رہا تھا۔"

♥ ♡ ♡ ♥

وہ کمپیوٹر پر مصروف تھی۔ جب دروازہ ہلکا سا ناک ہوا۔

"یس۔۔۔" کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے کہا تو ملازمہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

"بڑی بی بی آئی ہیں۔"

"اوہ تائی جان۔" وہ چونکی "اکیلی ہیں۔۔۔"

"نہیں ساتھ میں رائے سلیمان حیدر بھی ہیں۔"

"اور مما۔ پارٹی سے واپس آ گئیں۔؟" اس نے کمپیوٹر آف کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی تک تو نہیں لوٹیں۔"

"ٹھیک ہے تم کولڈ ڈرنکس وغیرہ لے کر آؤ اور کھانا تیار ہے؟" ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے بالوں میں برش چلایا۔

"کھانا تو بالکل تیار ہے جی۔"

"ایک دو ڈشز کا اضافہ کر دو۔ وہ لوگ کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔" ملازمہ کو ہدایت دے کر وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"السلام علیکم! تائی جان۔"

"جیتی رہو۔" تائی جان نے اسے محبت سے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

"اور آپ کیسے ہیں سلیمان بھائی! گاؤں سے کب آئے۔" وہ سلیمان حیدر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آج صبح ہی لوٹا ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"میری بٹی تو اب مجھے اپنی شکل بھی نہیں دکھاتی۔" تائی اماں نے کہا تو سلیمان بھی بول اٹھے۔

"ہاں بھئی۔ یہ تم کیا کر رہی ہو آج کل۔"

"وہی اسٹڈیز۔" زارا نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"مہینوں رائے ہاؤس میں نہیں جھانکتی ہو۔"

"کیا کروں سلیمان بھائی! سارا دن تو یونیورسٹی میں گزر جاتا ہے۔ واپسی میں بھی یونہی ٹائم نکل جاتا ہے۔ سوچتی تو روز ہوں کہ آج جاؤں گی۔" زارا نے کہا۔ ملازمہ ڈرنک سرو کرنے لگی تھی۔

"کیا ضرورت تھی اتنا پڑھنے کی۔ گریجویشن کافی نہ تھا۔" سلیمان بھائی کو تو پہلے ہی اس کے یونیورسٹی جوائن کرنے پر اعتراض تھا۔

"بالکل کافی نہ تھا۔" وہ فوراً" بول اٹھی۔ تو تائی جان نے بھی اس کی حمایت کی۔

"فارغ رہ کر کیا کرتی۔ اچھا ہے جب تک رضوان نہیں آ جاتا۔ بہتر ہے اپنا شوق پورا کر لے۔" زارا جز بز ہوئی۔ وہ اپنے شوق کو انتظار کا نام نہیں دے سکتی تھی مگر وہ خاموش ہی رہی کہ سلیمان کے سامنے وہ ابھی اپنے کیریئر کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی کہ تایا جان کے قتل کے بعد ہر معاملہ عملاً" سلیمان حیدر کے ہاتھ میں تھا۔ پاپا نے اپنے شوق سے لیدر گارمنٹس کا بزنس شروع کیا اور باقی ہر معاملے سے دستبردار ہو کر محض اپنے بزنس پر توجہ دینے لگے۔

سو تایا جان کی ہی طرح جاگیر کے معاملات سلجھاتے سلجھاتے سلیمان لہجے میں ایک تحکمانہ پن آ گیا تھا۔ اگر زارا کی بات سے وہ اختلاف کرتے تو زارا کے پاس کوئی دلیل بھی نہ بچتی کہ پھر کوئی سننا ہی گوارہ نہ کرتا۔ وہ پہلے رضوان سے بات کرنا چاہتی تھی۔

"یہ لو۔" تائی جان نے پرس کھنگال کر ایک چھوٹی سی سنہری ڈبیا اس کو دی۔ جس کے شفاف شیشے میں سے دل کی شکل کے ٹاپس نظر آ رہے تھے جس پر ڈائمنڈ جڑے تھے۔

"یہ کیا ہے؟"

"رضوان نے بھجوائے ہیں تمہارے لیے۔" سلیمان مسکرائے۔ اس نے جھینپ کر ڈبیہ پکڑ لی۔ رضوان اس سے قبل بھی اسے مختلف گفٹس بھجواتے رہتے تھے۔

"کیسا ہے؟"

"اچھا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ "میں کھانا لگواتی ہوں تائی جان۔"

پہلے کمرے میں آ کر اس نے ٹاپس سنبھال کر رکھے۔ پھر کچن میں آ کر خانساماں کو ہدایات دینے لگی۔ کھانے کے وقت تک مما اور پاپا بھی آ گئے تھے۔

"رضوان آ جائے تو میں فوراً" ہی تاریخ لینے پہنچ جاؤں گی۔" کھانے کے دوران تائی اماں نے اچانک کہا۔ پاپا نے ایک نظر زارا پر ڈالی۔ پھر لاپروائی سے بولے۔

"کیا جلدی ہے بھابھی۔"

"جلدی کیوں نہیں۔ بڑا عرصہ ہوا راجہ ہاؤس میں کوئی فنکشن نہیں ہوا۔ اب تو سلیمان کا بیٹا بھی آٹھ برس کا ہو گیا ہے۔"

"رضوان کو آنے تو دیں۔ بچے ایک دوسرے کو دیکھ لیں، اچھی طرح سمجھ لیں تو پھر دیکھا جائے گا۔" زارا کو پہلی بار پاپا کی کوئی بات اتنی اچھی لگی۔ سلیمان نے پلیٹ سے نظر ہٹا کر پاپا کو دیکھا۔

"نکاح ہو چکا ہے۔ سمجھنے سمجھانے کا وقت تو گزر گیا اب تو رشتہ نبھانے کا وقت ہے۔"

"یہ نیا دور ہے برخوردار۔"

"اور آپ اس نئے دور کے ساتھ کچھ زیادہ ہی قدم ملانے لگے ہیں۔" سلیمان نے قہقہہ لگایا۔ زارا کو اس کا یوں طنز کرنا بہت برا لگا۔ پاپا بھی خاموش ہو گئے تھے۔ ماما نے بات بدلنے کو سلیمان کے آگے سوئٹ ڈش رکھ دی۔

کھانے کے بعد زارا اسٹڈی کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ تائی جان اور سلیمان بہت رات گئے لوٹے تھے۔ سلیمان کو پاپا کے ساتھ زمینوں کے معاملات سلجھانے تھے۔ مما اور تائی جان اپنی اپنی تیاریاں لے کر بیٹھ گئیں۔ ان کے جانے کے بعد زارا مما کے کمرے میں آئی تو وہ سیف کھولے، بیڈ پر زیورات کے ڈبے سجائے بیٹھی تھیں۔

"مما! کیا کر رہی ہیں آپ؟" مما نے مسکرا کر ایک سیٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ دیکھو۔ کندن کا یہ سیٹ مجھے تمہاری دادی نے رونمائی میں دیا تھا۔ کتنا خوبصورت ہے نا۔"

"ہاں وہ تو ہے۔ مگر آپ یہ سب اس وقت کیوں کھولے بیٹھی ہیں۔" وہ ان کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"سنا نہیں رضوان آنے والا ہے۔"

"آپ تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے وہ کل کی فلائٹ سے آ رہا ہے۔"

"انشاء اللہ وہ دن بھی جلد ہی آئے گا۔ اس کے ایگزام تو شروع ہو گئے ہیں۔" انہوں نے ڈبہ بند کر کے ایک طرف رکھا اور دوسرا دیکھنے لگیں۔

"اس کے شروع ہوئے ہیں میرے تو نہیں۔" وہ آہستگی سے ڈبے پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ میرے ایگزام شروع ہونے میں پورے چھ ماہ باقی ہیں۔"

"تو؟" اب کے مما نے قدرے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"تو یہ مما کہ میں اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ ہونے سے قبل شادی نہیں کروں گی۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

مما نے بہت دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"اتنا عرصہ تو تیاریوں میں نکل ہی جائے گا۔"

"مما! میں جرنلزم میں ایم اے گھر بیٹھنے کے لیے نہیں کر رہی۔" وہ چڑ کر بولی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو زارا۔" مما کے لہجے میں ناگواری سی اتری۔

"مما! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔"

"رائے فیملی کی کسی بھی لڑکی نے اس سے قبل جاب کی ہے؟" مما نے الٹا اسی سے سوال کیا۔

"تو کیا کرے گی بھی نہیں۔" اس نے جرح کی۔

"زارا؟"

"مما! ان لوگوں کو یہ قیمتی زیور، کپڑے اور فنکشنز زندگی لگتے ہوں گے۔ مجھے وقت کا ضیاع لگتے ہیں۔ میں کچھ اور کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی صلاحیتیں آزمانا چاہتی ہوں۔"

"تمہارے پاپا۔"

"کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ خاصے لبرل ہیں۔ میری آزاد ماحول میں تربیت اور ایجوکیشن اس بات کا ثبوت ہے۔" وہ فوراً" بولی۔

"سلیمان نہیں مانے گا۔" انہوں نے نیا نکتہ نکالا۔

"میری شادی سلیمان سے تو نہیں ہو رہی اور رہے رضوان تو ان سے میں خود ہی بات کر لوں گی۔ آئی ہوپ۔ وہ مجھے با آسانی انڈر اسٹینڈ کر لیں گے۔"

"زارا!" مما نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔ "کیا ضرورت ہے اس خواری کی۔ آرام سے شادی کر کے لائف انجوائے کرو۔"

"مما! میں لائف کو اس طرح انجوائے نہیں کر سکتی ہوں، جس طرح آپ لوگوں نے کی۔ میری اپنی ترجیحات ہیں۔"

"پتا نہیں کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ میری سمجھ میں نہیں آتیں تمہاری باتیں۔" انہوں نے تنگ آ کر سارے ڈبے بند کرنے شروع کر دیے۔ "سیدھا سادا راستہ چھوڑ کر مارے مارے پھرنے میں نجانے کیا مزا ہے۔" مما چڑ کر بولیں۔

"اصل زندگی یہی ہے ماما۔"

"یہ ڈبے اٹھا کر سیف میں رکھو۔ میرے تو سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔" انہوں نے انگلیوں سے پیشانی دبائی۔

"دبا دوں۔" زارا شرارت سے مسکرائی۔

"کوئی ضرورت نہیں۔" مما نے اسے گھور کر دیکھا۔

"آپ نے میری بات کا تو جواب ہی نہیں دیا۔"

"صبح بات کریں گے۔" انہوں نے ٹالا۔

"اور رات بھر مجھے قائل کرنے کے لیے آپ دلیلیں سوچیں گی۔ بٹ مما! ایک بات طے ہے۔ میں قائل نہیں ہوں گی۔ مجھے کام کرنا ہے اور وہ میں کر کے رہوں گی۔" وہ مصمم ارادے سے بولی۔

"جانتی ہوں میں۔" مما کے لہجے میں خفگی در آئی۔ "رضوان آئے تو کہہ دوں گی اس سے سنبھالو زارا کو ہماری نہیں سنتی اب۔"

"اس معاملے میں کسی کی نہیں سنوں گی اور رضوان کی آپ فکر مت کریں۔ وہ میری بات مان لیں گے۔"

"سب اسی کی شہ ہے اور رضوان نے تمہیں ڈائمنڈ ٹاپس بھیجے ہیں۔" مما کو اچانک یاد آیا۔

"ہاں بھجوائے تو ہیں۔"

"تم نے مجھے دکھائے ہی نہیں۔"

"بھول گئی تھی۔"

"جھوٹ مت بولو۔" مما اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ "رضوان کا تحفہ بھولنے والی چیز تو نہیں۔"

"آئی سوئیر مما! واقعی بھول گئی تھی۔ اب دکھاؤں۔۔۔؟" وہ کھڑی ہو گئی۔

"نہیں صبح دیکھ لوں گی۔" مما نے روکا۔

"جیولری کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں۔ رضوان نے یونہی بھجوا دیے۔"

"محبت ہے اس کی۔ بہت سنبھال کر رکھنا۔"

"یہ رضوان وہاں صرف پڑھتے ہیں یا جاب وغیرہ بھی کرتے ہیں۔" زارا نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"اسے کیا ضرورت ہے۔ سلیمان خاصا پیسہ بھجواتا ہے اسے۔ بہت پیار کرتا ہے رضوان سے۔ رضوان چھوٹا ہی تو تھا۔ جب بھائی صاحب کا قتل ہوا۔ سلیمان نے اسے بچوں ہی کی طرح پالا۔ ایک باپ کی طرح خیال رکھا ہے۔ حالانکہ وہ خود اس وقت کوئی سولہ سترہ برس کا ہوگا۔ مگر شروع ہی سے باپ کے ساتھ اٹیچ تھا۔ انہی کے ساتھ زمینوں پر جاتا بلکہ وہ جہاں بھی جاتے تھے۔ بڑا بیٹا ہونے کی بنا پر سلیمان کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ سو وہ جاگیر کے سارے اسرار و رموز سمجھ چکا تھا۔ رضوان چھوٹا تھا۔ پھر اس کا رجحان بھی نہیں تھا۔ سلیمان نے بھی اسے ان سارے بکھیڑوں سے دور ہی رکھا۔"

مما پوری تفصیل بتانے بیٹھ گئی تھیں۔ وہ بغور سن رہی تھی۔ تب ہی بابا آ گئے۔

"کیا مذاکرات چل رہے ہیں۔" انہوں نے خوشدلی سے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ میں زارا کو سلیمان کے بارے میں بتا رہی تھی۔"

"سلیمان کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں؟۔۔۔" بابا نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ اس نے بھائی صاحب کے بعد کس طرح جاگیر کو سنبھالا۔ زارا کو یہ سب معلوم ہونا چاہیے۔"

"ہاں بھئی اس معاملے میں تو اس کی صلاحیتیں قابل رشک ہیں۔ اسی کی وجہ سے تو میں سب کچھ بھلائے اپنے بزنس میں مصروف ہوں۔" انہوں نے بے اختیار تعریف کی۔

"میرا خیال ہے سلیمان بھائی کی کافی تعریفیں ہو گئی ہیں اور رات بھی کافی ہو گئی ہے۔" زارا اٹھ کر ڈبے سمیٹنے لگی۔

"اور یہ آپ کیا کہہ رہے تھے عمیر۔۔۔؟" مما بابا کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"میں نے کیا کہہ دیا۔۔۔" انہوں نے وارڈ روب کھول کر نائٹ ڈریس نکالا۔

"رضوان آئے تو پہلے ایک دوسرے کو سمجھ لیں کوئی تک تھی اس بات کی۔"

"میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"ایسی باتیں یونہی تو نہیں کی جاتیں۔ کچھ تو تھا آپ کے ذہن میں۔۔۔" ان دونوں نے اپنی بحث شروع کر دی تھی۔ زارا نے سیف بند کیا اور اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

سر صفدر کی اسائنمنٹ بناتے بناتے زارا نے اچانک سر اٹھا کر کہا۔ "ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"وہ کیا ہے؟۔۔۔"

"افتخار کو عظمٰی میں کیا نظر آ گیا۔ جو اس پر مر گیا۔" عظمٰی کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لے رہی تھی۔

تب ہی افتخار لائبریری میں داخل ہوا۔ اس کی نگاہ چاروں طرف گھوم کر ایک پل کو عظمٰی پر رکی۔ جو اسے دیکھتے ہی پوری کتاب پر جھک گئی تھی۔ مگر وہ ان کی طرف آنے کے بجائے دوسری میز کی طرف بڑھ گیا۔

"تو بھئی صاحبو! الرٹ ہو کر سن لو۔"

"کیوں۔۔۔؟" ایک ساتھ کئی "کیوں" آئے تھے۔

"یونیورسٹی بند ہونے والی ہے۔"

"وجہ؟۔۔۔"

"جھگڑا، فساد، ہنگامہ۔۔۔"

وہ تینوں بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"اسد ملک اور سلیم بہادر کے درمیان تو تو میں میں ہو گئی ہے۔ میں۔۔۔ ان کے درمیان صلح کی کوشش کر رہا ہوں مگر ناممکن۔۔۔ ہنگامہ ضرور ہوگا۔"

"ہوا کیا ہوا تھا۔۔۔" عظمٰی نے پوچھا۔

"تمہیں نہیں پتا۔ اسد نے سر ابراہیم کے ساتھ شاید بدتمیزی کی۔ سلیم نے روکنا چاہا تو اس کے گلے پڑ گیا۔ بس دونوں گروپوں میں ٹھن گئی۔ پروفیسر صاحبان الگ ہڑتال کا سوچ رہے ہیں۔" زارا نے بتایا۔ عظمٰی کل جلدی چلی گئی تھی۔ سو اس سارے ہنگامے سے بے خبر تھی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے نا۔ استاد اسکول کا ہو یا یونیورسٹی کا۔ اسٹوڈنٹ کی کسی بھی غلطی پر سرزنش کرنا اس کا حق ہے۔" انعم نے کہا اور پھر سے افتخار کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو کہہ رہا تھا۔

"میں کوشش کروں گا انہیں سمجھانے کی۔ بلاوجہ ہنگامے کا فائدہ بھی کیا ہے۔"

"اسے بہت شوق ہے ہر جھگڑے میں ٹانگ اڑانے کا۔" عظمٰی جل کر بولی۔

"تمہیں کیوں فکر ہو رہی ہے۔" زارا نے چھیڑا۔

"مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں نے یونہی ایک بات کی تھی اور تم اٹھو آج گھر نہیں جانا کیا۔؟" عظمٰی نے ٹائم دیکھا تو انعم سے کہہ کر اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔

"میں ڈراپ کر دیتی ہوں۔" زارا بھی اٹھ گئی۔ افتخار انہیں اٹھتے دیکھ کر قریب آ گیا۔

"بہتر ہے آپ ایک دو دن یونیورسٹی نہ آئیں۔"

"کیوں؟۔۔۔"

"بس آثار کچھ اچھے نہیں ہیں۔ پس پردہ عناصر اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور کرائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔" زارا نے کہا۔ انہیں ڈراپ کر کے وہ گھر آ گئی۔ مما گھر پر نہیں تھیں۔ معلوم ہوا "رائے ہاؤس" گئی ہیں۔ زارا نے کھانا کھایا اور سو گئی۔ ابھی تو شام ڈھل رہی تھی۔ وہ لان میں نکل آئی۔

"بی بی! آپ کے لیے لیچی کا جوس لاؤں۔۔۔" ملازمہ نے پوچھا۔

"ہاں مگر فریش ہو اور بہت ٹھنڈا بھی۔"

"جی اچھا۔" وہ پلٹی پھر رک گئی۔ "وہ بی بی، رضوان صاحب کا فون آیا تھا۔"

"کب۔۔۔؟" زارا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"جب آپ سو رہی تھیں۔"

"تو مجھے اٹھا دیا ہوتا۔" وہ جھنجلا گئی۔ اسے رضوان سے بات کرنا تھی۔

"پری بی بی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا جب آپ سو رہی ہوں تو آپ کو ہرگز نہ اٹھایا جائے۔ ورنہ آپ کے سر میں درد ہو جاتا ہے۔"

"آئندہ رضوان کا فون آئے تو مجھے ضرور ہی جگا دینا۔ وہ کوئی لاہور سے نہیں امریکہ سے فون کرتا ہے۔"

"جی اچھا۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری۔

"اور کیا کہا تھا؟"

"کہہ رہے تھے چھ بجے دوبارہ فون کروں گا۔"

"اچھا۔" زارا نے ٹائم دیکھا۔ چھ بجنے میں تھوڑا ہی وقت تھا۔

"ٹھیک ہے تم جوس لاؤ۔"

اور جب تک وہ جوس سے فارغ ہوئی۔ رضوان کا فون آ گیا تھا۔

"کیسی ہو زارا؟۔۔۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کے ایگزام کیسے ہو رہے ہیں۔"

"ہاں اچھے ہیں۔ یہ بتاؤ گفٹ پسند آیا۔"

"اچھا تھا۔" وہ نارمل سے انداز میں بولی۔

"صرف اچھا۔" ان کا لہجہ و انداز متبسم تھا۔

"ہاں۔۔۔"

"بہت اچھا کب ہو گا۔۔۔؟"

"جب آپ بھائی کے پیسے کی جگہ اپنے پیسے سے گفٹ خریدیں گے۔" وہ فوراً بولی۔ رضوان کھل کر ہنسے پھر سراہنے والے انداز میں بولے۔

"بہت خوب۔ ویسے وہ دن بھی جلد ہی آئے گا۔"

"مجھے اسی دن کا انتظار ہے۔"

"اور کچھ؟۔۔۔" یہ ان کا مخصوص انداز تھا بات کے اختتام پر ہمیشہ یہی کہتے۔

"رضوان! آپ بزنس کی ڈگری لے کر کیا کریں گے؟۔" اس نے اچانک پوچھا۔

"آلو چھولے بیچیں گے۔" وہ ہنسے۔

"میں نے یہ سوال سنجیدگی سے کیا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"ظاہر ہے بزنس کروں گا۔ میرے اپنے کچھ آئیڈیاز ہیں زارا! مجھے وطن آنے دو۔ شاید میں بھی انکل عمیر کی طرح اپنا الگ بزنس اسٹارٹ کروں۔"

"ہوں۔۔۔" وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

"کیا سوچنے لگیں۔" رضوان اس کی خاموشی محسوس کر کے پوچھنے لگے۔

"رضوان میں بھی کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا گھر کے سارے ملازمین چھٹی پر چلے گئے ہیں۔" انہوں نے برجستہ پوچھا۔

"رضوان!" وہ دبے دبے لہجے میں چیخی۔

"مشرقی خواتین کام کاج کرتی ہی اچھی لگتی ہیں۔" وہ شریر سے لہجے میں گویا ہوئے۔

"میں فون بند کر دوں گی۔" وہ خفا ہو گئی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔ فضول حرکت نہیں۔۔۔" انہوں نے سرزنش کی۔ "کہو کیا کرنا چاہتی ہو۔"

"جاب۔۔۔"

"کیا امریکہ میں۔۔۔"

"ہونہہ۔ پاکستان میں۔۔۔"

"تو کر لو۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"آپ وہیں بیٹھ کر میری بہت مدد کر سکتے ہیں۔"

"ہاں تو کہو نا۔"

"مما کا خیال تھا کہ اس سے قبل خاندان کی کسی لڑکی نے جاب نہیں کی۔ ایک بار پاپا سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہہ دیا کام کرنا ہے تو میرے آفس میں آ جاؤ۔ لیکن بزنس میرا انٹرسٹ نہیں ہے۔ میں اخبار جوائن کرنا چاہتی ہوں۔"

"جہاں تک آنٹی کی بات ہے تو یہ کوئی کلیہ نہیں کہ پہلے کسی نے کام نہیں کیا تو تم بھی نہیں کرو گی۔ اگر تم میں صلاحیت ہے تو ٹھیک ہے، آگے آؤ کام کرو میں تمہیں سپورٹ کروں گا اور دوسرا فیلڈ تو وہی ہونی چاہیے۔ جس میں تمہارا انٹرسٹ ہو۔ جس میں واقعی تمہارے آنے سے کوئی ہلچل ہو۔ تم جو کرنا چاہتی ہو کرو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"مما کا خیال تھا سلیمان بھائی اعتراض کریں گے۔"

"سے لی۔ میں ان سے بات کر لوں گا۔ وہ میری بات نہیں ٹالتے۔"

"تھینک یو رضوان! آپ نے تو میری پرابلم حل کر دی۔" وہ خوش ہو گئی تھی۔

"یہ کوئی پرابلم نہیں تھی اور ذرا سی بات پر پریشان مت ہو جایا کرو۔"

"تھینکس اگین اینڈ گڈ بائے۔"

"کام تو مجھے کرنا ہی تھا رضوان حیدر۔ بس میں نے سوچا یہ معاملہ افہام و تفہیم سے سلجھ جائے تو اچھا ہے۔" اس نے موبائل آف کر کے سوچا۔ پھر انعم کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف انعم کی امی تھیں۔

"کیسی ہو زارا بیٹا۔" وہ شائستگی و شفقت سے پوچھنے لگیں اور ساتھ ہی شکوہ کیا۔ "تم تو کبھی آتی ہی نہیں ہو۔"

"بس آنٹی کسی دن چکر لگاؤں گی۔ انعم ہے۔"

"ہاں ابھی تمہیں ہی فون کرنے والی تھی۔" ریسیور فوراً ہی انعم کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا تھا۔

"خیریت تو تھی۔۔۔"

"یونہی موڈ ہو رہا تھا۔ عظمیٰ بھی یہیں ہے۔" اس نے اطلاع دی۔

"تم لوگوں کے تو مزے ہیں یار۔ کتنے پاس پاس گھر ہیں۔"

"اور تمہارے پاس اپنی ذاتی گاڑی ہے۔"

"مطلب؟۔۔۔"

"مطلب یہ کہ آجاؤ۔۔۔" عظمیٰ کی آواز ابھری۔

"اس وقت۔۔۔" وہ سوچ میں ڈوبی۔

"ہم نے سوچا تھا مل کر اسٹڈی کریں گے۔ مگر اس انعم کی تو زبان۔۔۔ پتا نہیں کس چیز کی بنی ہے۔۔۔"

"اسپیشل میٹریل کی ہے۔" عقب سے انعم چہکی۔

"آجاؤ زارا! ہم مووی دیکھنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

"بہت خوب، آئی ہو کمبائن اسٹڈی کے لیے اور دیکھی مووی جا رہی ہے۔"

"سب اس انعم کی کارستانی ہے۔ تو تم آ رہی ہو۔"

"آ۔۔۔ ہاں۔۔۔" اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ گھر پر بور ہونے سے بہتر تھا کہ ان کے ساتھ انجوائے کیا جائے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"کل رضوان کا فون آیا تھا۔" اگلے دن اس نے مما کو بتایا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟۔۔۔"

"زارا عمیر کوئی بات کہے اور وہ پوری نہ ہو یہ تو ممکن نہیں۔۔۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" مما چونکیں۔

"مطلب یہ کہ میں نے ان سے بات کر لی تھی اور رضوان کو میری جاب پر کوئی اعتراض نہیں۔" وہ مطمئن انداز میں مسکرا رہی تھی۔ مما سر تھام کر رہ گئیں۔

"تم سے پہلے ہی بات ہو گئی اور میں سوچ رہی تھی۔ اسے فون کر کے منع کر دوں گی۔" انہوں نے بے چارگی سے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تو یہ ارادے تھے آپ کے۔ لیکن دیکھ لیں زارا عمیر جب کچھ کرنے کی ٹھان لیتی ہے تو پھر اس کے راستے کی ساری رکاوٹیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔"

"خدا کا شکر ادا کیا کرو۔" مما نے بے اختیار اسے ٹوکا۔

"وہ تو کرتی ہوں مما! ہمیشہ ہی کرتی ہوں۔ جتنا اس نے مجھے نوازا ہے۔ کل میں انعم کی طرف گئی تھی۔ اسے بتایا تو انعم کہنے لگی۔ کتنی خوش قسمت ہو تم جو چاہتی ہو پا لیتی ہو اور خدا نے میری ہمیشہ ہر خواہش پوری کی ہے۔" وہ آسودگی سے مسکرا رہی تھی۔

"اپنی کتنی پروا ہے اور ہماری؟۔۔۔" مما نے خفگی سے اسے دیکھا۔
"آپ کی بھی پروا ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اب آپ آرام سے میری شادی کی تیاریاں کریں کیونکہ اب کافی وقت ہے آپ کے پاس۔" وہ انہیں چھیڑتے ہوئے بولی۔ مما بس اسے گھور کر رہ گئی تھیں۔ تب ہی ملازمہ فون لے کر آگئی۔
"انعم بی بی کا فون ہے۔۔۔" ملازمہ نے بتایا۔ مما اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
"ہیلو! کیا آج پھر کسی مووی کا پروگرام ہے۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"تمہیں کچھ پتا چلا۔۔۔" انعم نے چھوٹتے ہی فون میں کہا۔
"کیا؟۔۔۔" زارا نے حیرت سے پوچھا۔ آج وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ سارا دن یونہی گھر میں بور ہوتی رہی۔
"افتخار کو گولی لگ گئی ہے۔۔۔"
"کیا! کیسے؟۔۔۔" وہ چیخ ہی تو اٹھی۔
"وہ اسد کو سمجھانے گیا تھا۔ وہیں جھگڑا ہو گیا۔"
"تمہیں کس نے بتایا۔"
"اکنامکس ڈپارٹمنٹ میں میرا جو کزن ہے اس نے ابھی فون کیا ہے۔" انعم بہت پریشان تھی۔
"یونیورسٹی میں ہنگامہ ہوا ہے؟"
"نہیں یا ہر۔ لیکن اب ضرور ہوگا۔ سلیم سخت غصے میں ہے۔ افتخار کے دوست بھی بپھرے ہوئے ہیں' اسد غائب ہو گیا ہے۔"
"اور افتخار۔۔۔"
"وہ ابھی تک اسپتال میں ہے۔"
"عظمیٰ کو بتایا۔۔۔" زارا کو اچانک خیال آیا۔
"ہاں ابھی بتایا ہے۔ وہ تو بالکل چپ ہو گئی۔"
"اچھا تم اور عظمیٰ تیار رہو۔ میں آتی ہوں' ہاسپٹل چلتے ہیں۔" زارا نے فون بند کیا۔ پھر بھاگتی ہوئی مما کے بیڈ روم میں آئی۔
"مما! اپنی گاڑی کی چابی دے دیں۔ مجھے ابھی ہاسپٹل جانا ہے۔"
"کیوں۔" وہ بری طرح چونکیں۔ "خیریت تو ہے نا۔"
"خیریت نہیں ہے۔ وہ میرا کلاس فیلو ہے نا' اسے گولی لگ گئی ہے۔" زارا نے جلدی سے بتایا۔
"اوہ نو۔۔۔" مما کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ زارا نے ٹیبل پر رکھی چابی اٹھائی۔
"معلوم نہیں مما! کتنی دیر ہو جائے۔ مجھے عظمیٰ اور انعم کو بھی پک کرنا ہے۔"
عظمیٰ انعم کے گھر ہی مل گئی تھی۔ وہ لوگ ہاسپٹل پہنچے تو پتا چلا۔ وہ آئی۔ سی۔ یو میں ہے۔ گولی اس کے سینے پر لگی تھی۔ آپریشن کے بعد گولی نکال دی گئی۔ مگر ابھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہ تھی۔ اسٹوڈنٹس کی بھرمار تھی۔ سلیم اور آصف سخت غصے میں تھے۔
"ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔" سلیم ہتھیلی پر مکا مار کر دھاڑا۔ "وہ کیا سمجھتا ہے۔ اگر ہم جھگڑے بھاگتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بزدل ہیں۔"
"دعا کریں۔ نجانے اس وقت کس کی دعا اس کی زندگی بن جائے۔" ساجد نے آہستگی سے کہا۔
زارا نے عظمیٰ کو دیکھا۔ پھیکے پڑتے چہرے پر لرزتے لب' جن پر ایک ہی دعا چل رہی تھی۔ سر رضا اسٹوڈنٹس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔
"جب تک اسد گرفتار نہیں ہوتا۔ ہم کلاسز کا بائیکاٹ کریں گے۔" سلیم بہادر نے فیصلہ سنایا۔ افتخار نے یہ گولی اسی کی وجہ سے ہی تو کھائی تھی۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ سر رضا تھک کر ان کی طرف آئے۔
"آپ لوگ گھر چل کر دعا کریں۔ اس وقت اسے صرف دعاؤں کی ضرورت ہے۔"
زارا نے اثبات میں سر ہلایا۔ افتخار ابھی انڈر آبزرویشن تھا اور وہ تینوں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی تھیں۔
"پلیز ساجد! ہمیں فون کر کے ضرور بتانا۔" اس نے

تاکید کی۔ پھر عظمیٰ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"چلو عظمیٰ۔۔"
"ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔
"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انعم نے اسے تسلی دی۔ تو وہ مرے مرے قدموں کے ساتھ ان کے ساتھ چل دی۔
"اسے کیا ضرورت تھی۔ صلح کا علمبردار بننے کی۔" انعم نے جھنجلا کر کہا۔ زارا نے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے دیکھا۔
"وہ ایسا ہی ہے یہ ہم سب جانتے ہیں۔"
"ہاں جانتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس کی نیت نیک تھی مگر کیا فائدہ ہوا۔ الٹا اپنی جان خطرہ میں ڈال بیٹھا ہے۔ والدین کا اکلوتا بیٹا۔ نجانے کیا حال ہو رہا ہو گا ان کا۔"
"اسے کچھ نہیں ہو گا۔ میرا دل کہتا ہے۔ تم بس دعا کرو۔" اس پورے عرصے میں عظمیٰ پہلی بار آہستگی سے بولی تھی۔ پھر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سارا رستہ وہ لوگ خاموشی سے اپنی اپنی سوچوں میں گم رہی تھیں۔ وہ انہیں ڈراپ کر کے گھر آ گئی۔
"کیا ہوا ٹھیک تو ہے تمہارا کلاس فیلو۔" مما نے پوچھا۔
"نو مما! اس کی حالت بہت سیریس ہے۔" وہ افسردہ سی تھی۔
"اوہ۔" مما بھی پریشان ہو گئیں۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ مگر وقت گویا تھم سا گیا تھا۔ ایک ایک منٹ ٹھہر ٹھہر کر گزر رہا تھا۔ زارا کا دھیان عظمیٰ کی طرف چلا گیا۔ بالکل پیلا تھا اس کا چہرہ' ایک خوف تھا اس کی نگاہوں میں۔
"شاید یہ حادثہ عظمیٰ کے دل کو نرم کر دے۔" زارا نے ایک پل کو سوچا۔ شام تک وہ کئی بار ہاسپٹل بھی فون کر چکی تھی اور جب شام کو ساجد نے یہ خوشخبری سنائی کہ افتخار کی حالت اب قدرے بہتر اور خطرے سے باہر ہے تو اس نے فوراً عظمیٰ کو فون کیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥
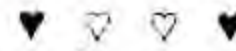
"کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔" زارا نے خوبصورت سا گلے بیڈ سائیڈ پر رکھا۔ افتخار مسکرا دیا۔
"اب بالکل ٹھیک ہے۔" افتخار نے زارا کے عقب میں مضمحل سی عظمیٰ کو دیکھا۔ عظمیٰ نے بس ایک نظر ہی افتخار کو دیکھا تھا۔ اسے ڈرپ لگی تھی۔ چہرے کی رنگت میں پیلاہٹ' مگر آنکھوں کی چمک اور لب و لہجہ کی تازگی اب بھی وہی تھی۔ زارا ہنس دی۔
"گولی نے بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔"
"کمبخت دل کے پاس سے گزر گئی۔ دل میں گھستی تو شاید کچھ بگڑ ہی جاتا۔" وہ مسکرایا۔
"اللہ نہ کرے۔" عظمیٰ بے ساختہ بولی۔ افتخار کا قہقہہ برجستہ تھا۔ دوسرے پل سینے میں اٹھتی ٹیس نے اسے لب بھینچنے پر مجبور کر دیا۔
"مجھے معلوم ہوتا کہ ایک ذرا سی گولی یہ کام کرے گی تو میں پہلے ہی کھا چکا ہوتا۔" تھوڑی دیر کے بعد وہ مسکرا کر بولا تھا۔ عظمیٰ بلش ہو گئی۔
"فضول مت بولو افتخار! تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے پسٹل کی نہیں سر درد کی گولی کھائی ہے۔" زارا نے گھورا۔
"اب تو مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" اس کے جملے پر زارا نے نظروں ہی نظروں میں سرزنش کی۔
"گھور کیوں رہی ہیں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں۔ کسی کی دعائیں ہمیں بچا گئیں۔" وہ معصومیت سے بولا۔
"کسی کی کیوں۔ ہم سب نے دعائیں کی تھیں۔"
"چلیں یہ کریڈٹ آپ لے لیں۔"
"لیکن تمہیں پرائے پھڈے میں پڑنے کی ضرورت کیا تھی۔" زارا نے پوچھا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔
"دو مسلمان بھائیوں کے درمیان صلح کروانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔"
"اچھا فرض نبھایا۔ گولی کھا کر آ گئے۔"
"یہ ان کا فعل ہے۔" وہ متانت ولاپروائی سے بولا۔

"یہ وہ دور نہیں ہے افتخار۔"
"ہاں یہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھ جانے کا دور ہے۔ مگر کب تک۔ کب تک ہم دور بیٹھے محض تماشائی بنے اپنے لوگوں کے ہاتھوں اپنے ہی لوگوں کے گریبان پھٹتے دیکھیں گے۔ کب تک محترم اساتذہ کی بے عزتی برداشت کریں گے۔"
"تو تم کیا کرو گے؟۔۔"
"احتجاج' کوشش' امن و صلح کی کوشش' اتنا جتنا میرے بس میں ہے۔" وہ ٹھوس لہجے میں گویا ہوا۔ زارا ایک پل کو چپ ہو گئی پھر سر جھٹک کر بولی۔
"اب تم سے بحث کون کرے۔"
"بحث مت کرو۔ عیادت کرو۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "مگر کیا پھول عظمیٰ کی زبان بیچ کر خریدے تھے۔" وہ فوراً ہی لہجہ بدل کر بولا تھا۔ عظمیٰ نے چونک کر سر اٹھایا۔ زارا ہنس دی۔
"عظمیٰ کی زبان کھلوانا تمہارا کام ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔" وہ عظمیٰ کو کوئی بھی موقعہ دیے بغیر باہر نکل آئی اور کاریڈور کے اختتام پر سیڑھیوں کے پاس کھڑی ہو گئی۔
"ارے آپ۔۔" زارا چونک کر پلٹی۔ پھر اپنے سامنے زین العابدین کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکن سی ابھر آئی۔
"آپ یہاں؟۔۔"
"کیوں میں یہاں نہیں آ سکتی۔" زارا کے لہجے میں بلا کی اجنبیت تھی۔
"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ خجل سا ہو گیا۔
"آپ شاید افتخار کی عیادت کے لیے آئی ہیں۔"
"ہاں۔" وہ مختصراً بولی اور گملے میں لگے پھول دیکھنے لگی۔
"میں بھی اسی کی عیادت کے لیے آیا تھا۔" کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔ زارا نے نظروں کا زاویہ بدل کر قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی بادامی آنکھوں سے ایک نامعلوم سی الجھن مترشح تھی۔
"وہ شاید اندر ہے۔" زارا کا لہجہ ذرا سا نرمی لیے ہوئے تھا۔ نجانے کیوں زارا کو وہ اس بچے کی طرح لگا۔ جسے کوئی چیز سمجھ میں نہیں آ رہی اور وہ کسی کی مدد کے بغیر اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔
"میں جا ہی رہا تھا۔" وہ پزل سا ہو کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بہت اچھی چہرہ شناس نہ تھی۔ مگر نجانے کیوں اسے زین ایک سادہ' حساس اور کنفیوزڈ نوجوان لگا تھا۔ وہ بے خیالی میں اسے سوچے گئی۔ جب عظمیٰ نے اسے پکارا۔
وہ چونک کر پلٹی۔
"چلیں۔۔" زارا نے پوچھا تو عظمیٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ زارا کو پہلے ہی کی طرح پریشان لگی۔
"کیا کہا اس نے۔۔"
"کچھ نہیں آؤ چلیں۔" عظمیٰ نے آہستگی سے کہا تو زارا نے اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی اور نہ عظمیٰ نے اسے کچھ بتایا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

باہر ہلکی رم جھم ہو رہی تھی اور کیفے ٹیریا میں گرما گرم بحثیں چل رہی تھیں۔ کلاسز ہوئی نہیں تھیں اور وہ لوگ آ کر پچھتا رہی تھیں۔
"خوامخواہ آئے۔" انعم سب سے زیادہ بے زار تھی۔
"چلتے ہیں۔ جوس تو پی لیں۔ اتنی پیاس لگ رہی ہے۔" وہ دروازے کے ساتھ والی ٹیبل گھیر کر بیٹھ گئیں۔ زارا کی نظروں نے عین سامنے والی ٹیبل پر زین کو اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ زین نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔ پھر ساتھ والے لڑکے سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دنوں سے اس نے زارا کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔
"لیکن تم گئی کہاں تھیں۔ اس دن افتخار کو دیکھنے ہاسپٹل بھی نہیں آئیں۔" زین کی طرف سے اپنی توجہ مکمل طور پر ہٹا کر اس نے انعم کو دیکھا۔
"بس مہمان آ گئے تھے۔ تو امی نے نکلنے ہی نہیں دیا۔" جوس کا سپ لے کر انعم نے بتایا۔
"کہیں خاص مہمان تو نہیں آ گئے۔" عظمیٰ

مسکرائی۔

"ہماری ایسی قسمت کہاں؟" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "پنڈی والی خالہ آئی ہیں۔"

"وہ جن کے بیٹے ڈاکٹر ہیں۔" عظمیٰ کو اس کے سارے رشتے داروں کے بارے میں معلومات تھیں۔

"ہاں۔" انعم نے منہ بنایا۔ "اسی لیے تو امی ہلکان ہوئی جا رہی ہیں۔ ان کے سامنے یہ ثابت کرنے کو کہ خاندان بھر میں مجھ سے زیادہ خوبصورت' سلیقہ مند' سگھڑ اور باحیا لڑکی کوئی نہیں۔ گھر کا بجٹ الگ خراب ہو رہا ہے اور میں آدھی رہ گئی ہوں۔ قورمہ' کباب بناتے بناتے لیکن یہ بات طے ہے۔ خالہ کبھی اپنے بیٹے کا رشتہ میرے ساتھ نہیں کریں گی۔"

"کیوں تم میں کس چیز کی کمی ہے۔" زارا نے پوچھا۔

"بھئی بات کمی کی نہیں ہے۔ آج کل ہوا ہی ایسی چلی ہے۔ خالہ کا بیٹا اب اچھی جاب پر ہے۔ وہ کسی امیر خاندان میں ہی رشتہ کرنے کی خواہش کریں گی۔ ویسے بھی اڑتی اڑتی سنی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے ڈاکٹر بہو کی خواہش رکھتی ہیں۔" انعم نے سینڈوچ اٹھایا۔

"تو پھر تمہاری امی کیوں ہلکان ہو رہی ہیں۔" عظمیٰ نے پوچھا۔

"ایک آس' ایک امید' وہی ماؤں والی مخصوص عادت' جب تک دانیال بھائی کہیں انگیج — نہیں ہو جاتے۔ وہ ایسی کوششیں کرتی رہیں گی۔ ویسے میں نے اس سے بدمزا سینڈوچ کبھی نہیں کھائے۔" انعم نے بات کا رخ بدلا۔

"ہاں کچھ عجیب سے ہیں۔" زارا نے سینڈوچ الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"چلیں پھر' ابھی پانچ منٹ میں ایک پوائنٹ نکلے گا۔" عظمیٰ نے جوس ختم کیا۔ تب ہی زین العابدین کے ساتھ بیٹھے لڑکے اٹھ کر چلے گئے۔ وہ کچھ لمحے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر کچھ متذبذب سا اٹھ کر قریب آگیا۔

"میں یہاں بیٹھ جاؤں۔"

انعم اور عظمیٰ نے زارا کو دیکھا۔ وہ خاموش ہی رہی۔

"بیٹھ جاؤ بھائی' یہ کرسی ہم گھر سے نہیں لے کر آئے۔" انعم نے کہا تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری۔ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی بولو! کیا پرابلم ہے تمہارے ساتھ۔" انعم کچھ شوخ و متبسم لہجے میں بولی۔

"پرابلم تو کوئی نہیں ہے۔" وہ کچھ گھبرا کر زارا کو دیکھنے لگا۔

"تو پھر۔" انعم خوامخواہ ہنس دی۔

"مجھے ان سے بات کرنی ہے۔" اس نے زارا کی طرف اشارہ کیا۔

"گویا ہم یہاں سے جائیں۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ کچھ زیادہ پراعتماد نظر نہیں آرہا تھا۔

"چلو انعم ہم چلتے ہیں۔" عظمیٰ بے زاری سے کہہ کر اٹھ گئی۔ وہ آج سارا دن اسی موڈ میں رہی تھی۔

"اچھا بھئی ہم تو چلتے ہیں اور زین تم ان سے بات کر لو۔" انعم نے مسکراتے ہوئے اپنا بیگ سنبھالا اور عظمیٰ کے ساتھ چلی گئی۔ زارا مکمل طور پر زین کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کہو۔"

زین — کچھ لمحے متذبذب سا اسے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھکا کر میز کی سطح کو ناخن سے کھرچنے لگا۔

"زین! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔" کچھ دیر انتظار کے بعد زارا کو کہنا پڑا تو زین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا۔ تو مجھے لگا میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ اکثر لوگوں سے مل کر ہمیں یہی احساس ہو جاتا ہے۔" زارا کو اس جملے پر خاصی کوفت ہوئی تھی۔

"میرا وہ مطلب نہیں۔ میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔"

"ڈپارٹمنٹ کے کسی بھی بندے سے پوچھ لیتے۔ وہ تمہیں میرے بارے میں بتا سکتا ہے کیونکہ مجھے یہاں پڑھتے ہوئے تقریباً "ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔"

"ہاں۔" وہ چپ سا ہو گیا۔ پھر آہستگی سے بولا۔

"مگر میں کچھ اور جاننا چاہتا تھا۔"

"کچھ اور کیا؟" زارا کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری۔

"آپ شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہیں۔" وہ خائف سا ہو گیا۔

"تم نے ابھی کوئی بات ہی نہیں کی۔ نہ سنجیدہ نہ مزاحیہ' ابھی تو تم صرف تمہید باندھ رہے ہو اور میں سن رہی ہوں حالانکہ مجھے جانا ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے بابا سے مل لیں۔" اس نے اچانک سر اٹھا کر کہا۔ زارا حیران سی رہ گئی۔

"کیوں؟ —"

"کیونکہ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

زارا کچھ حیران ہوئی۔ پھر بے اختیار پوچھنے لگی۔

"کیا وہ مجھے جانتے ہیں؟"

"وہ آپ سے ملے نہیں لیکن وہ آپ کو جانتے ہیں۔"

"کیسے؟ —" وہ اسے مسلسل حیران کر رہا تھا۔ "کیا میں انہیں جانتی ہوں؟ —"

"شاید ہاں' شاید نہیں۔" وہ پھر سے کنفیوز نظر آیا۔ "آپ ان سے ملیں گی تو وہ آپ کو بتا دیں گے۔ کیا آپ ان سے ملیں گی؟" اس کے لہجے میں ایک آس سی جاگی۔

زارا کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر کھڑی ہو کر اپنی فائل اور بیگ اٹھا لیا۔

"نہیں۔" اس کے سوال کا مختصر سا جواب دے کر وہ رکی نہیں چلی گئی۔ اسے اچانک لگا کہ سامنے بیٹھا شخص محض اسے سسپنس میں مبتلا کرنے کے لیے بکواس کر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ زین کی آنکھوں میں جاگتی ہوئی آس پر کسی تیزی سے مایوسی کی دھند بکھری تھی۔ زارا گھر آئی تو مما بھی اسی وقت لوٹی تھیں۔

"کہاں سے آرہی ہیں آپ؟ —"

"بس یہیں رائے ہاؤس تک گئی تھی۔" انہوں نے پرس ملازمہ کو تھمایا۔ پھر زارا سے پوچھنے لگیں۔

"تم نے کھانا کھا لیا۔"

"نہیں۔ ابھی تو آئی ہوں۔"

"فاطمہ کھانا لگاؤ۔" انہوں نے پکار کر کہا۔

"کیا بات ہے ممی؟ آپ کی ساری دلچسپیوں اور مشاغل کا گڑھ "رائے ہاؤس" بن کر رہ گیا ہے۔ کہیں میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی۔" اس نے مشکوک نظروں سے مما کو دیکھا۔ تو وہ مسکرا دیں۔

"ہو بھی سکتی ہے۔"

"مطلب؟ —" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ رضوان آرہا ہے۔" وہ بہت خوش تھیں۔

"ارے کب؟ —" زارا نے بے ساختہ پوچھا۔

"اگلے مہینے —"

"اس دن تو بات ہوئی تھی ہماری۔ تب تو اس نے ایسا کوئی پروگرام ظاہر نہیں کیا تھا۔"

"اس کے آتے ہی رخصتی کی تاریخ طے ہو جائے گی۔" مما نے گویا اس کی بات سنی نہیں۔

"مما! آپ کو پتا تو ہے۔"

"پتا ہے اور ہم نے بھی سب طے کر لیا ہے۔ شادی کے بعد تم دونوں جو چاہو کرو۔ بس والدین کو اپنے فرض سے سبکدوش ہونے دو۔" وہ واقعی سب طے کیے بیٹھی تھیں۔

"مما —! آپ کو کتنی جلدی ہے مجھے اس گھر سے نکالنے کی۔"

"تم ایسے جملے استعمال کر کے مجھے ہرگز اموشنل نہیں کر سکتیں۔" مما نے گھورا۔

"تو کس طرح اموشنل ہوں گی۔"

"بیٹا! انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اور میں چاہتی ہوں۔ تمہیں اپنی زندگی میں دلہن بنے دیکھ

لوں۔" مما ایک دم سنجیدہ ہوئی تھیں۔ زارا نے انھیں دیکھا اور خفگی بھرے لہجے میں بولی۔

"اب آپ مجھے اموشنل کر رہی ہیں۔"

"اور تم ہو بھی گئی ہو۔" مما نے کہا تو وہ ہنس دی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

زین اس سے اگلے دن یونیورسٹی نہیں آیا تھا اور اس سے اگلے اور پھر بہت سے دن۔ انعم کئی بار حیران ہو کر پوچھ چکی تھی۔

"کہاں گیا تمہارا وہ زین العابدین ؟"

زارا کندھے اچکا کر رہ جاتی کہ وہ خود حیران تھی۔ اس دن بھی انعم نے کہا تو وہ چڑ گئی۔

"مجھے کیا معلوم۔ میں تو اسے نام کے علاوہ جانتی بھی نہیں ہوں۔"

"اچھا بابا۔ میں نے یونہی پوچھ لیا تھا۔" انعم نے کہا تو زارا عظمیٰ کی طرف متوجہ ہوئی جو بے حد خاموشی سے گھاس کی پتیاں نوچ رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے۔" زارا نے اپنی نوٹ بک اس کے ہاتھ پر ماری۔ تو وہ بری طرح چونکی۔

"نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔"

"میں آج شام ہاسپٹل جاؤں گی تم لوگ چلو گے۔"

"مجھے تو ہرگز اجازت نہیں ملے گی۔ ایک دفعہ ہی مشکل سے ملی تھی۔" انعم نے منہ بنا کر کہا تو زارا نے عظمیٰ کو دیکھا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

"کیوں؟۔" زارا کو کبھی کبھی اس کے رویے پر حیرت سی ہوتی تھی۔

"میں اسے کسی غلط فہمی کا شکار نہیں کرنا چاہتی۔"

"عظمیٰ! تم کس سے ڈرتی ہو؟۔" زارا نے تحیر سے اسے دیکھا۔ عظمیٰ نے سر اٹھا کر نیلے امبر پر اڑتے پرندے کو دیکھا۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"محبت کے رستے میں بڑی کٹھنائیاں ہیں اور میں بہت بزدل، جب منزل تک پہنچنے کا حوصلہ نہیں ہے تو رخت سفر کیوں باندھوں۔ جب قدم سے قدم نہیں ملا سکتی تو ہاتھ تھام کر دھوکہ کیوں دوں۔ اسے کسی دوراہے پر لا کھڑا کرنے سے بہتر ہے کہ خاموش رہوں۔ اسے کوئی زاد راہ نہ تھماؤں۔ کبھی تو تھک کر پلٹے گا۔" اس کا لہجہ بہت عجیب سا تھا۔

"کیا یہ سب ممکن ہے۔"

"بس ایک کوشش ۔۔۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"اور اس سے پہلے تم ہار گئیں تو ۔۔۔" وہ ایک پل کو خاموش ہو گئی۔ پھر اتنا کہہ کر چلی گئی۔

"میں اسے ہرانا نہیں چاہتی۔"

"ہار تو وہ بھی گیا ہے اور تم بھی۔ وہ یہ بات مانتا ہے اور تم اس حقیقت سے نظریں چرا رہی ہو۔"

"شاید عظمیٰ کی جگہ میں ہوتی تو یہی کچھ کر رہی ہوتی کہ ہم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں ہمارے والدین بس زندگی میں ایک ہی چیز کماتے ہیں اور وہ ہے عزت، اور بدنامی کی ایک ذرا سی چھینٹ عزت کی اس چادر پر ہمیشہ کے لیے انمٹ داغ چھوڑ دیتی ہے۔ محبت اور اس پر مر مٹنے کی داستانیں ہمارے نزدیک محض کہانیاں ہیں اور ہمیشہ کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں۔" انعم اک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"عجیب لوگ ہیں ہم، اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ اور ۔۔۔" زارا نے آہستگی سے کہا۔

"یونہی گزارا ہے سکھی! یہ ڈھیر سارے رشتے، یہ ڈھیر ساری محبتیں ہمارے اردگرد ہیں۔ انہیں بھی تو ہم کو ہی نبھانا ہے۔ کسی ایک محبت کی خاطر اتنی ساری محبتوں کا گلا تو نہیں گھونٹ سکتے ہم لوگ ۔۔۔ سو یہ سب تو یونہی چلے گا۔"

"ہوں ۔۔۔" زارا نجانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ پھر سر جھٹک کر پوچھنے لگی۔

"تمہاری خالہ چلی گئیں۔؟"

"ہاں چلی گئیں۔ امی اب سارا دن اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی رہتی ہیں کہ اتنا خرچہ بھی کیا اور خالہ پھر بھی کوئی بات نہیں کر کے گئیں۔"

"ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو اپنی امی کو۔"

"تم نے سمجھا لیا اپنی مما کو۔" انعم نے برجستہ پوچھا۔ تو وہ ہنس دی۔

"یو آر رائٹ۔ مائیں کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ اولاد کے معاملے میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ چلیں ۔۔۔" وہ اٹھ گئی۔

"ہاں ۔۔۔" انعم بھی کھڑی ہو گئی۔ عظمیٰ فیضان اور ماریہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ زارا نے بس اسے دور سے ہاتھ ہلا کر بائے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف آ گئی۔ وہاں سے سیدھا وہ ہاسپٹل ہی آئی تھی۔ افتخار اب کافی بہتر تھا۔

"انشاء اللہ کل ڈسچارج ہو جائے گا۔" آصف اور باسط اس کے پاس ہی موجود تھے۔

"تھینک گاڈ۔ ڈپارٹمنٹ میں بالکل بھی رونق نہیں ہے تمہارے بغیر۔"

"تمہاری سکھیاں نہیں آئیں۔" افتخار آصف وغیرہ کے سامنے صرف عظمیٰ کا نہیں پوچھ سکتا تھا۔

"ہاں وہ نہیں آسکیں۔" زارا نے آہستگی سے بتایا۔ افتخار خاموش سا ہو گیا تھا۔ زارا جلد ہی اٹھ گئی۔ پارکنگ میں اسے زین العابدین مل گیا۔ اس کے ہاتھ میں بہت سی میڈیسن تھیں۔ زارا لاشعوری طور پر گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے رک کر اسے دیکھنے لگی۔ اپنے ماتھے کا پسینہ آستین سے صاف کرتے ہوئے زین نے نظریں اٹھائیں تو ٹھٹھک کر رکا۔ پھر اس کے قریب آ گیا۔

"آپ افتخار کے پاس آئی تھیں۔"

"ہاں۔" اس نے گاڑی کا لاک کھولا۔

"اب تو وہ ٹھیک ہے، انشاء اللہ جلد ہی ڈسچارج ہو جائے گا۔"

زارا نے دیکھا۔ وہ کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ شکل سے ہی مضطرب اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ زارا نے بے اختیار پوچھا۔

"تم یونیورسٹی نہیں آرہے بہت دنوں سے۔ کیا بیمار ہو۔؟"

وہ مضمحل سا مسکرایا۔ "نہیں میں تو ٹھیک ہوں۔ بابا کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔"

"اوہ نو۔" زارا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اب تو ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔" زین نے بتایا۔

"اسی ہاسپٹل میں ہیں ۔۔۔؟" زارا نے پوچھا۔

"جی ۔۔۔ آپ ۔۔۔ آپ ملیں گی ان سے ۔۔۔" اس نے جھجکتے ہوئے وہی سوال کیا۔ زارا نے ایک ثانیے کو سوچا۔ اثبات میں سر ہلا کر گاڑی دوبارہ لاک کی اور اس کے ساتھ ہولی۔ زین ایک دم ایکسائیڈ ہو گیا تھا۔

"بابا بہت خوش ہوں گے۔" ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے زین بولا۔ زارا اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"بابا ۔۔۔" وہ سوئے ہوئے ادھیڑ عمر بیمار شخص پر جھک گیا۔ زارا نے بہت غور سے ان کا زرد و کمزور چہرہ دیکھا مگر یادداشت میں کہیں کوئی شبیہ نہ تھی۔

"بابا! دیکھیں کون آیا ہے ۔۔۔" زین انہیں جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"زین ۔۔۔" زارا نے پکارا تو وہ رخ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔

"تمہارے بابا کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ انہیں سونے دو۔"

"لیکن وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔" زین کے لہجے میں اصرار تھا۔ گویا وہ اس موقع کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ "بس اٹھ جائیں گے۔ وہ دوا کے زیر اثر ہیں۔ ورنہ ان کی نیند اتنی بے خبر نہیں۔"

زارا کو وہ کسی ضدی بچے کی طرح لگا جو ضرور ہی انہیں اٹھا کر دم لے گا۔

"انہیں آرام کرنے دو۔ میں پھر آجاؤں گی۔" اس نے رسان سے کہا تو زین تیزی سے سیدھا ہو گیا۔

"آئیں گی نا ۔۔۔"

"ہاں۔" اس نے ایک نظر بابا پر ڈالی۔ "لیکن زین!

میں نے ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ پھر یہ مجھے کس طرح جانتے ہیں۔" وہ الجھن میں تھی۔

"میں نہیں جانتا۔ بابا کہہ رہے تھے۔ وہ خود بتائیں گے۔"

زارا نے بغور اسے دیکھا۔ وہ نظریں چرا گیا۔ اس کا لہجہ بتاتا تھا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مگر زارا نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

"اوکے۔ میں ان ہی سے پوچھ لوں گی۔" پھر وہ کچھ ٹھہر کر پوچھنے لگی۔ "ان کا نام کیا ہے؟" وہ بری طرح الجھ گیا۔

"میں انہیں بابا کہتا ہوں۔ آپ بھی انہیں بابا کہہ لیں۔"

زارا طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"تو تم کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"مجھ سے کچھ مت پوچھیں۔" وہ جز بز ہو کر بولا۔

"اوکے۔ بابا کا خیال رکھنا۔" وہ کچھ الجھتی' کچھ سوچتی ہوئی پلٹ آئی۔

"کیا چکر ہو سکتا ہے۔"

گاڑی میں بیٹھ کر بھی اس نے آخری بار سوچا تھا۔ پھر کوئی جواب نہ پا کر سر جھٹکتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

♥ ♥

"تم کیوں اتنی گم صم بیٹھی ہو۔" انعم نے پوچھا۔ تو وہ چونک گئی۔

"گم صم نہیں۔ کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے پھر طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں۔" زارا نے کہا۔

"آج کلاسز بھی تو لگاتار ہوئی ہیں۔" عظمیٰ نے کہا ساتھ ہی اپنا بیگ کھولنے لگی۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں۔ ایک آدھ کلاس بنک کر لو۔ مگر نہیں۔ ان پر تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا۔" انعم نے منہ بنایا۔

"تمہیں ایک مزے کی چیز کھلاتی ہوں۔" عظمیٰ نے بیگ سے لفافہ نکالا۔

"صبح سے خزانے پر سانپ کی طرح بیٹھی ہو۔ بتا نہیں سکتی تھیں۔ بیگ میں کچھ کھانے کو ہے۔" انعم جھنجلائی تو عظمیٰ ہنس دی۔

"ہر روز تم میرے بیگ کی تلاشی لیتی ہو۔ آج میں حیران تھی۔ تمہاری ناک کو کیا ہوا ہے؟"

"ہائے بڑی غلطی ہوئی۔ جاتے ہی چیک کرواؤں گی۔" اس نے اپنی ناک ہلائی۔

"مگر ہے کیا؟" زارا نے پوچھا۔

"سوہن حلوہ ہے میں نے خود بنایا ہے۔" اس نے لفافہ ان کے سامنے کیا۔

"واؤ۔ گویا آج کل تم بھی سگھڑ بننے کی کوشش کر رہی ہو۔" انعم نے فوراً" بڑا سا ٹکڑا اٹھایا۔

"میں آل ریڈی سگھڑ ہوں۔" اس نے لفافہ زارا کے سامنے کیا۔ وہ مٹھائی نہیں کھاتی تھی۔ مگر عظمیٰ اتنے شوق سے لائی تھی اس نے ایک چھوٹا ٹکڑا اٹھا لیا۔

"اس بات کا فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے کہ تم کتنی سگھڑ ہو۔" لفافہ اس کے ہاتھ سے غائب ہو گیا تھا۔ عظمیٰ نے غصے سے انعم کو گھورا۔ پھر ہنس دی۔

"فیصلہ تو ہو گیا۔ مکھیوں کی طرح جھپٹ پڑی ہو تم۔"

"نہیں۔ واقعی مزے کا بنا ہے۔" زارا نے کہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "تمہیں ایک نیوز بھی سناؤں۔"

"اس حلوے جتنی میٹھی اور مزے کی ہونی چاہیے۔" انعم نے دوسرا ٹکڑا نکال کر لفافہ درمیان میں رکھا۔

"اتنی ہے کہ نہیں۔ مگر خبر یہ ہے کہ رضوان واپس آ رہے ہیں۔" اس نے بڑے آرام سے خبر دی تھی۔ مگر وہ دونوں ہی اچھل پڑیں۔

"یہ تو اس سے بھی زبردست خبر ہے کب؟"

"کسی بھی دن۔ بس انہیں سرپرائز کا شوق رہتا ہے۔"

"ہائے زارا تمہاری شادی ہو جائے گی پھر۔" انعم نے بڑے جوش سے پوچھا۔

"لگتا تو یہی ہے۔"

"کتنا مزا آئے گا نا۔ میں آج تک کسی فرینڈ کی شادی میں شریک نہیں ہوئی۔" وہ پرجوش ہو رہی تھی۔

"میں تمہیں انوائٹ کروں گی تب نا۔" زارا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"ہیں۔" اس کا منہ کھلا تو زارا ہنس دی۔ انعم جھینپ گئی۔

"بدتمیز نہ ہو تو۔"

"پاگل ہو تم بھی۔ بھلا فرینڈز کے بغیر میری رخصتی ہو سکتی ہے۔" زارا نے پیار سے اپنی پرخلوص سی معصوم دوست کو دیکھا۔

"دیکھی ہماری ویلیو۔" انعم عظمیٰ کی طرف دیکھ کر اترائی تو زارا فوراً" بول اٹھی۔

"میں دونوں کی بات کر رہی ہوں۔"

"گھڑی بھر کو خوش نہ ہونے دینا۔" وہ جھنجلائی اور جب تک ان کے پوائنٹ کا ٹائم نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی شادی کے لیے اپنے ڈریسز ہی ڈسکس کرتی رہی۔ زارا گھر پہنچی تو فاطمہ نے چھوٹتے ہی پیغام دیا۔

"بیگم صاحبہ! رائے ہاؤس گئی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا آپ بھی ادھر ہی آجائیں۔"

"کیوں خیریت تو ہے نا۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔ مما خود تو اکثر ہی رائے ہاؤس جاتی تھیں۔ مگر اسے یوں کبھی نہیں بلایا تھا۔

"بڑی بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" ملازمہ نے بتایا۔ تو وہ پریشان ہو گئی۔ تائی جان کو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔

"اوکے۔ میں وہیں جا رہی ہوں۔" وہ الٹے قدموں واپس لوٹی۔ رائے ہاؤس کے سامنے دیگیں پک رہی تھیں۔

"کیا ہے۔" اس نے بے حد حیرت سے سوچا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ گاڑی پورچ میں لے گئی۔ وہاں پاپا کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔

"طبیعت زیادہ خراب لگتی ہے۔" وہ کچھ متفکر سی اندر داخل ہوئی۔ عالیہ بھابھی ڈرائنگ روم سے باہر نکلی تھیں پیچھے ہی ان کا آٹھ سالہ بیٹا سعد بھی تھا۔ وہ زارا کو دیکھتے ہی بول اٹھا۔

"زارا آنٹی! وہ۔"

عالیہ بھابھی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں دھکیل دیا تھا۔

"آؤ زارا! کب سے تمہارا انتظار ہے۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔ زارا کو وہ معمول سے زیادہ ہشاش بشاش بلکہ خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

"تائی جان کی طبیعت کیسی ہے اب۔"

"تائی جان۔" وہ کھلکھلا کر ہنسیں۔ زارا نے تعجب سے انہیں دیکھا اور وہ اس کی صورت دیکھ کر ہنستی ہوئی اس سے لپٹ گئیں۔

"بھابھی!۔" زارا نے بمشکل خود کو ان کی گرفت سے چھڑایا۔ "مانا کہ ساس بہو کا رشتہ کچھ ایسا ہی ہے۔ مگر ساس کی بیماری پر اتنا خوش ہونا۔ اگر ہونا ہی ہے تو دنیاداری نبھانے کو ہی افسردہ نظر آنے کی کوشش کر لیں۔"

بھابھی کی ہنسی پھر بھی رکنے میں نہیں آئی۔

"میں تائی جان کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔"

"جاؤ خود ہی پوچھ لو۔" انہوں نے اسے دروازے کی سمت دھکیلا۔ وہ لڑکھڑا کر دروازے سے نکلتے شخص سے ٹکرائی۔ بلکہ باقاعدہ اس کے سینے سے جا لگی تھی۔ وہ سرعت سے پیچھے ہٹی۔

"استقبال کا یہ انداز۔ اچھا لگا۔ نہ۔ نہ گھبرانے کی ضرورت نہیں تمہیں تو شرعی حق حاصل ہے۔"

"آ۔ آپ۔" زارا ہونق سی ہو گئی۔

"تائی تھینک ایسی جرات کا مظاہرہ آپ رضوان حیدر کے ساتھ ہی کر سکتی ہیں۔" متبسم لب ولہجہ' وہ جھینپ سی گئی۔

"بھابھی نے دھکا دے دیا تھا۔" زارا خجل سی ہو کر بولی۔

"بروقت دیا تھا۔" وہ برجستہ بولے۔

"آپ کب آئے؟۔۔۔" اس نے اپنے لہجہ و انداز کو نارمل کرنے کی سعی کی۔

"صبح دس بجے۔۔۔"

"آپ نے بتایا ہی نہیں۔"

"تب ایسا خوبصورت اتفاق کیسے ہوتا۔" وہ شریر سے لہجے میں گویا ہوئے۔

"اوہ پلیز۔ رستہ چھوڑیں۔" زارا کترا کر اندر داخل ہوگئی۔ سلیمان بھائی کے سوا سب ہی موجود تھے۔

"دیکھا میں نہ کہتی تھی۔ یہ لڑکی یوں ہی قابو آئے گی۔" تائی جان اسے دیکھتے ہی بول اٹھیں۔

"اٹس ناٹ فیئر آپ کو پتا ہے۔ میں پریشان ہو جاتی ہوں۔" وہ خفگی سے کہتی ہوئی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ رضوان بابا کے برابر بیٹھ گئے تھے۔

"بھئی ہم نے سوچا۔ جس طرح رضوان نے ہمیں سرپرائز کیا۔ ہم تمہیں بھی دیں۔ کہو کیسا رہا۔" عالیہ اندر داخل ہوئیں ان کے عقب میں ملازمہ ٹرالی گھسیٹتی آرہی تھی۔ جس میں انواع و اقسام کی کھانے پینے کی اشیاء بھری تھیں۔ ہر قسم کے جوسز تھے۔ عالیہ سب کو پیش کرنے لگیں۔

"میں جانتی تھی' ایسی حرکت آپ ہی کرسکتی ہیں۔" زارا نے کہا تو مسکرا دیں۔

"تم کون سا جوس لوگی۔"

"پیچ کا۔۔۔"

"وہ تو نہیں ہے۔ میں ابھی بنواتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگیں۔ زارا نے روک دیا۔

"بس ٹھیک ہے۔" اس نے یونہی ایک گلاس اٹھا لیا۔

"اچھا ہے عادت بدل دو۔ رضوان کو پیچ اچھی نہیں لگتی۔" عالیہ نے سرگوشی کی۔ وہ بس مسکرا کر تائی جان سے پوچھنے لگی۔

"سلیمان بھائی کہاں ہیں؟۔۔۔"

"وہ تو گاؤں چلا گیا تھا۔ فون کروایا ہے میں نے آتا ہی ہوگا۔" انہوں نے بتایا۔

"ہاں تو رضوان بیٹا! اب کیا ارادہ ہے تمہارا۔" پاپا نے پوچھا۔ تو رضوان انہیں اپنے پلان کے بارے میں مختصراً بتانے لگے۔ مما اور تائی جان مصروف ہوگئیں۔

"اب کیا ارادے ہیں؟" عالیہ نے زارا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"بالکل وہی پہلے والے۔" وہ لاپروائی سے بولی تھی۔ اس رات وہ لوگ واپس ہی نہ آسکے۔ اگلے دن بھی تائی جان نے آنے نہیں دیا۔ تیسرے دن وہ لوگ واپس آنے لگے تو تائی جان نے اسے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

"بس اب تو مستقل یہاں لے آؤں گی۔"

"رضوان کا بس چلے تو جانے ہی نہ دے۔" عالیہ نے سرگوشی کی تو وہ جھینپ گئی۔ رضوان اس کے قریب آئے۔

"میں تمہارے لیے کوئی گفٹ نہیں لایا۔"

"ہائیں۔ وہ کیوں بھئی۔" عالیہ نے چونک کر پوچھا۔ وہ زارا کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ وہ بھی ان کی بات سمجھ گئی تھی۔ تب ہی مسکرا کر بولی۔

"بہت اچھا کیا۔۔۔"

"یہ کیا پہیلی ہے بھئی۔ گفٹ لانے پر خوشی کا اظہار تو دیکھا تھا۔ یہ نہ لانے پر کیوں خوش ہو رہی ہو تم۔" عالیہ حیران ہوئیں۔

"یہ باتیں آپ کی سمجھ میں کہاں آئیں گی بھابھی۔" رضوان نے چھیڑا تو وہ خفا ہو کر کہنے لگیں۔

"ہاں۔ اب تو تم باہر سے ڈگری لائے ہو۔ اب واقعی تمہاری باتیں ہماری سمجھ میں کہاں آئیں گی۔"

"رضوان مذاق کر رہے ہیں بھابھی۔" زارا نے ٹالا۔

"اب تم اس کی سائیڈ نہیں لوگی تو اور کون لے گا۔" وہ مسکرا دی تھیں۔

"آؤ بیٹا! اب چلتے ہیں۔" پاپا نے پکارا تو وہ عالیہ سے مل کر اور رضوان کو خدا حافظ کہہ کر آگئی اور ان تین دن کے ہنگاموں میں اسے کہاں یاد رہا کہ کوئی اس کا کتنا منتظر ہے۔

♥ ♡ ♡ ♥

یونیورسٹی کے در و دیوار پر ہنگاموں کے بعد سکوت طاری ہوگیا اور دھیرے دھیرے جامعہ کی رونقیں افتخار کی واپسی کے بعد واپس آنے لگیں۔ کیفے میریا اور ڈپارٹمنٹ میں پھر سے اس کی شاعری شروع ہوگئی۔ وہ اب بھی عظمٰی کو دیکھ کر گنگنانے لگتا۔

"اس شہر میں روپ کا کال نہیں۔ کچھ اور ہے اپنے سائز میں۔"

عظمٰی بے نیاز بنی رہتی۔

زارا وہاں سے آتے ہی اسپتال گئی تھی۔ مگر وہ کمرہ خالی تھا۔ اس نے دریافت کیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ تو ڈسچارج ہوگئے تھے۔

"وہ ٹھیک تو تھے نا۔۔۔"

"بالکل ٹھیک تھے۔۔۔"

نرس نے رجسٹر بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ تو وہ واپس آگئی۔ زین اب بھی نہیں آرہا تھا۔ زارا کو افسوس سا ہوا۔ اسے ایک بار ان سے مل لینا چاہیے تھا۔

"میں آج صرف آپ کے لیے یونیورسٹی آیا ہوں۔"

وہ جو میڈم تبسم کی آمد سے ذرا پہلے افتخار کی زبانی منیر نیازی کی پنجابی نظم "شہروی کڑی" سن رہی تھی۔ چونک کر پلٹی۔ افتخار بھی خاموش ہوگیا۔ زین کی نگاہوں میں خفگی تھی۔

"میں۔" زارا ایک پل کو گڑبڑائی۔ "میں آئی تھی۔"

"دیر کر دی آپ نے۔ ورنہ ہم نے تو پل پل انتظار کیا تھا۔" اس کا لہجہ ایسا تھا کہ زارا شرمندہ ہو رہی تھی اور سب لوگ حیران اور عجیب نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"سوری زین۔۔۔" وہ سب کو نظر انداز کر گئی۔

"ایک بیمار شخص کے لیے دن سے رات کرنا کتنا دشوار ہے اور بابا نے ایک ایک سیکنڈ گنا ہے۔" اس کے لہجے میں شدید غصہ اور کرب اتر آیا۔ زارا کو اس کی حالت بہت عجیب لگی۔ عجیب سی وحشت اتر آئی تھی اس کے لہجے میں۔

"زین! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔۔۔" آصف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ زین نے اس کا ہاتھ انتہائی بے زاری سے جھٹکا۔ پھر زارا کو دیکھ کر انتہائی تلخی سے گویا ہوا۔

"اتنا ہی تو چاہا تھا انہوں نے زارا عمیر سے کہ وہ ایک بار ان سے مل لے۔ میں نے بھی کہا تھا آپ ان سے مل لیں۔ لیکن آپ نے انہیں انتظار سے روک دیا۔ اس پل کی بے آرامی انہیں یوں کرب انگیز انتظار کی اذیت سے تو دوچار نہ کرتی۔"

"زین! تم خوامخواہ اموشنل ہو رہے ہو۔ میں آنا چاہتی تھی مگر نہیں آسکی۔ کچھ مصروفیات نکل آئیں اچانک۔ پھر میں پہلی فرصت میں آئی تھی مگر بابا ڈسچارج ہوگئے۔" وضاحت دینا زارا کی سرشت میں نہ تھا مگر زین کی حالت اسے نرمی اختیار کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ورنہ نہ تو اس کا تعلق زین کے ساتھ تھا اور نہ اس کے بابا کے ساتھ۔ زین خاموش ہو کر لب کاٹنے لگا۔

"میں بابا سے ملنے آؤں گی۔"

زین نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر گویا ہار گیا۔

"کب؟۔۔۔" اس کے لہجے میں وہی معصومیت اتر آئی۔

"آج یا کل۔۔۔" زین نے اس کے ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک تھامی۔

"پین ہوگا۔۔۔"

آصف نے اپنی ہاتھ میں پکڑی پنسل اسے تھما دی۔

زین نے نوٹ بک پر اپنا ایڈریس لکھا۔ پھر نوٹ بک اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"پلیز۔ دیر مت کیجیے گا۔" اس کے لہجے میں بڑا اصرار تھا۔

زارا نے اثبات میں سر ہلایا تو لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔

"کیا مسئلہ تھا؟" عظمیٰ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" زارا نے افتخار کو دیکھا تو اس نے نظم وہیں سے سنانی شروع کر دی۔ جہاں سے چھوڑی تھی۔ مگر زارا کو نہ تو اس کی نظم سمجھ میں آئی اور نہ ہی میڈم تبسم کا لیکچر۔ وہ الجھ گئی۔

"کیوں ملنا چاہتے ہیں زین کے بابا مجھ سے۔ کیوں اتنی شدت سے منتظر ہیں۔"

اس سوال کا جواب ظاہر ہے اسے زین کے بابا ہی دے سکتے تھے۔

"اب تم ہم سے باتیں بھی چھپانے لگی ہو۔" میڈم تبسم جیسے ہی باہر گئیں۔ عظمیٰ اور انعم نے اسے گھیر لیا۔

"میں نے کیا چھپایا ہے۔" اس نے اپنی نوٹ بک وغیرہ شولڈر بیگ میں ڈالی۔

"زین تم سے پہلے کب ملا تھا؟"

"ہاسپٹل میں۔ اس کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔"

"اور اس نے صرف تمہیں بتایا۔ یونیورسٹی میں اور کسی کو نہیں پتا کہ وہ اتنے دنوں سے کیوں نہیں آ رہا۔" عظمیٰ نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

"اتفاقاً" وہ مجھے ہاسپٹل میں مل گیا۔"

"اور اس کے بابا تمہیں کیسے جانتے ہیں۔" انعم نے سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"یہ گھنی ہے بالکل نہیں بتائے گی۔" انعم نے دانت پیس کر کہا۔

"اوہ فرینڈز! مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بس ایک دن زین آ کر کہنے لگا کہ اس کے بابا مجھے جانتے ہیں اور وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"اور تم پھر بھی ان سے نہیں ملیں۔"

"میں۔ اتنے دنوں یونیورسٹی بھی نہیں آئی۔ سچی بات ہے ہاسپٹل میں ملنے سے پہلے تو مجھے یقین بھی نہ تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔" وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"زین کی حالت بہت خراب تھی تم ضرور جانا۔" انعم نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن شاید اس کی قسمت میں ابھی ان سے ملنا نہیں لکھا تھا۔ وہ گھر آئی تو مما افتاں خیزاں، روئی روئی سی تیاری کر رہی تھیں۔

"کیا ہوا مما۔؟"

"تمہارے انکل فیروز کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔"

"اوہ نو۔" فیروز انکل اس کے خالو تھے۔ انہیں کینسر تھا، کبھی کبھی ڈھیر سارا روپیہ اور مناسب علاج بھی قضا کو نہیں ٹال سکتا۔

"تم کپڑے بدلو۔ ابھی روانہ ہونا ہے۔ تمہارے پاپا ٹکٹ لے کر آتے ہوں گے۔" اسے ایک پل کو زین کے بابا کا خیال آیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ان سے مل سکتی۔ اس نے نوٹ بک کھولی۔ مگر وہاں کوئی فون نمبر نہ تھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔" وہ پریشان ہو گئی۔

"کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ جلدی کرو۔" ماما نے ڈانٹا تو وہ زین کو بھول کر چینج کرنے چلی گئی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد وہ لوگ اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں کہرام مچا تھا۔ آنٹی کی حالت بہت خراب تھی۔ ظاہر ہے ایک طویل رفاقت کا خاتمہ، صبر کرنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ قل خوانی کے بعد مما تو وہیں رک گئیں جبکہ وہ پاپا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ واپس آ گئی تھی۔

♥ ♥

بیل دینے سے پہلے وہ پزل سی تھی۔ دریا اس کے دائیں طرف تھا اور اونچ سورج کی کرنیں ساکت پانیوں کو چھو چھو کر اب پلٹنے لگی تھیں۔ زارا نے دور ریستوران میں جلنے والی روشنیوں کو دیکھا۔ پھر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ دور کوئی چڑیا چہچہائی تھی۔ پھر کسی کے قدموں کی آواز دھیرے دھیرے بلند ہوئی

دروازے تک آ کر رکی۔ پھر دروازہ بے آواز کھل گیا۔ زارا کو ایک دھچکا سا لگا۔

یہ وہ زین تو نہ تھا۔ اس کے چہرے پر جمی آنکھیں اتنی بے رونق اور بجھی ہوئی تھیں کہ زارا کو خوف سا محسوس ہوا۔ گھر کے اندر بالکل اندھیرا تھا اور دروازہ میں ایستادہ وجود ایک دم چپ اور ساکت تھا۔

"آئی۔ ایم سوری زین۔ میں۔"

"آپ کیوں آئی ہیں۔؟" اس کا لہجہ بھی اسی کی طرح سپاٹ اور بے رونق تھا۔

"میں تو اسی دن آ جاتی۔ مگر مجھے اسلام آباد جانا پڑا۔ میرے انکل کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ میں نے چاہا کہ تمہیں فون کر دوں مگر۔ تمہارا فون نمبر نہیں تھا۔"

وہ چند لمحے یونہی اسے گھورتا رہا۔ پھر ایک طرف ہٹ گیا۔

"اندر آ جائیں۔"

وہ اس کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔ گھر کی ایک ایک چیز پر تاریکی کا راج تھا۔ وہ کسی چیز سے ٹکرائی۔

"زین روشنی تو کرو۔" ٹیچ کی آواز کے ساتھ کمرہ روشن ہوا تھا۔ زارا نے دیکھا ہر چیز بے ترتیب تھی۔ فضا میں ابھرتی دریا کی لہروں کا شور، سیلن اور ہلکی سی بو شامل تھی۔ جو بہت عرصے سے بند گھروں سے آتی تھی۔ وہ ٹیرس پر نکل آیا تھا۔ سامنے دریا کنارے لوگوں کی آمدورفت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دور ریستوران میں جگمگاتی روشنیاں جلتے بجھتے جگنو لگ رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ گرل پر ٹکائے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی سرسراتی آواز ابھری۔

"اس دن میرا دل چاہا۔ یہ دریا بپھر جائے اور سب کچھ فنا ہو جائے۔ میں زندہ نہ رہوں یا۔" وہ اس کی طرف پلٹا۔ "یا تمہیں مار دوں۔" وہ دہل گئی۔ اسے ایکدم سے اس نیم تاریک اور پراسرار ماحول اور سامنے کھڑے شخص سے خوف سا محسوس ہوا۔ زارا نے خود کو نارمل کرنے کی سعی کی۔

"بابا۔ بابا کہاں ہیں؟"

وہ لب بھینچے اپنی تیز تیز چلتی سانسوں کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کی وحشت خون میں ابال پیدا کر رہی تھی۔

"وہ اس سے زیادہ آپ کا انتظار نہیں کر سکے۔"

زارا پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"وہ اپنا انتظار مجھے سونپ گئے۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا زارا عمیر۔" وہ ٹوٹ رہا تھا بکھر رہا تھا اور خود کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"میں۔ میں نے ایسا سوچا بھی نہ تھا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اٹھی۔

"آئیں میرے ساتھ۔" وہ اس کا بازو تھام کر بولا۔ وہ بس اس کے ساتھ گھسٹتی رہی۔ وہ دروازہ کھول کر اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ جہاں بیڈ کی چادر شکن آلود تھی۔ جیسے ابھی ابھی کوئی یہاں سے اٹھ کر گیا ہو۔ بیڈ کے عین اوپر دیوار پر زین اور بابا کی بہت بڑی تصویر تھی۔

"ان در و دیوار کو بہت غور سے دیکھیں زارا! یہ بابا کی آنکھیں بن گئی ہیں۔ میں نے جس پل انہیں بتایا کہ آپ کل آئیں گی۔ انہوں نے کہا دروازہ لاک نہ کرنا۔ برسوں کے بند دروازے جلدی نہیں کھلتے کہیں اسے انتظار نہ کرنا پڑے۔ یہ۔ یہ۔" اس نے روم ریفریجریٹر کا دروازہ کھولا۔ جس میں انواع و اقسام کی چیزیں بھری تھیں۔

"یہ سب انہوں نے آپ کے لیے منگوا کر رکھا تھا۔" اس نے ایک جھٹکے سے فریج کا دروازہ بند کیا اور اسی جھٹکے سے الماری کھول کر ایک گفٹ پیک نکالا۔

"یہ انہوں نے آپ کے لیے منگوایا تھا کہ زارا پہلی بار اس گھر میں آئے گی۔" اس نے گفٹ دیوار پر دے مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گرا اور اس میں نجانے کون سے چیز چکنا چور ہوئی تھی۔

"میں نے بابا کو زندگی بھر اتنا بے قرار، اتنا بے چین نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر کسی کا اتنا انتظار نہیں کیا۔ مگر آپ نہیں آئیں۔ کیوں کیا زارا عمیر آپ نے ایسا۔ کیوں کیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگا۔ زارا لبوں پر ہاتھ رکھے اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ تب ہی اس نے سر اٹھا کر وحشت انگیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ یہاں سے چلی جائیں۔"

"زین۔۔۔!" زارا نے کچھ کہنا چاہا۔ وہ چیخ اٹھا۔

"فار گاڈ سیک۔ آپ چلی جائیں یہاں سے۔ ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔ مار ڈالوں گا آپ کو۔۔۔"

وہ گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹی۔ پھر بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ ٹیرس سے گاڑی تک کا فاصلہ اس نے بھاگتے ہوئے طے کیا تھا۔ گھر کس طرح پہنچی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ بس دبی دبی سسکیاں تھیں۔ جو بیڈ روم میں آکر لبوں سے آزاد ہو گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ دفعتاً" اسے لگا کمرے کی دیواریں آوازیں اگلنے لگی ہیں۔

یہ دیواریں آنکھیں بن گئی ہیں۔

یہ چیزیں دیکھ رہی ہیں۔" یہ سب انہوں نے آپ کے لیے منگوائی تھیں۔"

"انہوں نے کہا۔ دروازہ لاک مت کرنا۔ برسوں کے دروازے جلدی نہیں کھلتے۔ کہیں اسے انتظار نہ کرنا پڑے۔"

"میرا دل چاہتا ہے میں آپ کو مار ڈالوں۔"

"اوہ میرے خدا۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ مگر آوازیں تھیں کہ بڑھتی جا رہی تھیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ بڑی ہمت کر کے دوبارہ وہاں گئی تھی۔ دروازہ پندرہ سولہ سالہ لڑکے نے کھولا۔ لباس اور وضع قطع سے وہ ملازم ہی لگتا تھا۔ اس نے بے حد حیرت سے زارا کو دیکھا۔

"زین ہیں۔۔۔؟"

"جی۔" وہ اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ قیمتی سازوسامان خاصی بے ترتیبی کا شکار تھا۔

"آپ بیٹھو! میں بھائی جان کو بلاتا ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟۔۔۔" زارا بیٹھی نہیں تھی۔

"ادھر بالکونی میں ہی بیٹھے رہتے ہیں۔"

"میں وہیں مل لوں گی۔" زارا نے کہا تو وہ اسے ساتھ لے کر ٹیرس پر آگیا۔ زین نے آہٹ پر پلٹ کر دیکھا۔

"مجھے معلوم تھا آپ آئیں گی۔"

"بھائی جان۔۔۔!" لڑکے نے کچھ کہنا چاہا۔ زین نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم جاؤ سلیم! تمہاری ماں انتظار کر رہی ہو گی۔ زیادہ انتظار نہیں کروایا کرتے' کبھی کبھی انتظار زندہ رہتا ہے اور انسان ہار جاتا ہے۔"

اس کا لہجہ بڑا عجیب تھا۔ زارا اٹک کر رہ گئی۔ وہ لڑکا سلام کر کے چلا گیا۔ وہ کچھ لمحے متذبذب سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کبھی کبھی کوئی پل محض پچھتاوا بن کر رہ جاتا ہے۔ میں مجرم نہیں ہوں۔ مگر مجھے اپنا آپ کسی مجرم سے کم نہیں لگتا۔" کناروں کو چھو کر پلٹتی لہر پر نظریں جما کر وہ آہستگی سے بولی۔ زین نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے جلتی ہوئی آنکھیں رگڑیں۔

"آپ کو خوف نہیں آیا یہاں آتے ہوئے۔۔۔"

"میں ڈری ہوئی تھی' مگر کچھ ایسا تھا جو مجھے یہاں دوبارہ کھینچ لایا ہے۔" وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی۔ یہ حرکت اس کے اندرونی اضطراب کی نشاندہی کر رہی تھی۔

"میں اس دن بہت ڈپریسڈ تھا۔ میں رونا چاہتا تھا۔ کسی اپنے کے سامنے بہت چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا اور مجھے آپ پر بہت غصہ بھی تھا۔" آج اس کے لہجہ و انداز میں اس دن والی وحشت نہ تھی۔ بس ایک دکھ ایک کرب تھا جو وہ تنہا برداشت کر رہا تھا۔

"زین۔۔۔ زین پلیز! مجھے بتاؤ۔ تم کون ہو۔ وہ کون تھے۔ کیوں انتظار کرتے تھے میرا' کیسے جانتے تھے مجھے۔" یہ سارے سوال اسے پاگل کیے دے رہے تھے۔

زین خاموشی سے اٹھا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ وہ تحیر سے اسے سیڑھیاں اترتے دیکھتی رہی۔ مگر وہاں سے اٹھی نہیں کہ اسے آج ان سارے سوالوں کا جواب چاہیے تھا۔ نیم تاریکی میں وہ دریا کی لہروں کا مدھم شور سنتی رہی۔ سورج دریا کے پانیوں میں گھل کر آسمان کی ہتھیلیوں کو رنگ گیا تھا اور دھیرے دھیرے یہ رنگ رات کی تاریکی چوس رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں سرخ مخملیں جلد والا بڑا سا البم تھا۔ اس نے وہ البم زارا کو تھمایا اور کچھ بھی کہے بغیر دوبارہ واپس چلا گیا۔ زارا نے سیڑھیوں پر معدوم ہوتی اس کی قدموں کی چاپ کو سنا اور تحیر سے ہاتھ میں پکڑی بند البم کو دیکھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اسے لگا' کچھ ہے جو بہت اچانک اس کے سامنے آئے گا۔

کوئی صدیوں پرانا راز' جو اس البم کے کھلتے ہی اس پر افشا ہو جائے گا۔

اس کے ہاتھوں میں مبہم سی لرزش اتر آئی۔

اس نے بہت آہستگی سے البم کو یوں کھولا۔ جیسے اس میں چھپا ہر چہرہ ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔

البم کے پہلے صفحے پر زین کے بابا کی تصویر تھی۔ زارا نے انہیں بہت بوڑھا اور بیمار حالت میں دیکھا تھا۔ مگر یہ ان کی جوانی کی تصویر تھی۔ اگلے کئی صفحوں پر ان ہی کی تصویریں تھیں۔ کالج میں فٹ بال ٹیم کے ساتھ' بادشاہی مسجد کے قریب' وادیٔ کاغان اور ناران کی سرسبز وادیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ۔ اگلی تصویر میں وہ ایک خوبصورت اور دراز قامت لڑکی کے کندھے پر بازو پھیلائے مسکرا رہے تھے۔ دوسری تصویر میں وہ کسی مہندی کے فنکشن پر بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ اس سے آگے وہ بری طرح چونکی۔

"ممّا۔" اس کے لبوں نے بے یقین سرگوشی کی۔ پیلے جوڑے میں ملبوس منہ پر ہاتھ رکھے وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھیں۔ ان کا دوسرا ہاتھ زین کے بابا کے ہاتھ میں تھا اور وہ انہیں مٹھائی کھلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

زارا نے تیزی سے اگلی تصویریں دیکھیں۔ ہر تصویر میں وہ موجود تھے۔ مہندی کے فنکشن' رخصتی کے وقت اور ولیمے میں۔ پھر اس نے ننھی سی زارا عمیر کو ان کی گود میں بیٹھے دیکھا۔ وہ اسے فضا میں اچھال رہے تھے۔ اس کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ وہ ان کے کندھے پر چڑھی تھی اور ماما پاپا مسکرا رہے تھے۔ پھر اس نے ماما کی گود میں ننھا سا بچہ دیکھا۔ زارا کا سارا وجود پسینے میں بھیگ گیا۔ دل کسی گہری کھائی میں جا گرا ہولے ہولے لرز رہا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں بالکل بے جان ہو گئے تھے۔

"رائے جمشید حیات۔۔۔" اس کے اردگرد دھماکے ہو رہے تھے۔

"تایا ابو کا قاتل۔"

تب ہی سیڑھیوں پر قدموں کی آواز ابھری اور زارا کی حیران آنکھوں میں خوف سا ابھرا۔ وہ ساکت وصامت بیٹھی زینے کی تاریکی کو گھورتی رہی۔ حالانکہ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اٹھ نہ سکی۔ جسم گویا پتھر کا مجسمہ تھا۔

اسے لگا وہ اب یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکے گی۔

(باقی آئندہ)

راحت جبیں

دوسری قسط

ناولٹ

تاریکی میں ایک ہیولہ نمودار ہوا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ تب وہ ہیولہ روشنی میں آیا۔

"۔۔۔میں چلتی ہوں۔" اس نے ہتھیلی کا دباؤ کرسی پر ڈال کر اٹھنا چاہا۔

"بیٹھ جائیں۔" کیسی سرد روح کو ٹھٹھراتی ہوئی آواز تھی۔ وہ جیسے اٹھی تھی' ویسے ہی بیٹھ گئی۔ ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔

"چائے۔" اس نے ذرا سا جھک کر مگ ٹیبل پر رکھا۔ پھر سیدھے ہو کر' ایک نظر اس کے خوفزدہ چہرے پر ڈالی۔

"بابا ہوتے تو نجانے آپ کی کیا کیا خاطر کرتے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے البم لینی چاہی۔ مگر گھبراہٹ میں زارا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔ زین نے فرش پر البم سے نکل کر بکھری تصویروں کو دیکھا۔ پھر اس کے زرد چہرے کو۔

"آپ کو معلوم ہو گیا نا۔ میں کون ہوں۔ وہ شخص کون تھا۔ جو آپ کو یہاں اس گھر میں دیکھنا چاہتا تھا۔"

زارا کچھ بھی نہ کہہ پائی۔

"جب میں نے آپ کو پہلی بار یونیورسٹی میں دیکھا۔ تو مجھے لگا' میں نے آپ کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ حالانکہ۔ ہم لوگ جدا ہوئے تو میں تقریباً ڈیڑھ برس کا تھا اور آپ شاید تین برس کی۔"

اس نے جھک کر وہ ساری تصویریں بڑی محبت سے سمیٹنی شروع کی۔ وہ انہیں یوں انگلیوں کی پوروں سے اٹھا رہا تھا' جیسے مقدس صحیفے کے اوراق ہوں۔ جو ہاتھ لگانے سے بکھر جائیں گے۔

"شاید اس لیے کہ آپ میں اپنی ماما کی شبیہ بہت گہری ہے اور میں اس البم کو سینکڑوں بار دیکھ چکا تھا۔" وہ ہاتھ میں پکڑی تصویروں کو ترتیب دے رہا تھا۔

پھر ایک دن بابا نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے زین۔۔۔؟"

"جی۔۔۔!" میں چونکا۔

"کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں، تم چپ چپ سے ہو۔"

میری نظریں شطرنج کے مہروں پر جمی رہیں۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"کوئی الجھن ہے، تم پچھلے بیس منٹ سے بساط پر نظریں جمائے بیٹھے ہو۔ جبکہ میں جانتا ہوں تم کوئی چال نہیں سوچ رہے۔"

وہ ہمیشہ مجھے میرے اندر تک پڑھ لیتے تھے۔ میں ہمیشہ سے ان کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح تھا اور وہ مجھے ہر بار، ہر نئے واقعے پر سطر سطر پڑھتے تھے۔ میں نے خاموشی سے بساط الٹ دی۔ وہ پھر بھی کچھ نہیں بولے۔

"بابا! البم دیکھیں۔" میں ہمیشہ یہ فرمائش کرتا اور وہ خوش ہو جاتے۔ یہ البم ماضی کی ریت میں چھپے وہ بند دروازہ تھے جنہیں وہ اپنے ہاتھوں سے کھولتے۔ آنکھوں میں ریت چبھتی جسے نمی دھو ڈالتی۔ وہ ان تصویروں کے اندر اتر جاتے۔ ان کے ساتھ باتیں کرتے، ہنستے کھیلتے اور یہ بھول جاتے کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔

"آئمہ کو لڈو بہت برے لگتے تھے اور میں نے اس رسم کے موقعہ پر اسے نہ جانے کتنے لڈو کھلا دیئے۔ آخر تنگ آکر اس نے کھانے سے ہی انکار کر دیا، جبکہ میں بضد تھا کہ ایک لڈو تم اور کھاؤ۔ زارا کو میرے کندھے پر چڑھ کر اچھلنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ جس دن اس نے پہلی بار مجھے ماموں کہا۔ میں سارے گھر کو ڈنر پر لے گیا تھا۔ سارا دن ماموں یار چلیں کی رٹ لگائے رکھتی۔ زارا میری گود میں ہوتی اور زین آئمہ کی۔ وہ ہنس کر کہتی "بدلوا لو۔ زارا تم لے لو زین مجھے دے دو۔" وہ یہ ساری باتیں مجھے نہیں بتاتے تھے۔ خود کو یاد دلاتے تھے۔

میں نے تصویر پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے کہا۔

"بابا! میں نے آج زارا عمیر کو دیکھا تھا۔"

وہ ششدر سے رہ گئے۔

"کہاں؟۔۔۔" انہوں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"یونیورسٹی میں۔۔۔"

"کیسی۔۔۔ کیسی ہے وہ بچی؟" ان کے لہجے میں سمندر کی لہروں جیسی بے قراری اور تڑپ تھی۔

"بچی نہیں ہیں۔ بڑی ہو گئی ہیں۔ مجھ سے سینئر ہیں۔۔۔" میں نے مسکرا کر بتایا۔

"تم۔۔۔ بات کرتے ہو اس سے؟" انہوں نے حسرت سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔"

"دیکھتے تو ہو گے۔۔۔؟"

"ہاں، میں انہیں آپ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میری نگاہ میں آپ کی تڑپ، آپ کی بے قراری آجاتی ہے اور انہیں غصہ آنے لگتا ہے۔" میں آپ کے تاثرات سوچ کر مسکرایا۔

"کیا وہ بھی مجھے۔۔۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" حالانکہ میں کہنا چاہتا تھا، بابا وہ بھی تو رائے ہاؤس کے مکینوں کے درمیان ہی پلی بڑھی ہیں۔

بابا خاموش ہو گئے۔ میں نے چور نظروں سے انہیں دیکھا اور البم بند کر دی۔ مگر جو تصویریں از سرِ نو ان کے ذہن میں تازہ ہو گئی تھیں انہیں کیسے بند کرتا۔

"اسے کسی دن لے کر آؤ نا۔۔۔" انہوں نے سر اٹھا کر ایک عجیب سی فرمائش کی۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پوچھا۔

"کیا وہ آئیں گی؟"

"نہیں۔" کتنا عجیب اور مایوس لہجہ تھا ان کا، جس کے اندر سے ایک حسرت ابھری۔

"اگر وہ آجائے تو میں اسے بتاؤں۔۔۔"

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں بابا! وہ رائے جمشید حیات سے ملنے کبھی نہیں آئیں گی۔" میں انہیں کوئی جھوٹی امید نہیں دلانا چاہتا تھا۔ مگر خود اسی امید کے سہارے آپ سے کہہ بیٹھا۔

"آپ ملیں گی ان سے؟"

"نہیں۔" آپ کے ایک لفظ نے مجھے کتنا مایوس کیا۔ بابا ہر روز مجھ سے پوچھتے۔

"آج زارا نے کیسے کپڑے پہنے تھے۔ اس نے تم سے کوئی بات کی؟"

میں چپ رہتا تو پوچھتے۔

"وہ کیسی ہے؟"

"بالکل پھپھو جیسی۔" وہ ہر روز پوچھتے۔ میں ہر روز یہی جواب دیتا۔ "پھر ایک دن انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ نجانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ آپ ان سے ملیں گی تو وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں نے سوچا۔ میں آپ کو لے آؤں گا۔ آپ انکار کریں گی۔ میں تب بھی آپ کو یہاں لاؤں گا لیکن آپ مجھے ہاسپٹل میں مل گئیں۔"

وہ ایک ایک تصویر البم میں لگا رہا تھا اور وہ ششدر سی لبوں پر ہاتھ رکھے سن رہی تھی۔

"بابا! مجھ سے کتنا لڑے تھے؟"

"تم نے مجھے کیوں نہیں جگایا۔"

"بابا! میں نے۔۔۔"

"تم جانتے تھے۔ میں نے اس کا پل پل انتظار کیا ہے۔ لمحہ لمحہ جاگا ہوں میں۔ تم نے پھر بھی کیوں۔"

"زین۔ کیا تم واقف نہیں تھے میری حالت، میری کیفیت سے۔۔۔" وہ بہت غصے میں تھے اور میں مجرم بنا کھڑا تھا۔ کاش میں نے اس دن آپ کی بات نہ مانی ہوتی۔

"بابا! انہوں نے وعدہ کیا ہے۔ وہ پھر آئیں گی۔" میں نے ان کے سامنے امید کا چراغ جلا دیا۔

"کب؟۔۔۔" انہوں نے تڑپ کر پوچھا۔ میں نہیں جانتا تھا، لیکن میں نے کہہ دیا۔

"بہت جلد۔۔۔"

وہ ساری رات پلک نہیں جھپکتے تھے۔ ڈاکٹرز نیند کا انجکشن دینا چاہتے تو وہ چیخ اٹھتے۔

"مجھے نہیں سونا۔ وہ پھر آئے گی اور مجھے سوتا دیکھ کر لوٹ جائے گی۔"

"آپ زارا عمیر کو لے آئیں۔ ورنہ ان کی حالت بگڑ جائے گی۔" ڈاکٹرز نے کہا تو مجھے غصہ آگیا۔ بابا کو میری ذرا بھی پروا نہیں رہی تھی۔ میں ان سے لڑ پڑا۔

"اگر آپ کو ان لوگوں سے اتنی ہی محبت تھی تو کیوں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ آئیں سامنے آئیں ان لوگوں کے اور کہیں کہ آپ بے گناہ ہیں کیوں مجرموں کی طرح چھپ رہے ہیں۔ اگر آپ نے کچھ نہیں کیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کیوں بھاگے تھے۔"

"تمہاری وجہ سے۔۔۔؟" بابا نے آہستگی سے کہا۔

"میری وجہ سے۔۔۔ مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ان کے اندھے انتقام کے ہاتھوں تم مارے جاتے۔" کتنا خوفزدہ لہجہ تھا بابا کا۔

"مگر کیوں۔۔۔ جب آپ نے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔ آپ نے انہیں اپنی بے گناہی کا یقین بھی نہیں دلایا۔"

"کوئی ثبوت بھی تو ہوتا۔ سارے حالات و واقعات اسی طرح ترتیب پائے تھے کہ مجرم میں بن گیا۔"

"تو اب آپ اپنی بے گناہی کس طرح ثابت کریں گے۔" میرا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"تم ایک بار اسے لے کر تو آؤ۔"

"نہیں بابا۔۔۔" میرا لہجہ قطعی تھا۔ "میں اب ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اگر ان میں ذرا بھی مروت ہوتی تو ایک بیمار شخص کو دیکھنے وہ ضرور آتیں۔"

بابا خاموش ہو گئے۔ کچھ نہیں بولے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ خفا ہو گئے ہیں۔ پھر انہیں ڈسچارج کر دیا اور مجھ سے رہا نہیں گیا تو پھر سے آپ کے پاس چلا گیا۔"

ایک دم سے تاریکی کا احساس بڑھ گیا۔ تو زارا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گھنے بادلوں نے چاند کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ اس گھنی تاریکی میں درختوں سے ٹکراتی ہوا کا شور زارا کی سماعتوں پر خوف بن کر گرا۔ گھر کے اندر کہیں کوئی روشنی نہیں تھی اور اس کے سامنے بیٹھا سایہ کہہ رہا تھا۔

"انہوں نے کہا زین! بہت اچھا سا تحفہ لانا۔ میری زارا پہلی بار میرے گھر آئے گی۔"

زارا گھبرا کر اٹھ گئی۔ "میں چلتی ہوں۔"

"وہ رات بڑی بھیانک تھی اور ایسی راتوں کی بھی

سحر نہیں ہوتی۔" وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ زارا سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ وہ سایہ اس کے سامنے آ گیا۔

"اگر میں آپ کو اپنے بابا کی قاتلہ کہوں تو آپ کو برا نہیں لگنا چاہیے۔"

"مجھے جانے دو۔" وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"میں کب روک رہا ہوں آپ کو۔ روک ہی نہیں سکتا۔" وہ مایوس سے لہجے میں گویا ہوا۔ "مگر آپ اتنا تو بتا دیں۔ کیا آپ بھی میرے بابا کو قاتل سمجھتی ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں اتری۔ وہ سایہ اس کے پیچھے تھا۔

"آپ واقعی یہ سمجھتی ہیں کہ بابا نے آپ کے تایا کو قتل کیا ہے؟"

زارا رکی نہیں۔

"میرے بابا قاتل نہیں ہیں۔ انہوں نے کسی کو نہیں مارا۔ وہ کسی کو مار ہی نہیں سکتے۔ آپ کو یہ بات ماننی ہو گی۔" وہ اس کے گاڑی میں بیٹھنے تک چیختا رہا۔

اس نے گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ دی۔ گھر میں مما فون پر کسی سے اس کی بابت دریافت کر رہی تھیں۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں زارا؟" مما نے اسے دیکھتے ہی فون رکھا۔

وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

"زارا! کیا ہوا؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے مما۔۔۔"

"تم ٹھیک تو ہو۔ اتنی پیلی کیوں ہو رہی ہو؟۔" کسی انہونی کے احساس سے ان کا دل کانپ گیا۔

"بولو زارا! چپ کیوں ہو۔ میری جان! میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

وہ ان کے ساتھ لگی لمبے لمبے سانس لیتی رہی۔ وہ اسے لے کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"بتاؤ نا بیٹا! کہاں سے آ رہی ہو؟"

"مما!" اس نے سر اٹھا کر ماں کا پریشان چہرہ دیکھا۔

"آپ سمجھتی ہیں۔ ماموں نے تایا ابو کو قتل کیا تھا۔"

"تم کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔؟"

"آپ مجھے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتیں۔ مت دیں۔ مگر اب یہ سوال آپ سے ماموں کی روح کرے گی۔"

"زارا۔۔۔!" وہ چیخ اٹھیں۔ زارا کے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بول پائی۔ مما نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"کیا بکواس کر رہی تھیں تم ابھی۔"

زارا نے آہستگی سے خود کو ان کی گرفت سے چھڑایا اور قدرے دور جا کھڑی ہوئی۔ چند لمحے اسے اپنی ہمت مجتمع کرنے میں لگے۔ پھر وہ بے حد آہستگی سے بولی تھی۔

"میں ان سے ملی تھی مما۔"

"تم۔۔۔ تم جمشید سے ملی تھیں؟" کتنی حیرت و بے یقینی تھی ان کے لہجے میں۔ زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ک۔۔۔ کہاں۔۔۔ کہاں ہے وہ؟" مما کی آواز کسی سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر کتنی تڑپ تھی ان کے لہجے میں۔ زارا کا دل چاہا۔ وہ خاموش رہے۔ کبھی نہ بتائے۔

اک تسلی تھی۔ وہ جہاں بھی ہے زندہ ہے۔ اک امید، اک آس تھی۔ وہ کبھی تو آئے گا۔

"تم بولتی کیوں نہیں ہو زارا! وہ ٹھیک تو ہے نا۔"

کیسی بے بسی اور تڑپ تھی اس ایک جملے میں۔ وہ سامنے ہوں تو وہ انہیں بانہوں میں بھینچ لیں۔ پیشانی پر بوسہ دیں۔ وہ ان کا ماں جایا، ان کا مان اکلوتا چھوٹا بھائی۔

کیسے کہوں جس کی سلامتی کی دعائیں آپ چھپ چھپ کر کیا کرتی تھیں۔ منوں مٹی تلے جا سویا۔ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور آنکھیں گم صم تھیں۔

آنکھیں ایک قاتل کو دیکھتی تھیں اور دل ماں کی تڑپ اس کے یقین کو۔

"زارا۔۔۔!" وہ تڑپ تڑپ کر پکار رہی تھیں۔

"وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔۔۔"

ایک دم سے ساری کائنات پر خاموشی چھا گئی تھی۔ ہر آواز ساکن اور ہر نظر ٹھہری ہوئی بے یقین۔ ہر شے حیران اور منجمد اور وہ آنکھیں، آس میں جاگی آنکھیں چپ، خالی، بے جان، کوئی ایک منظر بھی نہ تھا ان آنکھوں میں۔ زارا کو ایسی چپ آنکھوں سے خوف آنے لگا۔ آس ٹوٹی۔ دن رات جپی گئی امید کی تسبیح دانہ دانہ بکھری۔ تو وہ آنکھیں خود بخود تھک کر بند ہو گئیں۔ زارا نے انہیں لہرا کر گرتے دیکھا۔

"مما۔۔۔ امما۔۔۔!" وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔

"فاطمہ! امجد!" اس نے ایک تواتر سے ملازموں کو آوازیں دیں۔ آناً فاناً سب ہی اکٹھے ہو گئے۔

"کیا ہوا بیگم صاحبہ کو؟"

"بے ہوش ہو گئی ہیں۔ تم پانی لاؤ۔" اس نے مما کا سر اپنی گود میں رکھا۔ امجد فوراً ہی پانی لے آیا۔ اس نے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ مگر انہیں ہوش نہیں آ رہا تھا۔

"ڈاکٹر کو فون کروں؟۔" کسی ملازم نے پوچھا۔

"فوراً۔۔۔" وہ ہراساں ہوئی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے نیچے گرا بیگ اٹھا کر قالین پر الٹ دیا۔ ملازم نے ان کے فیملی ڈاکٹر کا نمبر ملایا تھا۔

"بس جی! آپ جلدی آ جائیں۔ انہیں ہوش نہیں آ رہا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ اس نے موبائل سے پاپا کا نمبر ملایا۔

"پاپا! مما بے ہوش ہیں اور انہیں ہوش نہیں آ رہا۔ پلیز آپ جلدی گھر آ جائیں۔" وہ چھوٹتے ہی بولی تھی۔

"ڈاکٹر کو فون کیا ہے؟۔۔۔" وہ پریشانی سے پوچھ رہے تھے۔

"ڈاکٹر شمسی کو فون کیا ہے پاپا! وہ آ رہے ہیں، بس آپ گھر پہنچیں۔" فون بند کر کے وہ پھر سے مما کی طرف متوجہ ہوئی۔ مگر وہ بے حس و حرکت تھیں۔

ڈاکٹر اور پاپا ایک ساتھ پہنچے تھے۔ ساتھ میں سلیمان بھائی بھی تھے۔ سب سے پہلے تو مما کو بیڈ پر منتقل کیا۔

"کوئی شاک لگا ہے یا کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے۔" انہوں نے معائنے اور ٹریٹ منٹ کے بعد کہا تھا۔

سب کی سوالیہ نظریں زارا کی طرف اٹھیں۔
"مجھے نہیں معلوم۔ میں جب آئی تو یہ بے ہوش تھیں۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔
"فاطمہ ' امجد! کیا ہوا تھا؟" پاپا نے ملازموں کی طرف دیکھا۔
"پتا نہیں صاب جی۔" "انہیں کچھ معلوم ہوتا تو بتاتے۔"
"کوئی ملنے تو نہیں آیا تھا؟"
"نہیں جی! کوئی بھی نہیں۔" فاطمہ نے جواب دیا۔
"کوئی فون وغیرہ۔"
"نہیں سر جی۔ میں نے جب آخری بار دیکھا تو وہ یہیں صوفے پر بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ پھر پریشان ہو کر ٹہلنے لگیں۔ زارا نے بہت دیر کر دی۔ میں اس کی سہیلی کے گھر فون کرتی ہوں۔" امجد نے جلدی جلدی بتایا۔
"تم کہاں تھیں زارا؟" سلیمان بھائی نے پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی۔
"وہ میں"
"اتنی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔" ڈاکٹر شمسی بروقت بول اٹھے۔ پھر پاپا سے پوچھنے لگے۔ "کیا تم بہت زیادہ مصروف رہنے لگے ہو آج کل؟"
"مصروف تو میں ہمیشہ سے ہی ہوں۔" انہوں نے تفکر سے مما کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھا۔
"پھر بھی خیال رکھا کرو۔" وہ کھڑے ہو گئے۔
"یہ ہوش میں تو آجائیں گی۔" سلیمان نے پوچھا۔
"یا پھر اسپتال لے جائیں۔"
"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بھابھی انشاءاللہ جلد ہی ہوش میں آجائیں گی۔ اگر کوئی پرابلم ہوئی تو مجھے فون کر دینا۔" وہ مطمئن لہجے میں کہہ کر اٹھ گئے۔
"میں آپ کو باہر تک چھوڑ دیتا ہوں۔" سلیمان بھائی ڈاکٹر شمسی کے ساتھ باہر نکل گئے۔ تب پاپا نے ماما کے چہرے سے نظریں ہٹا کر زارا کو دیکھا۔

"کیا بات ہے زارا! تمہاری مما کو کیا ہوا ہے؟" ان کا لہجہ سنجیدہ و پر یقین تھا گویا وجہ صرف زارا ہی جانتی ہے اور زارا نے سوچا تھا۔ اب چھپانے کا کیا فائدہ' جانے والا تو اپنی ساری دشمنیاں اپنے ساتھ ہی لے گیا۔
"پاپا! ماموں کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔
"ماموں۔" ایک پل کو پاپا کے ذہن سے یہ رشتہ ہی نکل گیا۔ دوسرے پل وہ چونک کر بولے۔
"یو مین' جمشید حیات"
زارا نے اثبات میں سر ہلایا۔
"آئی سی" انہوں نے مما کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ شوہر تھے' جانتے تھے وہ اپنے بھائی سے کتنی محبت کرتی تھیں۔
"آئمہ کو کیسے معلوم ہوا؟" انہوں نے آہستگی سے پوچھا۔
"میں نے بتایا تھا" زارا کی آواز ان سے بھی مدھم تھی۔ وہ بری طرح چونکے۔
"تم نے تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" ان کی نگاہوں میں الجھن سی تیرنے لگی تھی۔
"زین العابدین ان کا بیٹا! میرا یونیورسٹی فیلو ہے۔" پاپا ٹھٹک گئے۔ پھر انہوں نے پلٹ کر دروازے کو دیکھا۔ پھر تیزی سے مگر مدھم آواز میں بولے۔
"سنو زارا! یہ بات کسی اور کے سامنے نہیں کرنا۔ سلیمان کے سامنے تو ہرگز نہیں۔"
زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا مگر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ تب ہی سلیمان بھائی آگئے۔
"آئی تھنک سلیمان! تم چلے جاؤ۔ ڈنر ابھی جاری ہوگا۔ صرف منیجر پر سب چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ تم جا کر انہیں اٹینڈ کرو۔" پاپا نے کہا تو وہ بیٹھتے بیٹھتے رک گئے۔
"میرے خیال میں کوئی حرج نہیں۔ جب تک آنٹی کو ہوش نہیں آتا۔ میں رک جاتا ہوں۔"
"نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ آئمہ جلد ہوش میں آجائے گی۔ کوئی پریشانی والی بات نہیں تم جاؤ۔" وہ

ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ جب انہیں ہوش آئے تو سلیمان یہاں موجود ہو۔ سلیمان نے الجھ کر انہیں دیکھا۔ پھر کندھے اچکا کر بولے۔
"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔"
ان کے جانے کے بعد پاپا تھکے تھکے سے انداز میں کرسی پر گر گئے۔
"تو یہ کہانی ختم ہو گئی" وہ زیر لب بڑبڑائے۔ زارا یونہی ماما کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔
"بیٹھ جاؤ بیٹا!" پاپا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ پھر وہ آہستگی سے مما کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔
"پاپا! کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"وہ ایسا شخص تھا نہیں۔ مگر حالات وواقعات میں چاہتا تھا کہ ہر چیز واضح ہو کر سامنے آئے مگر سلیمان اس نے رپورٹ بھی درج نہیں کرائی۔" وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولے۔ تب ہی مما ہلکا سا کراہیں۔
"ن جمشید۔" ان لبوں نے ہزاروں بار یونہی بے صدا آوازیں دی تھیں۔ آج انہیں الفاظ ملے تھے۔
"مما!" زارا نے ان کے گال تھپتھپائے۔
"جمشید مر گیا میرا بھائی مر گیا۔" الفاظ اب بھی بے یقین تھے۔
"مما!"
انہوں نے ایک دم آنکھیں کھولیں۔ وہ کچھ لمحے خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہیں۔ پھر زیر لب بڑبڑائیں۔
"خواب کوئی خواب دیکھا تھا میں نے؟" انہوں نے نظروں کا زاویہ بدل کر زارا کو دیکھا۔
"نہیں" ان کا سر آہستگی سے نفی میں ہلا۔ "تم نے بتایا تھا تم نے بتایا تھا وہ وہ مر گیا۔" انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ زارا نے انہیں سہارا دیا۔ تب ہی ان کی نگاہ پاپا پر پڑی۔
"تم نے سنا عمیر! وہ مر گیا۔ میرا بھائی' تمہارا

دوست' نہیں دوست نہیں تمہارے بھائی کا قاتل' خود بخود ختم ہو گیا۔ تم لوگوں کو موقع دیئے بغیر ہی" مما کے لہجے میں وہی وحشت تھی جو اس نے زین کے لہجے میں محسوس کی تھی۔
"مما پلیز! سنبھالیں خود کو۔ وہ تو کبھی بھی ہمارے درمیان نہیں تھے۔" زارا نے اپنے تئیں انہیں تسلی دینا چاہی تھی مگر وہ بھڑک اٹھیں۔
"وہ تھا۔ وہ ہمیشہ سے میرے پاس تھا۔ اس نے ہمیشہ میرا کندھا تھپتھپایا ہے۔ ہمیشہ میرے آنسو صاف کیے ہیں' تسلیاں دی ہیں' وہ کبھی مجھ سے دور نہیں رہا۔ زارا عمیر! کبھی نہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں اور انہوں نے اتنی اجنبیت سے زارا کا نام لیا تھا کہ وہ تڑپ اٹھی۔ مگر وہ اب پاپا کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔
"آپ تو خوش ہیں نا عمیر! بہت خوش۔ وہ جسے ختم کرنے کی چاہ میں ایک عمر گزری تم لوگوں کی۔ وہ خود بخود ختم ہو گیا۔ کچھ تو انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑی ہو گی۔ کچھ تو دل کو قرار آیا یا ابھی کسی اور کا خون بھی چاہیے تم لوگوں کو؟"
"آئمہ!" انہوں نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مگر انہوں نے تیزی سے ہاتھ جھٹک دیا اور ہذیانی انداز میں چیخیں۔
"چلے جائیں یہاں سے۔ اس سلیمان کو بھی بتائیں جا کر خوشیاں منائے' مٹھائی بانٹے' چراغاں کرے کہ اس کا کام قدرت نے کر دیا۔"
پاپا نے بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر روتی مما کو دیکھا۔ پھر دانستہ باہر نکل گئے تھے۔ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔
"مما! ہمت سے کام لیں۔"
"اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ بے گناہ اور معصوم تھا زارا۔"
(کیا آپ بھی میرے بابا کو قاتل سمجھتی ہیں)
"مما! اس یقین دہانی کی ضرورت کہ آپ انہیں بے قصور سمجھتی ہیں۔ مجھے نہیں زین کو ہے۔" زارا

نے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر آہستگی سے کہا۔

"زین۔۔۔؟" انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"زین العابدین۔۔۔"

"کہاں۔۔۔ کہاں ہے وہ۔۔۔؟" مما ایک دم سیدھی ہو بیٹھیں۔

"وہ یونیورسٹی فیلو ہے میرا۔۔۔ میں اس کے گھر گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تایا ابو کا قتل ماموں نے کیا ہے یا نہیں لیکن زین کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس وقت اسے آپ کی اور آپ کو اس کی ضرورت ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔ مما تڑپ کر سیدھی ہوئیں۔

"مجھے اس کے پاس لے چلو زارا!" وہ اس کا ہاتھ تھام کر ملتجی لہجے میں بولی تھیں۔

"مما! اس حالت میں کیسے لے جاؤں آپ کو۔"

"م۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔" انہوں نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھے۔

"رات بہت ہو گئی ہے۔ صبح ہی جا سکیں گے۔" اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کر کے رات کے گزرنے کا احساس دلایا۔ وہ بری طرح جھنجھلا گئیں۔

"تم سمجھتی نہیں ہو۔ مجھے ابھی اس کے پاس جانا ہے۔ وہ اکیلا ہے، پریشان ہے۔ اس وقت اسے صرف میری ضرورت ہے زارا کہ یہ دکھ صرف میرا اور زین کا ہے۔"

"اس وقت کوئی نہیں جانے دے گا۔۔۔" زارا نے آہستگی سے کہا۔ مما نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر رو پڑیں۔

"ہاں دیواریں تب بھی تھیں۔ دیواریں اب بھی ہیں۔"

"ٹوٹ جائیں گی۔ ساری دیواریں ٹوٹ جائیں گی مما! صبح تو ہونے دیں۔ میں آپ کو خود لے کر جاؤں گی۔" زارا نے تسلی دی تو وہ خاموش سی ہو گئیں۔

"اچھا دیکھو۔ کسی کو بتانا نہیں کہ ہم کہاں گئے ہیں۔"

"نہیں بتاؤں گی۔۔۔"

"یہ۔۔۔ یہ صبح کب ہو گی؟" انہوں نے بے تابی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر بند کھڑکی کو۔ "کھڑکی کھول دو زارا!" انہوں نے یوں کہا جیسے صبح کا رستہ اس بند کھڑکی نے روک رکھا ہو گا۔

زارا نے کچھ بھی کہے بغیر کھڑکی کھول دی تھی۔ باہر تاریک رات بہہ رہی تھی اور مما نے اس رات کو تکتے تکتے صبح کی تھی۔ کتنا جاں گسل اور اذیت ناک انتظار تھا۔ جب صبح کی پہلی کرن نے کھڑکی سے جھانکا تو مما بے تابی سے بولی تھیں۔

"چلیں۔"

زارا انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔ پاپا آئے تھے اور یوں لگتا تھا وہ بھی ساری رات جاگتے رہے تھے۔

"آپ سوئے نہیں پاپا۔۔۔؟" زارا نے ان کی سرخ آنکھیں دیکھیں۔

"ساری رات وہ واقعات پھر سے دہراتا رہا۔"

"سارے جرم تب بھی اسی کے نام نکلے ہوں گے۔" مما کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"سارے جرم اسی کے نام نکلے ہوتے تو میں سونہ جاتا۔" انہوں نے آہستگی سے کہا پھر پوچھنے لگے۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"ٹھیک ہوں۔۔۔" مما نے رکھائی سے کہہ کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ "آپ آفس جائیں۔"

"میں آج آفس نہیں جا رہا۔"

"کیوں؟" مما نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔

"آج کا دن تمہارے۔۔۔"

"مجھے ضرورت نہیں۔۔۔" وہ اجنبیت سے بولیں۔ پاپا نے کچھ کہنے کو لب کھولے مگر زارا بول اٹھی۔

"پاپا پلیز۔ مما اس وقت تنہا رہنا چاہتی ہیں۔"

"میں نے ایک عمر اس کی جدائی کا دکھ تنہا سہا ہے۔ اس کی موت کا دکھ اگر بانٹوں گی تو۔۔۔" وہ زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

"اوکے۔ اپنا خیال رکھنا۔" پاپا نے کہا اور پھر وہ بنا ناشتہ کیے آفس چلے گئے تھے۔ جیسے ہی ان کی گاڑی باہر نکلی۔ مما کھڑی ہو گئیں۔

"چلو زارا!۔۔۔"

زارا کو معلوم تھا اب وہ نہیں رکیں گی۔

ان کے جاتے ہی سلیمان آ گئے۔

"وہ تو بی بی نہیں گئی ہیں۔" امجد نے بتایا۔

"کہاں؟۔۔۔"

"پتا نہیں جی۔ کچھ بتایا تو نہیں۔"

"کمال ہے، رات کو ان کی اتنی طبیعت خراب تھی۔ صبح صبح کہاں چلی گئیں؟" سلیمان حیرت سے بڑبڑائے پھر پوچھنے لگے۔

"اکیلی گئی ہیں؟۔۔۔"

"زارا بی بی ساتھ تھیں۔"

"اور صاحب؟"

"وہ تو صبح صبح ہی آفس چلے گئے بغیر ناشتہ کیے۔"

"اچھا۔" سلیمان نے کچھ سوچا۔ پھر موبائل پر نمبر پریس کرتے ہوئے لان چیئر تک آ گئے۔

"ہیلو انکل! میں سلیمان۔۔۔"

"صبح صبح۔ خیریت تو ہے نا۔"

"صبح صبح تو آپ آفس کے لیے نکل گئے۔ خیریت تو آپ سے پوچھنی چاہیے۔"

"ہاں بس یونہی۔"

"آنٹی اور زارا بھی گھر پر نہیں ہیں۔"

پاپا خاموش ہو گئے۔

"ان کی طبیعت کیسی تھی؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ٹھیک نہیں تھی۔۔۔"

"وہ گئیں کہاں؟۔۔۔" سلیمان الجھ گئے۔

"جمشید حیات کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" انہوں نے آہستگی سے بتایا۔ سلیمان اچھل ہی تو پڑے۔

"کیا؟۔۔۔"

"ہاں۔ رات ہی معلوم ہوا تھا۔ اسی لیے آئمہ کی طبیعت بگڑ گئی۔"

"خبر جھوٹی بھی تو ہو سکتی ہے۔۔۔"

"نہیں ہے۔" پاپا کا لہجہ سپاٹ سا تھا۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"جس نے بھی بتایا۔ جھوٹ نہیں بولا۔ یہ آج کا سچ ہے کہ جمشید حیات ختم ہو گیا۔"

"تو آنٹی اور زارا۔۔۔"

"سنو سلیمان! آئمہ نے ساری زندگی ہماری لگائی پابندی کو نبھایا ہے۔ وہ کبھی اپنے بھائی سے نہیں ملی۔ لیکن آج اگر وہ اس کی قبر پر جانا چاہے تو میں روک نہیں سکتا۔" پاپا نے قطعی لہجے میں کہا۔

"اوکے۔ خدا حافظ۔" سلیمان نے مزید کوئی بھی بات کیے بغیر فون بند کر دیا۔ کچھ لمحے وہ بند فون کو گھورتے رہے، پھر ان کے لبوں پر ایک پُراسرار سی مسکراہٹ ابھری۔

"تو کہانی ختم ہو گئی۔ بہت بزدل نکلے جمشید حیات۔ بہت بزدل لیکن اچھا ہوا خود ہی ختم ہو گئے۔ یہ کام مجھے نہیں کرنا پڑا۔"

وہ مسکرائے۔ پھر کھڑے ہو گئے۔ اپنا والٹ نکال کر انہوں نے پانچ سو کا نوٹ گھسیٹا اور امجد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"جاؤ عیش کرو۔"

"یہ کس لیے سر جی؟۔۔۔" اس نے حیرت سے پانچ سو کا نوٹ دیکھا۔

"آج میں آزاد ہوں۔ مکمل آزاد۔۔۔" عجیب سی طمانیت ان کے لہجے و انداز میں تھی۔ امجد نے انہیں جاتے دیکھا پھر نوٹ سنبھال کر جیب میں رکھ لیا تھا۔

♥ ▽ ▽ ♥

گیٹ یونہی کھلا تھا۔ وہ لوگ اندر چلی آئیں۔ گملوں میں پانی ڈالتا سلیم انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ پھر ان کے قریب آ گیا۔

"زین کہاں ہے؟۔۔۔" زارا نے پوچھا۔

"وہ تو اپنے کمرے میں ہی بند ہیں صبح سے، نکلے ہی نہیں۔" اس نے افسردگی سے بتایا۔

"اب نکلے گا۔ اس سے کہو۔ اس کی پھپھو آئی ہیں۔" مما نے بے تابی سے کہا۔ سلیم نے تحیر سے انہیں دیکھا۔

"آپ بھائی جان کی۔۔۔"
"ہاں۔ ہاں میں اس کی پھپھو ہوں۔" وہ جھنجھلا گئیں۔
"لیکن آپ پہلے تو کبھی نہیں آئیں۔؟"
"اب تو آئی ہوں نا۔" وہ تڑخ کر بولیں۔ سلیم سرہلاتے ہوئے پلٹ گیا۔
"آئیں میرے ساتھ۔"
وہ انہیں لاؤنج میں بٹھا کر سامنے والا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔
"بھائی جان! باہر آئیں۔ دیکھیں آپ سے ملنے کون آیا ہے۔"
اندر گہری خاموشی چھائی رہی۔
"بھائی جان! آپ کی پھوپھو آئی ہیں۔" سلیم نے پھر پکارا۔ جواب ندارد۔ زارا نے مما کی طرف دیکھا۔ ان کا دل ان کی آنکھوں میں دھڑک رہا تھا۔ پھر وہ بے تاب ہو کر خود دروازہ کھٹکھٹانے لگیں۔
"زین۔۔۔! دروازہ کھولو۔ پلیز دیکھو' میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ پھپھو ہوں تمہاری۔"
"کوئی نہیں ہے میرا۔۔۔" وہ اندر سے چلایا۔
"ایسا مت کہو۔ مت کہو یوں زین۔۔۔! میں میں ہوں نا تمہاری پھپھو۔ خدا کے لیے ایک بار تو دروازہ کھول دو۔" وہ بلک بلک کر رو دیں۔ تڑپتے ہوئے اسے پکار رہی تھیں اور وہ بے حس بنا بیٹھا تھا۔
"زین۔۔۔! زین! خدا کے لیے دروازہ کھول دو۔" وہ بار بار پکار رہی تھیں۔
"آپ چلی جائیں یہاں سے۔ مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ کسی سے بھی۔۔۔" وہ چیخ رہا تھا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ مما بلک رہی تھیں۔ اسے پکار رہی تھیں اور درمیان میں بس ایک دروازہ حائل تھا۔ سلیم حیران تھا اور زارا پریشان۔
"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ روتی رہیں۔ اندر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ تھک کر وہیں بیٹھ گئیں۔ مگر ان کا ہاتھ اب بھی تھکے تھکے انداز میں دروازے پر دستک دے رہا تھا اور وہ خود آنکھیں بند کیے دروازہ سے لپٹی زیر لب بڑبڑا رہی تھیں۔
"مجھے یہ دکھ تمہارے ساتھ رونا ہے۔ یہ میرا دکھ ہے اور تمہارا۔ وہ تمہارا باپ تھا اور میرا بھائی۔ بس یہاں یہی دو رشتے تھے اس کے۔ مجھے اور تمہیں مل کر رونا ہے زین۔"
"بس کریں مما! وہ نہیں کھولے گا۔" زارا نے انہیں زبردستی دروازے سے الگ کیا۔ عین اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ اگر زارا انہیں ہٹا نہ چکی ہوتی تو وہ گر جاتیں۔ مما نے تڑپ کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ شدت گریہ سے زین کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ان کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھا۔ مما کی بانہیں پھیلیں' مگر وہ انہیں دیکھتا رہا۔
"زین آؤ۔"
وہ نفی میں سرہلا کر پیچھے ہٹا۔ "آپ کہیں کہ میرے بابا قاتل نہیں تھے۔"
"نہیں تھے۔ اس نے کسی کو نہیں مارا۔ وہ معصوم تھا' بے گناہ تھا۔"
اور وہ ان کی بانہوں میں بکھر گیا۔ بچوں کی طرح لپٹ کر ان سے رویا اور کھل کر رویا۔
"کوئی ایسا نہیں تھا جو میرے ساتھ مل کر روتا۔ میں بالکل تنہا تھا۔" وہ بھی اس کے ساتھ روتی رہیں۔
"مما پلیز! خود کو سنبھالیں۔" زارا نے اپنے آنسو پونچھ کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔ "زین کو اس وقت آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔"
"تم تنہا کہاں ہو بیٹا! میں ہو نا بدقسمت تمہارے ساتھ 'اپنے بھائی کا دکھ دیکھنے کے لیے۔ ہائے۔۔۔ میں فائقہ کو کیسے بتاؤں گی۔ ابھی تو وہ شوہر کا صدمہ نہیں سہ پائی۔" وہ پھر سے رونے لگیں۔
"بتایئے گا' ضرور بتایئے گا۔ رائے ہاؤس کے ایک ایک شخص کو بتایئے گا۔ ان کے اندھے انتقام کو کچھ تو تسکین ملے گی۔" زارا نے زہر خند لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت جذباتی ہو رہی تھی۔
"نام بھی مت لینا زارا۔" مما ایک دم خوفزدہ ہو گئیں۔

"کیوں مما۔۔۔؟"

"انہیں پتا بھی نہیں چلنا چاہیے کہ ہم یہاں زین سے ملنے آتے ہیں۔ یا زین تمہارے ماموں کا بیٹا ہے۔"

زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"ماموں اب نہیں رہے اور زین کا اس پورے واقعہ میں کوئی قصور نہیں۔ وہ تو بمشکل سال بھر کا تھا تب۔"

"میں نے کہہ دیا نا۔ نام بھی نہیں لینا۔ کبھی بھول کر بھی نہیں۔" ان کے لہجے میں سختی در آئی۔

"کیا آپ بلاوجہ خوفزدہ نہیں ہو رہیں۔" اسے اس بات پر یقین نہ تھا کہ وہ لوگ ایک بے قصور شخص کو سزا دیں گے۔

"تم انہیں نہیں جانتیں۔ میں جانتی ہوں۔ وہ زین کو نہیں چھوڑیں گے۔ سلیمان نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی۔"

"قاتل سے۔" زارا نے یاددہانی کرائی۔

"وہ تو انہیں ہی قاتل سمجھتے ہیں۔"

"ایک ڈیڑھ سال کے بچے کو کس طرح قاتل سمجھ سکتے ہیں وہ۔ زین کا تو کوئی قصور نہیں۔" اس نے جرح کی۔

"تم سے کہہ دیا نا۔ بھولے سے بھی نام نہیں لینا۔" مما کے لہجے میں سختی در آئی۔

"مما! آج کے دور میں بھی یہ دشمنیاں زمانہ جاہلیت کی طرح پنپ سکتی ہیں۔" وہ حیران تھی۔

"کیا یہ ایک مثال کافی نہیں۔ انسان کے اندر کا وحشی حیوان تو ہر دور میں زندہ رہا ہے اور آج اس کی وحشت کی تسکین محض ایک گولی کر دیتی ہے۔" ان کے لہجے میں تلخی ہی تلخی تھی۔ تب ہی زین نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"آپ تو جانتی ہیں کہ بابا نے قتل نہیں کیا۔" وہ گویا پھر سے یقین دہانی چاہتا تھا۔

"وہ میرا بھائی تھا۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں میں۔ وہ کبھی کسی کو نہیں مار سکتا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔ زین نے پرسکون ہو کر آنکھیں موند لیں۔

"بیگم صاحب! بھائی نے کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔" سلیم اندر آیا۔

"ہاں۔ تم ناشتہ لگاؤ۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو کھلاؤں گی۔" مما نے پیار سے اس کی پیشانی چومی۔ کتنا اہم ہو گیا تھا وہ۔ انہوں نے تیزی سے آنسو صاف کیے۔

"یہ رشتے ناتے تو ایک دوسرے کا حوصلہ اور سہارا ہوتے ہیں نجانے ہم انہیں کس طرح توڑ چھوڑ دیتے ہیں۔" زارا اپنی ہی سوچوں میں گم رہی۔ مما نے اپنے ہاتھوں سے اسے ناشتہ کروایا تھا۔ اسے کھلاتی تھیں اور خود روتی جاتی تھیں۔

"پھر کب آئیں گی؟" جب وہ جانے کو اٹھیں تو زین نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"روز آیا کروں گی۔" مما نے پھر سے اسے پیار کیا۔ وہ انہیں چھوڑنے دروازے تک آیا تھا۔

"زین کو اس وقت ہماری کتنی ضرورت ہے نا مما۔۔۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے دروازے میں کھڑے تنہا زین کو دیکھا۔

"ہاں۔۔۔" مما کی آنکھیں پھر سے برس پڑیں۔

"کاش ہم اسے گھر لے جا سکتے۔" زارا نے بے حد مایوسی سے کہا۔ مما اپنی بے بسی پر روتی رہیں۔

"اوہ نو۔۔۔" گھر پر رضوان کو دیکھتے ہی زارا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ لوگ اس وقت کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ رضوان شاید انتظار کر کر کے اب واپس جانے کے ارادہ سے اٹھا تھا۔ وہیں لان میں رک گیا اور کیونکہ وہ انہیں دیکھ چکا تھا۔ سو مجبوراً انہیں وہاں تک آنا پڑا۔

"کہاں تھیں آپ۔ میں کافی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔"

"ہاں بس۔۔۔ خیریت تو تھی۔۔۔؟" مما نے پوچھا۔ وہ بری طرح چونک گیا۔ پھر بے اختیار پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا؟۔۔۔" اسے شاید مما کی رات والی حالت کی خبر نہ تھی۔

شدت گریہ سے مما کی حالت تو خستہ تھی ہی۔ خود زارا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ زارا نے گڑبڑا کر مما کو دیکھا۔

"میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ زارا یونہی پریشان ہو گئی۔" انہیں بروقت بہانہ سوجھا۔

"تو آپ ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں گئیں۔"

"تھوڑا ریسٹ کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔" انہوں نے آہستگی سے کہا تو رضوان نے تحیر سے انہیں دیکھا۔ ان کی ایک ایک حرکت سے اضطراب اور بے چینی مترشح تھی۔ اس نے ایک نظر زارا پر ڈالی۔

"اوکے۔ آپ پھر آرام کریں۔" اس نے زیادہ کرید نہیں کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔

♥ ♥

"آنٹی اب کیسی ہیں؟۔۔۔" صبح صبح ناشتے سے بھی پہلے رضوان کا فون آیا تھا لیکن ایک ہفتے بعد۔

"خیال آ گیا آپ کو۔۔۔" زارا نے جتایا۔

"خیال تو بہت تھا۔ پر میں نے سوچا تم کون سا سچ بولو گی۔" وہ شاکی لہجے میں بولا۔

"واٹ ڈو یو مین؟۔۔۔" وہ ٹھٹھک گئی۔

"کیا ہوا تھا؟۔۔۔" رضوان پہلے بھی بے خبر تھا۔ اب بھی شاید سلیمان نے اسے کسی معاملے کی خبر نہ ہونے دی تھی۔

"مما کی طبیعت۔۔۔"

"طبیعت تو ان کی واقعی خراب تھی۔ مگر کس وجہ سے۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی۔"

"وجہ کیا ہوتی تھی بس یونہی۔۔۔" وہ گڑبڑا سی گئی تھی۔

"خیر تم نہ بتانا چاہو تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ ورنہ تم لوگوں کے چہرے بتا رہے تھے کہ کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔"

"اگر کوئی بات ہوتی تو کیا میں آپ سے چھپاتی۔" زارا پزل سی ہو گئی تھی۔

"اچھا چھوڑو۔ یونیورسٹی جا رہی ہو۔؟" اس نے بات بدلی۔

"ہاں۔ اب تو ایگزام بھی نزدیک ہیں۔"

"بہت اچھی پوزیشن لانا۔ پھر اپنا اخبار نکالنا۔"

"رئیلی رضوان!۔" وہ خوش ہو گئی۔

"کیوں اعتبار نہیں ہے۔" رضوان متبسم لہجے میں بولا۔

"آپ پر تو خود سے بھی زیادہ ہے۔" زارا نے بے ساختہ کہا۔ رضوان کا قہقہہ اس سے بھی بے ساختہ تھا۔

"یہ جملہ ڈائری میں نوٹ کرنے کے قابل ہے۔"

"تو کرلیں روکا کس نے ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"ہم ایسے جملے ڈائری پر نہیں دل پر لکھا کرتے ہیں۔"

"آپ ایسی باتیں بھی کر لیتے ہیں۔" وہ جھینپ گئی۔

"ہم ایسی ویسی سب باتیں کر لیتے ہیں۔ بس وقت کا انتظار ہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"بس یا کچھ اور۔۔۔" وہ فون رکھنے والی تھی۔

"فی الحال بس۔۔۔"

اس نے کہا تو زارا نے تیزی سے فون بند کر دیا۔

"اوہ گاڈ۔ کیا ہو گیا آج رضوان کو۔" وہ حیرت سے مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ پھر مسرور سی تیار ہونے چلی گئی۔

مما ہر روز زین کے پاس جاتیں۔ گھر کی صفائی کرواتیں۔ اس کے لیے خود کھانا بنواتیں۔ ایک دن مما کو اس کی شرٹ خود دھوتے دیکھ کر تو زارا حیرت سے پوچھ کر رہ گئی۔

"مما! ایسی محبت کا اظہار آپ نے کبھی مجھ سے تو نہیں کیا۔"

"تمہارے ماموں زندہ ہوتے تو وہ تم سے ایسی ہی محبت کا اظہار کرتے۔"

"ماموں سچ ہی کہتے تھے۔ آپ لوگوں کو اپنی اولادیں بدل لینی چاہیے تھیں۔" زارا نے منہ بنایا۔

"خدا نہ کرے پھر آپ کو وہ زندگی جینا پڑتی۔ جو میں اور میرے بابا جیسے ہیں۔" زین فوراً" کہہ اٹھتا۔

"زارا!۔۔۔" مما کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"آ کے ناشتہ کرو۔"

اس نے تیزی سے بالوں میں برش کیا۔

"عظمیٰ اور انعم تو میرا حشر کر دیں گی۔ اتنے دنوں سے میں بغیر بتائے یونیورسٹی سے غائب ہوں۔" اپنی چیزیں بیگ میں ڈالتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔ مما کے دوبارہ پکارنے پر وہ نیچے آئی۔

"مما! مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں کینٹین سے کچھ لے لوں گی۔"

"اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو؟۔" مما نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

"زین کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔ بہت حرج ہو رہا ہے اس کا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" مما نے تائید کی۔ تو وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

زین ابھی تک سو رہا تھا۔

"رات کو بہت دیر سے سوئے تھے۔" سلیم نے بتایا۔

"زین۔۔۔! زین۔۔۔!" زارا نے اس کا بازو جھنجھوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگا۔

"کیا ہوا؟۔۔۔"

"ہوا کچھ نہیں۔ فوراً" اٹھو۔ تمہیں یونیورسٹی جانا ہے۔ ہری اپ۔۔۔"

"مجھے نہیں جانا۔ آپ جائیں۔" اس نے گر کر تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

"تمہیں جانا ہے۔" زارا نے تکیہ کھینچ کر کارپٹ پر پھینک دیا۔ وہ کچھ لمحے اسے یونہی دیکھتا رہا۔ پھر سپاٹ لہجے میں پوچھنے لگا۔

"کس لیے؟۔۔۔"

"یونیورسٹی کس لیے جاتے ہیں۔ اپنی پڑھائی مکمل نہیں کرو گے۔"

"کس کے لیے؟۔۔۔" اس کا لہجہ ہنوز سنجیدہ و سپاٹ تھا۔

"کیا مطلب کس کے لیے؟۔۔۔" زارا نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"وہ جنہوں نے میرے لیے کچھ خواب دیکھ رکھے تھے۔ اپنے خوابوں کو سمیٹ کر چلے گئے۔ اب میں کس کے لیے کوشش کروں۔" وہ دل گرفتی سے بولا۔ زارا نے آہستگی سے اس کے بکھرے بالوں کو سنوارا۔

"سنو زین! ماموں نہیں رہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، لیکن ان کے خواب آج بھی زندہ ہیں۔ میری اور مما کی آنکھوں میں۔"

زین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مرد بنو زین! اپنے دکھوں کو اشتہار نہیں بنایا کرتے۔" زارا نے اسے بازو سے پکڑ کر باتھ روم کی طرف دھکیل دیا اور خود وارڈروب کھول کر اس کے لیے ڈھنگ کا لباس نکالنے لگی۔

♥ ♥

"کیا کہہ رہی ہو تم۔؟" وہ دونوں ایک ساتھ چیخی تھیں۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔۔۔" زارا نے ان کے ہونق چہروں پر ایک نگاہ ڈالی اور مسکرا دی۔

"کوئی کہانی لکھ رہی ہو یا افسانہ سنا رہی ہو۔" انعم کو یہ بات کسی صورت ہضم نہ ہو رہی تھی۔

"اسے معجزہ کہتے ہیں۔۔۔" زارا کو ہنسی آ رہی تھی۔

"وہ زین العابدین تمہارا ماموں زاد ہے۔" عظمیٰ نے پھر سے تصدیق چاہی۔ زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ویری اسٹرینج۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ اتنے دن یونیورسٹی میں کیا کرتی رہیں۔؟" وہ لوگ ٹریک ہی نہ بدل رہی تھیں مجبوراً" زارا ہی کو موضوع بدلنا پڑا۔

"جھک مارتے رہے۔" انعم اس کے بات بدلنے پر جھنجلائی۔ عظمیٰ ہنس دی۔

"بس تمہارا انتظار کرتے تھے۔ کئی بار موبائل پر بھی رنگ کیا۔ مگر وہ بھی آف ہوتا تھا۔ گھر فون کرو تو پتا چلتا محترمہ صبح سے غائب ہیں۔ کب آئیں گی معلوم نہیں۔ اب تو تمہارے گھر آنے کو پلان کر رہے تھے ہم تو۔ کیونکہ ہمارے بلکہ انعم کے پاس زبردست نیوز ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ اسی کو تمہارا انتظار تھا۔"

"ایسی کیا بات تھی انعم۔۔۔؟" زارا نے انعم کو دیکھا۔

"اف۔ میرے ساتھ بھی معجزہ ہو گیا۔" وہ دونوں آنکھیں میچ کر بڑے جوش سے بولی۔

"کہیں تمہارا پرپوزل تو نہیں آ گیا۔" زارا نے رازداری سے پوچھا۔

"ہائے اللہ! تمہیں کیسے پتا چلا۔۔۔" اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔

"تمہاری حالت بتا رہی ہے۔"

"یہ بھی تو پوچھو پرپوزل کس کا آیا۔" عظمیٰ نے کہا تو زارا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کون ہیں موصوف؟۔۔۔"

"پنڈی والی خالہ کے اکلوتے فرزند ارجمند۔۔۔" اس نے مزے سے بتایا۔

"واٹ۔۔۔!" زارا تو اچھل ہی پڑی۔

"ہاں جی۔ خالہ باقاعدہ پرپوزل لے کر آئی ہیں۔"

"تو گویا تم نے ثابت کر دیا کہ تم اپنی فیملی کی سب سے اچھی کیلنڈ، سگھڑ، خوبصورت اور سلیقہ مند لڑکی ہو۔"

"میں نے نہیں امی نے۔ بے چاری خالہ دھوکہ کھا گئیں۔" وہ ہنسی۔

"تو مٹھائی کب کھلا رہی ہو۔۔۔"

"ارے اس انگلی میں انگوٹھی تو آنے دو۔ شاندار پارٹی کرواؤں گی۔۔۔ گھر میں۔۔۔" وہ ہاتھ لہرا کر کھلکھلائی۔

"خوش ہو۔۔۔؟" زارا نے اس کا چمکتا چہرہ دیکھا۔

"ایسی ویسی۔ سارے خاندان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا انعم نے۔۔۔ کون کون نہیں تاک لگائے بیٹھا تھا۔" وہ کھلکھلائی تو عظمیٰ نے بے اختیار ٹوکا۔

"یوں نہیں کہتے انعم! اپنے رب کا شکر ادا کرو کہ تمہارے والدین کی پریشانی ختم ہوئی اور دعا کیا کرو۔ خدا سب کی امیدیں اور آرزوئیں پوری کرے۔"

"سوری اللہ میاں جی۔" انعم نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کو دیکھا۔ "میں تھوڑا اوور ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں ہرگز غرور نہیں کر رہی۔"

"پوری جوکر ہو تم۔۔۔" زارا ہنس دی۔

"لو تمہارے آ گئے ہیں ماموں زاد۔ سو ہم تو چلے۔" انعم نے دور سے آتے زین کو دیکھ کر کتابیں اٹھائیں۔

"چلیں۔۔۔" زین نے قریب آ کر پوچھا۔ زارا نے اس سے کہا تھا کہ واپسی پر وہ اس کے ساتھ جائے گی۔

"ہاں چلو۔۔۔"

وہ گھر پہنچے تو مما پہلے سے موجود ان کے لیے کھانا بنوا رہی تھیں۔

"جلدی سے فریش ہو کر آ جاؤ۔ میں نے مسالے دار بھنڈی اور چکن بنایا ہے۔"

"واؤ۔۔۔" دونوں زارا کی فیورٹ ڈشیں تھیں۔

"پھپھو۔۔۔!" زین نے اچانک ان کا ہاتھ پکڑا۔ "مت کریں اتنی محبت مجھ سے۔"

"اب تو ساری محبتیں صرف تمہارے لیے ہیں۔" انہوں نے محبت و شفقت سے اس کا گال تھپتھپایا۔

"یہ چیٹنگ ہے مما! میرے حصے کی محبتیں؟۔۔۔" وہ جو فریش ہونے باتھ روم کی طرف جا رہی تھی۔ رک کر خفگی سے بولی۔

"زارا ڈیئر! تمہیں ہم جلد ہی رخصت کر دیں گے تاکہ یہ جھگڑا ہی ختم ہو۔" مما نے ٹماٹر کاٹتے ہوئے بے حد اطمینان سے کہا۔

"دیٹس گڈ آئیڈیا۔۔۔" زین نے فوراً" تائید میں سر ہلایا۔

"دیٹس ناٹ فیئر۔" وہ خفا ہو کر باتھ روم میں گھس گئی۔ کھانا انہوں نے ٹیرس پر کھایا۔

اور یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔ مما پہلے ہی یہاں آجاتیں۔ وہ دونوں یونیورسٹی سے آتے۔ کھانا کھاتے۔ کچھ دیر گپ شپ چلتی۔ پھر زارا دانستہ زین سے آئسکریم کی فرمائش کردیتی۔ مما گھر چلی جاتیں اور وہ زین کے ساتھ شہر کی سڑکیں ناپتی۔ مقصد صرف اور صرف زین کو اس بات کا احساس دلانا تھا کہ زندگی اب بھی جیے جانے کے لائق ہے اور وہ بھی ان کی بے تحاشا محبت اور توجہ کے نتیجے میں اب نہ صرف سنبھلنے لگا تھا بلکہ زندگی کی رعنائیوں میں حصہ بھی لینے لگا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ اپنی تمام تر احتیاط کے باوجود سلیمان بھائی نے اسے کتنی بار زین کے ساتھ دیکھا تھا اور پاپا مما کے بدلے ہوئے معمولات پر کس قدر حیران تھے۔

♥ ♥

"آج کل کہاں ہوتی ہو آئمہ۔۔۔؟" پاپا کے ایک سرسری سے سوال نے جہاں مما کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہیں زارا بھی پریشان ہوگئی۔

"کہاں ہوں گی۔ یہیں تو ہوتی ہوں۔۔۔" مما نے سنبھل کر قدرے لاپروائی سے جواب دیا۔

"جب بھی فون کرو۔ تم گھر پر ہی نہیں ہوتیں۔" پاپا کا لہجہ اب بھی سرسری ہی تھا۔ وہ بڑی رغبت سے بریانی کھارہے تھے۔

"آپ ہی تو کہتے ہیں کہ گھر میں رہنے کے بجائے لوگوں سے ملا جلا کروں۔" وہ قصداً مسکرائیں۔

"ہوں۔۔۔" انہوں نے پانی کا گلاس منہ کو لگایا۔ "اور تمہاری اسٹڈی کیسی جارہی ہے؟" وہ ایک دم زارا کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اچھی جارہی ہے۔" زارا نے ٹھٹھک کر جواب دیا۔

"کافی لیٹ آرہی ہو گھر۔ ایکسٹرا کلاسز ہو رہی ہیں۔۔؟"

ان کے اگلے سوال نے زارا کو بوکھلا دیا۔

"جی۔۔۔"

"اچھی بات ہے۔" پاپا نے سرہلایا۔ زارا نے مما اور مما نے چونک کر زارا کو دیکھا تھا۔ پاپا اتنے مصروف تھے کہ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ انہیں ان کے معمولات کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ مما بہت ڈسٹرب سی ہوگئیں۔

"ہم کچھ بھی غلط نہیں کررہے۔"

زارا نے خود کو مطمئن کیا اور کھانا کھانے لگی۔ پاپا بھی خاموشی سے کھانے میں مصروف ہوگئے تھے۔ زارا کا دل چاہا وہ پاپا کو زین کے بارے میں بتادے مگر مما کو دیکھ کر خاموش رہی۔ انہوں نے اس کے بعد ایک لقمہ بھی نہ لیا تھا۔

"تمہارے پاپا کو کیا ہوا؟۔۔۔" جیسے ہی پاپا اٹھے۔ مما اپنی پریشانی چھپا نہ سکیں۔

"آئی ڈونٹ نو۔" زارا نے کندھے اچکائے۔ "مجھے نہیں یاد۔ پاپا نے اس سے پہلے کبھی لیٹ آنے کے بارے میں یوں پوچھا ہو۔"

"کہیں انہیں کچھ معلوم تو نہیں ہوگیا۔" مما بہت فکرمند تھیں۔ "کہ ہم روز زین سے ملتے ہیں۔"

"مما!۔۔۔" زارا نے چیچ رکھ کر انہیں دیکھا۔ "ہم دن میں کتنے ہی لوگوں سے ملتے ہیں۔ اب کیا پاپا ہر ایک کے بارے میں انکوائری کروائیں گے۔ انہوں نے یونہی پوچھ لیا ہوگا۔ ہماری روٹین بھی تو ایک دم چینج ہوگئی ہے۔" اس نے مما کو تسلی دینی چاہی مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی۔

"ہم کچھ دنوں کے لیے وہاں نہیں جائیں گے۔" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں زین کو فون کردوں گی۔"

"صبح یونیورسٹی میں ملے گا نا تو میں بتادوں گی۔ مگر مما یوں کب تک چلے گا۔ وہ میرے اور آپ کے لیے کتنا ضروری ہوتا جارہا ہے۔ ہم کب تک چھپا پائیں گے۔" وہ الجھ کر بولی۔

"میں نے سوچ لیا ہے۔ وہ ماسٹرز کرلے تو اسے باہر بھجوادوں گی۔"

"مما۔۔۔!" زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"آپ اسے خود سے دور کردیں گی۔"

"اتنے برس اسی کے سہارے کاٹ دیئے کہ میرا بھائی جہاں بھی ہے زندہ سلامت ہے تو کیا زین کے لیے دل پر پتھر نہ رکھ سکوں گی۔"

زارا بس انہیں دیکھ کر رہ گئی اور اگلے دن جب زین نے اس کے پاس آکر پوچھا۔

"چلیں۔۔۔"

تو اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

"آج پھپھو نہیں آئیں گی۔۔۔؟"

"نہیں زین! مما اب کچھ دنوں تک نہیں آسکیں گی۔"

"کیوں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ان کی۔۔۔" وہ بے چین ہوگیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔ انہیں لگتا ہے کہ اگر وہ یونہی آتی رہیں تو پاپا کو شک ہوجائے گا اور پھر۔۔۔"

"زارا! مجھے اب کسی سے ڈر نہیں لگتا۔" زین نے سر اٹھا کر کہا اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"مما کو تو لگتا ہے نا۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید مجھے بھی۔ ورنہ اب تک کسی نہ کسی کو تمہارے بارے میں ضرور بتا چکی ہوتی۔" وہ آہستگی سے بولی۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔

"آپ لوگوں کی محبتیں مجھے کمزور کردیتی ہیں۔"

"کچھ دنوں کی تو بات ہے۔ ہم تو روز یونیورسٹی میں ملیں گے اور مما بھی خود کو روک نہیں پائیں گی۔" زارا نے تسلی دی تھی۔ اس نے اثبات میں سرہلادیا۔ مما روز اسے فون کرلیتی تھیں مگر وہ خود کو روک نہ سکا۔ تیسرے دن وہ ان کے گھر تھا۔ مما نے سنا تو حواس باختہ سی بھاگتی ہوئی آئیں۔

"تم یہاں۔ او مائی گاڈ۔۔۔"

"سوری پھپھو! لیکن رہا نہیں گیا۔۔۔" وہ اطمینان سے بولا۔ مما اسے کھینچتی ہوئی اپنے بیڈروم میں لے گئیں۔

"پاگل تو نہیں ہوگئے زین! جانتے ہو اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی۔ اوف۔۔۔ سارے ملازمین نے دیکھ لیا۔۔۔" وہ گویا ہاتھ پاؤں ہی چھوڑ بیٹھی تھیں۔ جیسے ابھی کہیں سے کوئی گولی نکل آئے گی۔

"پھپھو!۔۔۔" زین نے خاصی دلچسپی سے ان کا گھبرانا دیکھا۔ "کیا میرے ماتھے پر لکھا ہے کہ میں رائے جمشید حیات کا بیٹا۔۔۔"

مما نے بے اختیار اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ زین نے ان کا ہاتھ ہٹایا۔ پھر رازداری سے پوچھنے لگا۔

"کیا دیواروں کے بھی کان ہیں۔"

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔" وہ گھبرا کر باہر نکلیں۔ وہ سہولت سے بیڈ پر نیم دراز کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

"اُفوہ مما! کیا ہوگیا آخر۔۔۔ ارے زین تم۔۔۔" زین پر نظر پڑی۔ "ارے۔۔۔ تم۔۔۔" مما کی نسبت اس کے رسپانس میں حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی کا عنصر بھی تھا۔

"جی۔۔۔ میں۔۔۔" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"اب۔۔۔ اب کیا ہوگا زارا؟۔۔۔" مما نے پسینہ صاف کیا۔

"اُفوہ مما! یہاں بیٹھیں۔" اس نے مما کو تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔ "ریلیکس۔۔۔ کیا ہم سے ملنے کوئی مہمان نہیں آتا۔ یوں تو کسی کو معلوم ہو یا نہ ہو مگر آپ کی حالت ضرور بتادے گی۔"

"زین بیٹا! تم جاؤ اب۔ میں خود ملنے آؤں گی تم سے۔" انہوں نے زین کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔

"مما! وہ پہلی بار ہمارے گھر آیا ہے۔ ایسے کیسے جاسکتا ہے۔ اینڈ ڈونٹ وری مما کچھ نہیں ہوگا۔ زین! آؤ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔"

وہ مما کو تسلی دیتی۔ زین کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"رضیہ۔۔۔ رضیہ! بہت اچھی سی چائے لاؤ اور فریزر میں جو کچھ ہے سب لے آؤ۔۔۔" اس نے ملازمہ کو آواز دے کر کہا۔

"یہ ہوئی نا بات۔۔۔" زین نے خوش ہوکر کہا اور جب تک وہ چائے پیتا رہا۔ مما ہولتی رہی تھیں اور

جب اس نے گھر سے قدم نکالا۔ وہ شکرانے کے نفل پڑھنے چلی گئی تھیں۔

♥ ♥

زین نے دروازہ کھولا۔ پھر بے اختیار مسکرا دیا۔ مما سخت غصے میں کھڑی تھیں۔

"معزز خاتون! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

مما نے اسے پیچھے کیا اور اندر داخل ہو گئیں۔

"اب آئی میری شامت۔" زین نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ پھر دروازہ بند کر کے آیا۔ وہ کمرے کے بیچوں بیچ انتہائی غصے میں کھڑی اسے گھور رہی تھیں۔

"سچ بتاؤں پھپھو! آپ اتنے غصے میں بھی بہت گریس فل اور پیاری لگتی ہیں۔" وہ مسکرایا۔ دوسرے معنوں میں ان کے غصے کا لیول تھوڑا کم کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ وہ کچھ مزید تپ کر بولی تھیں۔

"یہ کل کیا حرکت کی تھی تم نے؟"

"میں نے۔۔۔!" زین نے حیرت سے سینے پر انگلی رکھی۔ پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔ "میں نے تو کوئی حرکت نہیں کی۔ بس آپ سے ملنے آیا تھا۔"

"میرے منع کرنے کے باوجود۔۔۔"

"کیا کرتا آپ کو دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔" وہ سر جھکا کر معصومیت سے بولا۔ انداز ایسا تھا گویا اپنی غلطی تسلیم کر رہا ہو۔ وہ ڈھیلی پڑ گئیں۔

"میری محبتوں کو مذاق سمجھتے ہو تم۔"

"باخدا! ہرگز نہیں۔۔۔"

"تمھیں نہیں پتا زین! تم میرے لیے کیا ہو۔ جمشید کا دوسرا جنم۔ تمھیں اگر خراش بھی آئی تو میں مر جاؤں گی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اٹھیں۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھا اور بچوں کی طرح ان سے لپٹ گیا۔

"آئی ایم ساری پھپھو! رئیلی ویری ساری۔ لیکن ان چند دنوں میں آپ کا اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ دو دن نہیں دیکھا تو مجھے لگا میری دنیا ختم ہو گئی ہے۔"

"تم اور زارا میرے احساسات نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ تم دونوں سلیمان کو نہیں جانتے۔ میرے سامنے پلا بڑھا ہے وہ۔ میں جانتی ہوں۔ وہ جتنا مہذب نظر آتا ہے۔ اس سے زیادہ وحشی ہے۔ کبھی زمینوں پر جا کر دیکھو۔ اپنے مزارعین کو بے جان جانور کی طرح استعمال کرتا ہے اور صلہ کچھ بھی نہیں۔"

"آپ کی محبت اپنی جگہ۔ مگر پھپھو! یوں کب تک چلے گا۔ میں اب آپ سے دور نہیں ہو سکتا۔"

"زین۔۔۔! تم ملک سے باہر چلے جاؤ۔" مما نے اچانک کہا۔ زین ہنس دیا۔

"گویا بابا کی طرح میں بھی ساری زندگی روپوشی میں گزار دوں۔"

"تم میرے بھائی کی آخری نشانی ہو۔"

"پھپھو! ۔۔۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "جب تک بابا زندہ تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں کیا ہوں' کیا چاہتا ہوں۔ کیا سوچتا ہوں۔ میں ساری زندگی ایک ننھے بچے کی طرح بابا کی انگلی پکڑ کر چلا ہوں۔ میں نے وہی کیا۔ جو انہوں نے چاہا لیکن اب۔۔۔ اس مرحلے پر آکر مجھ پر میری سوچیں واضح ہوئی ہیں۔"

"کیا چاہتے ہو تم؟۔۔۔" مما نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

"جینا چاہتا ہوں۔ سر اٹھا کر۔ اپنی مکمل شناخت کے ساتھ اور اس الزام کے بغیر کہ میں کسی قاتل کا بیٹا ہوں۔" وہ ٹھوس لہجے میں گویا ہوا۔

"زین۔۔۔!" مما خوفزدہ ہو گئیں۔

"میرے لیے زندگی آزادی ہے' شناخت ہے۔ عزتِ نفس ہے۔ میں ایک بار اس ڈری سہمی زندگی سے باہر نکل کر کھل کر سانس لینا چاہتا ہوں۔ خواہ اس کے بعد ایک سانس بھی نہ ملے۔"

"زندگی بہت اہم ہے زین۔"

"زندگی کی حقیقت موت ہے اور مجھے اس سے پہلے ڈر لگتا تھا اب نہیں۔"

زین کی شخصیت دو رخی ہو گئی تھی۔ کبھی وہ ننھے معصوم بچے کی طرح زندگی کے میلے میں کسی نہ کسی انگلی کا متلاشی نظر آتا۔ جسے تھام کر وہ سارا سفر تمام کر دے۔ تو کبھی اس کے اندر ایک جرات مند بے خوف ۔۔۔

اور نڈر مرد جاگ اٹھتا۔ شاید "بابا اور وقت" نے اس کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کیا تھا۔ بابا نے اسے انگلی پکڑنا سکھایا تھا اور وقت کہتا تھا زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیو۔ زین نے مما کو دیکھا اور مسکرایا۔

"آپ پریشان ہو گئی ہیں پھپھو۔۔۔؟"

"تم کیا کرنے والے ہو زین۔۔۔؟" مما نے ڈری سہمی آواز میں پوچھا۔

"رائے سلیمان کے سامنے جا کر کہوں گا۔ میں رائے جمشید کا وارث ہوں۔"

مما کا دل اندر کہیں ڈوب گیا۔ زین ان کی کیفیت دیکھ کر ہنس دیا۔ پھر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

"ایسا کچھ نہیں کرنے والا میں۔۔۔"

مگر اس کی آنکھوں میں ابھرتی چمک بتا رہی تھی۔ وہ جو کچھ کرنے والا ہے اس سے کم بھی نہیں۔

♥ ♥

"بی بی! کھانا لاؤں آپ کے لیے۔۔۔"

ملازمہ نے آکر پوچھا۔ وہ ابھی ابھی یونیورسٹی سے لوٹی تھی۔

"مما گھر پہ ہیں؟۔۔۔" زارا نے بالوں سے بینڈ کھینچا۔

"ہاں جی۔۔۔"

"کھانا کھا لیا انہوں نے؟۔۔۔" اس نے سینڈل اتارتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں باجی! صبح صبح آپ کے جانے کے بعد کہیں گئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئیں تو بہت پریشان تھیں۔ تب سے کمرے میں بند ہیں۔ کھانا تو ایک طرف انہوں نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔" ملازمہ نے بتایا۔ تو وہ چونک گئی۔ اتنی صبح وہ کہاں جا سکتی ہیں۔ زارا جانتی تھی مگر وہ پریشان کیوں ہیں؟

"تم کھانا لگاؤ۔ میں دیکھتی ہوں۔" وہ جوتا پہن کر مما کے کمرے کی طرف آئی۔ دروازہ بند تھا۔

"مما!۔۔۔" اس نے ناک کرکے ساتھ ہی پکارا۔

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"کیا ہوا مما۔۔۔؟" وہ اندر داخل ہوئی۔ مما پلٹ کر تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"زین آیا تھا آج؟۔۔۔"

"ہاں۔۔۔" زارا ان کے قریب گئی۔ "آپ صبح اس کی طرف گئی تھیں۔ خیریت تھی یا کل کا غصہ نکالنے گئی تھیں۔" وہ مسکرائی۔

"زین نے کوئی بات نہیں کی تم سے۔۔۔" انہوں نے بیڈ کی بیک سے سر ٹکایا۔

"آپ کے آنے کے متعلق تو کوئی بات نہیں کی۔"

"کچھ اور نہیں کہا؟۔۔۔" وہ نجانے کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ زارا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"اور کیا کہتا۔ بس روٹین کی باتیں ہوتی رہیں۔"

"وہ کچھ کر بیٹھے گا زارا۔۔۔!" مما نے ایک دم سیدھا ہو کر اس کے ہاتھ تھام کر بے حد پریشانی سے کہا۔

"کیا؟۔۔۔" زارا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"وہ کہتا ہے میں سلیمان کے سامنے جا کر اسے بتاؤں گا کہ میں رائے جمشید کا بیٹا ہوں۔"

"مما!۔۔۔" زارا ہنس دی۔ "مذاق کیا ہو گا اس نے۔ وہ پاگل تو نہیں ہے کہ خود بھیڑیے کی کچھار میں گھس جائے۔"

"وہ ایسا کر سکتا ہے زارا۔۔۔"

"اس میں اتنی جرات ہی نہیں ہے مما! وہ تو کسی کے مشورے کے بغیر قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔" زارا کو زین سے اس جرات کی امید ہی نہیں تھی۔

"میں نے آج اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے۔ بالکل وہی چمک' جو اپنے باپ کے قاتل کا تذکرہ کرتے ہوئے سلیمان کی آنکھوں میں ابھری ہے۔" مما نے جھرجھری لی اور وہ مما کے خوفزدہ لہجے سے خائف سی ہوئی تھی۔ تب ہی کچھ لمحے بول ہی نہ سکی۔ پھر گہری سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"کیا واقعی زین ایسا کر سکتا ہے۔"

"اگر اس نے ایسا کیا تو۔۔۔۔!" مما کی آواز ایک ڈری سہمی سرگوشی میں بدل گئی۔ "تو وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

"مما! پلیز! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے گویا خود کو تسلی دی۔

"ایسا ہی ہوگا زارا۔۔۔! ایسا ہی ہوگا۔ مجھے آثار نظر آرہے ہیں۔ زین کے اندر ہی اندر ایک لاوا پک رہا ہے اور یہ لاوا کسی دن بہہ نکلے گا اور کون اس کی لپیٹ میں آئے گا۔۔۔" وہ جیسے سوچ کر ہی کانپ گئیں۔

"مما! پلیز ایسی باتیں مت کریں۔" زارا ڈر سی گئی۔ "زین ایک سمجھ دار لڑکا ہے۔ وہ کبھی بھی ایسا قدم نہیں اٹھائے گا۔"

"ایسا قدم جنون میں اٹھایا جاتا ہے اور جنون میں انسان وہ کچھ کر لیتا ہے جس کی اجازت عام طور پر انسان کی سمجھ نہیں دیتی۔"

"مما! وہ آپ کی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں اور آپ اسے سمجھالیں گی۔"

"ہاں زارا! اسے سمجھاؤ۔ وہ امریکہ چلا جائے۔ وہیں سیٹل ہوجائے۔ یہاں رہا تو کچھ نہ کچھ ہوجائے گا۔" وہ بے تابی سے بولیں۔

"میں صبح ہی اس سے بات کروں گی۔" زارا نے تسلی دی۔

"بات نہیں کرنی اسے فورس کرنا ہے۔"

"ہم اسے منالیں گے۔ لیکن اس طرح۔۔۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"دل نہیں چاہتا زارا! تم کھالو۔۔۔" وہ بے زاری سے بولیں۔

"آپ کے بغیر نہیں کھاؤں گی۔" زارا نے قطعی لہجے میں کہا۔ تو مما مجبوراً صرف اسی کی خاطر ٹیبل تک آئیں۔ لیکن برائے نام ہی کھا سکیں۔

"اب آپ فریش ہو کر بہت اچھی سی ڈریسنگ کریں۔ ورنہ پاپا یقیناً پوچھیں گے۔ آپ کی کوئی فرینڈ آئی تو پہچاننے سے انکار کردیں گی۔" اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو انہوں نے اثبات میں سرہلا دیا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ زین نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کردیا تھا۔ پیار تو مما پہلے بھی اس سے بہت کرتی تھیں۔ مگر یوں اس کے سامنے اپنے دل کی بات نہیں کرتی تھیں۔ زارا کو اچھا لگتا۔ مما اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ تو وہ فون لے کر صوفے پر آبیٹھی۔ وہ زین سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مگر کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد بھی اس نے فون ریسیور نہیں کیا۔

"کمال ہے ابھی تک پہنچا نہیں۔" فون بند کرتے ہوئے زارا نے سوچا۔ لاشعوری طور پر وہ پریشان ہوگئی تھی۔ شاید مما کی باتوں کا اثر تھا۔

"اب تک تو اس کو گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔" اس نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد وہ پھر کال کررہی تھی۔ دوسری بیل پر ہی ریسیور اٹھالیا گیا۔

"زین! کہاں تھے؟۔۔۔" اس کی آواز سنتے ہی وہ پوچھنے لگی۔

"ابھی تک تو زندہ سلامت اسی کرۂ ارض پر موجود ہوں۔" اس کی چہکتی ہوئی فریش آواز آئی۔

"میں کب سے ٹرائی کررہی تھی۔"

"میں نہا رہا تھا اور ابھی مجھے کھانا بھی کھانا ہے۔"

"تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ فوراً نکالو کھانا۔۔۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"مجبوری ہے فون کا تار کچن تک نہیں جاتا۔"

"میں بند کررہی ہوں۔۔۔"

"لیکن آپ نے فون کیا کیوں؟۔۔۔"

"یونہی بس۔ تمہاری آواز سننا تھی۔" وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر اب ارادہ بدل گئی۔

"میری آواز اتنی خوبصورت ہے۔ آج سے قبل کسی نے نہیں بتایا۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"اتنی بھی نہیں ہے۔ اب تم کھانا کھالو۔"

"اکیلے کھانے کو دل نہیں چاہتا۔۔۔" اس نے مجبوری بتائی۔

"میں کھانا کھا چکی ہوں۔" وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

"اوہ۔ تب تو مجبوری ہے۔۔۔" اس نے سرد آہ بھری تو زارا نے بائے کہہ کر فون بند کردیا۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ جائے اور پہلا نوالہ اسے اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلائے۔ مگر وہ ضبط کرگئی۔

♥ ♥

"میں جب تک آپ سے ملا نہیں تھا۔ مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ یہ رشتے اتنے اہم ہوتے ہیں۔ بابا بہت ذکر کرتے تھے "پھپھو" کا "آپ" کا۔ لیکن میرا کبھی دل نہیں چاہا۔ میں آپ لوگوں سے ملوں۔ میں نے سوچا تھا کبھی سرِ راہ یونہی چلتے چلتے وقت آپ لوگوں کو میرے سامنے لے بھی آیا تو میں اجنبی بن جاؤں گا۔"

زارا نے آتی جاتی لہروں سے نظریں ہٹا کر زین کو دیکھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے آپ لوگوں پر غصہ آتا تھا۔ جنہوں نے بابا کو اتنا تنہا کردیا۔ میرے لیے تو ہر رشتہ بابا کی ذات میں نہاں تھا۔ وہی سب کچھ تھے۔ باقی ہر رشتہ بے معنی۔۔۔ لیکن اب۔۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر نجانے کیا سوچنے لگا۔

"اب؟۔۔۔" زارا کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

"اب تو سارا منظر ہی بدل گیا ہے۔ بابا نہیں رہے۔ یہ گھر جو میرے لیے کسی جنت سے کم نہ تھا۔ اب کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ مجھے وحشت ہوتی ہے یہاں آنے سے اور آپ۔۔۔" اس نے ذرا کی ذرا نظروں کا زاویہ بدل کر زارا کو دیکھا۔ جو اڑتے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"اب مجھے افسوس ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلے کیوں نہ ملے۔"

"مل تو گئے۔۔۔" زارا مسکرائی۔ "ورنہ زندگی بھر انجان رہتے۔"

"فائدہ۔ اس خوف میں لپٹے ہوئے رشتے اور تعلق کو کب تک نباہ سکیں گے۔"

"زین!۔" زارا نے سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا یہ کافی نہیں کہ ہم لوگ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ اپنی پرابلمز شیئر کرسکتے ہیں، دکھ بانٹ سکتے ہیں۔"

"چوری چھپے۔۔۔ ڈر ڈر کے۔" زین کے لہجے میں تلخی در آئی۔ "میں کسی کو یہ نہیں بتا سکتا کہ آپ کون ہیں۔ کیوں ملنے آئی ہیں مجھ سے۔ میں پھپھو سے ان کے گھر ملنے نہیں جا سکتا۔ وہ مجھ سے ملنے آتی ہیں تو چوری چھپے۔۔۔ جیسے کوئی گناہ کوئی جرم کیا جارہا ہو۔"

"زین! سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم اچھے وقت کا انتظار تو کرو۔" زارا نے رسانیت سے کہا تو ایک استہزائیہ مسکراہٹ زین کے لبوں پر بکھر گئی۔

"اچھے وقت کا انتظار تو بابا نے بھی کیا تھا۔ کیا صلہ ملا۔ نہیں۔۔۔ میرا گزارا اب کم میں نہیں ہوتا۔ یہ پیاس تو اب جاگ اٹھی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں کھلے عام اپنی پھپھو کے گھر آؤں۔ ان سے لاڈ اٹھواؤں۔ ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتاؤں کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ یہ مسز آئمہ عمیر میری پھپھو ہیں۔ یہ زارا عمیر۔۔۔"

"زین پلیز۔۔۔" زارا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

"یہ سب کچھ ہم تمہارے لیے ہی تو کررہے ہیں۔" وہ بے چارگی سے بولی۔ "ایسی ہی کوئی آگ ہمارے اندر بھی تو جل رہی ہے۔ کیا مما کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بھائی کی اولاد کو یوں تنہائیوں کے سپرد کریں مگر ہم کیا کریں، ہم ڈرے ہوئے خوفزدہ لوگ ہیں۔"

"کس بات کا خوف ہے آپ کو۔ میری زندگی چھن جانے کا۔ ارے ایک بار تو سر اٹھا کر جینے دیں۔ یہ زندگی تو ہر صورت کبھی نہ کبھی ختم ہونی ہی ہے۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔ زارا نے بے حد خفگی سے اسے دیکھا۔

"تمہیں ہمارے احساسات کی ذرا بھی پروا نہیں۔ تمہاری ان ہی باتوں نے مما کو ڈسٹرب کردیا ہے۔" وہ سر جھٹک کر اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

"تم تھوڑا انتظار تو کرو زین! کوئی نہ کوئی رستہ نکل ہی آئے گا۔" روشنی کی کوئی کرن اس کے پاس نہیں

تھی مگر وہ پھر بھی پُرامید تھی۔
"رستہ تو اب میں نکالوں گا۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔
"کیا کہہ رہے ہو؟۔۔۔۔"
"مجھے بابا کو بے گناہ ثابت کرنا ہے۔" وہ مصمم ارادے سے بولا۔
"کیا کرو گے تم۔۔۔۔!" زارا نے قدرے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
"ثبوت۔۔۔ ثبوت اکٹھے کروں گا۔"
"زین! اتنے برسوں کے بعد۔۔۔۔"
"ہاں اتنے برسوں کے بعد۔ سچ کبھی نہیں چھپتا اسے کبھی نہ کبھی عیاں ہونا ہی ہوتا ہے اور میں اسے منظرِ عام پر لا کر ہی رہوں گا۔" زین کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھری۔
(میں نے آج اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے بالکل وہی چمک 'جو اپنے باپ کے قاتل کا تذکرہ کرتے ہوئے سلیمان کی آنکھوں میں ابھرتی ہے)
زارا بالکل ان ہی کی طرح خوفزدہ ہوئی۔
"تم کیا سوچ رہے ہو۔۔۔۔؟"
زین نے اچھ کر اسے دیکھا۔ پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔
"پتا نہیں۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ چار سو اندھیرا ہے۔ بہت گہرا اندھیرا۔"
"زین پلیز! تم ہمیں بتائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔"
زین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"ایک وعدہ آپ کو بھی کرنا ہو گا؟۔۔۔" زین نے کہا تو وہ چونک گئی۔
"کیسا وعدہ؟۔۔۔"
"آپ مجھے روکیں گی نہیں۔"
زارا نے کچھ لمحے سوچا۔ پھر نفی میں سر ہلا دیا۔
"میں ایسا وعدہ نہیں کر سکتی۔"
زین کی نگاہوں میں خفگی سی اتر آئی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔
"آیئے۔ آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔" اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ زارا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"تمہیں لگتا ہے کہ ہم یہ سب اپنے لیے کر رہے ہیں۔"
وہ سر جھٹک کر اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو گھورنے لگا تھا۔ زارا نے کچھ لمحے اس کے جواب کا انتظار کیا۔ پھر خاموشی سے بیگ اٹھا کر نیچے اتر گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥
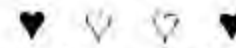
"زارا! رضوان کا فون آیا تھا۔" اس نے ابھی جرنل کھولا ہی تھا۔ جب مما نے آکر بتایا۔ چھٹی کا دن تھا وہ ابھی اسٹڈی کے ارادے سے بیٹھی تھی۔
"اس کا تو اکثر ہی فون آتا ہے۔ آج کیا کہہ رہا تھا۔" اس نے سامنے کھلی کتاب سے کچھ پوائنٹس نوٹ کرنا شروع کیے۔
"وہ تمہیں لنچ پر لے جانا چاہتا ہے۔"
"آج تو میں بالکل فارغ نہیں۔۔۔۔" اس نے بے نیازی دکھائی۔
"فارغ تو وہ بھی نہیں۔ بس اس کی محبت ہے جو تمہارے لیے وقت نکال رہا ہے۔" مما مسکرائیں۔
"پھر تو مجبوری ہے جانا پڑے گا۔"
"نہیں ایسی کوئی مجبوری بھی نہیں۔ منع کر دیتی ہوں کہ زارا عمیر کے پاس آج کی تاریخ میں وقت ہی نہیں۔" مما اس کا لہجہ پا گئی تھیں۔
"مما!" زارا ہنس دی۔
"اچھا سنو! تم کل زین کی طرف گئی تھیں۔" انہوں نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔
"ہاں گئی تو تھی۔۔۔۔"
"بات کی اس سے؟۔۔۔۔"
"کون سی بات؟۔۔۔" وہ غائب دماغی سے پوچھنے لگی کہ ذہن اس کی کل کی باتوں میں الجھ گیا تھا۔
"امریکہ سیٹل ہونے والی۔۔۔۔"
"نو مما! میں اس سے بات نہیں کر سکی۔ مجھے لگا وہ اس معاملے میں کچھ نہیں سنے گا۔"
"میں جانتی ہوں۔ میں نے اس دن ذرا سی بات کی تھی۔ اس نے یوں اگنور کیا جیسے میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔" وہ مایوسی سے گویا ہوئیں۔
"مما! ہم اسے روک نہیں سکیں گے۔" زارا نے آہستگی سے کہا تو وہ خاموش سی ہو گئیں۔
"مجھے اسے روکنا ہے ہر صورت میں۔۔۔۔"
"سچ پوچھیں تو میری ہمت نہیں ہوئی اس سے یہ کہنے کی۔ وہ بگڑ جاتا۔"
"ہاں۔۔۔" مما نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ "تم اٹھو تیار ہو جاؤ۔ رضوان آتا ہی ہو گا۔"
"اوکے۔" ماما نے بات بدلی تو وہ بھی خاموشی سے اٹھ گئی۔ ابھی تیار ہو رہی تھی جب رضوان کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ لپ اسٹک کو آخری ٹچ دے کر ڈرائنگ روم میں آگئی۔
"ہیلو۔۔۔۔"
"ہیلو۔۔۔" رضوان نے ایک بھرپور نگاہ اس کے سراپے میں ڈالی۔ رائل بلیو کلر کے ڈریس کے ساتھ سلور نازک سی جیولری میں وہ ہمیشہ سے زیادہ منفرد اور خوبصورت لگ رہی تھی۔
"چلیں۔۔۔" زارا نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو وہ مما کو خدا حافظ کہہ کر اسے ساتھ لیے باہر نکلنے لگا کہ فون کی بیل گونج اٹھی۔
"ہیلو۔۔۔۔" وہ ایک دم کسی کا نام لیتے لیتے خاموش ہوئی تھیں۔ زارا ٹھٹک کر مما کو دیکھنے لگی۔
دوسری طرف زین تھا۔
"کیسی ہیں پھپھو آپ؟۔۔۔"
"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" انہوں نے چور نظروں سے رضوان کو دیکھا۔ پھر اس کی طرف سے بالکل لاشعوری طور پر رخ بدل لیا۔
"زارا کہاں ہے؟"
"زارا۔۔۔" وہ تذبذب کا شکار ہو گئیں۔ زارا نے آگے بڑھ کر ریسیور تھام لیا۔
"ہیلو!۔۔۔"
"تھینک گاڈ۔ میں تو سمجھا۔ آپ مجھ سے بات بھی نہیں کریں گی۔"
"کیوں؟۔۔۔" وہ بہت سہولت سے بات کر رہی تھی۔
"مجھے لگا کل آپ خفا ہو کر گئی ہیں۔"
"کیا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ تمہاری باتیں تو ایسی ہی تھیں۔۔۔"
"اچھا چھوڑیں نا۔ صلح کر لیں۔"
"سوچوں گی۔"
"ابھی آپ پھپھو کو لے کر آ سکتی ہیں۔"
"ابھی۔۔۔ کیوں؟۔۔۔"
"بس آ جائیں نا۔ ایک چھوٹا سا سرپرائز ہے۔" اس کا لہجہ مسکراتا ہوا تھا۔
"ابھی کیوں نہیں بتا دیتے۔"
"آئیں گی تو بتاؤں گا۔"
"ابھی تو ممکن نہیں ہے۔ شام میں آؤں گی۔"
"ابھی کیوں نہیں۔۔۔" وہ بضد تھا۔
"اوکے۔ میں شام میں ضرور آجاؤں گی۔" رضوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے خدا حافظ کہہ گئی۔ پھر رضوان کی طرف پلٹی۔
"سوری۔ میری فرینڈ کا فون تھا۔ چلیں۔۔۔"
چائنز ریسٹوران میں ان کی ٹیبل پہلے ہی ریزرو تھی۔ ویٹر نے ٹیبل تک ان کی رہنمائی کی۔ ریزروڈ کا کارڈ اٹھا کر ان کے سامنے مینو کارڈ رکھ دیئے۔
"کیا لو گی؟۔۔۔"
"ایز یو لائک۔" وہ اس وقت زین کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کارڈ کھولے بغیر ہی بے توجہی سے بولی۔ رضوان نے ایک پل کو اس کی بے توجہی محسوس کی۔ پھر خود ہی آرڈر لکھوانے لگا۔
"کیا سرپرائز ہو گا۔" رضوان سامنے نہ ہوتا تو اصرار کر کے پوچھ ہی لیتی۔ پوچھنا کیا اب تک وہاں پہنچ بھی گئی ہوتی۔"
رضوان نے اس کے چہرے پر بکھرے سوچ کے رنگوں کو پڑھنے کی کوشش کی۔ نجانے وہ کس بات پر الجھ رہی تھی۔ اس نے انگلی سے ٹیبل بجایا۔ زارا

چونک کراس کی طرف متوجہ ہوئی۔
"اچھی لگ رہی ہو۔؟"
ایک مدھم سی مسکان زارا کے لبوں پر بکھری۔
"کیا سوچ رہی ہو؟۔۔۔"
"کچھ خاص نہیں۔۔۔"
"میں جانتا ہوں تم مجھے نہیں سوچ رہیں۔"
رضوان برجستہ بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
"آپ تو میرے سامنے ہیں۔۔۔"
"بعض اوقات سامنے رکھی چیز نظر نہیں آتی۔"
"آپ چیز نہیں۔" وہ بھرپور اعتماد سے بولی تو رضوان مسکرا دیا۔
"کبھی کبھی یونہی خوش گمان کر دیتی ہو مجھے۔"
"گمان کیوں۔ آپ کا اور میرا بہت واضح رشتہ ہے۔" گلدان میں سجے ادھ کھلے گلاب کی پتیوں کو چھوتے ہوئے زارا نے ذرا نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ مسرور سا ہو گیا۔
"تم عام لڑکیوں کی طرح اپنی فیلنگز چھپانے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔"
"کیونکہ میں عام لڑکی نہیں ہوں۔" وہ مبہم سا مسکرائی۔
"بس تمہارا یہی اعتماد تو پسند ہے مجھے۔۔۔"
ویٹر کھانا سرو کرنے لگا تو وہ خاموش ہو گئے۔
"ویسے آج آپ کو مجھے لنچ کروانے کا خیال کیسے آ گیا۔"
"اچھا نہیں لگا۔۔۔"
"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے نیپکن کھولا۔
"کھانے کے بعد شاپنگ کے لیے چلیں گے۔"
حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ رضوان ہنس دیا۔
"یقین جانو۔ ساری شاپنگ اپنے پیسوں سے کرواؤں گا۔"
زارا جھینپ گئی۔
"اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔"
"ضرورت تو تب سے ہے جب تم میرے نکاح میں آئی تھیں۔ میری ذمہ داری تھیں مگر میں اپنے پیسے کا انتظار کر رہا تھا۔"
"رضوان! آپ تو بات پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔" وہ بے چارگی سے بولی۔
"لیکن مجھے اچھا لگا تھا۔ میری لائف پارٹنر کو ایسا ہی خوددار ہونا چاہیے تھا۔"
"اور اگر میں ایسی نہ ہوتی تو۔۔۔"
"تو میں بنا دیتا۔۔۔" اس نے برجستہ کہا تو وہ ان کے جملے سے محظوظ ہوتی کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"سوچ تو کافی دنوں سے رہا تھا۔ مگر آتے ہی سلیمان بھائی نے مختلف کاموں میں الجھا دیا۔ تو وقت ہی نہ نکال سکا۔ بھائی کو انکار اس لیے نہیں کر سکتا تھا کہ انہوں نے ایک عرصہ تک یہ سب بالکل تنہا ہینڈل کیا ہے۔ اب وہ کہتے ہیں رضوان میرا بازو ہے۔"
"ہاں۔ تایا ابو ہوتے تو سلیمان بھائی کو اتنی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی بڑی ذمہ داریاں نہیں اٹھانی پڑتیں۔"
"ہاں یہ تو ہے۔"
"کبھی کبھی مجھے تایا ابو بہت یاد آتے ہیں۔"
"تب تو تم بہت چھوٹی تھیں۔"
"ہاں شاید ان کی باتیں سنتی ہوں اس لیے۔" وہ بہت سہولت سے رضوان کو اس موضوع کی طرف لے آئی تھی۔
"حالانکہ بابا مجھے کبھی یاد نہیں آئے۔ سلیمان بھائی نے مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ ہمارے والد نہیں ہیں۔ میرے لیے تو وہ بابا کا دوسرا روپ ہیں۔"
"رضوان! کیا سلیمان بھائی کسی کو قتل کروا سکتے ہیں؟" بہت اچانک سوال کیا تھا اس نے۔ رضوان نے چونک کر اسے دیکھا۔ رضوان کو اس لمحے وہ بہت الجھی ہوئی لگی۔
"کیا مطلب؟"
"آئی مین۔۔۔ اگر تایا ابو کے قاتلوں کو پتا چل جائے تو کیا وہ انہیں۔۔۔ اصولاً" تو انہیں پولیس کے حوالے کرنا چاہیے نا۔ تفتیش ہونی چاہیے۔۔۔"
"زارا! کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" رضوان کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ اس کے لہجے سے خائف سی ہو کر پلیٹ پر جھک گئی۔ باقی سارا وقت وہ خاموش ہی رہے تھے لیکن شاپنگ کے درمیان زارا خاموش تھی اور رضوان نے ساری شاپنگ اپنی پسند سے کروائی تھی۔
شام ڈھلے وہ شاپنگ بیگز لیے گھر میں داخل ہوئی تو مما ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ اس نے بددلی سے ساری چیزیں صوفے پر ڈھیر کر دیں۔
"یہ کیا ہے؟۔۔۔"
"پتا نہیں۔ رضوان نے خریدا ہے میرے لیے۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی شاپنگ پر لے گیا تھا۔" وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔
"ارے تو کھول کر دیکھو نا۔۔۔" مما نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"میں دیکھ چکی۔ آپ دیکھ لیں۔"
"کیا ہوا؟۔۔۔" خلافِ توقع اسے بشاش نہ پا کر انہوں نے سوال کیا۔
"کچھ نہیں مما۔ تھک گئی ہوں۔"
"تو یہاں کیوں کھڑی ہو۔ نہا کر تھوڑی دیر سو لو۔ بالکل فریش ہو جاؤ گی۔" مما نے پیار سے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ پھر پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر واپس پلٹی۔
"مما! آپ نے زین کو فون کیا تھا؟"
"تمہارے جانے کے بعد کئی بار ٹرائی کیا، لیکن سلیم بتاتا ہے وہ گھر پر نہیں ہے۔" مما نے بتایا تو کچھ سوچنے لگی۔ پھر سر جھٹک کر بولی۔
"دوبارہ ٹرائی کیجیے گا۔ وہ بے چارہ کوئی سرپرائز دینا چاہ رہا تھا۔ بلا رہا تھا مجھے اور آپ کو۔۔۔"
"ارے۔۔۔ تو تم مجھے تو بتا دیتیں۔" مما جھنجلا گئیں۔
"رضوان کے سامنے کس طرح بتاتی۔ پھر مجھے یقین تھا آپ بعد میں اسے فون ضرور کریں گی۔"
"کیا تو تھا مگر وہ اسی وقت کہیں نکل گیا۔ ذرا موبائل تو دینا۔" مما نے کہا تو زارا پلٹ کر صوفے تک آئی۔ شاپنگ کے ساتھ اس کا شولڈر بیگ بھی رکھا تھا۔ اس نے بیگ کھول کر موبائل نکالا۔ پھر خود ہی زین کا نمبر ڈائل کرتی ہوئی مما کے قریب آ بیٹھی۔ تین چار بیل کے بعد سلیم نے فون اٹھایا تھا۔
"سلیم! زین کہاں گیا ہے۔۔۔؟" زارا نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
"پتا نہیں باجی۔ وہ تو دوپہر ہی میں نکل گئے تھے۔ پھر لوٹے ہی نہیں۔"
"کچھ بھی بتا کر نہیں گیا۔"
"میں بازار سبزی لینے گیا تھا۔ واپس آیا تو گھر پر نہیں تھے۔ ویسے صاحب کی موت کے بعد وہ اکثر اسی طرح پورا پورا دن گھر سے غائب رہتے ہیں اور پھر خود ہی واپس بھی آ جاتے۔" سلیم کا لہجہ کہتا تھا فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ اس قسم کے معمول کا عادی ہے۔
"ٹھیک ہے سلیم! زین آئے تو اس سے کہنا گھر فون کر لے۔"
"بالکل کہہ دوں گا باجی۔۔۔ باجی۔۔۔!" اس نے بات کرتے کرتے پھر پکارا۔
"کہو۔۔۔"
"مجھے لگتا ہے آج بھائی جان بہت اداس ہیں۔۔۔"
"کیوں؟۔۔۔"
"آج ان کی سالگرہ تھی نا۔ جب صاحب ہوتے تھے تو ضرور مناتے تھے۔ آج انہیں صاحب بہت یاد آئے ہوں گے۔ یہ پہلی سالگرہ ہے جو ان کے بغیر گزری۔"
"اوہ نو۔۔۔" تو یہ تھا وہ سرپرائز۔ وہ اپنے سونے اور خالی گھر کی وحشت دور کرنے کو انہیں بلا رہا تھا اور وہ آج بھی نادانستگی میں اسے دکھ دے گئی تھی۔
"کیا ہوا؟۔۔۔" مما نے دہل کر پوچھا۔
زارا نے مرے مرے انداز میں موبائل آف کر کے صوفے پر رکھا۔
"کیا ہوا۔ زین ٹھیک تو ہے۔۔۔؟"
"آج اس کا برتھ ڈے تھا۔ ماموں کے بعد پہلی سالگرہ اور اس نے صرف ہمیں انوائٹ کیا تھا۔ وہ ہمیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔" وہ بے حد تاسف سے بولی۔ مما کا دل دکھ سے بھر گیا۔

"کتنا یاد کیا ہوگا اس نے بھائی کو آج۔۔۔" وہ رو دیں۔

"شاید اسی لیے وہ ہمیں بلا رہا تھا۔ بانٹ لینے سے دکھ کم ہو جاتا ہے نا۔ اب وہ خفا ہو گیا ہوگا۔۔۔" وہ گہری افسردگی کا احساس لیے اپنے کمرے میں آگئی اور پھر رات گئے تک اس نے بار بار فون ٹرائی کیا تھا۔ مگر جواب ندارد۔ شاید سلیم بھی اپنے گھر چلا گیا تھا۔

♥ ♥

"زین! اب اٹھ جاؤ یار۔ آج تو تمہارا دن ہے۔" وہی پرشفقت لہجہ، وہی مانوس و محبوب لمس۔

وہ ہڑبڑا کر جاگا۔

اس کی نظریں پنکھے کے گھومتے پروں پر تھم گئی۔ اس نے شعوری کوشش کی، وہ لہجہ، وہ لمس پھر سے محسوس کرنے کی۔ جو روح تک کو شانت کر دیتا تھا۔ مگر خالی در و دیوار خاموشی و افسردگی سے اسے تکتے رہے۔

"بابا۔۔۔!" ایک سسکی سی اس کے لبوں سے نکلی۔

آنسو نہیں جانے کیوں۔ مگر وہ رویا نہیں۔ یونہی چھت کو تکتا رہا۔ جہاں ایک فلم سی چل رہی تھی۔

بابا اس کے لیے کیک بیک کر رہے ہیں۔

وہ کیک کاٹ رہا ہے اور بابا اس کی پیشانی پر بوسہ شفقت ثبت کر رہے ہیں۔

اسے لگا کسی نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

زین کی انگلیوں نے بے اختیار اسے چھوا۔ تو گرم پانی کنپٹی پر بہہ نکلا۔

ایک خالی پن تھا جو اس کے اندر جاگا۔

وہ بابا کے ساتھ مل کر شہر کی سڑکیں ناپتا۔ تاریک گلیوں، پررونق بازاروں سے گزرتا۔ وہ لوگ کھانا باہر کھاتے۔

"یہ تو بڑی پرابلم ہے۔ آخر لوگ کیا سوچتے ہوں گے ہمارے بارے میں۔"

"کیا مطلب؟۔۔۔" وہ حیران ہوا تھا۔

"اب یہ میرا تمہارا کوئی جوڑ تو نہیں ہے۔ ایسا کرو۔ تم فوراً اپنے لیے کوئی پیاری سی پارٹنر ڈھونڈ لو اور میں۔۔۔"

"کیا آپ؟۔۔۔" وہ چیخ اٹھا تھا۔

"تو کیا حرج ہے۔ تمہارے بعد میں تنہا کیا کروں گا۔"

"بابا! یہ چیٹنگ ہے۔ آپ صرف اپنی شادی کے لیے میری شادی پر زور دے رہے ہیں۔"

"ساری دنیا ہی چیٹر ہے بیٹا۔۔۔"

"کتنا اچھا لگے گا۔ جب باپ بیٹا ایک ہی دن شادی کریں گے۔" اسے سوچ کر ہی شرمندگی ہوئی۔

"ہاں اچھا تو واقعی بہت لگے گا۔ اپنی نوعیت کی منفرد شادی ہوگی۔" وہ ہنس دیتے۔ اس دن وہ کسی اور کی بات نہیں کرتے تھے۔ صرف زین کی اور اپنی۔

بیل تیز سے تیز تر ہو گئی تھی۔ مگر وہ اوندھا پڑا اسنی ان سنی کرتا رہا۔ پھر دروازہ ایک آواز کے ساتھ کھلا۔

"بھائی جان۔۔۔!" سلیم نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہے؟۔۔۔" وہ تکیے میں منہ چھپائے ہوئے بولا۔

"آپ نے رات کو دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ باہر کا دروازہ لاک نہیں تھا۔"

"یاد نہیں رہا۔۔۔" وہ رکھائی سے بولا۔

"کمال ہے۔ یہ بھولنے والی بات ہے۔ آپ کو آج اٹھنا نہیں۔۔۔"

"تم جا کر اپنا کام کرو۔۔۔" وہ سختی سے بولا تو سلیم چلا گیا۔ وہ خالی الذہنی کے ساتھ بستر پر پڑا رہا۔

"بھائی جان ناشتہ۔۔۔" سلیم پھر سے آموجود ہوا۔

"مجھے نہیں کرنا۔۔۔"

سلیم کو محسوس ہوا اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی وہ خاموشی سے پلٹ گیا۔ کمرے میں اس کے کام کرنے اور کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

"آج کا دن کیسے گزرے گا۔" اس نے یاسیت سے سوچا۔

"بھائی جان۔۔۔!"

"خدا کے لیے سلیم! مجھے بار بار ڈسٹرب مت کرو۔ جو کام کرنا ہے کرو اور جاؤ۔" وہ چیخ اٹھا۔

"بھائی جان! آپ کو یاد ہے آج کے دن صاحب مجھے نیا سوٹ لے کر دیتے تھے۔" سلیم نے آہستگی سے کہا۔

"آج کے دن؟۔۔۔"

"آپ کی سالگرہ کے دن۔۔۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

زین نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا اور سلیم نے اس کی سرخ آنکھوں کو۔ پھر زین نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر اپنا والٹ نکالا۔ تب ہی نظر ٹیبل کے اوپر رکھے دو پھولوں پر پڑی۔

"یہ۔۔۔" اس نے سوالیہ نظروں سے سلیم کو دیکھا۔

"میں لایا تھا آپ کے لیے۔۔۔"

"ہوں۔۔۔" اس نے والٹ نکال کر ٹیبل پر رکھا۔ "اس میں سے پیسے لے کر اپنا نیا سوٹ لے آؤ۔"

"نہیں بھائی جان! میں نے تو صرف اس لیے کہا تھا کہ آپ مجھ سے صاحب کی باتیں کریں گے تو دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔"

"تم نہیں لو گے تو میرے دل کا بوجھ کچھ اور بڑھ جائے گا۔"

"اب دل نہیں کرتا بھائی جان۔۔۔" وہ سچ مچ افسردہ تھا۔

"نہیں سلیم! پلیز تم جاؤ۔ ابھی اپنے لیے سوٹ لے کر آؤ۔" اس کے بے حد اصرار پر سلیم نے پیسے لے لیے۔

"میں سبزی لینے جاؤں گا تو لیتا آؤں گا۔" سلیم نے کہا تو زین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بھائی جان! آپ اپنی پھپھو کو بلا لیں۔" اس نے جاتے جاتے مشورہ دیا۔ زین خاموشی سے ٹیبل پر رکھے دو پھولوں کو دیکھتا رہا۔

"شاید سلیم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔"

وہ چار و ناچار اٹھ بیٹھا۔ فون سیٹ اپنی طرف کھسکا کر نمبر ڈائل کیا۔ مگر دوسری طرف بزی ٹون سنائی دے رہی تھی۔ بعد میں سہی۔

سر بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کے بعد وہ خود کو ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا۔ کچن میں آکر اس نے کیک بنانے کے جملہ لوازمات تلاش کیے۔ کیک بنانا اس نے بابا سے سیکھا تھا۔ میدہ، بیکنگ پاؤڈر، انڈے، گھی اور پسی ہوئی ناریل کا پیکٹ نکال کر اس نے اپنے لیے چائے کا پانی رکھا اور خود انڈے پھینٹنے لگا جب تک چائے بنی وہ زیادہ تر کام نبٹا چکا تھا۔ چائے مگ میں نکال کر اس نے کیک کے آمیزے کو سانچے میں نکال کر اوون میں رکھا اور اپنا کپ اٹھا کر پھر سے بیڈ روم میں آگیا۔ تب اس کی پھپھو اور زارا سے بات ہوئی۔ وہ حیران ہو گیا۔

"شاید کوئی ہے۔" وہ ان کے لہجے سے سمجھ گیا تھا۔ زارا نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ قدرے مایوس سا ہوا۔

"لیکن شام ہونے میں کوئی زیادہ دیر تو نہیں۔" اس نے خود کو تسلی دی۔ "کوئی ہوگا ورنہ وہ یوں انکار نہیں کر سکتی تھی۔"

اس نے گھڑی پر ایک نگاہ ڈالی۔ کیک تیار ہو گیا تھا اور اسے آئسنگ کے لیے کریم وغیرہ کی ضرورت تھی۔

"سلیم بھی چلا گیا ہے اور۔۔۔" اس نے الماری کھول کر اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "کوئی ڈھنگ کا لباس نہیں۔ بابا ہوتے تو کیا میں اس حلیے میں گھوم رہا ہوتا۔ کوئی نئی شرٹ ضرور ہی خرید لینی چاہیے۔"

جب سے بابا کی ڈیتھ ہوئی تھی۔ اسے اپنے سارے پروگرام خود سے ڈسکس کرنے کی عادت سی

ہو گئی تھی۔ سلیم اسے کئی بار خود سے باتیں کرنے پر ٹوک چکا تھا۔ مگر عادت تھی کہ جاتی ہی نہ تھی۔ اس نے سیف کھول کر پیسے نکالے۔ راستے میں اسے افتخار مل گیا۔

"کدھر کو شہزادے۔۔۔۔"

"بس کپڑے خریدنے نکلا تھا۔"

"چلو آؤ۔ تمہیں منے حلوائی کا خاص سوہن حلوہ کھلاؤں۔" افتخار نے دعوت دی۔

"سوہن حلوہ۔" زین نے ذرا دیر کو سوچا۔ "نہیں۔ افتخار بھائی آج میں آپ کو چائے پلواؤں گا۔" اسے افتخار اچھا لگتا تھا۔ نڈر اور بے خوف۔ اسے لگتا وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے۔

"کس خوشی میں؟۔۔۔۔"

"آج میرا برتھ ڈے ہے۔" وہ مسکرایا۔

"خیر سے بچہ کتنے سالوں کا ہو گیا ہے۔۔۔۔"

"اتنے سال تو ہو گئے ہیں کہ آپ مجھے جوانوں میں شمار کرنے لگیں۔" زین نے برجستہ کہا تو افتخار نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔

"ہاں بھئی۔ لگ رہا ہے۔ چلو پھر چائے ہو جائے۔" افتخار نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

چائے پی کر وہ دونوں مارکیٹ آ گئے تھے۔ افتخار کو اپنے اباجی کے لیے سوٹ خریدنا تھا۔ وہیں زین نے زارا کو کسی کے ساتھ دیکھا۔ وہ دونوں شاپنگ کر رہے تھے۔ وہ نوجوان ایک ایک چیز اس کے مشورے سے خرید رہا تھا اور وہ بس ہوں ہاں کر رہی تھی۔ زارا کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔

وہ مسکرا دیا۔

"تو یہ تھی مصروفیت۔۔۔۔" زین نے انہیں گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔

"کون ہو سکتا ہے وہ کیا رائے ہاؤس کا کوئی مکیں۔۔۔۔" اس کی پیشانی کی رگیں تن گئی۔ نجانے کیوں ان میں سے کسی بھی شخص کو زارا کے ساتھ دیکھنا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اسے لگتا وہ پھپھو اور زارا ایک تکون ہیں جس کا چوتھا کونہ کوئی نہیں۔ زین نے بغور اس خوبرو شخص کو دیکھا۔

"ہاں یہ بھی ان ہی میں سے ہے۔"

اس کے دل نے نفرت سے کہا۔ اسے زارا پر بے حد غصہ آیا۔

"وہ کیوں مسکرا رہی ہے۔"

"ہاں بھئی کیا کہتے ہو اچھی ہے۔" افتخار نے اس کے ہاتھ میں پکڑی شرٹ کو ہلایا۔

"اچھی ہے لیکن مجھے نہیں لینی۔" اس نے بے زار سا ہو کر شرٹ رکھ دی۔

"کیوں؟۔۔۔۔" افتخار نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"بس میرا موڈ نہیں ہے۔" افتخار کو اس کا مزاج بگڑا بگڑا سا لگا۔

"میرا تو ہے۔" افتخار نے وہ شرٹ خرید کر پے منٹ کر دی۔ زین منع ہی کرتا رہ گیا۔

"میری طرف سے سالگرہ کا تحفہ سمجھ لو۔" وہ دکان سے باہر آ گیا۔

"تھینک یو افتخار بھائی۔" زین نے باہر آ کر کہا۔

"اچھا میں چلتا ہوں۔ خوامخواہ میں اتنا وقت لے لیا تمہارا۔"

"گھر جائیں گے۔؟"

"ہاں اور تم؟۔۔۔"

"میں۔۔۔۔" زین نے دور تک پھیلی سڑک پر آتے جاتے لوگوں اور ٹریفک کو دیکھا۔ اسے اپنا آپ ایک دم بہت تنہا لگا۔

"پتا نہیں۔"

افتخار نے بغور اسے دیکھا۔

"کوئی ایسا نہیں جو میرا انتظار کرے۔۔۔۔" وہ یاسیت سے بولا۔

"تو چلو پھر آج کی شام ہمارے نام کر دو۔" افتخار نے کہا اور زین کو ہمیشہ اپنا غصہ، غم اور دکھ شیئر کرنے کے لیے کسی نہ کسی کی ضرورت تو رہتی تھی سو جو اس کی سمت ہاتھ بڑھاتا وہ اسی کے ساتھ ہو لیتا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

راحت جبیں

ناولٹ

یونیورسٹی میں ایک زین کا ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا زارا کو شدید ناگوار گزرتا تھا۔ لیکن اس نے بھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی تھی۔ اس کی دوست بھی متوجہ ہونے لگی تھیں۔ ایک دن زین نے اسے مخاطب کر کے کہا کہ اس کے بابا اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ زارا حیران رہ گئی۔ وہ اس کے بابا سے ملنے اسپتال گئی وہ سو رہے تھے۔ زارا واپس آ گئی۔ اسے اسلام آباد جانا پڑا۔ دوبارہ وہ ان کے پاس نہ جا سکی۔ اسلام آباد سے واپس آئی تو پتا چلا کہ زین کے ابو کی وفات ہو گئی ہے۔

زارا زین کے گھر گئی تو اس پر انکشاف ہوا کہ زین کے ابو رائے جمشید حیات تھے۔ جن پر زارا کے تایا کے قتل کا الزام تھا۔ رائے جمشید حیات اس کے سگے ماموں تھے۔ زارا کی امی کو پتا چلا تو وہ رو رو کر بے حال ہو گئیں۔

زارا کے تایا کی زمینیں تھیں جو اس کے تایا زاد بھائی سلیمان سنبھالتے تھے۔ سلیمان نے ہی رائے جمشید حیات پر الزام لگایا تھا زارا کا نکاح سلیمان کے چھوٹے بھائی رضوان سے ہو چکا تھا۔ رضوان باہر پڑھنے گیا ہوا تھا۔

زین کی زارا سے بہت دوستی ہو گئی تھی۔ رضوان بھی باہر سے پڑھ کر آ گیا تھا۔ وہ سلیمان سے بہت مختلف مزاج رکھتا تھا۔ اور سلیمان کی نسبت بہت روشن خیال اور فراخ دل تھا۔

۳
تیسری قسط

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔۔۔"

وہ ہڑبڑا کر جاگا۔

"ابھی تک بستر میں ہو لیزی بوائے۔۔۔" پھپھو نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔ پھر اس کی پیشانی چوم لی۔ "ہیپی برتھ ڈے جان۔۔۔"

"تھینک یو۔ لیکن میری سالگرہ تو کل گزر گئی۔" وہ سنجیدہ سا اٹھ بیٹھا۔

"ایک دن سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔" زارا

نے ہو کے اس کی طرف بڑھایا۔
"فرق تو۔۔۔ خیر۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"سوری بیٹا! لیکن تم مجھے تو بتا دیتے اور ساری شام کہاں غائب رہے؟۔۔۔" مما نے پوچھا۔
"افتخار بھائی لے گئے تھے۔"
"کتنی بار میں نے فون کیا۔ تم رات گئے تک گھر نہیں آئے تھے۔ میں پریشان ہو گئی تھی۔" پھپھو نے اس کے بال سنوارے۔ "اتنی دیر تک باہر مت رہا کرو۔"
"خالی گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے پھپھو! تھک جاتا ہوں ان خالی در و دیوار کو تکتے تکتے۔" وہ بے زاری سے گویا ہوا۔ مما نے کچھ کہنا چاہا۔ زارا بول اٹھی۔
"پلیز آپ لوگ اتنی سنجیدہ گفتگو مت کریں اور تم نہا لو اٹھ کر۔"
وہ کہہ کر کچن میں آ گئی۔ مما بیڈ روم کی سیٹنگ ٹھیک کرنے لگی تھیں۔ وہ نہا کر نئی شرٹ پہن کر آیا تو مما نے خوبصورت سی رسٹ واچ اس کی طرف بڑھا دی۔
"تمہارا برتھ ڈے گفٹ۔"
"بہت خوبصورت ہے۔" زین نے پرانی گھڑی اتار کر میز پر رکھی۔
"زارا کہاں ہے؟۔۔۔" اس نے نئی گھڑی کلائی پر باندھتے ہوئے کہا۔
"کچن میں ہے شاید تمہارے لیے کچھ بنا رہی ہے۔" پھپھو نے بتایا تو وہ کچن میں چلا آیا۔
زارا انڈے پھینٹ رہی تھی۔
"نہا لیے؟۔" اس نے آہٹ پر پلٹ کر دیکھا۔
"ہاں۔۔۔"
"اچھے لگ رہے ہو۔ یہ کلر تم پر سوٹ کرتا ہے۔" اس نے شرٹ کی طرف اشارہ کیا۔
"افتخار بھائی نے لے کر دی تھی کل۔" زین نے بتایا پھر پوچھنے لگا۔ "آپ نے مجھے کوئی گفٹ نہیں دیا۔"
"میں تمہارے لیے کیک بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اور گفٹ تمہارا ڈیو ہے۔ اپنی مرضی کا لے لینا۔"
"کوشش کر رہی ہیں۔"
"ہاں۔ کیونکہ مجھے کیک بنانا نہیں آتا۔" وہ ہنسی۔ "ویسے مجھے پتا ہے کہ کیسے بناتے ہیں۔" "میں نے سوچا آج ٹرائی کرتی ہوں۔"
"ہٹیں۔ میں سکھاتا ہوں۔ کیک کیسے بناتے ہیں۔"
"تمہیں بنانا آتا ہے؟" وہ بادل اسے تھما کر ایک طرف ہو گئی۔
"کل بنایا تھا۔۔۔" زین نے کپ میں میدہ نکالا۔
"سوری زین! مجھے جانا تھا لیکن میں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا۔ تم غائب ہی ہو گئے۔"
"آپ کے وعدے پر کون اعتبار کرتا۔" وہ آہستگی سے ہنسا۔ زارا نے خفگی سے دیکھا تو سنجیدہ ہو گیا۔
"میرا دل نہیں چاہتا تھا۔۔۔"
"مجھ سے ملنے کو؟۔۔۔" زارا نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"ہاں!" وہ صاف گوئی سے گویا ہوا۔
"کیوں؟۔۔۔"
وہ خاموش ہی رہا۔ کچھ لمحوں کے بعد جھجکتے ہوئے پوچھنے لگا۔
"کل آپ کے ساتھ کون تھا؟۔۔۔"
زارا نے چونک کر گہری نظروں سے اسے دیکھا۔
"تم نے دیکھا تھا؟۔۔۔"
"ہاں۔۔۔"
"اسی لیے گھر نہیں لوٹے تھے۔"
"ہاں۔۔۔"
"کیوں۔۔۔؟"
"پتا نہیں۔۔۔" اس نے اوون گرم ہونے کے لیے آن کر دیا۔
"بہرحال وہ رائے رضوان حیدر ہے۔ تایا ابو کا چھوٹا بیٹا۔"
"مجھے پتا تھا ان ہی میں سے کوئی ہو گا۔ آپ کا جانا بہت ضروری تھا۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔
"ہاں۔ تمہیں اچھا نہیں لگا۔"
"میں آپ کو ان لوگوں کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا۔"
زارا نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"میرا تعلق بھی تو رائے فیملی سے ہے۔"
"میں آپ اور پھپھو کو بابا کے حوالے سے دیکھتا ہوں۔"
"رضوان بہت اچھے انسان ہیں۔۔۔"
"ہونہہ۔۔۔" وہ آمیزے کو اسٹار کی شکل والے سانچے میں ڈالنے لگا۔
"میری ان کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔۔۔" زارا نے اطمینان سے بتایا۔ وہ پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔
"یا۔۔۔؟"
زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "وہ سلیمان سے بہت مختلف ہے۔۔۔"
"آپ ان سے شادی مت کریں۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔ زارا مسکرا دی۔
"اب تو مجبوری ہے۔"
"کیسی مجبوری ہے؟۔۔۔" وہ جھنجھلایا۔
"پسند کرتی ہوں اس کو۔۔۔" زارا آرام سے بولی۔
"محبت تو نہیں کرتیں؟۔۔۔"
"پسندیدگی محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔ ہو سکتا ہے۔"
زین نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔
"آپ اس شخص سے ضرور شادی کریں گی۔"
"کرنی پڑے گی کیونکہ ہمارا نکاح ہو چکا ہے۔ اب تو بس رخصتی ہی باقی ہے۔"
زین نے حد درجہ بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر سانچہ یونہی چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ زارا نے کیک اوون میں رکھا اور باہر آ گئی۔ وہ چپ چاپ سا پھپھو کے پاس بیٹھا تھا۔ بعد میں اس نے زارا سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

♥ ♥

"افتخار! تم نے زین کو دیکھا ہے۔" کاریڈور میں چلتے چلتے اچانک رک کر اس نے ہلز کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے افتخار سے پوچھا۔
"کئی بار دیکھا ہے۔"
"میرا مطلب ہے کہ ابھی۔" وہ ہنس دی۔
"ابھی تو لائبریری میں جا کر سب کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ بہت پڑھنے لگا ہے۔"
افتخار نے جواب دیا تو وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ وہ واقعی لائبریری کی کونے والی ٹیبل پر کتاب کھولے نوٹ بک پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ زارا کو دیکھتے ہی اس نے کتاب اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لی۔ وہ مسکراتی ہوئی سامنے آ بیٹھی۔ وہ تب بھی نظرانداز کرتا رہا۔ زارا نے انگلی سے ٹیبل بجائی۔ تب کتاب کے عقب سے اس نے خفا نظروں سے اسے دیکھا۔
"تمہیں رضوان واقعی اچھا نہیں لگا۔۔۔"
"آپ یہاں مجھ سے یہی پوچھنے آئی ہیں۔۔۔" اس نے جھنجھلا کر کتاب ٹیبل پر پٹخی۔
"ہاں۔۔۔" وہ اطمینان سے بولی۔
"مجھے رائے ہاؤس کا کوئی فرد اچھا نہیں لگتا۔"
"میں بھی۔۔۔"
"اس وقت آپ بھی۔۔۔" وہ منہ پھلا کر بولا۔
"اتنے بڑے بڑے سچ نہیں بولا کرتے۔" زارا متبسم لہجے میں بولی۔ "دل دکھنے لگتا ہے۔"
"اور جو میرا دل دکھ رہا ہے۔۔۔"
"تو اس میں میں کیا کر سکتی ہوں۔۔۔"
"اس سے شادی مت کریں۔۔۔"
زارا ہنس دی۔
"کیسی بچوں جیسی ضد ہے تمہاری۔۔۔"
"آپ مجھے بچہ ہی سمجھتی رہیں۔۔۔" وہ تنتنا کر اٹھ گیا۔ زارا بھی اس کے پیچھے چلی آئی۔
"تم اس سے ملو گے تو تمہیں وہ اچھا لگے گا۔"
زین درمیان والی سیڑھی پر رک کر پلٹا۔

"مجھے صرف اتنا معلوم ہے۔ وہ شخص آپ کو مجھ سے دور کردے گا۔ کبھی تمہیں ملنے دے گا اور میں آپ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ بابا آپ سے محبت کرتے تھے۔"

"اب بھی تو ملتی ہوں۔"

"ابھی آپ رائے ہاؤس میں نہیں رہتیں۔ تب آپ اس شخص کے سامنے جواب دہ ہوں گی۔"

وہ دو دو سیڑھیاں اتر گیا۔

"زین۔۔۔ زین۔۔۔!"

زارا نے پکارا۔ آخری سیڑھی پر انعم نے اسے روکا۔

"یہ تم تو لگتا ہے اپنے ماموں زاد کو ہی پیاری ہو گئی ہو۔"

"نہیں بس۔۔۔" وہ رک گئی۔ "ذرا زین کو دیکھنے آئی تھی۔"

"بھی ہمیں بھی دیکھ لیا کرو۔ زین کوئی بچہ نہیں جو بھیڑ میں پھر سے گم ہو جائے گا۔"

"سارا دن تو تمہارے ساتھ ہوتی ہوں۔"

"ہاں اور تمہیں پھر بھی یہ نہیں پتا کہ وہ افتخار کا بچہ عظمیٰ کے ہاں پھر سے جا پہنچا ہے۔"

"کیا؟۔۔۔" زارا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں جی کل شام کی بات ہے یہ۔۔۔" انعم کو حسب معمول مزا آ رہا تھا۔

"عظمیٰ کہاں ہے؟۔۔۔"

"رو رہی ہے۔۔۔" اس نے آرام سے کہا۔

"واٹ۔۔۔!" انعم اسے وہاں لے آئی جہاں عظمیٰ تنہا منہ پھلائے سخت غصے میں بیٹھی تھی۔

"یہ میں کیا سن رہی ہوں عظمیٰ۔۔۔" زارا اس کے قریب بیٹھی۔

"میں اسے قتل کر دوں گی۔" وہ چیخ اٹھی۔

"بس کر چکیں اسے قتل۔" انعم نے ہاتھ جھاڑے۔

"میں یونیورسٹی چھوڑ دوں گی۔۔۔ ذلیل کروا رہا ہے مجھے سب کے سامنے۔"

"ہائی داوے اب کے کیا لے کر گیا تھا۔۔۔" زارا نے پوچھا۔

"اچار کا مرتبان۔۔۔" انعم دل کھول کر ہنسی۔ زارا نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی۔

"کیا وہ بھی سارے دوستوں میں بانٹنے تھے۔"

"نہیں اسے عظمیٰ کے ابا بہت اچھے لگے۔ بقول اس کے۔ آج کے دور میں ایسے سادہ اور درویش منش انسان کہاں ملتے ہیں سو وہ تو ابا کی محبت میں ابا سے ملنے گیا تھا مرتبان لے کر۔"

"تو عظمیٰ کے ابا نے کیا کہا۔۔۔" اب تو زارا کو بھی اس ساری کہانی میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

"چٹخارے لے لے کر اچار کھایا۔ افتخار کو عظمیٰ کے ہاتھ سے بنوا کر پکوڑے کھلائے۔ بقول ابا آج کے دور میں ایسے سعادت مند اور بزرگوں کا احساس کرنے والے نوجوان کہاں دستیاب ہوتے ہیں۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟۔۔۔"

"کیونکہ میں وہیں موجود تھی۔۔۔" انعم کو عظمیٰ کی حالت سوچ سوچ کر ہنسی آ رہی تھی۔

"تمہارے بہت دانت نکل رہے ہیں۔۔۔" عظمیٰ تاؤ کھا کر بولی۔

"ہاں۔ عظمیٰ دانت پیس پیس کر اسے گھور رہی تھی اور وہ مزے سے پکوڑے کھاتا ہوا کہہ رہا تھا۔ پکوڑے بہت مزے کے بنے ہیں۔ لگتا ہے عظمیٰ نے نہیں بنائے۔" اس کے لبوں سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا۔ عظمیٰ نے ہاتھ میں پکڑی فائل اسے کھینچ ماری۔

"اللہ کرے یہ سب تمہارے ساتھ بھی ہو۔۔۔"

"ہائے اللہ کرے۔" اس نے فوراً دعائیہ انداز میں ہاتھ بلند کیے۔ عظمیٰ غصے میں اٹھ کر جانے لگی۔ زارا نے ہاتھ پکڑ کر روکا۔

"تم کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔ میں بات کروں گی اس سے۔۔۔"

"وہ کہہ دے گا۔ اچھا نہیں لگا اچار۔ کوئی بات نہیں اگلی بار سہی۔" انعم نے کہا اور دوسرے پل بچاؤ بچاؤ کا نعرہ لگاتی وہاں سے بھاگی تھی کہ عظمیٰ نے ہاتھ

اپنے سینڈل کی طرف بڑھایا تھا۔

"عظمیٰ۔۔۔" زارا نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ عظمیٰ نے دور جاتی انعم کو دیکھا۔ وہ شائستہ وغیرہ کے گروپ میں جا گھسی تھی۔ پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں واقعی افتخار کا آنا اچھا نہیں لگتا۔۔۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی زارا! اور نہ ہی بن رہی ہوں۔ مجھے واقعی اس کا یوں گھر آنا اچھا نہیں لگتا۔" وہ جھنجھلا کر بولی۔

"تمہیں لوگوں کی پروا ہے افتخار کی نہیں۔۔۔"

"مجھے اپنے لوگوں کی پروا ہے۔ مجھے اس بات کی فکر ہے کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔" وہ زور دے کر بولی۔

"کیا وہ تمہیں جانتے نہیں۔" زارا نے پوچھا تو عظمیٰ نے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر ان پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے سنجیدہ نظروں سے زارا کو دیکھا۔

"غلط فہمیاں کہاں سے جنم لیتی ہیں۔ قریبی رشتے شک کی نذر کس طرح ہو جاتے ہیں؟۔۔۔"

عظمیٰ کے سوال نے زارا کے ذہن کو رائے جمشید حیات کی طرف موڑ دیا۔

ہاں میں جانتی ہوں۔ یہ غلط فہمیاں، یہ شک قریبی رشتوں کو کس طرح کھا جاتے ہیں۔ ماموں بھی تو اسی آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔

"شک کا ناگ بالکل اسی طرح اعتبار کو بھی ڈس لیتا ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

زارا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"کس کا اعتبار۔۔۔؟"

"میرے اپنے لوگوں کا۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "زارا! تم میرے خاندان اور گھر کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔"

"میں سمجھتی ہوں دوستی میں کرید نہیں ہونی چاہیے۔ جتنا تم نے مناسب سمجھا بتا دیا۔"

"بنیادی طور پر ہمارا خاندان زمیندار ہے۔ تعلیم کا رواج نہیں۔ خاص طور پر لڑکیوں میں تو بالکل نہیں۔ میرے ابا نے اپنے شوق میں میٹرک کے بعد پی ٹی سی کر کے استاد بننے کو ترجیح دی تھی۔ یوں بھی وہ باقی لوگوں سے ذرا مختلف اور لبرل واقع ہوئے ہیں اور بہت نرم دل بھی۔ ان کی تعلیم یوں ادھوری رہ گئی کہ دادا نے ان کی مزید فیس دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا خواب ادھورا رہ گیا اور یہ ادھورے خواب بہت تکلیف دیتے ہیں زارا! ابا نے چاہا۔ وہ یہ خواب اپنے بچوں کی صورت میں پورے کریں۔ میں بڑی بیٹی تھی۔ انہوں نے مجھے اسکول میں داخل کروا دیا۔ یہاں تک تو خیر تھی کہ اتنی تعلیم تو ہر کوئی دلوا لیتا ہے۔ آفت تو تب ہوئی۔ جب میں میٹرک کے بعد کالج میں چلی آئی۔ خاندان میں کوئی بھونچال آگیا۔ ہر کوئی ابا کو سمجھانے آ رہا تھا۔ ابا ہنس ہنس کر ٹالتے رہے۔ دادا نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

"اپنی بیٹیوں کی کمائی کھائے گا عبدالجبار۔ اس سے بہتر ہے ڈوب کر مر جا۔"

"ابا پھر بھی کچھ نہیں بولے۔ انہوں نے مجھے کبھی کچھ نہیں کہا۔ کبھی لمبی چوڑی نصیحتیں نہیں کیں۔ ہاں جب بھی میں نئی کلاس میں جاتی تھی۔ ابا پہلے دن سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے۔

"پتر! سیدھے کالج جانا اور سیدھے گھر آنا۔۔۔"

"اور بس۔ میرے لیے یہ ایک جملہ نہیں تھا۔ ان کے اعتماد کا حصار تھا۔"

گھاس کی ایک ایک پتی توڑتے ہوئے وہ بہت آہستگی سے بول رہی تھی۔ اسے معلوم بھی نہ ہوا کب انعم آ کر پھر سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"پورے خاندان کی نظریں مجھ پر لگی ہیں کہ کہاں میں لڑکھڑاؤں اور وہ ابا کو منہ کے بل گرا دیں۔ میرے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت پر ان کی نظر ہے۔ میں اگر کبھی بھولے سے گنگنا بھی لوں تو ان کی نگاہوں میں شک اترنے لگتا ہے۔ میرے لباس میں اگر کوئی معمولی سی تبدیلی بھی نظر آ جائے تو وہ ہونٹوں میں انگلی دبا کر فیشن کو کوسنے لگتی ہیں۔ "فیشن" ان کی نظر میں فحاشی ہے برائی ہے اور فیشن کرنے والے کو بخشا ان کی لغت میں نہیں۔ واضح رہے کہ فیشن کے

زمرے میں صاف ستھرا اچھا لباس بھی آجاتا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی گریس فل کیوں نہ ہو اور اب تو میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہوں۔" واستہزائیہ سی ہنسی ہنس دی۔ "اب تو میرے بگڑنے کے فل چانس ہیں۔"

"ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں دنیا میں۔" زارا نے تحیر سے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہمارا الگ گھر ہے اور اس کا ماحول بھی ایسا نہیں۔ جس دن افتخار آیا تھا ابا نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا مگر اماں نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ نظریں میرے اندر کہیں گڑ کر رہ گئی ہیں۔ تم لوگوں کے لیے یہ مزاج 'تھرل' ہے اور میرا عمر بھر کا اعتماد داؤ پر لگا ہے۔" اس نے انعم پر نگاہ ڈالی۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"سوری عظمیٰ! لیکن تمہیں معلوم ہے میں صرف مذاق کیا کرتی ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ زارا! ان حالات میں میں کس طرح اس کی پذیرائی کروں۔" وہ بے بسی سے پوچھنے لگی۔

"شاید تم ٹھیک ہی کر رہی ہو۔" زارا نے ایک طویل سانس کھینچی۔ پھر اچانک پوچھنے لگی۔ "کیا وہ تمہیں اچھا نہیں لگتا۔"

"پھر وہی بات۔" عظمیٰ نے جھنجلا کر اسے دیکھا۔ "مسئلہ یہ نہیں ہے زارا۔"

"تم میری بات نہیں سمجھیں۔ میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں۔ اگر وہ براہ راست اپنا پرپوزل بھجوا دے تو۔"

"تو میں انکار کر دوں گی۔" وہ قطعی لہجے میں بولی۔

"بس یہیں پر آکر اس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔" انعم کو یہیں پر آکر اعتراض ہوتا تھا۔

زارا نے تحیر سے عظمیٰ کو دیکھا۔

"کیوں؟ کیوں انکار کرو گی تم؟"

"لوگ تو یہی کہیں گے۔ یونیورسٹی پڑھنے نہیں شوہر پسند کرنے گئی تھی۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"نہیں عظمیٰ!" زارا نے بے اختیار ٹوکا۔ "اس سے پہلے تم نے جو کچھ کہا۔ وہ سب ٹھیک لیکن اب تم غلط کہہ رہی ہو۔ اگر وہ واقعی تمہارے ساتھ مخلص ہے جو کہ وہ ہے تو تم اسے یوں نہیں انکار کر سکتیں۔"

"یہی تو سمجھاتی ہوں اسے۔ ہم یہ کب کہہ رہے ہیں کہ تم اسے لو لیٹر لکھو۔ اس کے ساتھ گھومو پھرو۔ لیکن اگر وہ بھی تمہیں پسند کرتا ہے اور تم بھی اسے پسند کرتی ہو۔ تو اس بات کی اجازت تمہیں مذہب بھی دیتا ہے اور قانون بھی کہ تم شادی کر لو۔ اب اس معاشرے کے ان پڑھ اور جاہل لوگوں کی خاطر تم محبت کو ٹھکرا دو گی تو میں تو اسے بے وقوفی ہی کہوں گی۔" انعم بول اٹھی۔

"تم اسے جو بھی سمجھو، لیکن میں یہی کروں گی۔ میں کبھی کسی بات پر شرمندہ ہونا نہیں چاہتی۔" عظمیٰ کا لہجہ ٹھوس تھا۔

"کوئی گناہ تو نہیں کر رہی ہو جو تم شرمندہ ہو گی اور کمال ہے محبت جیسا آفاقی جذبہ تمہارے لیے شرمندگی ہے۔" انعم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔" وہ اس کی بات جھٹلا کر زارا کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تم بات کرو گی افتخار سے؟"

زارا ایک طویل سانس لے کر سیدھی ہوئی۔

"ہاں کروں گی اور تم فکر مت کرو۔ وہ سمجھ دار ہے۔ سمجھ جائے گا۔"

"سمجھ جائے گا لیکن باز نہیں آئے گا۔ یہ تم مجھ سے لکھوا لو۔" انعم چڑ کر بولی۔ زارا مسکرا دی۔

"تمہیں کیوں اتنی فکر ہے اس کی۔ فرینڈ تو ہماری عظمیٰ ہے۔"

"بس میں نہیں چاہتی کہ اس لو اسٹوری کا اینڈ ٹریجک ہو۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔" عظمیٰ نے اسے تیکھی نظروں سے گھورا۔ [illegible]

"اس دن حالت دیکھی تھی اس کی۔ لگتا تھا گولی افتخار کو نہیں اس کو لگی ہے۔" وہ زارا کو دیکھتے ہوئے برجستہ بولی اور عظمیٰ بہت کچھ کہنے کی کوشش میں کچھ بھی نہ کہہ پائی تو وہاں سے اٹھ گئی۔

"تم باز نہیں آتا۔" زارا نے گھورا تو وہ ڈھٹائی سے ہنس دی۔ زارا واقعی افتخار سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ کرکٹ ٹیم کے ساتھ ملتان چلا گیا۔

♥ ♥

بینک میں اتنا روپیہ تو تھا کہ وہ آرام سے تعلیم مکمل کر کے کچھ عرصہ گزارہ کر سکے۔ لیکن وہ سنجیدگی سے ابھی سے کچھ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ کوئی ایسا نہ تھا جو اس کے مستقبل کے بارے میں سوچ سکے۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔

"زندگی کتنی تنہا ہو گئی ہے۔" اس نے سر اٹھا کر دریا کے چوڑے پاٹ کو دیکھا۔ سفید بگلے قطار در قطار دریا کے کنارے اتر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے نم جھونکے آنے والی شام کی آہٹیں سنا رہے تھے۔

"ایک اور شام اداس اور تنہا۔"

ہر آنے والی شام اسے اتنا ہی تنہا اور اداس کر دیتی تھی۔ وہ بہت دیر تک بیٹھا یونہی پانیوں پر بنتے بھنور دیکھتا رہا۔

"بابا زندہ ہوتے تو یہ زندگی کتنی مختلف ہوتی۔" اس نے ذرا سا جھک کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھا۔ ایک ریڑھی والا آواز لگاتا جا رہا تھا۔ نہ تو اس کی آواز میں جان تھی اور نہ وجود میں۔ مگر اسے زندگی کی گاڑی گھسیٹنا تھی۔ اس نے دوپٹے میں لپٹی گندمی رنگت والی لڑکی کو غور سے دیکھا۔ وہ ہر روز اسی وقت کتابوں کا پلندہ اٹھائے یہیں سے گزرتی تھی۔ اس کی نظریں ہمیشہ زمین کو چھوتیں۔ اس کی چال میں ایک عجیب سا خوف نظر آتا تھا۔ گویا ایک ایک قدم سوچ کر رکھتی ہو۔ تب ہی ایک گیند اڑتی ہوئی اس کے عقب میں گری۔

"اوہ نو۔" کی معصوم آوازوں پر اس نے رخ بدل کر برابر والے ٹیرس پر دیکھا۔ ننھے منے گول گوتھنے گلابی گلابی سے بچے ٹیرس کی گرل پر چڑھ آئے۔

"انکل۔ انکل۔ ہماری بال۔"

زین نے جھک کر بال اٹھایا اسے ان کی طرف اچھال دیا۔ بال ان کے اوپر سے گزر کر عقب میں گری۔ وہ خوشی سے چیختے ہوئے گیند کی طرف بھاگے۔ ہلکی سی نسوانی چیخ پر وہ بے اختیار دونوں ہاتھ گرل پر ٹکا کر نیچے جھکا۔ وہ سیاہ چادر والی لڑکی اپنا پاؤں پکڑے زمین پر بیٹھی تھی۔

وہ ذرا سا اور جھکا۔

"کیا ہوا؟"

لڑکی نے گھبرا کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کے لب کپکپائے۔ پھر اس نے بے بسی سے چہرہ جھکا لیا۔ اس کی سیاہ اداس آنکھوں میں درد اور آنسو گڈمڈ سے ہو گئے تھے۔

وہ کچھ لمحے متذبذب سا اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتا رہا۔ پھر نیچے اتر آیا۔

"اینی پرابلم اوہ نو۔"

شیشے کا لمبا سا ٹکڑا پاؤں کی ایڑی میں گھس گیا تھا۔ وہ ضبط کی شدت سے نچلا لب کاٹ رہی تھی مگر شیشہ کھینچنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ زین بے اختیار اس کے قریب بیٹھا۔

"ٹھہرو میں نکالتا ہوں۔"

لڑکی نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ زین نے اس کی ایڑی تھام کر احتیاط سے مگر زور سے شیشہ کھینچا۔ شیشہ باہر آیا ساتھ ہی خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ لڑکی کے منہ سے چیخ نکلی۔

"بس نکل آیا۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ لڑکی نے آنکھیں کھولیں اور بھل بھل نکلتے خون کو دیکھ کر اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ زین نے اپنی جیب ٹٹولی۔ مگر رومال ندارد تھا۔ اس نے سیاہ چادر کا کونہ کھینچ کر ایڑی پر رکھا۔

"اسے پکڑو۔"

خود وہ اٹھ کر تیزی سے چلا گیا۔ لڑکی نے گردن

گھما کر اسے دیکھا۔ تکلیف کی شدت سے منہ سے سسکاری نکل آئی۔ وہ جلد ہی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں رومال تھا۔ اس کے قریب بیٹھ کر اس نے چادر ہٹائی اس پر رومال باندھ دیا۔ پھر اس کا بازو تھام کر بولا۔

"آؤ پٹی باندھ دوں۔"

وہ بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹی اور خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"م۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"ایسے تو گھر تک نہیں پہنچ پاؤ گی۔ بس یہیں برآمدے تک چلی آؤ۔ چند منٹ لگیں گے۔" وہ پراسرار لہجے میں بولا۔ لڑکی نے ایڑی پر بندھا رومال دیکھا۔ جو خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ مجبوراً اس کے سہارے وہ برآمدے تک چلی آئی۔ برآمدے میں ایک ہی کرسی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر اندر غائب ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ نیچے بیٹھ کر اس نے باکس کھولا۔ رومال کھولتے ہوئے زین نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ پھر مسکرا دیا۔

"اتنی بڑی ہو کر رو رہی ہو۔"

وہ شرمندہ ہو گئی۔ چادر کے کونے سے آنسو صاف کرنے لگی۔

"شرمندہ ہونے والی بات نہیں۔ تکلیف میں بڑے بڑے رو دیتے ہیں۔" پھر ہنس کر شرارتی انداز میں بولا۔ "میں بھی۔۔۔"

لڑکی کے لبوں پر مسکراہٹ کی رمق بھی نہ جاگی۔ وہ لب بھینچے اپنی ایڑی کو گھورتی رہی۔ زین نے پٹی کی۔ پھر باہر نکل آیا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی بی۔ایل کی کتابیں وہیں بکھری تھیں۔ اس کی چپل بھی۔ وہ اٹھا کر اندر آ گیا۔

"یہ ٹوٹی ہوئی چپل پہن کر گھر سے نکلنے کا نیا رواج نکلا ہے۔" اس نے کتابیں اس کی طرف بڑھائیں۔ چپلیں نیچے رکھ دیں۔

"راستے میں ٹوٹی تھی۔۔۔" وہ آہستگی سے بولی اور اٹھنے لگی۔

"پانی پیو گی۔۔۔؟"

اس نے پہلے نفی، پھر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ زین مسکراتا ہوا پھر سے اندر گھس گیا۔ وہ خاموشی سے کھڑی کتابیں جھاڑتی رہی۔ پھر اس نے بے بسی سے ٹوٹی ہوئی چپل کو دیکھا اور لب کاٹنے لگی۔ ایڑی سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"لو۔۔۔" اس نے شربت کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ مینگو اسکوائش میں برف کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ اسے ایک دم شدید پیاس کا احساس ہوا۔ تو گلاس تھام لیا۔

"ساتھ یہ ٹیبلٹ لے لو۔ تکلیف نہیں ہوگی۔" اس کے لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔ جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔ زین نے گولی اس کی پھیلی ہتھیلی پر رکھی۔ وہ غٹاغٹ گلاس چڑھا گئی۔

"اور لو گی۔۔۔؟" اس نے نفی میں سر ہلایا اور چادر ٹھیک کرنے لگی۔

"یہ میری چپل پہن جاؤ۔ تمہاری تو پہننے کے قابل نہیں رہی۔"

"نہیں یونہی ٹھیک ہے۔۔۔" اس نے ایک چپل پاؤں میں ڈالی اور دوسری ہاتھ میں پکڑی۔

"یوں جاؤ گی۔ پاؤں میں کچھ اور لگ گیا تو میں دوسری بار پٹی نہیں کروں گا۔"

اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"تھوڑی بڑی ہیں مگر گزارا ہو جائے گا۔ اگلے دن واپس کر دینا۔ روز تو گزرتی ہو یہاں سے۔ نہیں بھی کرو گی تو کوئی بات نہیں۔ میرے پاس اور بھی چپل ہیں۔"

وہ متذبذب سی کھڑی اس کے چپل دیکھتی رہی۔

"یہ پہننی پڑیں گی۔ خود بخود پاؤں میں نہیں چڑھتیں۔" زین نے کہا تو اس نے اپنی چپل اتار کر اس کی پہن لی۔ وہ اسے دروازے تک چھوڑنے نہیں آیا۔ بس وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ دروازے کے قریب جا کر پلٹی۔

"شکریہ۔۔۔"

"ویلکم۔۔۔" وہ مسکرایا پھر دروازہ کھول کر اندر غائب ہو گیا۔ اس کے قدم تھکے تھکے انداز میں اپنے رستے پر چل دیئے۔

"کون تھیں بھائی جان۔۔۔؟" سلیم نے اسے نکلتے دیکھا۔ آتے ہی پوچھنے لگا۔ زین نے فریج کھول کر جائزہ لیا۔

"کون؟"

"جو ابھی ابھی یہاں سے گئی ہیں۔۔۔" اس نے گھی کا ڈبہ اور سودے کا لفافہ رکھا۔

"مجھے پتا نہیں۔۔۔" اس نے تھوڑے سے انگور پلیٹ میں نکالے۔

"وہ یہاں سے ہو کر گئی ہیں اور آپ کو پتا ہی نہیں۔" سلیم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"میں واقعی نہیں جانتا۔ وہ کون تھی۔"

"اب آپ یہ بھی کہیں گے کہ وہ یہاں آئی ہی نہیں تھیں۔"

"خیر آئی تو وہ تھی۔" زین نے انگور کا دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ سلیم کچھ خفا ہو کر برتنوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ زین باہر نکلنے لگا تو جھنجھلا کر بولا۔

"جانے نہیں تو اپنی چپل کیوں اس کو دی۔"

زین نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا پھر سراہنے والے انداز میں بولا۔

"یار! بڑی تیز نظر ہے تیری۔۔۔ ویسے تمہیں کس بات پر غصہ آ رہا ہے چپل پر یا اسے دینے پر۔۔۔"

"آپ پر؟۔۔۔" سلیم نے جھنجھلا کر کڑاھی چولہے پر رکھی۔ زین ہنس دیا۔

"میں نے کیا کیا ہے۔۔۔؟"

"کچھ نہیں صاحب! ہم نے تو یونہی پوچھ لیا۔ ہمیں معاف کر دیں۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ زین کا قہقہہ بہت بلند تھا۔ نجانے کیا تھا مگر اس کی کچھ لمحے پہلے والی وہ بے زاری اور یاسیت بالکل ختم ہو گئی تھی۔

♥ ♥ ♥

"بس میں نہیں کھیل رہی۔۔۔"

زارا نے ریکٹ پھینکا اور خود پلٹ کر سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔

"اب ہارنے لگی ہیں تو۔۔۔"

"میں ہارنے نہیں لگی۔ تمہیں کھیلنا نہیں آتا۔"

"جھوٹ بھی بولتی ہیں آپ۔۔۔" وہ اس کے برابر آ بیٹھا۔

"زندگی بھر میں نے اتنے جھوٹ نہیں بولے جتنے تمہاری خاطر بولے ہیں۔" وہ ہنس پڑی۔

"میری خاطر۔۔۔" زین نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"اپنی سہیلی کے گھر جا رہی ہوں۔ لائبریری جانا ہے۔ یونہی لانگ ڈرائیو پر نکل گئی تھی وغیرہ وغیرہ۔"

"ایک سچ کو چھپانے کے لیے اتنے جھوٹ۔ کیا خیال ہے۔ میں اور آپ مل کر ایک سچ بول ہی نہ دیں۔" وہ متبسم لہجے میں بولا۔

"خدا کا خوف کرو۔" زارا جلدی سے بولی۔

"ابھی تو لگتا ہے صرف انسانوں کا خوف سر پر سوار ہے۔ بلکہ صرف ایک انسان "رائے سلیمان حیدر۔" لیکن جس دن میں نے اس خوف کے حصار کو توڑ دیا۔ وہ دن کوئی اور ہی تاریخ لکھے گا۔" اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

"جب تم اس لہجے میں بات کرتے ہو تو مجھے تم سے خوف آنے لگتا ہے۔" وہ جھرجھری لے کر بولی۔ زین مسکرا دیا۔

"خیر آپ کو تو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔"

"خیر قتل کی دھمکیاں تو تم مجھے بھی دے چکے ہو۔" زارا کی نگاہوں میں شرارت مچلی۔

"اب جانے بھی دیں۔۔۔" وہ جھینپ گیا۔

"اس دن تو تم اتنے دعوے کر رہے تھے کہ مجھے لگا بس کچھ کر ہی دو گے۔"

زین نے بغور سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں بہت بزدل انسان ہوں۔ بابا کی محبت نے مجھے واقعی بزدل بنا دیا ہے۔ میں واقعی وہی کرنا چاہتا ہوں جو کہتا ہوں مگر مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ پھر آپ لوگ۔۔۔ آپ لوگوں نے مجھے کچھ اور بزدل کر دیا ہے۔ مگر کبھی نہ کبھی تو میں خود میں ایسا حوصلہ پاؤں گا ہی کہ ان کے سامنے جا کھڑا ہوں کہ دیکھو میں اس شخص کا بیٹا ہوں جس نے کچھ نہیں کیا مگر ساری زندگی ایک بے جرم سزا کی طرح کاٹ دی۔" اس کا چہرہ دہکنے لگا تھا۔

"ریلیکس زین! اس کا فیصلہ تو ہونا ہی ہے اور وقت بہتر منصف ہے۔۔۔" زارا نے رسانیت سے سمجھایا۔

"جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے وقت کے انصاف کا انتظار کریں۔ وقت انہیں کچھ بھی نہیں دیتا۔" وہ تڑخ کر بولا اور زارا کے لیے اس کے مزاج کا اتار چڑھاؤ بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ اچھے بھلے خوشگوار موڈ میں بیٹھا بیٹھا ایک اذیت میں اتر جاتا تھا۔ تب ہی کسی نے بیرونی گیٹ دھڑ دھڑایا تھا۔

"شاید لائٹ نہیں ہے۔" بیل کی آواز نہ سن کر زین بولا۔ پھر سلیم کا انتظار کیے بغیر خود ہی گیٹ کھولنے چلا گیا تھا۔ کھٹکا ہٹاتے ہی اس سے قبل کہ وہ گیٹ کھولتا۔ کسی نے دھکا دے کر چھوٹا دروازہ کھولا تھا۔

"کیا بے ہودگی ہے یہ۔۔۔" زین جھنجلایا۔ دوسرے پل آنے والے نے اسے گریبان سے پکڑ کر زوردار دھکا دیا۔ زین پشت کے بل زمین پر گرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا آدمی بھی اندر داخل ہو گیا۔ زارا گھبرا کر کھڑی ہوئی۔

آنے والوں کے تیور بہت خطرناک تھے۔

زارا بے اختیار آگے بڑھی۔

"تم وہیں رکو بی بی! یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔" عقب سے آنے والے نے ہاتھ اٹھا کر سرد و خشک لہجے میں کہا۔ زارا کے قدم تھم گئے تھے۔ وہ کچھ متوحش سی رک کر زین کو دیکھنے لگی۔

"ہو کون تم لوگ۔۔۔؟" زین کھڑا ہو گیا تھا۔ دونوں چہرے اس کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ ایک پل کو اس کا دھیان رائے سلیمان کی طرف گیا تھا۔

"تمہارا باپ۔۔۔" دوسرے شخص نے جارحانہ انداز میں اس کا گریبان دبوچا۔

احساس توہین سے زین کا چہرہ سرخ ہو کر کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا۔

"زبان سے بات کرو۔"

"ابھی تو زبان سے ہی بات کر رہے ہیں، لیکن آج کے بعد تم نے اس لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔"

"کون لڑکی؟۔۔۔" زین نے الجھ کر انہیں گھورا۔

"یہ۔۔۔" پہلے شخص نے چپل کی جوڑی اس کے آگے پھینکی۔ وہ اس کے گھٹنوں سے ٹکرا کر نیچے گری۔ زارا کا خیال تھا کہ زین اب ان سے بھڑ جائے گا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب زین مٹھیاں بھینچے ان چپلوں کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر سامنے غصے میں بپھرے شخص کو بے حد حیرت سے دیکھا۔

"تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"غلط فہمی کے پتر۔۔۔" وہ پھر سے بپھرنے لگا تھا۔ دوسرے شخص نے اس کا بازو پکڑا۔ پھر زین کو گھورتے ہوئے سخت و سنگین لہجے میں بولا تھا۔

"ہم غیرت پر قتل ہو بھی جاتے ہیں، قتل کر بھی دیتے ہیں۔ بہتر ہے اپنا رستہ بدل لو۔"

"میں نے صرف اس کی مدد کی تھی۔" زین قدرے جھنجلا سا گیا تھا۔ نجانے کون لوگ تھے ایک بے بنیاد سی بات کو لے کر مرنے مارنے پر اتر آئے تھے۔

"کیوں بہن لگتی تھی وہ تیری۔" پہلے والا تڑخ کر بولا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ میری کیا لگتی تھی۔ وہ مصیبت میں تھی اور میں نے انسانیت کے ناطے

[اس] کی مدد کر دی۔" زین نے بے حد حیرت سے انہیں [دیکھتے] ہوئے وضاحت کی تھی۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ [کیوں] وہ لوگ اتنی سی بات کو اتنا بڑا ایشو بنا رہے تھے۔

"آئندہ اس قابل ہی نہیں رہو گے انسانیت کے [علم]بردار۔" وہ کچھ زیادہ ہی مشتعل تھا اور بہت کچھ کر [گزر]نے پر آمادہ۔ اس دوسرے شخص نے اسے بازو تھام [کر] پیچھے کیا۔

"یہ صرف ایک وارننگ تھی۔ اس کے بعد [وا]رننگ نہیں دیں گے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا [بر]د بہا دیں گے۔۔۔ بے غیرت مت سمجھنا ہمیں۔"

زین نے چاہا کہ وہ ان لوگوں کی غلط فہمی دور کر دے [مگر] وہ کچھ بھی سننے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ دھمکیاں دیتے جیسے [آ]ئے تھے ویسے ہی پلٹ گئے۔ وہ کچھ متحیر سا سرخ چہرہ [لی]ے غصہ ضبط کرنے کی سعی کرنے لگا۔ زارا تیزی سے [اس] کے قریب آئی۔

"کون تھے یہ لوگ؟"

زین نے ایک طویل سانس لے کر خود کو پر سکون [کر]نے کی کوشش کی۔ پھر آہستگی سے بولا۔

"معلوم نہیں۔۔۔"

"تم سے کیوں جھگڑ رہے تھے۔"

"انہیں غلط فہمی ہو گئی تھی۔۔۔" اس کا لہجہ اب [بھ]ی مدھم اور پُر سوچ تھا۔ زارا نے تعجب سے اسے [دی]کھا۔

"کیسی غلط فہمی؟"

زین نے خاموشی سے آگے بڑھ کر گیٹ لاک کیا۔

"کہیں وہ سلیمان بھائی۔۔۔؟" زارا زیرِ لب [بڑبڑ]ائی۔

"نہیں اس کے بندے نہیں تھے۔" وہ بس خود کو [نارمل] کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو پھر کون تھے۔ یوں تمہارے گھر میں گھس کر [تم]ہیں دھمکیاں دینا۔ تم پولیس کو انفارم۔۔۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ قصداً" مسکرایا۔

"کیوں ضرورت نہیں۔ کیا جنگل میں رہتے ہیں کہ

جس کا دل چاہے۔ گھر میں گھس کر مار کٹائی کرنے لگے۔" وہ تلملا کر بولی۔ اسے زین کے انداز پر حیرت اور غصہ آ رہا تھا۔

"آئیں اندر چلتے ہیں۔۔۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر قصداً" مسکرایا۔ زارا نے خفگی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور مشکوک نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟"

"بائے گاڈ۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ایک لڑکی کی مدد کی تھی ذرا سی۔ یہ لوگ نجانے کس غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔"

"یونہی تو کوئی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتا زین العابدین! خاص طور پر کسی لڑکی کے معاملے میں۔"

"حالانکہ یہی وہ معاملہ ہے جہاں لوگ۔۔۔" زارا نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا تھا۔

"تم مجھے ٹال رہے ہو۔۔۔"

"او گاڈ۔۔۔ تو آپ کو مجھ پر یقین نہیں۔ بھلا میں آپ سے کیا چھپا سکتا ہوں۔" وہ بے حد بے چارگی سے بولا تھا۔

"شاید بہت کچھ۔۔۔" وہ اسے شک بھری نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ زین محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"اب میں مزید کیا کہوں۔"

"کچھ مت کہو۔ میں اب چلتی ہوں۔" وہ یقیناً" خفا ہو کر کہہ رہی تھی اور زین نے اسے روکا بھی نہیں۔ وہ خود اس وقت بہت الجھ رہا تھا۔ بس اتنا کہا۔

"پھپھو کو مت بتایئے گا۔ وہ خوامخواہ پریشان ہو جائیں گی۔"

زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر قدرے جتانے والے انداز میں بولی تھی۔ "اور جو میں پریشان ہوں گی۔"

"تو کیا حل ہو اس کا۔۔۔"

"کاش تم۔۔۔" وہ اسے اپنے ہاں شفٹ ہونے کا کہتے کہتے رک گئی۔ وہ بات سمجھتے ہوئے مسکرا دیا۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

www.paksociety.com

"وہ لوگ۔۔۔"

"جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔۔۔یہ محاورہ تو سنا ہی ہوگا آپ نے۔" زارا کی تشویش و پریشانی پر طمانیت کی اک لہری اس کے اندر پھیل گئی۔

"بس اپنا خیال رکھنا۔۔۔"

(اور جس پل بابا نے اس دنیا سے منہ موڑا میں نے سوچا تھا شاید یہ بدنصیبی میری قسمت میں لکھ دی گئی ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسا نہ ہو جو میری کسی تکلیف پر تڑپ اٹھے اور اب۔۔۔وہ پرسکون انداز میں مسکرایا۔ محبتوں کے اس خزانے کو کہاں سنبھال رکھوں۔)

زارا کے جانے کے بعد وہ بیڈ روم میں آگیا۔ اس کا دھیان اس کالی چادر والی لڑکی کی طرف چلا گیا۔ اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

زارا گھر آئی تو رضوان بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرایا' جبکہ زارا کچھ بے زار سی ہو گئی۔ وہ اس وقت رائے ہاؤس کے کسی مکین کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کہاں رہ گئی تھیں زارا۔ رضوان کافی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔" مما نے یونہی پوچھا جبکہ وہ جانتی تھیں کہ زارا کہاں ہو سکتی ہے۔

"انعم کی طرف گئی تھی۔" زارا نے مختصراً" کہا' پھر رضوان کی طرف دیکھتے ہوئے قصداً" مسکرائی۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"جیسا نظر آتا ہوں۔۔۔" اور وہ ہمیشہ کی طرح بہت فریش نظر آرہا تھا۔

"کھانا لگواؤں تمہارے لیے۔۔۔" مما کھڑی ہو گئیں۔

"مما جان' بھوک نہیں ہے۔ رہنے دیں۔" وہ انہیں ٹال کر رضوان کے عین سامنے صوفے پر بیٹھنے لگی۔

"میرا خیال تھا۔ ہم لوگ آج آؤٹنگ کے لیے نکلیں گے۔"

"آج۔۔۔" وہ کچھ متذبذب سی اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت کہیں' خاص طور پر رضوان کے ساتھ کہیں بھی جانے کے لیے ذہنی و دلی طور پر آمادہ نہیں تھی۔ نجانے کیوں زارا کو ان لوگوں سے چڑ سی ہونے لگی تھی۔

"اگر موڈ نہیں تو پھر کبھی سہی۔۔۔" وہ شاید اس کا تذبذب پا گیا تھا۔ تب ہی فوراً" بول اٹھا۔

"میں واقعی آج کچھ تھکی ہوئی ہوں۔ آپ پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔" اب کے وہ ذرا دوٹوک لہجے میں بولی تھی۔ مما نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ رضوان پھر کچھ دیر ہی رکا۔

"کیا ہوا۔ کوئی پرابلم ہے؟۔۔۔" رضوان کے جانے کے بعد مما نے پوچھا۔

"پرابلم کیا ہوگی۔" وہ الٹا ان ہی سے پوچھنے لگی۔

"تو پھر رضوان کے ساتھ کیوں نہیں گئیں۔"

"بس میرا موڈ نہیں تھا۔" زارا بیزار کن لہجے میں بولی۔

"تمہیں کم از کم رضوان کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ تمہارا شوہر ہے۔"

"جانتی ہوں۔ مگر یہ بھی تو ضروری نہیں کہ جب اس کا موڈ ہو تب ہی میں۔۔۔"

"اچھا جانے دو۔ یہ بتاؤ۔ زین کیسا ہے؟" مما نے اس کے موڈ کے پیش نظر بات بدلی۔

"زین۔۔۔" ایک پل کو اس کا ذہن بھٹک کر آج کے واقعہ کی طرف چلا گیا۔

"کیا سوچنے لگیں۔" مما کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ تو وہ الجھ کر بولی تھی۔

"مما! زین کتنا اکیلا ہے۔"

"اکیلا کیوں۔ کیا ہم نہیں ہیں۔" مما فوراً" بولیں۔

"ہم۔۔۔" زارا استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ "ہم کیا ہیں اس کے۔ جس رشتے کا وہ اعلان نہیں کر سکتا۔ ہم کسی کو بتا نہیں سکتے تو کیا معنی رکھتا ہے یہ ہمارا اور اس کا تعلق۔ فرض کریں' اگر اسے کوئی پرابلم ہو۔ کیا مدد کر سکتے ہیں ہم اس کی؟ کیا رائے فیملی اس کے لیے کچھ کرنے کو تیار ہوگی۔ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔ وہ تنہا تھا اور تنہا ہے۔"

"کیا ہوا زارا! زین کو کوئی پرابلم ہے کیا۔" مما فوراً" ان کی ٹینشن پا گئی تھیں۔ زارا نے سر جھٹکا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے۔ ہم نے بہت غلط کیا۔ خواہ مخواہ اسے اپنی محبتوں کا پابند کر دیا۔ وہ آزاد ہوتا تو ضرور اپنے لیے کوئی نہ کوئی رستہ ضرور ڈھونڈ لیتا۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو۔ زارا؟" مما پریشان سی ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

"کچھ نہیں۔ بس کبھی کبھی مجھے چڑ سی ہونے لگتی ہے۔ اس ساری روٹین سے۔" وہ اپنا بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ بھی بتا کر وہ مما کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ انہیں پریشان کر گئی ہے۔

♥ ♡ ♡ ♥

ٹھنڈا یخ فرش تھا۔ گھنی خاموشی سے گلے ملتی مہیب تاریکی' کہیں روشنی کی کوئی کرن' کوئی ننھا سا جگنو تک نہ تھا۔ بس کبھی کبھی کوئی دبی دبی سی کراہ' ایک خوفزدہ سی سسکی تھی۔ جو اسی خاموشی سے ٹکرا ٹکرا کر اندھیرے میں بکھر رہی تھی۔

وہ کون تھی؟

کیوں تھی؟

اور کہاں تھی؟

اندھیرا ان سارے سوالوں کو نگل گیا تھا۔

جواب کہاں سے آتے؟۔۔۔

"کیا یہ سارا فساد میرے ہونے کا ہے۔" ایک زخمی سی سوچ نے اس کے خوابیدہ اونگھتے جاگتے ذہن کو بیدار کیا۔ اس کے سہارے کے متلاشی بازو بے اختیار پھیلے۔ اندھیرے نے انہیں تھاما اور پتھریلی دیوار نے اسے سہارا دیا۔ اس نے جلتی آنکھوں کو میچ کر کھولا۔ مگر کہیں کوئی منظر نہ جاگا تھا۔ بس وہی ایک اندھیرا۔

اس کے لبوں پر سسکیاں منجمد ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اپنے وجود پر لگے ایک ایک زخم کو شمار کرنا شروع کیا۔ پھر تھک کر گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیا۔ اس کے سوجے ہوئے چہرے پر گرم سیال آگ لگانے لگا تھا' اور ہر زخم بے حد حیرت سے اپنا قصور پوچھنے لگا تھا۔

وہ جواب کیا دیتی۔ بس زور زور سے رونے لگی تھی۔

اسے اپنی ماں پر غصہ آرہا تھا' جس نے اسے جنم دیا اور خود مر گئی۔

اسے اپنے باپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ کہتے تھے اسے اس کی ماں سے بڑی محبت تھی۔ تب ہی زمانے کے سمجھانے پر اسے سوتیلی ماں کی گود میں دے کر خود بھی چلا گیا۔

پھر وہ ایک دم چپ ہو کر سوچنے لگی۔

کیا ہوا تھا؟

نیون سائن کی طرح ایک کے بعد دوسرا منظر' اس اندھیرے میں جھلملانے لگا۔

وہ مہربان اجنبی' جسے اس نے نظر بھر کے دیکھا بھی نہ تھا۔ کہیں کوئی دیکھ نہ لے کے خوف نے اسے نظر اٹھانے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔ وہ بس گھر آگئی تھی۔ جب ترکاری کاٹتی بھابھی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"اتنی دیر۔۔۔"

اس نے خاموشی کا پہلا سبق پانچ سال کی عمر میں سیکھا تھا۔ جب پانچ انگلیوں کے نشان اس کے زرد گال پر پہلی بار ثبت ہوئے تھے۔ آج بھی کبھی کبھی وہ نشان جلنے لگتے تھے۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ مگر اس کی چال کی لڑکھڑاہٹ نے سارے راز فاش کر دیے۔ بھابھی کی نگاہیں اس کے چہرے سے پھسل کر ایڑی پر بندھی پٹی اور پھر مردانہ قیمتی چپلوں پر رکی تھیں۔ مگر رکی نہیں پھر سے اٹھ کر اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

"ارے ماں۔۔۔یہ کیا ہے؟" اس ایک جملے میں ان گنت سوال تھے۔ شک کے کوڑیالے سانپ اس کے گرد پھنکارنے لگے۔ وہ ساری جان سے لرز گئی۔

"شش۔۔۔ شیشہ لگ گیا تھا۔"

"اچھا۔۔۔"

"میرا جوتا ٹوٹ گیا تھا۔۔۔" نجانے کیا بات تھی کہ کوئی خوف اسے جھوٹ بولنا نہ سکھا سکا۔ وہ ہمیشہ ڈر کر سارے سچ اگل دیتی تھی۔

بھابھی کی آنکھوں میں ایک شاطرانہ سی چمک ابھری۔ بہت عرصہ ہوا گھر میں کوئی ہنگامہ نہ جاگا تھا' اور قدرت نے یہ موقعہ پلیٹ میں رکھ کر پیش کیا تھا۔ اس قابل نفرین وجود سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرنے کا ایک خوبصورت موقعہ۔ ان کے ذہن نے پل بھر میں اس ڈرامے کے سارے ڈائیلاگ ترتیب دیے۔

"اوئی ماں۔۔۔ میں مرگئی۔"

یہ پہلا ڈائیلاگ تھا جو انہوں نے نین تارا کے کندھے پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے بولا تھا۔ پھر وہ لپک کر بھائی کے کمرے میں گھس گئیں۔ پتا نہیں وہاں کون سا سین لکھا گیا۔ بس وہ بپھرا ہوا باہر آیا تھا۔ اور اس نے وہی چپل اٹھائی تھی۔ وہ ہکا بکا سی پٹتی رہی۔ پھر چیخ چیخ کر معافی مانگنے لگی۔ بنا کسی قصور کے۔ بس اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ مار کے خوف سے وہ جرم کی نوعیت جانے بغیر معافی مانگنے لگتی تھی۔ جو اس کے ناکردہ جرم کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتی۔

تب بھی وہ بس چیخ چیخ کر کہتی رہی۔

"اب نہیں کروں گی۔۔۔ اب نہیں کروں گی۔"

"اب تمہیں کچھ کرنے کے قابل ہی کہاں چھوڑوں گا میں۔۔۔" اس نے اسے گھسیٹ کر کمرے میں روئی مال کی طرح پھینک کر دروازہ بند کر دیا تھا او۔

اب وہ پھر سے اپنے اللہ سے شکوہ کناں تھی۔

کیوں تھی وہ۔۔۔ کیا اس کا ہونا اتنا ہی اہم تھا۔

اگر تھا تو کس کے لیے۔

اگر وہ نہ ہوتی تو کہاں کمی واقع ہوتی۔ شاید کہیں بھی نہیں۔ اس نے ایک بار پھر سوچا اسے مرجانا چاہیے۔ مرجانا اتنا اذیت ناک نہیں ہے جتنا کہ زندہ رہنا۔۔۔

اس نے تھک کر گھٹنوں میں چہرہ چھپا لیا۔ شاید اسے وہ ہمت درکار تھی۔ جو اسے کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کر دے۔

♥ ♡ ♡ ♥

"مرجائے گی وہ۔۔۔"

"مرجانے دو۔" کیسی سفاکی تھی اس کے لہجے میں۔ بتول نے ہنڈیا میں ڈوئی گھمائی' پھر ڈھکن رکھ کر مکمل طور پر ظہور کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اپنے سر کیوں لیتے ہو۔ بلاؤ اس کے مامے کو۔ آجاتا تھا نصیحتوں کے ٹوکرے اٹھائے۔ یتیم کے سر پر ہاتھ۔۔۔ یہ انجام ہوتا ہے۔" وہ تنفر لہجے میں کہتی ظہور کو کچھ اور متنفر کر رہی تھی۔

"بلوایا ہے اسے بھی۔ بس یہی ڈر ہے کہیں وہ ساتھ لے جانے کی بات نہ کرے۔" ظہور کے لہجے میں ایک پل کو تشویش جھلکی۔

"تو منع کرنا۔۔۔!"

"ایسے کیسے کر دوں۔ پانچ مرلے کا مکان ہے اس کے نام۔۔۔ وہ میرے نام کر دے۔ پھر میری بلا سے جہاں مرضی دفع ہو۔" وہ ایک دم بھڑک کر بولا تھا۔ بتول کی تیوری چڑھ گئی۔

"مجھے تو اس بڈھے کی عقل پر حیرت ہے۔ لے کر پوتی کے نام مکان کر دیا۔ کل کو بیاہ ہو تو جائیداد تو چلی گئی نا غیروں کے قبضے میں۔"

"اس کی تو مت ماری گئی تھی۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کروں۔" ظہور کچھ الجھ کر بولا۔

"کرنا کیا ہے۔ کچھ ڈرا دھمکا کر مکان اپنے نام لکھواؤ اور اسے اس کے مامے کے ساتھ رخصت کر دو۔ ہم کہاں اس کی رکھوالی کرتے رہیں۔ نجانے کون کون سے گل کھلانے والی ہے۔ ہم تو یوں بھی بدنام ہیں سوتیلے جو ہوئے۔"

"اپنے نام لکھوا لوں اور وہ جو نیاز ہے۔" وہ طنز کے ساتھ گویا ہوا۔

"اسے اپنے ساتھ ملاؤ۔ ورنہ وہ کچھ بھی نہیں کرنے دے گا۔" بتول نے مشورہ دیا۔ "تو جا ابھی مل جا [illegible]

مکان۔۔۔ کئی لاکھ کا ہو گا۔ پھر نیاز پڑھا لکھا ہے۔ کوئی بہتر رستہ ہی نکالے گا۔" بتول نے مشورہ دیا۔ ظہور کی ڈور تو یوں بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ جو وہ کہتی آنکھیں بند کر کے عمل کرتا۔

"ہوں۔ کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" ظہور نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

"بہتر یہ ہے کہ اس کے مامے کے آنے سے پہلے کچھ کر لو۔ کہیں وہ ساتھ ہی نہ لے جائے۔"

"یوں جانے دیں گے بھلا۔" ظہور نے کہا پھر اٹھ کر چپل پہننے لگا۔۔۔ "میں مشورہ کرتا ہوں نیاز سے۔ تم اسے کچھ کھلا پلا دو۔ کہیں مر مرا ہی نہ جائے۔"

ظہور کے جانے کے بعد بتول کچھ دیر یونہی بیٹھی سوچتی رہی۔ چولہے میں آگ بجھ گئی تھی۔ پھر اس نے سر جھٹک کر دوپٹے کے پلو سے ہنڈیا نیچے اتاری۔ چنگیر اٹھا کر دیکھا۔ اس میں دوپہر کی روٹیاں پڑی تھیں۔ بتول نے روٹی پر آلو گاجروں کا سالن ڈالا۔ پھر چنگیر اٹھا کر کونے والے کمرے کی طرف چل دی۔ کنڈا اٹھا کر اس نے دروازہ کھولا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھی نین تارا نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بتول نے چنگیر اس کے قریب رکھی۔

"روٹی کھا لے تارا۔۔۔" بتول کے لہجے میں خلاف معمول ہلکی سی نرمی تھی۔ نین تارا کی آنکھوں میں خوف جاگا۔

"تم تو مجھے ہی قصوروار سمجھتی ہو گی۔ میری بھی عقل ماری گئی اس لمحے جو جا کر تمہارے بھائی سے کہہ بیٹھی۔ وہ تو یوں بھی غصے میں پاگل ہو جاتا ہے۔ صبح سے دروازے کے سامنے چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ ابھی باہر نکلا تو میں روٹی لے آئی ہوں۔"

نین تارا یونہی چنگیر کو گھورتی رہی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ بھابھی یہ کہانی اسے سناتا جو تمہیں جانتا نہ ہو۔ میں نے تو بچپن سے آج تک تمہارا ہر ہر روپ دیکھا ہے۔ مگر وہ لب بستہ روٹی کو گھورتی رہی۔ اسے بے حد بھوک لگی تھی' مگر وہ متذبذب تھی۔ شاید جانتی تھی کہ اس ہمدردی کے معنی کچھ اور ہیں۔ کیا اتنا معلوم نہیں تھا؟۔

"روٹی سے کیسی دشمنی۔ ابھی ظہور آگیا تو مجھ پر برسے گا۔" بتول نے پکارا۔

"نوالہ بنا کر منہ میں رکھنے والا باپ نہیں۔ کھانے سے ناراضی پر سو سو منتیں کر کے کھلانے والی ماں بھی نہیں۔ جسم و جاں کا رشتہ تو قائم رکھنا ہے تارا بی بی۔" اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر نوالہ توڑا۔ بتول قدرے مطمئن ہو گئی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سمجھاؤں گی ظہور کو۔۔۔" بتول نے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

نین تارا کا دل چاہا وہ اس کا ہاتھ جھٹک دے۔ مگر وہ بت بنی بیٹھی رہی۔ بتول باہر نکل گئی۔ دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

سب سے چھپ کر بیٹھ جانے کی خواہش اسے لائبریری کے کونے تک لے گئی تھی اور اب وہ بے مقصد لکیریں کھینچتا ہوا نجانے کن سوچوں کے گرداب میں الجھا تھا۔ کسی سوچ کا چہرہ واضح نہ تھا۔ وہ الجھی الجھی سوچوں کے درمیان کبھی بابا سے شکوہ کرنے لگتا۔ کبھی زارا اور پھپھو کی محبتوں پر غور کرنے لگتا۔ تو کبھی سیاہ چادر کی اوٹ سے موہنا سا سہما سہما مکھڑا جھانکنے لگتا اور پھر وہ لوگ۔۔۔

"کون ہو سکتے تھے؟"

وہ سب کچھ بھول کر پھر سے ان ہی کے بارے میں سوچنے لگا۔ حقیقت تو یہ ہی تھی کہ پچھلے دو دنوں میں زین نے اس لڑکی کے بارے میں سوچا بہت تھا۔ وہ اب بھی حیران تھا۔ بغیر کسی معقول وجہ کے ایک ذرا سی بات کی بنیاد پر وہ لوگ کس طرح غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

"عجیب جاہل اور شکی مزاج لوگ تھے۔ زارا وہاں نہ ہوتی تو میں بتا دیتا۔۔۔" وہ ایک دم جھنجلا سا گیا۔

"کیا تم نے ہواؤں سے بھی لڑنا شروع کر دیا ہے۔" زین نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر زلدا کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ [illegible]

"مجھے کس سے لڑنا ہے میں کس سے لڑ سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ مایوس سا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔" زارا نے ہلکے سے سرزنش کی۔ "یہ مایوسی کیوں۔۔۔؟"

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے۔ بابا نے مجھے بہت بزدل بنا دیا ہے۔ میں کبھی کسی سے نہیں لڑ سکتا۔" اس نے پین کو زور سے دبایا اس کی نب ٹوٹ گئی۔

"لڑنا کوئی اچھی بات بھی نہیں۔"

"جو لڑنا نہیں جانتے۔ وہ ہمیشہ ہار جاتے ہیں۔ میرے بابا کی طرح۔" اس کے لہجے میں طنز اتر آیا۔ زارا نے دانستہ اس کا جملہ نظرانداز کیا اور بات بدلتے ہوئے بولی تھی۔

"میں کافی دیر سے تمہیں تلاش کر رہی تھی۔"

"کیوں۔۔۔" زین نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔

"یوں ہی میں نے سوچا۔ آج ہم لنچ باہر کرتے ہیں۔ کوئی کلاس تو نہیں ہے تمہاری۔" زارا دیکھ رہی تھی وہ پھر یاسیت کا شکار ہو رہا تھا۔ سو اس کا موڈ بدلنے کو اچانک ہی پلان بنا بیٹھی۔

"کلاس تو کوئی نہیں ہے۔"

"تو بس پھر اٹھ جاؤ۔۔۔"

"میں تو تیار ہوں۔ مگر کہیں جو آپ کے رضوان صاحب مل گئے تو۔۔۔" زین نے کھڑے ہوتے ہوئے چھیڑا۔

"تو کیا ہوا انہیں بھی ساتھ لے لیں گے۔۔۔" زارا نے قدرے لاپروائی دکھائی۔

"اچھا متعارف کیا کہہ کر کروائیں گی مجھے۔۔۔"

"ہم اچھے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں۔۔۔" زارا نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

"سوچ لیں۔ میں اچھی خاصی پرسنیلٹی رکھتا ہوں اور عمر میں آپ سے کچھ بڑا ہی لگتا ہوں گا۔ موصوف جیلس ہو جائیں گے۔" زین نے چھیڑا۔

"جسٹ شٹ اپ۔ رضوان ایسے نہیں ہیں۔۔۔" زارا نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ ہنس دیا۔ پھر لب بھینچ کر پوچھنے لگا۔

"رائے فیملی میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔۔۔"

"رائے فیملی انسانوں پر ہی مشتمل ہے۔ بائے دا وے میرے اور مما کے بارے میں کیا رائے ہے تمہاری۔۔۔" زارا کو اس کا یوں کہنا برا لگا تھا۔ تب ہی سنجیدہ لہجے میں پوچھنے لگی تھی۔

"آپ دونوں تو اسپیشل پیس ہیں۔" وہ اس کی خفگی محسوس کر کے ہنس دیا۔

"اچھا چائنیز چلو گے۔" وہ لوگ پارکنگ میں پہنچ گئے تھے۔ زارا نے گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جہاں آپ لے چلیں گی کیونکہ میں تو غریب سا بندہ ہوں۔ یہ ہوٹلنگ وغیرہ تو افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔ زارا ہنس دی۔ وہ دونوں چائنیز ریستوران میں آ گئے۔

"کیا لو گے؟" مستعد بیرے نے ان کے سامنے مینو کارڈ لا رکھے تھے۔

"کچھ بھی ایسا جو سمجھ میں آ سکے کہ کیا کھا رہے ہیں۔" زین نے ریستوران کا جائزہ لیتے ہوئے یوں ہی جواب دیا۔ حالانکہ وہ اور بابا اکثر چائنیز آیا کرتے تھے۔ زارا نے مسکراتے ہوئے آرڈر دیا۔ زین اب بھی ریستوران میں آتے جاتے لوگوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب زارا نے آہستگی سے پوچھا۔

"وہ لوگ پھر تو نہیں آئے۔۔۔"

"وہ کون۔۔۔؟" زین نے چونک کر پوچھا۔ ایک پل کو اس کے ذہن سے نکل گیا تھا کہ زارا کس کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ پھر ایک دم یاد آنے پر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا تھا۔

"نہیں آئے۔۔۔"

"وہ لڑکی کون تھی۔۔۔" زارا نے پوچھا۔ زین مسکرا دیا۔

"آپ کو شاید میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں واقعی خاصا شریف نوجوان ہوں۔ کسی لڑکی کو اس انداز میں نہیں جانتا۔ وہ تو اس کے پاؤں میں شیشہ لگ گیا تو میں۔۔۔"

"اوکے۔ لیو اٹ۔ مجھے یہ کہانی بار بار نہیں سننی۔۔۔" زارا چھ کروئیٹری کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو سوپ سرو کر رہا تھا، زین ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

حقیقت بس اتنی سی ہی تھی جسے زارا قبول نہیں کر رہی تھی۔ سو وہ لوگ خاموشی سے سوپ پینے لگے۔ تب ہی زارا کی نگاہ بھٹک کر داخلی دروازے کی طرف گئی۔ ایک پل کو اسے لگا اس کی روح فنا ہو گئی ہو۔

"سلیمان بھائی۔۔۔" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ زین نے چونک کر پہلے اسے پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر دیکھا۔ وائٹ کاٹن کے شلوار سوٹ اور واسکٹ میں ملبوس اس سنجیدہ، خوبرو اور پروقار شخص کو دیکھ کر اس کی کنپٹی کی رگیں تن گئیں۔ اس کے ساتھ رضوان بھی تھا۔ زین نے پلٹ کر زارا کو دیکھا۔ وہ کچھ نڈھال سی نظر آئی۔ زین لب بھینچے سوپ میں چمچ گھمانے لگا۔

"اب دیکھتے ہیں آپ ہمیں کس طرح متعارف کرواتی ہیں۔" زارا نے چونک کر زین کو دیکھا۔ وہ قدرے سنجیدہ نظر آیا۔ زارا نے بنا کچھ بولے سوپ کے پیالے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ان لوگوں کو نظرانداز کرنے کی دانستہ کوشش کی۔ جبکہ دھیان پورے کا پورا اسی طرف تھا۔ کچھ لمحے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ لوگ اب وہاں نہیں ہیں۔ اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ لوگ اب وہاں نہیں تھے۔ شاید ان کا ارادہ بدل گیا تھا یا کوئی امپورٹنٹ کال۔ کیونکہ جس پل زارا نے انہیں دیکھا سلیمان بھائی فون پر بات کر رہے تھے۔ زارا کے چہرے پر اطمینان سا بکھر گیا، جبکہ زین کے لبوں پر بکھری طنزیہ مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

"یہ ہے میرا اور آپ کا رشتہ، ڈر اور خوف کی چادر میں لپٹا ہوا۔" سوپ کے پیالے میں چمچ گھماتے ہوئے اس کا لہجہ گہرے طنز کا غماز تھا۔

"جانتی ہیں۔ اس پل میرا کیا دل چاہا تھا۔۔۔" وہ دونوں ہتھیلیاں میز کے کنارے پر ٹکا کر ذرا سا اس کی طرف جھکا۔ "میں رائے سلیمان حیدر کے پاس جاؤں اور کہوں "ہائے! میں ہوں زین العابدین۔ رائے سکندر حیات کا اکلوتا فرزند۔ کیا ایکسپریشن ہوتے اس کے۔ اور کیا کرتے وہ اس لمحے پسٹل نکالتے اور گولی داغ دیتے میرے سینے پر۔ رہا جواز، تو خاصا معقول جواز ہے ان کے پاس۔۔۔ میں ان کے باپ کے قاتل کا بیٹا ہوں اور انہیں اپنے باپ کے قاتل کی نسل ختم کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔۔۔ ہے نا۔۔۔"

زارا جز بز ہو گئی۔

"یہ ہے میری زندگی۔ اور آپ کہتی ہیں زین العابدین تم ایسی زندگی جیو۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ زندگی ہے زارا۔ اسے۔۔۔ اسے زندگی کہتی ہیں آپ۔۔۔ کیا اس سے زیادہ پرسکون لمحے موت کے نہیں ہوں گے اور پھر میں کیوں جیوں ایسی زندگی۔ میرا جرم کیا ہے۔ کوئی تو جرم نکلے میرے نام خواہ معمولی کیوں نہ ہو۔ میں کسی طرح تو اس فرار پر خود کو آمادہ کر سکوں۔" وہ ایک طیش میں بولے چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشت سی جاگ اٹھی تھی۔

"زین پلیز۔۔۔ کنٹرول یور سیلف۔۔۔" زارا نے لجاجت سے کہا۔ زین نے سوپ کا پیالہ دھکیلا اور خود ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"سوری۔ مجھے اب بھوک نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ زارا لب بھینچے سوپ کے پیالے میں جھانکتی رہی۔

♥ ♡ ♡ ♥

نیم تاریک کمرے کی ٹھنڈک میں اترتے شام کے گہرے سایوں میں باہر سے آتی آوازوں کے ہجوم نے ایک شور برپا کر رکھا تھا۔ وہ نیم جاں سی چارپائی کی پٹی پر سر ٹکائے اپنے اوپر لگے الزامات کی فہرست سنتے ہوئے دم بخود تھی۔

کبھی کبھی اسے شک سا ہوتا۔ جس نین تارا کی وہ لوگ بات کر رہے ہیں، وہ نہیں کوئی اور ہے اور وہ شخص جس کے ساتھ اسے منسوب کیا جا رہا ہے۔

کون تھا۔۔۔؟ وہ تو اس کا نام بھی نہیں جانتی تھی۔

دروازہ کھلا تھا اور نین تارا یہ دروازہ بند کردینا چاہتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔ لیکن وہ یوں ہی پڑی ٹکر ٹکر کھلے دروازے سے باہر جھانکتی رہی۔ جہاں صحن کا ایک حصہ اس کی نگاہوں کی زد میں تھا۔ جہاں افسردہ و پژمردہ سی شام بکھری تھی۔ اس نے پھر سے آوازوں پر کان دھرے۔

"تبھی سوتیلی پر میں نے سگی سے بڑھ کر چاہا۔"

"اچھا۔۔۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور جس شخص کو وہ یہ کہانی سنائی جارہی تھی۔ کیا وہ بالکل ہی انجان ہے۔

"کسی شریف لڑکی کے یہ لچھن تو نہیں ہوتے کہ یوں جا کر لڑکوں سے ملے۔ میری تو ناک کٹ گئی۔ محلے والے تو باتیں۔۔۔"

اور یہ کیسی زندگی ہے جو میں جی رہی ہوں کیا یہ واقعی جیے جانے کے قابل ہے۔" ایک بار پھر کچھ کہا کہ ہمیشہ کے لیے سو رہنے کی خواہش نے بڑی شدت سے اس کے اندر سر اٹھایا۔

"اور یہ لوگ جو اس کے اپنے ہونے کے دعوے دار ہیں۔ کیا اسے جانتے نہیں۔ یا نہ جاننے کا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔"

اس نے کان بند کرلیے۔

نجانے کتنا وقت گزرا تھا۔ جب دروازے سے آتی شام کا رستہ کسی وجود نے روک لیا تھا۔ اندھیرے کا احساس بڑھا۔ تو نین تارا نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تہبند کرتے میں ملبوس ادھیڑ عمر شخص کے سانولے چہرے کی چند جھریوں میں عجیب سی یاسیت، دکھ اور ہمدردی کا احساس بہہ رہا تھا۔ وہ نہ گرجا نہ برسا، نہ اسے لعن طعن کیا۔ بس خاموشی سے آکر اس کے قریب آ بیٹھا۔

"ماما۔۔۔" نین تارا نے سر اٹھا کر خاموش بیٹھے شخص کو خوف کے عالم میں دیکھا۔

"یہ تونے کیا کیا تارا پتر۔۔۔"

ہائے کیسا دل کو چیرتا ہوا لہجہ تھا۔ نین تارا تڑپ اٹھی۔

"اس دنیا میں کوئی تو ایسا ہو جو بنا کہے میری بے گناہی پر اعتبار کرے۔"

"میں نے کچھ بھی نہیں کیا ماما۔۔۔" اس کا کمزور و بے بس لہجہ شاید اس کا دفاع کرنے کے قابل نہ تھا تب ہی ماما نے اگلا سوال کیا تھا۔

"تو تو بڑی صابر و تھی۔۔۔"

"تھی" نین تارا کے دل میں تیر کی طرح لگا تھا۔

"کون ہے وہ۔۔۔؟" تب نین تارا نے بے اختیار خواہش کی تھی۔

"کاش واقعی کوئی ہوتا۔ شاید تب یہ بے جرم سزا کا احساس تو نہ مارتا۔۔۔"

"ماما! کیا میں ایسی ہوں۔" اس نے کس بے چارگی سے سوال کیا تھا۔ اس کا دل آج بھی اتنا ہی پاکیزہ و مصفا تھا۔ کہیں کوئی ذرا سی بھی بے ایمانی نہ تھی اس کے دل میں۔ مگر اس کا ماما بھی تو مرد تھا۔

"تو کیا یہ سارے جھوٹ بولتے ہیں۔"

"یہ ان سے پوچھو یا اپنے دل سے۔ بس مجھ سے کچھ مت پوچھو ماما کہ میرے پاس تو کہنے کو بھی کچھ نہیں۔ یہ ایک زخم لگ گیا تھا۔" اس نے اپنا بازو آگے کیا۔ "بس پٹی باندھی تھی اس نے میری جگہ کوئی بھی ہوتی شاید وہ یوں ہی مدد کرتا اور میں نے تو پہلے اسے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا بلکہ اس دن بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی۔ اس کا نام کیا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے۔ ماما! یہ لوگ مجھے جینے نہیں دیں گے۔ پتا نہیں یہ ایسا کیوں کررہے ہیں۔" وہ رونے لگی تھی۔

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو ماما۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔" اس نے سر اٹھا کر ملتجی لہجے میں کہا۔ ماما دم سادھے گم صم بیٹھا نجانے کیا سوچ رہا تھا پھر ایک طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔

"ماما! میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔۔۔" نین تارا نے پھر سے کہا۔ یہی ایک رشتہ تھا۔ اس کی آس، آس کی امید۔۔۔

ماما نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر باہر نکل گیا۔ سب

کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں وہ تھکے تھکے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر جوتے کی نوک پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد ماما مقبول زیر لب بڑبڑایا۔

"وہ ایسی تو نہیں لگتی۔"

"ایسی ویسی کے سر پر سینگ نہیں ہوتے۔ قدم بھٹکتے دیر کتنی لگتی ہے۔" بتول چمک کر بولی۔

"غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔۔۔" ماما مقبول نے آہستگی سے کہا۔

"کوئی غلط فہمی نہیں ہے ماما۔ بتول کو اس نے ڈر کے مارے سب کچھ بتا دیا ہے۔" ظہور بے زاری سے بولا۔

"تو اب کیوں مکر رہی ہے۔۔۔"

"میسنی ہے اور پھر کس کا حوصلہ ہو گا کہ خود اپنے کرتوت سب کے سامنے کھولے۔ کبھی چور نے بھی کہا کہ اس نے چوری کی ہے۔" بتول نے بات کہہ کر تائید کے لیے ظہور کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو اس پر اعتبار کیا۔ صبح و شام نکلتی تھی پڑھائی کے بہانے۔ کون جانے کہاں جاتی تھی۔ اب میں اپنی دکان دیکھوں یا گھر بیٹھ کر اس کی نگرانی کروں۔" ظہور بھڑک کر بولا تھا۔ تب ہی بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد نیاز اندر داخل ہوا۔

"سلام ماما۔۔۔"

"وعلیکم السلام۔۔۔" ماما مقبول نے ذرا سا سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سے جوتے کی نوک پر نظریں جما دیں۔

"آ گئے ماما۔ چل گیا پتا۔ اپنی بھانجی کے کرتوتوں کا۔۔۔" طنزیہ لہجے میں کہتا وہ اس کے قریب بیٹھا۔

"تمہاری بھی تو کچھ لگتی ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"یہی تو مصیبت ہے کہ کچھ لگتی ہے ہماری۔ ورنہ اب تک ٹکڑے ٹکڑے کرکے دریا میں بہا دیتے۔" نیاز اپنی ہتھیلی پر مکا رسید کرتے ہوئے غرایا۔

"پھر ہم ہوتے بھی کون ہیں۔ سوتیلے کا تو نام ہی بدنام ہے۔" بتول ہاتھ نچا کر بولی۔

"پھر تم لوگوں نے سوچا کیا ہے۔" ماما مقبول نے قدرے بیزار لہجے میں پوچھا۔ وہ بار بار کی دہرائی گئی باتوں سے اکتا گیا تھا۔

"سوچنا کیا ہے۔ بیاہ کرنا ہے اس کا۔ کوئی لڑکا دیکھو پنڈ میں۔ ادھر شہر میں رشتے ملنا بہت مشکل کام ہے اور اب پہلے والی تو بات بھی نہیں رہی۔ بدنام لڑکی کو تو۔۔۔" لگتا ہی نہ تھا کہ ظہور اپنی بہن کے متعلق بات کر رہا تھا۔

"میرے ساتھ بھیج دو۔ میں خود ہی کوئی معقول لڑکا دیکھ کر اسے رخصت کردوں گا۔" ماما نے آہستگی سے کہا۔

"وہ راضی ہو گی تب نا۔۔۔" بتول بڑبڑائی۔

"تو چپ رہ۔۔۔" ظہور نے اسے گھرکا۔ پھر ماما کی طرف متوجہ ہوا۔ "تمہارے ساتھ بھیج کر جگ کی باتیں سنیں لوگ تو یہی کہیں گے سوتیلی بہن کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ اس نے تو ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ پر ہمیں تو دنیا کا منہ رکھنا ہے۔"

"مرتے ہوئے باپ کی کہی بات کا لحاظ ہے ورنہ۔۔۔" نیاز کچھ زیادہ ہی جذباتی تھا۔

"تو اب میں کیا کروں۔ اس کے ساتھ جو سلوک بھی تم لوگوں نے کرنا تھا کرلیا۔۔۔" ماما اس وقت خود کو بے حد بے بس محسوس کررہا تھا۔ وہ جانتا تھا تارا ایسی لڑکی نہیں۔ مگر وہ ان لوگوں کی بات بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔

"کرنا کیا ہے۔ بس کوئی لڑکا دیکھو۔ برادری میں بیٹھے ہو کوئی تو ہو گا۔"

"برادری میں اب کون رہا ہے۔" ماما مقبول کا ذہن دور دور تک سوچ رہا تھا۔ مگر ہر طرف مایوسی ہی نظر آرہی تھی۔

"یہ اب ہم کیا جانیں۔ حالات تمہارے سامنے ہیں۔ تم خود سیانے ہو۔۔۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے کوئی سدباب کرلو۔ ورنہ ہمارے پاس تو ایک ہی حل ہے کہ اس بے غیرت کو زندہ زمین میں

گاڑ دیں۔"

"اللہ کے واسطے پتر۔ اب مزید اس کے ساتھ کچھ مت کرنا۔ میں کرتا ہوں پچھ۔" اس کی بوڑھی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ مری ہوئی بہن کی ایک ہی نشانی تھی۔

"جلدی کرنا ماما! ہم سے اب اس کی زیادہ نگرانی نہیں ہوتی۔" نیاز کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"بیٹھو نیاز بھائی! میں چائے کا پانی رکھتی ہوں۔ بس اس چکر میں دھیان ہی نہیں رہا۔" بتول نے جلدی سے جیٹھ کو روکنا چاہا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں ہوٹل اکیلا چھوڑ آیا تھا۔" اس کا چائے کا چھوٹا سا ہوٹل تھا ماما مقبول بھی اٹھ کھڑا ہوا تو ظہور بول اٹھا۔

"تم کہاں ماما! روٹی پانی کھا کر جانا۔"

"اب روٹی کس کے گزرنی ہے پتر۔" ماما نے دل گرفتگی سے کہا۔ "بس چلتا ہوں شام گہری ہونے سے پہلے گاؤں پہنچنا ہے۔"

"ٹھیک ہے ماما! پر ذرا جلدی آنا۔ یہ نہ ہو کہ۔۔۔۔" اس کے بات ادھوری چھوڑنے پر ماما نے ملتجی انداز میں اسے دیکھا۔ جیسے کہتا ہو "اسے کچھ مت کہنا۔" پھر خاموشی سے باہر کی سمت بڑھ گیا۔

نین تارا ایک موہوم سی امید کے سہارے بیٹھی تھی کہ شاید ماما اسے ساتھ ہی لے جائے۔ مگر وہ اس سے ملے بغیر ہی چلا گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"لو بھائی ظہور! کاغذات تو سارے تیار ہیں۔" نیاز صبح ہی صبح وارد ہوا تھا۔ چولہے کے پاس پراٹھا کھاتے ظہور نے چونک کر دیکھا۔

"اتنی جلدی۔۔۔"

"کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ بس کچھ پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔" وہ پیڑھی کھینچ کر قریب بیٹھا۔

"تو اب۔۔۔"

"تو اب بس اس کے دستخط چاہئیں۔" نیاز نے ہاتھ میں پکڑی فائل پر ہاتھ مارا۔

"کر دے گی۔"

"کیوں نہیں کرے گی۔"

"نہ کیے تو۔۔۔" بتول نے خدشہ ظاہر کیا۔

"کیسے نہیں کرے گی۔ ہڈیاں توڑ دوں گا اس کی۔" نیاز بھڑک کر بولا۔

"تو بس پھر چلو پہلے دستخط ہی کروالیں۔ ہو سکتا ہے آج ماما پھر چکر لگائے۔ اس کے آنے سے پہلے پہلے یہ کام ہو جائے تو اچھا ہے۔" ظہور نے چنگیر پرے دھکیلی۔ بتول نے بھی توے سے روٹی اتار کر رومال میں لپیٹی۔ توا اتار کر آٹے والے ہاتھ رگڑتی ان کے پیچھے چلی آئی۔

نین تارا ان تینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر سہم سی گئی۔ ظہور نے شاید پھر بھی اس سے کبھی نرم لہجے میں بات کرلی ہو۔ لیکن نیاز نے جب بھی اس پر ڈالی قہر کی نظر ہی ڈالی تھی۔ اس کے باپ نے نین تارا کی ماں سے دوسری شادی کی تھی۔ اس کی ماں نے اپنی سوکن سے نفرت کی تو بہت کھل کر کی اور ہمیشہ واشگاف الفاظ میں اس کا اظہار بھی کیا۔ یہی نفرت ظہور اور نیاز کے دلوں میں بھی موجزن تھی۔ نین تارا کا نام اس کے باپ نے رکھا تھا۔ وہ واقعی ان کی آنکھوں کا تارا تھی۔ پھر اس کے دادا تھے جو ہمیشہ اسے اپنے کندھے پر سوار رکھتے۔ اس نے واقعی بہت محبتیں سمیٹی تھیں۔ شاید قدرت اسے ایک ہی بار نوازنا چاہتی تھی کہ اس کے بعد اسے محبت کی بوند بوند کو ترسنا تھا۔ تقدیر نے وہ ساری محبتیں ایک ایک کر کے چھینی تھیں۔ وہ باشعور تھی۔ تڑپ تڑپ کر روتی اور کسی دوسری محبت کا دامن کس کر پکڑ لیتی لیکن ایک کے بعد دوسری پھر تیسری۔ باپ کی وفات کے بعد جب دادا کی گود میں پناہ ملی تو انہوں نے سب کے بدلتے ہوئے رویے دیکھ کر انتہائی بے بسی و بے چارگی کے ساتھ یتیم پوتی کی طرف دیکھا۔

عمر ایک ایک سال کر کے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھی اور وہ بے بس تھے۔ کوئی ایسا سائباں نہ تھا کہ وہ مطمئن ہو جاتے۔ موت کے قدموں کی آہٹ تیز

ہونے لگی تو وہ کچھ نہ کر سکے۔ بس ایک مکان اس کے نام لگا گئے۔ ان کا یہی خیال تھا کہ اس کے کرائے سے نین تارا کی تعلیم کے اخراجات اور اسے بیچ کر اس کی شادی کا خرچ نکل آئے گا۔ کم از کم کسی پر بوجھ تو نہ بنے گی وہ۔ مگر وہ یہ بات نین تارا کو نہ بتا سکے اور وہ ان کے زیر بار آگئی۔ اسے اپنی چھوٹی سی ضرورت کے لیے گھنٹوں منتیں کرنی پڑتیں۔ اس پر خرچ ہونے والی معمولی سی رقم بھی اس پر احسان تھی۔ زندگی بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ پھر شک ذلت گالی گلوچ جس نے نین تارا سے اس کی ذات کا اعتماد بھی چھین لیا تھا۔

"یہ کاغذ ہیں۔ ان پر دستخط کر دو۔۔۔" نیاز نے کاغذات اس کی سمت بڑھائے۔ نین تارا نے بے حد حیرت سے ان کاغذات کو دیکھا۔ پھر ان سب کی طرف۔

"یوں آنکھیں نکال نکال کر کیا دیکھ رہی ہو۔ دستخط کرو۔۔۔" وہ غرایا۔ ساتھ ہی قلم کھول کر اس کی سمت بڑھایا تھا۔

"یہ کیا ہے؟۔۔۔" نین تارا نے خوف زدہ سا ہو کر انہیں دیکھا۔

"سوال مت کرو۔ جو کہا ہے بس وہ کرو۔۔۔" ظہور دھاڑا۔ وہ اب بھی متذبذب و خوفزدہ سی کبھی قلم دیکھ رہی تھی کبھی کاغذ۔ ان چہروں کی سمت دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ جو حد درجہ بیگانگی کی چادر اوڑھے اسے دہشت زدہ کر رہے تھے۔

"کر دے کر دے۔ کیوں اپنی شامت کو آواز دے رہی ہے۔" بتول نے کہا تو اس نے بمشکل پلکیں اٹھا کر اپنا سوال دہرایا تھا۔

"یہ کیا ہے بھابھی؟۔۔۔"

"جواباً" نیاز کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر لگا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ ایک طرف الٹ گئی۔ نیاز نے اسے گردن سے دبوچ کر سیدھا کیا۔

"نکاح نامہ ہے۔ تیرے اس یار کے ساتھ نکاح کروانے لگے ہیں۔" نین تارا نے ایک اذیت کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔

"دستخط کر دے سیدھی طرح سے ورنہ گردن توڑ دوں گا۔" نیاز نے ایک جھٹکے سے گردن چھوڑی۔ نین تارا کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

"ذرا سنبھل کے نیاز! کیوں آپے سے باہر ہو رہے ہو۔ اس نے انکار تھوڑی کیا ہے۔" بتول نے آگے بڑھ کر اسے ساتھ لگایا اور بائیں ہاتھ سے اس کی گردن سہلانے لگی۔ نین تارا نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرا کے اسے دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیلا۔ بتول نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ مگر برا نہیں مانا۔

"دیکھو تارا۔۔۔"

"جب تک مجھے پتا نہیں چلے گا یہ کیسے کاغذ ہیں۔ میں دستخط نہیں کروں گی۔" نین تارا چیخ اٹھی تھی۔ نیاز اور ظہور نے اچنبھے کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ وہ یوں انکار کر سکتی ہے۔

"تارا تو کیا کرے گی اس مکان کا۔ یہ تیرے بھائی ہیں کوئی غیر نہیں۔ تو۔۔۔"

"مکان۔۔۔" نین تارا چونک اٹھی۔ "وہ مکان تو دادا نے میرے نام کیا تھا۔"

"تمہیں کس نے بتایا۔۔۔" اب چونکنے کی باری ان کی تھی۔ وہ تو بتول کو گھور رہے تھے کہ اس نے کیوں بتایا کہ تارا کے نام کوئی مکان بھی ہے۔

"یہ ضرور اس کے مامے کی کارستانی ہوگی۔ اسی لیے اتنا اچھل رہی ہے۔۔۔" بتول نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"تم لوگ کچھ بھی کہو۔ میں ان پر سائن نہیں کروں گی۔ وہ مکان دادا نے میرے نام کیا ہے۔" پتا نہیں ڈرپوک سی نین تارا کے اندر اتنا غصہ کہاں سے آگیا تھا کہ وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو کر کہہ گئی۔

"نہیں کرے گی دستخط۔۔۔" نیاز کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"نہیں کروں گی۔۔۔ نہیں کروں گی۔۔۔" اس نے ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے کاغذات جھپٹے اور وہ

ٹکڑے کردیئے۔
"ہاں تو اپنے اس یار کے نام کرے گی۔" نیاز وحشیوں کی طرح پل پڑا اور ایک بار پھر اس کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

آسمان پر تیرتے کھلے ملے سرمئی بادلوں نے موسم کے تیور اچانک ہی بدلے تھے۔ ہلکی سی خوشگواریت نے ٹھنڈک کا روپ دھار لیا۔ درختوں کے سبز پیرہن کے رنگ دھندلانے لگے اور ان میں ہلکی سی زردی جھلکنے لگی۔ قریب ہی کہیں خزاں زدہ موسموں کی آہٹیں سنائی دینے لگی تھیں۔
زارا نے بالوں کو برش کر کے کلپ کیا۔ پھر شولڈر بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔
مما لان میں شام کا اخبار دیکھ رہی تھیں۔ ٹھنڈک کے پیش نظر ہلکی گرم شال ان کے کاندھوں پر تھی۔ آہٹ پر انہوں نے سر اٹھا کر زارا کو دیکھا۔
"کہاں کی تیاری ہے؟"
"زین کی طرف جارہی ہوں۔" وہ ان کے پاس رک گئی۔
"بیٹھو ذرا۔" مما نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"کہیے۔" مما نے اخبار تہہ کر کے ٹیبل پر رکھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگیں۔
"زین کے ساتھ کوئی پرابلم ہے؟"
"کیسی پرابلم؟" زارا نے چونک کر انہیں دیکھا۔
"میں کل گئی تو وہ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ کچھ خاموش بھی۔ زیادہ بات نہیں کر رہا تھا۔"
"یونہی مما موڈ ٹھیک نہیں ہوگا اس کا۔" زارا ٹالنے کو بولی۔
"موڈ کیوں خراب تھا۔" وہ اتنی پریشانی سے بولیں کہ زارا بے اختیار مسکرادی۔
"مما! آپ اسے بچوں کی طرح ٹریٹ مت کریں۔ وہ اب جوان ہوگیا ہے اور اس کی اپنی ایک پرسنل لائف ہے۔ ضروری تو نہیں کہ وہ ہم سے ہر بات شیئر کرے۔"
"تم اس سے پوچھنا تو سہی۔ کیا پرابلم ہے؟"
"آپ نے نہیں پوچھا۔"
"بہت۔ بہت پوچھا۔ مگر وہ کچھ بتانے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ بس کہنے لگا کہ پھپھو آپ کو وہم ہوگیا ہے۔"
"آپ کو کچھ نہیں بتایا تو مجھے کہاں بتائے گا۔"
"پھر بھی تم پوچھنا تو۔" وہ بضد تھیں۔
"پوچھ لوں گی۔" زارا کھڑی ہوئی۔ پھر مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"بائی دا وے مما۔ یہ آپ نے اتنی پروا کبھی میری تو نہیں کی۔"
مما نے اسے گھور کر دیکھا۔ "تم جیلس مت ہوا کرو میرے بیٹے سے۔"
"گاڈ۔ پھر بھی آپ کہتی ہیں کہ میں جیلس مت ہوا کروں۔"
"زارا۔" مما نے چڑ کر اسے دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے جھک کر ان کے گال پر پیار کیا۔
"میں کبھی جیلس نہیں ہوتی مما۔" مما نے مسکراتے ہوئے اس کے گال تھپتھپائے۔
"میں جانتی ہوں۔ ہر انسان اور ہر رشتے کی ہمارے دل میں ایک الگ جگہ ہوتی ہے جہاں کوئی دوسرا رشتہ کوئی دوسرا انسان جھانک بھی نہیں سکتا۔"
"کتنا اہم ہوگیا ہے وہ ہمارے لیے۔" زارا نے بے حد حیرت سے سوال کیا۔
"ہاں۔ اور شاید ہم اسی لیے اتنا خوفزدہ رہتے ہیں۔" مما نے ایک طویل سانس لے کر کہا تو زارا بہت کچھ سوچتی ہوئی گاڑی تک آئی تھی۔
زین لان میں ہی بیٹھا تھا۔
"ہیلو اینگری ینگ مین۔" زارا نے کہا۔ زین نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر زارا کو دیکھ کر بنا جواب دیے اٹھ کر اندر جانے لگا۔ زارا نے اس کا بازو پکڑ کر روکا۔ پھر سامنے آتے ہوئے قدرے گھور کر کہنے

لگی۔
"اچھا تو اب تم مجھے نخرے بھی دکھاؤ گے۔" زین نے بنا کچھ بولے بس اپنا بازو چھڑایا تھا۔
"اف۔ اتنی خفگی۔"
"آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟" وہ خفگی سے پوچھنے لگا۔
"تم سے ملنے۔" زارا اطمینان سے بولی۔
"مجھ سے ملنے مت آیا کریں۔" وہ روٹھے پن سے بولا۔
"کیوں؟" زارا کو اس کی خفگی پر ہنسی آرہی تھی۔
"پہلے رائے سلیمان حیدر سے اجازت نامہ لکھوا لیں۔"
"یہ بات اپنی پھپھو سے کہتے۔" زارا ذرا سنجیدہ ہوئی۔
"ان سے نہیں کہہ سکتا۔" زین جز بز ہو کر بولا۔
"ہاں ان سے نہیں کہہ سکتے۔ لیکن مجھ سے لڑ سکتے ہو اور اپنے گھر آنے سے منع بھی کر سکتے ہو۔ بس اتنی ہی پروا ہے میری یعنی کہ اکلوتی کزن کی کوئی قدر ہی نہیں۔"
"میں واقعی بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ آپ یہاں مت آیا کریں۔ مجھ سے مت ملا کریں۔ جب تک کہ۔" وہ لب بھینچ کر جملہ ادھورا چھوڑ گیا۔ زارا نے چونک کر اسے دیکھا۔
"جب تک کہ۔"
"جب تک میں بابا کو بے گناہ ثابت نہیں کر لیتا۔" زین کا لہجہ مصمم تھا۔ زارا جھنجلا گئی۔
"اگر ان کی بے گناہی کا کوئی ثبوت ہوتا۔ تو آج سے بیس بائیس برس پہلے سامنے آچکا ہوتا۔"
"کیسے سامنے آتا۔ بابا تو بزدلوں کی طرح بھاگ نکلے اور ان کے فرار نے ہی تو انہیں مجرم ثابت کیا تھا۔"
"تو تم اب کہاں سے ثبوت نکالو گے۔"
"کسی نے تو دیکھا ہوگا۔ کسی کو تو کچھ معلوم ہوگا۔"
"اگر ایسا ہوتا تو کیا تب کوئی نہ بولتا۔"
"خوف بڑے بڑوں کی زبانیں بند کر دیتا ہے۔ ہم نے تو اس کا عملی تجربہ کیا ہے۔" زین کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔ "کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور مل جائے گا جو بابا کی بے گناہی کو ثابت کر سکے اور اب یہ میں کر کے رہوں گا۔"
"زین۔" زارا نے اسے بغور دیکھا۔ "کیا تم وقت کا انتظار نہیں کر سکتے۔"
"اب نہیں۔ اور آپ۔ آپ واقعی یہاں مت آیا کریں۔ ہو سکے تو پھپھو کو بھی منع کر دیجئے گا۔ ان سے کہئے گا کہ اب زین ان کے پاس آئے گا۔"
"تم خوامخواہ اموشنل ہو رہے ہو زین۔"
"نہیں۔ میں اموشنل نہیں ہو رہا۔ حقیقت کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگا ہوں اور میرا خیال تھا کم از کم آپ تو مجھے انڈراسٹینڈ کریں گی۔" زین العابدین نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر سر جھٹک کر سنجیدہ لہجہ و انداز میں بولی تھی۔
"میں چلتی ہوں اب۔" زین العابدین نے تعجب سے اسے دیکھا پھر بے اختیار پوچھنے لگا۔
"آپ خفا ہو کر جارہی ہیں۔" زارا رک گئی۔
"تمہیں پروا ہے اس بات کی۔"
"بہت۔ بہت ہے۔" وہ بے تاب سا ہوا۔ زارا مسکرادی۔
"نہیں میں خفا ہو کر نہیں جارہی۔ شاید۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو زین العابدین۔ بس ہم لوگ ہی خود غرض ہو کر سوچ رہے ہیں۔ تمہیں جو بھی کرنا ہے کرو۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی۔"
"تھینک یو۔ تھینک یو سو مچ۔" وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔
"میں اب چلتی ہوں اور کیا مما کو منع کروں کہ وہ۔"
"میں جانتا ہوں۔ میں یا آپ انہیں روک نہیں سکیں گے۔" زین نے جملہ ادھورا چھوڑ کر بے

چارگی سے کندھے اچکائے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

ماما مقبول اس کے زخم گنتے گنتے رو پڑے تھے۔
"کیا حال کر دیا ظالموں نے۔۔۔"
"کیا سر آنکھوں پر بٹھاتے اس کو۔۔۔" کہیں کوئی پشیمانی کا احساس تک نہ تھا۔ کٹھور بے مروت لہجے۔
"میں نے کہا تھا اسے میرے ساتھ بھیج دو۔"
"ہم نے بھی کہا تھا کوئی لڑکا دیکھو۔"
"اب اتنی جلدی اچھا رشتہ کہاں سے ڈھونڈوں۔ تم لوگ تو اسے مار ہی ڈالو گے۔"
"کوئی تو ہو گا۔ اب اچھے رشتے کا انتظار مت کرتے رہنا۔ بس دو وقت کی روٹی دے دے اس مردود کو۔ بھلے کوئی بھی ہو۔" ظہور نے حد درجہ بے مروتی دکھائی۔
"ایسے کیسے دھکا دے دیں۔ کیسی لاڈلی دھی تھی زیتون اور احمد کی۔" ماما رندھی ہوئی آواز میں بولا۔
"بڑا ہی نرم دل ہے تیرا ماما۔۔۔ اتنا کچھ ہو گیا اور تو اب بھی۔۔۔" نیاز کا لہجہ مذاق اڑاتا ہوا تھا۔
"وہ اکرام بھی تو ہے ذرا اس سے بات کر کے دیکھو۔" ظہور نے یاد دلایا تو ماما مقبول نے تڑپ کر اسے دیکھا۔
"اس سے تو اچھا ہے تم اس کا گلا گھونٹ دو۔ شادیاں کرنے کا شوق ہے اسے۔ ابھی پچھلے دنوں اس کی چوتھی بیوی اسے چھوڑ کر بھاگی ہے۔"
"یہ بھاگ گئی تو سر پر ہاتھ رکھ کر روتا۔۔۔" بتول چڑ کر بولی۔
"اسے میرے ساتھ بھیج دو۔ میں خود اس کی شادی کروا دوں گا۔۔۔" ماما مقبول نے ایک بار پھر منت کی۔
"وہ مانے گی تب نا۔ اس کے دماغ پر تو وہ بنگلے والا سوار ہے۔ نہ۔۔۔ ماما نہ۔۔۔ یہ تیرے بس کی بات نہیں۔ تیری نرمی اسے اور راہ دکھائے گی۔" ظہور نے صاف بے اعتباری کا اظہار کیا۔ ماما مقبول پھر سے بے بس ہو گیا۔ وہ رو رو کر کہتی رہی۔

"ماما! مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔" ان لوگوں نے اتنا موقعہ ہی نہیں دیا کہ وہ بتا سکتی کہ یہ لوگ اس سے مکان کے کاغذات پر دستخط کروا رہے ہیں۔
"بس ماما! اب تم گئے آؤ تو کوئی رشتہ دیکھ آنا۔ ورنہ پھر میں خود اکرام سے بات کرتا ہوں۔" نیاز نے رکھائی سے کہا۔ ماما مقبول نے بڑی بے بسی سے ان سب کی طرف دیکھا۔ پھر چارپائی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ نجانے کیوں ٹانگیں بے جان سی ہو گئی تھیں۔
"میں چلتا ہوں۔۔۔"
اب کے بتول نے اسے چائے کے لیے بھی نہیں روکا تھا۔ باہر نکل کر بہت دیر تک وہ نجانے کیا سوچتا رہا تھا۔ اس کے قدم بار بار ایک ہی رستے پر اٹھتے اور پھر رک جاتے تھے۔ انا اور خودداری کہتی تھی۔
"مت جاؤ۔۔۔" عزت نفس قدموں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ مگر نین تارا کی حالت اسے اسی رستے کی طرف دھکیل رہی تھی۔
"نہیں مجھے وہاں نہیں جانا۔" اس نے خود کو گھر کا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور قدم چپکے چپکے اس رستے کی طرف اٹھ گئے تھے۔ بس اس نے خود کو اس گھر کے سامنے پایا۔ جس کے بارے میں اس نے چپکے چپکے معلومات کی تھیں۔
سب کہتے تھے وہ پڑھا لکھا اور بے حد شریف لڑکا ہے۔ وہ کچھ شش در سا بند گیٹ کو گھورتا رہا۔
"کیا پتا وہ سچ مچ تارا سے شادی کرنا چاہتا ہو۔" اس نے ایک نظر اس پرانے مگر خوبصورت گھر پر ڈالی۔ اس کا ہاتھ متذبذب سا اٹھا اور پھر جھک گیا کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور پلٹ جانا چاہا۔ مگر نین تارا کی سسکیوں کی صدا نے اس کے قدموں کو زنجیر کر دیا۔ اس کے بوڑھے ہاتھ نے بے اختیار بیل پر انگلی رکھی۔

ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔" دور کہیں بیل گونجی اور یہ آواز اس کے دل پر ہتھوڑے کی طرح لگی تھی۔ اس کی عزت نفس، انا اور خودداری پر بڑی کاری ضرب تھی۔ گیٹ کھلا تو وہ سر نہ اٹھا سکا۔

"جی بابا جی۔۔۔" سلیم نے پوچھا۔ تو اس نے ذرا سا نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ملازم نما لڑکا ہاتھ میں جھاڑن پکڑے منتظر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"تمہارا صاحب ہے۔" اس نے آہستگی سے پوچھا۔
"جی بھائی جان ہیں۔ اندر آجائیں۔" سلیم نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا اور رستہ چھوڑ دیا۔ وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔
"بھائی جان یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔۔۔" سلیم نے کہا۔ وہ بک ریک میں کتابوں کو ترتیب دے رہا تھا۔ زین نے پلٹ کر دیکھا پھر کھڑا ہو گیا۔
شکل و صورت اور وضع قطع سے دیہاتی نظر آنے والا یہ شخص اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ ماما مقبول نے ایک نظر بغور سامنے کھڑے تئیس چوبیس سالہ خوبرو اور خوش شکل نوجوان کو دیکھا۔ ماما مقبول نے ساری زندگی ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزاری تھی۔ مگر وہ انسانوں کی پہچان رکھتا تھا۔ اسے لگا یہ نوجوان کبھی کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔
"جی بابا۔۔۔"
اور ماما مقبول کو یاد آیا کہ وہ یہاں کس لیے آیا ہے۔ تو پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔ اس نے صافے سے پسینہ صاف کیا۔ اس کے ایک ایک انداز سے الجھن، پریشانی اور تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔
"کیا ہوا بابا۔۔۔ کوئی پریشانی ہے۔" وہ اسے جانتا نہ تھا مگر کس قدر اپنائیت بھرا لہجہ تھا۔ ماما مقبول سسک اٹھا۔

"میں اس بدنصیب کا ماما ہوں۔۔۔" زین العابدین نے الجھ کر اسے دیکھا۔
"کس کی بات کر رہے ہیں۔"
"نین تارا۔ ظالموں نے بڑا برا سلوک کیا ہے اس کے ساتھ۔ مجھے پتا ہے تم دونوں کوئی کھیل نہیں کھیل رہے۔ وہ کبھی تم سے ملنے یہاں نہیں آئی۔ سب کہتے ہیں تم ایک شریف باپ کا خون ہو۔ سب تمہارے کردار کی تعریف ہی کرتے ہیں۔"
زین ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ غصے میں لال پیلے ہوتے دو جاہل مرد اور یہ آنسو آنسو روتا بوڑھا۔ کہانی نجانے کیا رخ بدل رہی تھی اور وہ زبردستی ہی اس کہانی کا اک اہم کردار بن گیا تھا۔ زین نے ایک طویل سانس لے کر سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔ وہ اس لڑکی پر گزری مصیبتوں اور مظالم کا ذکر کر رہا تھا۔ زین دم بخود تھا۔ یہ کون لوگ تھے۔ ایک ذرا سی بات کی بنیاد پر یہ کیا ظلم ڈھا رہے تھے۔ اس کا نرم دل اس مظلوم لڑکی کے لیے گداز ہونے لگا۔
"بابا! جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں جھوٹ ہے۔"
"ہاں۔۔۔" ماما مقبول نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "لیکن وہ لڑکی وہ تو ماری گئی نا۔"
زین کے دل کو ایک تاسف نے گھیر لیا۔ اسے پہلی بار کسی کی مدد کرنے پر افسوس ہونے لگا۔ شاید وہ اس لیے اتنی ڈری سہمی اور خوفزدہ سی لگتی تھی۔
"اب۔۔۔ میں کیا کر سکتا ہوں اس کے لیے۔۔۔" زین نے قدرے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔
"تم۔۔۔" ماما مقبول نے تذبذب کے عالم میں اسے دیکھا۔ پھر اپنی ساری بکھری قوتوں کو مجتمع کیا۔
"اگر تم واقعی اس کو پسند کرتے ہو تو اس سے شادی کر لو۔۔۔"
"جی۔۔۔!" زین بھونچکا رہ گیا۔

(باقی آئندہ)

راحت جبیں

یونیورسٹی میں ایک زین کا ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا زارا کو شدید ناگوار گزرتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی تھی۔ اس کی دوست بھی متوجہ ہونے لگی تھیں۔ ایک دن زین نے اسے مخاطب کرکے کہا کہ اس کے بابا اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ زارا حیران رہ گئی۔ وہ اس کے بابا سے ملنے اسپتال گئی' وہ سو رہے تھے۔ زارا واپس آگئی۔ اسے اسلام آباد جانا پڑا۔ دوبارہ وہ ان کے پاس نہ جاسکی۔ اسلام آباد سے واپس آئی تو پتا چلا کہ زین کے ابو کی وفات ہوگئی ہے۔

زارا زین کے گھر گئی تو اس پر انکشاف ہوا کہ زین کے ابو رائے جمشید حیات تھے۔ جن پر زارا کے تایا کے قتل کا الزام تھا۔ رائے جمشید حیات اس کے سگے ماموں تھے۔ زارا کی امی کو پتا چلا تو وہ رو رو کر بے حال ہوگئیں۔

زارا کے تایا کی زمینیں تھیں جو اس کے تایا زاد بھائی سلیمان سنبھالتے تھے۔ سلیمان نے ہی رائے جمشید حیات پر الزام لگایا تھا زارا کا نکاح سلیمان کے چھوٹے بھائی رضوان سے ہوچکا تھا۔ رضوان باہر پڑھنے گیا ہوا تھا۔

زین کی زارا سے بہت دوستی ہوگئی تھی۔ رضوان بھی باہر سے پڑھ کر آگیا تھا۔ وہ سلیمان سے بہت مختلف مزاج رکھتا تھا۔ اور سلیمان کی نسبت بہت روشن خیال اور فراخ دل تھا۔

ناولٹ

۴

چوتھی قسط

"وہ مرجائے گی۔۔۔" ماما مقبول سسک اٹھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟" وہ بمشکل خود کو سنبھال پایا لیکن نہیں۔۔۔ وہ اب بھی حیرت میں گم سامنے کھڑے شخص کو یوں دیکھ رہا تھا' جیسے اس کی سماعتیں سننے میں دھوکا کھارہی ہوں۔

"وہ اس کو مار ڈالیں گے۔" اس کی لرزیدہ آواز میں التجا تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔؟"

"وہ بڑی مشکل میں ہے پتر! اللہ کے واسطے اس کی مدد کرو۔ اس سے شادی کرلو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگا تھا۔

"دیکھیں بابا! میں۔۔۔ یہ۔۔۔ یا اللہ"

وہ ایک دم گھوم کر بک ریک پر اپنے ہاتھ جما کر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ سب اس کے لیے بہت غیر متوقع تھا۔ اس کے عقب میں ماما مقبول اب بھی خاموش نہیں ہوا تھا۔ اس کی سسکتی بلکتی آواز زین کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس بوڑھے کو اٹھا کر باہر پھینک دے۔ مگر وہ بڑے ضبط سے پلٹا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اسی متحمل لہجے میں بولا۔

"دیکھیں بابا! آپ سب لوگ بلاوجہ بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔ میرا اور اس لڑکی کا نہ تو ایسا کوئی تعلق تھا، نہ ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔ آپ خدا کے لیے بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ مشکل میں تھی۔ میں نے اس کی ذرا سی مدد کردی۔ اس کی جگہ کوئی بوڑھی اماں، کوئی بزرگ، کوئی بچی، بھکاری، کوئی بھی ہوتا، میں یہی کرتا۔ مدد کرنا گناہ نہیں ہے۔ خدا کے لیے آپ لوگ اسے جرم مت بنائیں۔"

"اس پر یہ مصیبت تمہاری وجہ سے ٹوٹی ہے۔" وہ اب بھی بضد تھا۔

"میں نے مان لیا۔ میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں گا۔ اس سے بھی اور اس کے بھائیوں سے بھی۔ تائب ہو جاؤں گا کسی کی بھی مدد کرنے کے خیال سے۔"

"کچھ بھی نہیں لے گی تمہارا۔ یہیں کسی کونے میں پڑی رہے گی۔ بھلے دو وقت کی روٹی بھی نہ دینا۔ بس اپنا نام دے دو۔" نجانے کون سی امید تھی جو ماما مقبول کو پسپا ہونے ہی نہ دیتی تھی۔

"فار گاڈ سیک۔" زین ایک دم مشتعل ہوگیا۔ "یہ کیا ڈرامہ کر رہے ہیں آپ لوگ مل کر۔ کیا میں جس کی مدد کروں اسی کے ساتھ شادی رچانا شروع کردوں۔ کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ کچھ تو سوچیں یہ بات کرنے سے پہلے۔ آپ مجھے جانتے نہیں۔ میں کون ہوں۔ کیسا ہوں، میری عادات و کردار کیا ہے اور مجھ سے آگر کہہ رہے ہیں کہ میں اس لڑکی سے شادی کرلوں۔ آپ پلیز چلے جائیں یہاں سے۔۔۔ کوئی اور دیکھیں۔۔۔ میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اس کے یوں چیخ اٹھنے پر ماما مقبول ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ زین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نچلا لب دانتوں میں چباتے ہوئے وہ بے حد مضطرب نظر آرہا تھا۔ ماما مقبول کی ڈبڈبائی ملتجی نگاہیں اسے کچھ اور ڈسٹرب کر رہی تھیں۔ وہ کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر پلٹ گیا۔ اس نے اپنے بہتے آنسو صاف کرنے کی کوشش بھی نہ کی تھی اور اپنے تمام تر غصے کے باوجود اس کی آخری نگاہ زین کے اندر گڑ گئی۔ وہ کچھ لمحے یونہی کھڑا لب کاٹتا نجانے کیا سوچتا رہا۔ پھر بے اختیار باہر کی طرف لپکا۔ ماما مقبول کو اس نے گیٹ کے پاس روکا تھا۔

"دیکھیں بابا! میں کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ میری کسی بات سے آپ ہرٹ ہوئے ہوں۔ تو میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں لیکن میں وہ نہیں کر سکتا جو آپ چاہتے ہیں۔"

ماما مقبول نے خاموشی سے اس کی بات سنی پھر چھوٹا دروازہ دھکیل کر باہر نکل گیا۔

"کیا ہوا بھائی جان؟" سلیم نے قریب آکر حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔" وہ سر جھٹک کر ڈسٹرب سا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ماما مقبول بہت دیر تک اپنے سامنے پھیلے دریا کے چوڑے پاٹ کو دیکھتا رہا۔ کنارے کی پھیلی گھاس کے ساتھ بوسیدہ و پرانی سی کشتی رکی تھی۔ جس میں بوڑھا ملاح چہرے پر کپڑا ڈالے اونگھ رہا تھا۔ سورج کی کرنیں چھدرے درختوں سے چھن چھن کر دریا کے نیلے پانیوں میں رنگ گھول رہی تھیں۔ ہوا دھیرے دھیرے درختوں کے پتوں سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ماما مقبول نے صافے سے اپنی جلتی آنکھیں رگڑیں۔ ہوا کی سرگوشی ایک واضح آواز میں ڈھل گئی تھی۔

"پتا نہیں بیٹی کیا چیز ہوتی ہے مقبول! نیاز بھی ہے اور ظہور بھی۔ پر جب وہ مجھے ابا کہتی ہے تو مجھے لگتا ہے میرا دل بھر گیا ہے۔ کیسا کرم کیا رب نے، میرے گھر میں رحمت اتار دی۔ پتا نہیں کون لوگ ہیں جو بیٹیوں کو دھتکارتے ہیں انہیں بوجھ سمجھتے ہیں۔"

محبت کا دریا بہتا تھا اس آواز میں۔

"پرایا دھن ہوتی ہیں احمد۔۔۔" مقبول نے اپنی آواز سنی۔

"ہاں تو ڈھونڈوں گا نا میں بھی اس کے لیے کوئی شہزادہ۔ سدا سکھ کا جھولا جھولے گی میری نارو۔"

"آو! دیکھ احمد! کیسا سکھ کا جھولا جھولی ہے تیری نین تارہ۔" ٹپ ٹپ کئی آنسو اس کے ہاتھ کی پشت پر گرے۔ ماما مقبول کو لگا یہ آنسو اس کے نہیں احمد کے ہیں۔ تب ہی ایک اور آواز الفاظ کا روپ دھار کر اس کی سماعتوں پر آگری۔

"دیکھ تو بھرا مقبول! میری نینو کیسا پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہی ہے ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔ ماں صدقے۔۔۔ ماں واری۔۔۔ بھلا کرنے دے گی اپنی دھی رانی کو۔۔۔"

"او وہ پاگلے! کتنی بار سمجھایا ہے نہ کیا کر اتنا پیار۔ بیٹیوں سے اتنا پیار نہیں کرتے۔"

"نہ بھرا! ایسے تو مت بولو۔ سب کہتے تھے، زیتون بانجھ ہے۔ اس نے تو میرا بھرم رکھ لیا۔ میرے قدموں تلے جنت آئی اس کے آنے سے۔ میری تو آنکھوں کا تارہ ہے، میرے دل کی ٹھنڈک۔" اور اس سے اگلی آواز ماما مقبول کے دل کو مسلتی چلی گئی۔

"میری نینو کا خیال رکھنا مقبول! میں نے کبھی اس سے سخت آواز میں بات بھی نہیں کی۔ بڑی ملوک سی دھی ہے میری۔ اسے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ خدا کے بعد بس ایک تیرا آسرا ہے۔"

"اللہ سوہنے! تیرے بھید تو ہی جانے۔" اک آہ اس کے لبوں پر ٹوٹ کر بکھری۔ آنکھیں پھر سے ساون رونے لگی تھیں۔ "تیری قسمت میں یہی خواری لکھی تھی نین تارہ! کاش تو مرجاتی۔ کاش تو بھی زیتون اور احمد کے ساتھ ہی مرجاتی۔"

وہ گھٹنوں کے بل ریت پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ہمارے بعد کیا گزری عزیزو
سناؤ شہر کیسا رہ گیا ہے

ان تینوں کے اندر قدم رکھتے ہی افتخار نے بے اختیار شعر پڑھا۔ عظمیٰ نے ایک دم سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سے انجان بن کر فائل کری پر رکھنے لگی۔ افتخار کے لبوں پر مبہم مسکان کچھ اور گہری ہوئی۔ ایک بازو کرسی پر پھیلائے وہ قدرے ریلیکس انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا آصف جھنجھلا گیا۔

"سارے شہر کا حال تو تمہیں سنا چکے۔ اب مزید کیا سننا باقی ہے کہ ایک ہفتے میں لاہور لاہور نہیں رہا، سوئٹزرلینڈ ہو گیا ہے۔" افتخار نے جواب نہیں دیا۔ یونہی مسکراتا رہا۔

"خدا کا شکر ہے افتخار بھائی! تم لوٹے تو۔ اس ایک ہفتے میں ڈیپارٹمنٹ میں کوئی رونق نہیں تھی۔" نعم اپنے بے ساختہ انداز میں بولی۔

"اچھا!" افتخار کی آنکھوں میں چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"اچھا بھلا سکون تھا۔" عظمیٰ چڑ کر بڑبڑائی تھی۔

"عظمیٰ بی بی کیا فرما رہی ہیں؟" اس نے کان میں انگلی چلاتے ہوئے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ جیسے عظمیٰ کے بات دہرانے کا منتظر ہو۔

"کچھ نہیں کہہ رہی۔ تم سناؤ۔ کب واپس آئے ملتان سے۔؟" زارا نے اچٹتی سی نظر اٹھتی کلستی

عظمیٰ پر ڈال کر بات بدلی۔ افتخار ابھی اپنے ملتان کے ٹور کے بارے میں بتانے ہی لگا تھا۔ جب میڈم تبسم آگئیں۔ دوران لیکچر زارا نے دیکھا تھا۔ عظمیٰ ایک لفظ بھی نوٹ نہیں کر پائی تھی۔

"کوئی پرابلم۔۔۔" زارا نے ذرا سا اس کی طرف جھک کر پوچھا۔ عظمیٰ نے چونک کر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا کر نوٹ بک پر جھک گئی۔ جیسے ہی میڈم باہر نکلیں وہ بھی بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی تھی۔ زارا نے ایک طویل سانس لے کر افتخار کو دیکھا۔ اس نے حسب معمول عظمیٰ کے جانے کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھا تھا۔ پھر آصف کی طرف متوجہ ہوا جو اس سے کسی پنجابی نظم کی فرمائش کر رہا تھا۔

"ہاں تو سنو۔" وہ فوراً "شروع ہو گیا۔

"میرے دل دیاں سونیاں کنداں
تیری آس دے پنکھے پھیرو
میری رات۔۔۔"

زارا سر جھٹک کر باہر نکل آئی۔ انعم پہلے ہی جا چکی تھی۔ اب کاریڈور میں نجانے کس بات پر عظمیٰ سے جھگڑ رہی تھی۔ زارا تیز تیز قدموں سے ان کے قریب آئی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" زارا نے اسے آہستگی سے ٹوکا پاس سے گزرتی شہلا بھی رک گئی تھی۔

"خیریت انعم بہت غصے میں لگ رہی ہے۔"

"یونہی ہمیں نخرے دکھا رہی ہے۔" عظمیٰ مسکرائی۔ زارا کو اس کی مسکراہٹ خود ساختہ لگی۔ شہلا کو آصف نے آواز دے لی تو وہ اس کی طرف چلی گئی۔

"اچھا۔ مجھے لائبریری جانا ہے۔ تم لوگ چل رہے ہو۔" عظمیٰ نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے پوچھا تو انعم تاؤ کھا کر زارا کی طرف پلٹی۔

"پہلے اس سے پوچھو کہ یہ کس سے بھاگ رہی ہے؟۔۔۔"

"ہاں بھئی تم کس سے بھاگ رہی ہو؟۔۔۔" زارا نے اسی طرح انعم کا سوال عظمیٰ کی طرف ٹرانسفر کیا۔

"میں کس سے بھاگوں گی۔" عظمیٰ نے قدرے حیرت سے زارا کو دیکھا۔ جواباً" وہ کندھے اچکا کر بولی تھی۔

"مجھے کیا پتا" انعم پوچھ رہی ہے۔"

"انعم تو بے وقوف ہے' خوامخواہ اموشنل ہو رہی ہے۔"

"اور تم بہت خوش ہو۔۔۔؟" انعم نے جھجھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیا مجھے خوش نہیں ہونا چاہیے۔ ایک ٹھیک کام ٹھیک وقت پر ہونے جا رہا ہے۔" عظمیٰ کا لہجہ مطمئن سا تھا۔

"ہاں تمہاری انا سربلند رہے بس۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا عظمیٰ بی بی! تم ساری عمر ترسو گی۔ جو لوگ اس بے دردی سے محبت کو ٹھکراتے ہیں۔ محبت انہیں کبھی معاف نہیں کرتی۔"

"انعم! بددعا تو مت دو۔" عظمیٰ کا لہجہ عجیب سا تھا۔ انعم ایک دم چپ ہو گئی۔ پھر گویا تھک کر پوچھنے لگی۔

"کیوں کر رہی ہو عظمیٰ اس طرح؟"

اور عظمیٰ کی نگاہیں بے حد خاموشی سے اپنی ہاتھ کی لکیروں سے الجھنے لگیں۔

"وہ اب بھی تمہاری قسمت بن سکتا ہے۔ تم کوئی اشارہ تو دو۔" انعم نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر آہستگی سے کہا۔ عظمیٰ نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا پھر آہستگی سے ہاتھ چھڑا لیے۔

"تم سے کس نے کہا' میں اسے اپنی قسمت بنانا چاہتی ہوں۔"

انعم بری طرح چڑ گئی۔

"ہاں تم کسی سے بھی شادی کر سکتی ہو' بس افتخار کھوکھر سے نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔ عظمیٰ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ مگر کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ زارا ایک طویل سانس لے کر اس کے سامنے آئی۔

"اب مجھے بھی کچھ بتاؤ گی۔"

"کیا بتاؤں۔ خود تو منگنی کروانے پر تلی ہے اور میرا ایک پرپوزل اس سے ہضم نہیں ہو رہا۔ اب تم ہی بتاؤ۔ ہمارے جیسے سفید پوش گھرانوں میں تو یوں بھی پرپوزل بلکہ اچھے پرپوزل خال خال ہی آتے ہیں۔ امی' ابو کا خیال ہے کہ رشتہ ٹھیک ٹھاک ہے انہیں ہاں کر دینی چاہیے تو میں کیسے انکار کر دوں۔"

وہ نظریں چرائے بظاہر نارمل سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ زارا نے حیرت سے کہا۔

"عظمیٰ۔۔۔!"

"اب تم بھی زارا کی طرح مجھے ہی سمجھاؤ گی۔" وہ جھنجلا گئی۔

"نہیں۔ تم خود سمجھ دار ہو۔ زیادہ بہتر جانتی ہو کہ کیا فیصلہ کرنا ہے۔ بس اتنا کہوں گی کیا یہ زیادہ بہتر نہیں کہ ہم اپنی زندگی ایسے شخص کے ساتھ بسر کریں جو ہم سے محبت کرتا ہو۔"

"اس سے زیادہ بہتر ہے کہ ہم سر اٹھا کر جئیں۔ کہیں کوئی پچھتاوا' کہیں کوئی کمی نہ ہو۔۔۔" عظمیٰ کا لہجہ مضبوط تھا۔

"سر اٹھا کر تو تم جی لو گی۔ مگر ذرا غور کرنا کیا واقعی کوئی پچھتاوا کہیں کوئی کمی نہ ہو گی۔" زارا کے سوال پر اس نے نظریں چرا کر بس اتنا کہا تھا۔

"تو لائبریری چلتے ہیں۔"

اور زارا نے مزید کچھ بھی کہنے کا ارادہ ملتوی کر کے اس کے ساتھ قدم بڑھا دیے تھے۔ لائبریری میں زین بیٹھا تھا۔ زارا نے دانستہ نظر انداز کیا تھا۔ وہ زین کو تھوڑا وقت دینا چاہتی تھی تاکہ جو کچھ اس نے کل زارا سے کہا تھا اس پر غور کر سکے۔ عظمیٰ نے کچھ کتابیں ایشو کروائی تھیں۔ سو وہ کتابیں لے کر واپس آ گئیں۔ اپنی سوچوں میں گم زین نے اسے دیکھا ہی نہ تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

نلکے کے پاس کوئی ہمسائی بیٹھی تھی۔ صحن میں بلب کی زرد تیز روشنی پھیلی تھی۔ چولہے میں آگ جل رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے آگ سینکنے میں مصروف تھی۔ پاس ہی مونگ پھلی کے چھلکوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگی تھی۔ ماما مقبول گھر میں داخل ہوا تو بتول کی تیوری چڑھ گئی۔

"تو ماما! تم ابھی تک یہیں پھر رہے ہو۔"

ماما مقبول خاموشی سے کونے میں لگے نلکے کی طرف بڑھ گیا۔ ٹھنڈے پانی کی دھار نکلی تو وہ جلتی آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈالنے لگا۔

"تم گاؤں نہیں گئے ماما۔۔۔؟" بتول نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" ماما نے ذرا سا ہاتھ روک کر مختصراً" کہا اور پھر سے منہ دھونے لگا۔ تب ہی ہمسائی بتول کی طرف جھک کر رازداری سے پوچھنے لگی۔

"اس کو پتا ہے۔۔۔"

"سب پتا ہے۔۔۔" بتول نے اس کا ہاتھ دبایا اور پھر ماما مقبول کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پنڈ کیوں نہیں گئے ماما۔۔۔؟"

"کام تھا۔۔۔" ماما مقبول نے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔

"کون سا کام ماما؟" بتول کو نجانے کون سی کھدبد لگی تھی۔ ماما مقبول نے پلٹ کر دیکھا۔ تو جلدی سے بولی۔ "میرا مطلب تھا گاؤں نہیں جانا تھا تو ذرا جلدی گھر آجاتے۔ اب تو روٹی بھی ختم ہو گئی۔"

"روٹی کھا آیا ہوں۔۔۔" اس نے یونہی کہہ دیا۔ چند قدم آگے بڑھائے پھر رک کر پوچھنے لگا۔

"ظہور کہاں گیا ہے۔"

"بیٹھا ہو گا کہیں منہ چھپائے۔ چار بندوں میں بیٹھنے کے قابل کہاں چھوڑا اس کلموہی نے۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ماما مقبول سر جھٹک کر بند دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ فوراً "بول اٹھی۔

"اب اس سے کیا مذاکرات کرنے ہیں۔"

ماما نے بغیر جواب دیے باہر گلی چٹخنی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔

"پتا نہیں کیسا بے غیرت اور ڈھیٹ بندہ ہے۔" وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ مامے مقبول نے سوئچ بورڈ ٹٹول کر بٹن دبایا تو کمرہ تیز روشنی سے بھر گیا۔ وہ اب بھی اسی دیوار کے ساتھ گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ مامے مقبول کے دل پر گھونسا پڑا۔ اس نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کونے میں چارپائی پر لحاف پڑا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے چارپائی تک آیا اور لحاف اٹھا کر اس پر ڈال دیا۔ اس کے بے جان سے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھام اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے دھیرے دھیرے پکارنے لگا۔

"تارو... تارو پتر..."

اس کی گھنی پلکیں آپس میں جڑی تھیں۔ چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔

بتول دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

ماما مقبول نے پلٹ کر دیکھا۔ پھر چڑ کر بولا تھا۔

"کیا ہے۔ سو جاؤ جا کر۔ میں ہوں اس کے پاس۔ کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔"

"میں تو دیکھنے آئی تھی کہ..."

مامے مقبول نے اب کے یوں دیکھا جیسے کہتا ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ مامے مقبول نے تارہ کی ساکت پلکوں کو دیکھا اور ڈر گیا۔

"تارو... تارو پتر! آنکھیں تو کھول۔" اس نے تارہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے ساکت وجود میں ذرا سی جنبش ہوئی۔ نم پلکوں میں لرزش سی ابھری اور اس کے ساتھ ہی آہوں اور سسکیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ نجانے کہاں کہاں سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

"تارو!" مامے مقبول نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ تارہ کی آنکھیں دھیرے سے کھلیں۔ درد کی اک تیز لہر اٹھی۔ جسے اس نے لاشعوری طور پر نچلا لب دانتوں تلے دبا کر روکنے کی کوشش کی تھی۔ کچھ لمحے وہ یونہی اپنے اوپر جھکے بوڑھے چہرے کو تکتی رہی۔ یہ چہرہ اپنے خدوخال بدل لیتا تھا۔ یہ نم دکھی آنکھیں کسی اور کی آنکھوں میں ڈھل جاتی تھیں۔ ہاں ایک مماثلت تھی ان سارے چہروں میں۔ دھند کی اوٹ سے چھپکے چھپکے جھانکتے یہ سارے چہرے غم زدہ تھے اور ساری آنکھیں رو رہی تھیں۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ گرم سیال اس کی کنپٹی پر بہہ نکلا۔

"نہ رو' تو تو بڑی صابر دھی ہے۔" مامے مقبول نے اپنی ہتھیلی سے اس کا چہرہ صاف کر کے پیشانی چومی۔ اس نے ایک پل کو آسودگی سے آنکھیں بند کیں۔ پھر بدقت اٹھ بیٹھی۔

"ماما! یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"لحاف اچھی طرح اوڑھ لو۔ سردی بہت ہے۔" مامے مقبول نے آہستگی سے کہا۔

"ماما یہ لوگ... یہ کہتے ہیں مکان ان کے نام لکھ دوں۔" اس نے آہستگی سے لحاف اپنے کندھوں تک کھینچ لیا۔

"کیا؟" ماما مقبول بری طرح چونکا۔

"ماما! میں مکان ان کے نام لکھ دوں؟۔" وہ اس سے گویا پوچھ رہی تھی۔

"تو اس لیے یہ حال کیا ہے ان وحشیوں نے تیرا..." ماما مقبول زیر لب بڑبڑایا۔

"ماما! یہ... یہ مجھے مار ڈالیں گے۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو..." اس نے خوفزدگی کے عالم میں التجا کی۔

"ہاں میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔" مامے نے گویا تسلی دی۔ اس نے دونوں ہتھیلیوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ مامے مقبول نے نظریں چراتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا۔

"چل اٹھ چارپائی پر چل کر بیٹھ۔ اتنا ٹھنڈا فرش ہے۔"

نین تارا نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر لبوں سے چیخ نکل گئی۔ ایڑی پر ڈھائی تین انچ لمبا زخم کھل گیا تھا۔ سارا پاؤں سوج رہا تھا۔

"پٹی کیوں اتار دی۔" ماما تڑپ اٹھا۔

"یہی تو فساد کی جڑ تھی۔" وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ بمشکل خود کو گھسیٹ کر چارپائی تک لائی۔ ماما مقبول نجانے کس سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ اسے سہارا بھی نہ دیا۔

"میں آج اس کے پاس گیا تھا۔"

نین تارا نے چارپائی پر گرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں نے اس سے کہا وہ تم سے شادی کر لے مگر..."

اور نین تارہ کا دل چاہا وہ ان دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے۔

"اور کتنا ذلیل کرو گے مجھے۔" جو اپنے تھے سر سے چادر کھینچ رہے تھے اور یہ شخص اس کے لیے عزت کی بھیک مانگ رہا تھا اور وہ بھی اس سے جو اس کا کچھ بھی نہ لگتا تھا۔ یا اللہ اور کتنی خواری لکھی ہے...

بتا کس جرم کے معتوب ٹھہرائی گئی۔ ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا کہ جیتے جی دوزخ میں ڈال دیا' بے بسی سی بے بسی۔ بس ایک آنسوؤں پر اختیار تھا اور رات کا دامن آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔

♥ ♡ ♡ ♥

فائنل ایگزام جیسے جیسے نزدیک آ رہے تھے۔ ہر کوئی افراتفری کا شکار ہو رہا تھا۔ افتخار کی شاعری بھی کم ہو گئی تھی۔ شہلا اور آصف کے گروپ نے شاید ابھی کتابیں کھولی تھیں۔ وہ ایک ایک سے نوٹس مانگتے پھر رہے تھے۔ کوئی تھیسس میں مصروف تھی' کسی کی اسائنمنٹ ادھوری۔ عظمیٰ کو اپنی پوزیشن کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ سو وہ ہمیشہ لائبریری کے کسی نہ کسی کونے میں پائی جاتی۔ پروفیسرز کے لیکچرز کے ساتھ ساتھ نصیحتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ انعم کی لاپروائی کا وہی عالم تھا۔ وہ دن گن گن کر اپنی خالہ کا انتظار کر رہی تھی۔ زارا بھی سنجیدگی سے اسٹڈی میں مصروف تھی۔ عظمیٰ اپنے نوٹس بانٹنے میں لگی رہتی اور انعم اس سے لینے میں۔

"اتنی محنت سے بنائے گئے نوٹس کتنی آسانی سے بانٹ دیتی ہے یہ لڑکی۔"

"تمہیں بھی تو دیتی ہوں۔" عظمیٰ نے اپنی عینک ٹھیک کی۔

"میں تو خیر تمہاری سہیلی ہوں۔" اس نے ڈھٹائی سے کندھے اچکائے۔

"ہاں اپنے پاس ڈھیر جمع کیا ہے۔ کبھی انہیں پڑھنے کی زحمت بھی کر لیا کرو۔" زارا نے ڈانٹا۔

"پاس ہونا ہے نا' ہو جاؤں گی۔" اس نے لاپروائی سے کہہ کر میز پر ہاتھ مارا اور چھوٹے کو بلا کر چائے کا کہنے لگی۔ پھر دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے ان کی طرف پلٹی۔

"یار! سردی بڑھتی جا رہی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے..." زارا نے تائید کی تو وہ عظمیٰ سے پوچھنے لگی۔

"تمہاری امی نے ابھی تک بیسن نہیں بنایا۔"

"ابھی تو نہیں بنایا۔"

"بنایا تو مجھے ضرور بھجوانا۔" پھر زارا سے کہنے لگی۔

"عظمیٰ کی امی بیسن بہت مزے کا بناتی ہیں۔"

"کچھ ہاتھ پیر خود بھی ہلا لیا کرو۔"

"ہلاتی تو ہوں مگر صرف دعا مانگنے کے لیے کہ اللہ میاں جی خالہ جلد آ جائیں۔ ویسے زارا! عظمیٰ! مجھے لگتا ہے خالہ کی نیت خراب ہو گئی ہے۔ تب ہی تو اب منگنی کا ذکر بھی نہیں کر رہیں۔" وہ بے حد تشویش سے کہہ رہی تھی۔ تب ہی افتخار ان کے پاس آ گیا۔

"اور سنائیں کیا حال چال ہے؟۔" خالی کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ ٹکاتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

"ہمارے حال تو ٹھیک ہیں۔ مگر تم آج کل کچھ موڈ میں نہیں لگتے۔" زارا نے مسکراتی نگاہوں سے عظمیٰ کو دیکھا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

"دو سال یونیورسٹی میں یونہی گزار دیے۔ اب تھوڑا پڑھنے بھی دیں زارا بی بی۔"

"اگر کوئی پرابلم ہو تو عظمیٰ کے پاس کافی اچھے نوٹس

ہیں۔ سب کو دے دیتی ہے۔" انعم نے فوراً "آفر کی۔ عظمیٰ نے اسے بری طرح گھورا تھا۔ افتخار کی آنکھوں میں تبسم جاگا۔

"ہمیں یہ سب میں شامل ہی کہاں کرتی ہیں اور سنائیں عظمیٰ بی بی! اباجی کا کیا حال ہے۔؟" وہ فوراً" ہی لہجہ بدل کر پوچھنے لگا۔

"ٹھیک ہیں......" عظمیٰ نے جز بز ہو کر جواب دیا۔

"میرا سلام کہیئے گا۔"

"چلیں اب۔" افتخار کی بات نظرانداز کر کے اس نے زارا کو دیکھا۔

"نہیں جی۔ بیٹھیں آپ لوگ..... میں چلا جاتا ہوں۔" اس کا لہجہ ہی ایسا ہوتا تھا کہ عظمیٰ پزل ہو جاتی تھی۔

"کیا بدتمیزی تھی یہ....." افتخار کے جانے کے بعد وہ انعم پر برس پڑی۔

"بدتمیزی کی کیا بات ہے۔ سب کی طرح وہ بھی کلاس فیلو ہے۔ وہ نوٹس لے لے گا تو کیا ہو جائے گا یا پھر تم اسے سب میں......" انعم کے لہجے میں شرارت تھی۔

"انتہائی ڈھیٹ ہو تم۔" عظمیٰ نے بری طرح چڑ کر اس کی بات کاٹی۔

"چائے آگئی ہے' اب لڑنے مت بیٹھ جانا....." زارا نے ٹوکا تو عظمیٰ نے سر جھٹک کر چائے کا کپ اپنی طرف کھسکایا۔ دوسری طرف افتخار کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھما کر کسی نے نظم کی فرمائش کر دی تھی۔ وہ بیٹھا نہیں تھا۔ یونہی ایک ہاتھ میں کپ تھامے' دوسرا آصف کی کرسی پر ٹکائے کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس کی گمبھیر جاندار آواز کیفے ٹیریا کی گرم فضا میں گونجتی ہر آواز پر غالب آگئی۔ وہ قتیل شفائی کی نظم "اکھیاں جھوٹ نہ بولیں" سنا رہا تھا۔

پہلے دل کا حال کہیں پھر اپنے بھید بھی کھولیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
ان سے گزری جیسی جیسی
بات کریں تو ویسی ویسی
روتے روتے کبھی ہنسیں' کبھی ہنستے ہنستے رولیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
بھید چھپائیں جب یہ کوئی
لگتی ہیں کچھ کھوئی کھوئی
لیکن پلک جھپک میں پھر یہ پیار کی راہ پہ ہولیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں
کاجل کے سنگ بہتے بہتے
تھک جائیں سچ کہتے کہتے
سیج بچھا کر سپنوں کی تب تھوڑی دیر کو سولیں
اکھیاں جھوٹ نہ بولیں

ایک پل کو تو عظمیٰ بھی تھم سی گئی تھی۔ وہ براہ راست کچھ نہیں کہتا تھا۔ مگر اس کا مبسم گمبھیر لہجہ اسے ہمیشہ ڈسٹرب کر دیتا۔ انعم دھیرے سے کھنکاری تھی۔ عظمیٰ نے تیزی سے چائے ختم کی۔ پھر ناکسی کی طرف دیکھے بولی۔

"چلیں۔ پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔"

انعم نے زارا کے گھورنے پر بمشکل خود کو کچھ بھی کہنے سے روکا تھا۔ واپسی پر پارکنگ میں اسے زین مل گیا۔

"تم آج یونیورسٹی آئے تھے؟" زارا نے بے حد حیرت سے پوچھا۔ زین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"ظاہر ہے تب ہی تو یہاں نظر آرہا ہوں۔"

"سارا دن کہیں دیکھا نہیں تھا۔ میں سوچ رہی تھی' تمہیں گھر جا کر فون کروں گی۔" زارا نے جرسی کی جیب سے ٹٹول کر گاڑی کی چابی نکالی۔

"آپ گھر کیوں نہیں آئیں۔؟" زین نے بے اختیار شکوہ کیا۔

"تم نے مس کیا۔"

"بہت....." وہ ایمانداری سے بولا۔

"تم نے خود ہی تو منع کیا تھا۔" زارا نے اطمینان سے کہا تو وہ جھنجھلا گیا۔

"وہ تو میں غصے میں بول گیا تھا... اور پھپھو بھی نہیں آئیں۔"

"میں نے انہیں منع کر دیا تھا۔"

"آپ نے مگر کیوں؟۔۔۔"

زارا نے قدرے حیرت سے اس کا جھنجھلانا دیکھا۔

"زین، یا تو تم کہنے سے پہلے سوچ لیا کرو یا پھر جو کچھ کہتے ہو اس پر قائم رہا کرو۔"

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بس میں آپ لوگوں سے دور نہیں رہ سکتا۔ آپ اور پھپھو دو دن تک نہیں آئیں۔ میں انتظار کرتا رہا۔ پھر مجھے لگا میں اکیلا ہو گیا ہوں۔ کوئی بھی نہیں میرا۔ آپ۔۔۔ آپ کیوں نہیں میری مدد کرتیں۔" وہ پھر سے ڈبل مائنڈڈ ہو رہا تھا۔ پھر سے وہی اضطراب اس کے لب و لہجہ میں اتر آیا تھا۔ جو زارا کو ہمیشہ تکلیف دیتا تھا۔

"کروں گی۔ ضرور تمہاری مدد کروں گی۔ مگر اس وقت تم سیدھے گھر جاؤ۔ کھانا کھاؤ، کافی پیو اور آرام کرو۔"

"آپ آج بھی نہیں آئیں گی۔۔۔" اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے زارا کو دیکھا۔ ایک پل کو وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ آج تائی جان کو آنا تھا۔ شاید وہ آ بھی چکی ہوں گی اور اس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ مگر وہ یہ زین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

"آج گھر میں کچھ کام ہے مجھے۔ مگر میں کل ضرور آؤں گی۔"

"او کے۔۔۔" حسب معمول وہ فوراً ہی مان گیا تھا اور زارا تب تک وہیں کھڑی رہی۔ جب تک اس کی بائیک نظروں ۔۔۔۔۔ سے او جھل نہ ہو گئی۔ پھر سر جھٹک کر لاک کھولنے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

رضوان واپس جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر رک گیا۔

"السلام علیکم۔۔۔" زارا رک کر باہر نکل آئی۔

"وعلیکم السلام۔" وہ وہیں اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ واپس جا رہے ہیں۔"

"تم کہو تو نہ جاؤں۔۔۔" دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اس نے برجستہ پوچھا تو وہ مسکرا کر قدرے بے نیازی سے گویا ہوئی۔

"آپ کی مرضی ہے۔"

"اگر ہم آپ کی مرضی پر چلنا چاہیں تو۔۔۔" اس نے متبسم لب و لہجے میں پوچھا۔

"تو۔۔۔" زارا نے اسے دیکھا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر بولی تھی۔ "مت جائیں۔"

"او کے۔۔۔" وہ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ تو تائی جان نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ابھی تو تم جلدی جلدی کا شور مچا رہے تھے۔"

وہ مسکرا کر دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھنے لگا۔ زارا تائی جان سے ملتے ہوئے شکوہ کرنے لگی۔

"کتنے دنوں بعد آئی ہیں آپ۔۔۔"

"ہاں ہم تو جیسے روز آتی ہو۔۔۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے جواباً کہا۔

"مجھے تو ماما منع کرتی ہیں۔" وہ اطمینان سے کہہ کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"کیوں آئمہ! تم کیوں منع کرتی ہو۔ یہ میری بچی پہلے ہے اور بہو بعد میں۔" تائی اماں نے کہا تو مما نے اسے گھور کر دیکھا۔

"میں نے کب روکا ہے۔ خود اسی کے پاس وقت نہیں ہوتا۔"

زارا ہنس دی پھر بھابھی اور سعد کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"انہیں کیوں نہیں لائیں۔"

"بھئی، ان سے ملنا ہے تو جا کر مل لینا۔ میں تو اس لیے آگئی کہ صبح گاؤں جا رہی ہوں۔ سوچا جاتے جاتے ملتی جاؤں۔"

"ابھی آپ کو آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ پھر جا رہی ہیں۔"

"وہاں حویلی کا حشر کر دیا ہو گا نوکروں نے۔ چار دن کے لیے آجاؤں تو سارے کام رک جاتے ہیں ویسے بھی یہاں میرا دل نہیں لگتا اور تمہارا امتحان کب تک ہے۔۔۔؟" انہوں نے کہتے کہتے بات بدلی۔

"بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔"

"بس آئمہ! اب رخصتی کی تاریخ دے دو۔ جیسے ہی اس کا امتحان ختم ہوتا ہے۔ یہ مبارک کام بھی ہو ہی جائے۔ نئے سال تک رضوان کی فیکٹری میں کام بھی شروع ہو جائے گا۔ یہ نیا سال ہماری حویلی میں بس خوشیاں ہی خوشیاں لائے گا۔ انشااللہ۔" تائی جان حسب معمول جذباتی ہو گئیں۔ زارا نے ایک طویل سانس لے کر رضوان کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"جاؤ زارا! تم چینج کر کے کھانا کھالو۔۔۔" ماما نے سوچا، کہیں زارا اپنی کسی بات سے ناگواری کا اظہار نہ کر دے۔ سو اسے بہانے سے ہٹا دیا۔

"کھانا تو۔۔۔ خیر۔۔۔ رضوان آپ کافی پئیں گے۔" زارا نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں مگر لان میں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں تم لوگ باتیں کرو جا کر۔۔۔"

زارا نے پہلے خانساماں کو کافی بنانے کا کہا۔ پھر چینج کر کے اور فریش ہو کر آئی تو ساتھ ہی ملازم کافی دے گیا۔ رضوان پہلے ہی لان میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔

"آپ کی فیکٹری کہاں تک پہنچی۔" زارا نے مگ اس کی طرف بڑھایا۔

"بس عنقریب کام شروع ہو جائے گا۔" اس نے اخبار تہہ کر کے ٹیبل پر رکھا اور مگ تھام لیا۔ زارا اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ سبز لباس میں کھلے بالوں اور شفاف چہرے کے ساتھ خاصی فریش لگ رہی تھی۔ وہ نجانے کیا سوچ کر مسکرا دیا۔ زارا اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر کے ایک پل کو پزل سی ہوئی۔ ابھی کوئی بات ڈھونڈ ہی رہی تھی جب وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"صرف نکاح نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"مجھ سے کچھ کہا۔۔۔"

"تم سے کیا کہنا ہے۔ اب تو جو کچھ بھی کہنا ہے، اپنی والدہ محترمہ سے کہنا ہے۔"

"مطلب۔۔۔؟"

"مطلب یہ۔۔۔" وہ ذرا سا اس کی طرف جھکا۔ "وہ جو بھی سوچ رہی ہیں بالکل ٹھیک سوچ رہی ہیں۔" اس کا لہجہ و انداز متبسم تھے۔

"اتنی جلدی کیا ہے؟" وہ ٹالنے کو بولی۔

"بہت جلدی ہے۔" وہ زور دے کر بولا۔

"اور وہ آپ کا وعدہ۔"

"کون سا؟۔۔۔" رضوان چونکا۔

"میرے اخبار والا۔۔۔"

"ہو جائے گا یار! کہاں منع کر رہا ہوں لیکن میں بہت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اب امی کو مزید ٹالنا ممکن نہیں۔۔۔ اور شاید خود کو بھی۔۔۔" آخری جملہ مدھم و گمبھیر لہجے میں کہا گیا تھا۔

"مجھے کم از کم آپ سے یہ امید نہیں تھی۔" زارا نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"اچھا۔۔۔" رضوان نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ "اور کون کون سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں ہم سے۔" زارا نے بنا کوئی جواب دیے کافی کا مگ لبوں سے لگا لیا۔

♥ ♡ ♡ ♥
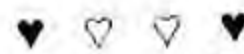
رات کو اپنے تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ لاؤنج میں آگئی۔ مما بی بی سی نیوز سن رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر ریموٹ اٹھا کر آواز ہلکی کر دی۔

"پاپا نہیں آئے ابھی تک۔" زارا قدرے مطمئن موڈ میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ کشن اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

"وہ کہاں آتے ہیں اتنی جلدی۔" وہ قدرے بیزاری سے بولیں۔ "حالانکہ آج میں نے ان سے بہت کچھ ڈسکس کرنا تھا۔"

"آئی نو مما! آپ کو کیا ڈسکس کرنا تھا۔ جب بھی تائی جان یہاں سے ہو کر جاتی ہیں۔ آپ کی ڈسکشنز کافی بڑھ جاتی ہیں۔"

"تم اتنا الرجک کیوں ہو اس ٹاپک سے؟۔" مما نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"اور آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے مجھے نکالنے کی۔"

"قرض کی ادائیگی جتنی جلدی ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ تمہاری۔۔۔" فون کی بیل نے ان کا جملہ کاٹ دیا۔ زارا نزدیک تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔

"ہائے۔ شیراز بھائی۔"

"کیسی ہو زارا۔۔۔" ان کا بشاش لہجہ ان کی کامیاب اور خوشگوار زندگی کا ضامن تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں' بھابھی اور میرا بھتیجا کیسا ہے۔ کب لے کر آرہے ہیں اسے ہمارے پاس۔۔۔"

"دھیرج گڑیا! بھابھی تمہاری بہت اچھی ہیں۔ کیونکہ ہماری بیوی ہیں' بھتیجا تمہارا بہت خوبصورت ہے کیونکہ مجھ پر گیا ہے۔"

"اوہو۔۔۔"

"باقی رہا ہمارے آنے کا سوال تو وہ تمہاری شادی پر ہی ممکن ہے۔" انہوں نے اطمینان سے اس کے سوالوں کے جواب دیے۔

"گویا ابھی آپ کے آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"مجھ سے بات کرواؤ۔" مما نے کہا تو اس نے ریسیور ان کی طرف بڑھا دیا اور خود کچن میں آگئی۔ پلیٹ میں کاجو اور تلی ہوئی مونگ پھلی نکال کر لائی تو مما مصروف تھیں۔

"بس تم تیاری رکھو۔"

"ہاں' اس کے ایگزامز کے فوراً بعد۔"

"یہی کوئی دو تین ماہ ہیں بس۔۔۔"

کچھ لمحے دوسری طرف کی بات سننے کے بعد وہ پھر بولی تھیں۔

"ہاں تمہارے پپا کسی بزنس ٹور کے سلسلے میں شکاگو جارہے ہیں۔ یہی کوئی ایک ہفتے کے بعد۔"

"ہاں' ہم رابعہ اور فہد کو میرا پیار دینا۔"

"خدا حافظ۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔" انہوں نے ریسیور رکھا۔ پھر کاجو کھاتی زارا سے خوشگوار موڈ میں کہنے لگیں۔

"شیراز کہہ رہا ہے۔ وہ مارچ میں آنے کی کوشش کرے گا۔"

"چلیں اچھی بات ہے۔" زارا نے پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔ انہوں نے مونگ پھلی کے چند دانے منہ میں رکھے۔ "اس نے جب سے شادی کی ہے۔ پاکستان آنا تو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔" ان کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

"ان کی اپنی لائف سیٹل ہو گئی ہے اور آپ کو تو بھائی کئی بار بلا چکے ہیں۔"

"ہاں پہلے میں سوچتی تھی' تمہاری شادی کے بعد ہم لوگ وہیں چلے جائیں گے مگر اب زین یہاں بالکل اکیلا ہو جائے گا یا پھر وہ بھی۔۔۔" جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ نجانے کیا سوچنے لگیں۔ پھر سر جھٹک کر پوچھنے لگیں۔

"تم زین سے ملی تھیں۔۔؟"

"ہاں' بہت خفا ہو رہا تھا کہ پھپھو آئیں کیوں نہیں۔"

"تم نے مجھے خوامخواہ روک دیا۔۔۔"

"میں چاہتی تھی۔ وہ ایک بار تنہا بیٹھ کر اچھی طرح سوچ لے کہ آخر وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ ڈبل مائنڈڈ ہے۔ ایک بار سوچ لے اسے کیا کرنا ہے۔ لیکن مما! اس کی شخصیت میں کوئی استحکام نہیں' اس کے فیصلوں میں کوئی مضبوطی نہیں۔ وہ آج کچھ کہتا ہے تو کل کچھ اور۔ ایک پل کو لگتا ہے وہ ساری دنیا کو ٹھوکر میں اڑا دے گا۔ کوئی نہ کوئی اسٹیپ ضرور لے گا اور دوسرے پل وہ پھر سے کسی نہ کسی سہارے کا متلاشی نظر آتا ہے' ایک دن وہ کہتا ہے کہ اسے کوئی یہ نہ بتائے کہ اسے کیا کرنا ہے اور دوسرے دن وہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ تھامے اور منزل تک لے جائے۔"

مما بے حد خاموشی سے سنتی رہی تھیں پھر ایک طویل سانس لے کر بولیں۔

"ذرا غور کرو زارا! ہم میں سے ہر کوئی ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو سہارا دے رہا ہے۔ کسی کا نام' کسی کا اسٹیٹس' کسی کی محبت ہمیں مضبوط کر دیتی ہے۔ تنہا انسان کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ یونہی تو اسے معاشرتی حیوان نہیں کہا گیا۔ یہ اس کا ماحول ہوتا ہے جو اسے مضبوط کرتا ہے۔ یہ اس سے منسلک رشتے ہوتے ہیں۔ جو اس میں سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ زین کے پاس کیا ہے۔ گمنام ماضی' حال کی کشمکش اور غیر یقینی مستقبل' وہ بہت اکیلا ہے۔ اس کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے۔۔۔ اسی لیے تو میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔" مما کا لہجہ اور آنکھیں دونوں بھیگ گئیں۔

"مما! ماموں بھی ایسے ہی تھے۔" زارا نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ لیکن حالات۔۔۔ حالات توڑ دیتے ہیں انسان کو۔"

"لیکن ہم کر بھی کیا سکتے ہیں زین کے لیے۔" زارا نے قدرے بے چارگی سے کہا۔ مما نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔ پھر مبہم سا مسکرائیں۔

"ہاں۔ تم تو واقعی کچھ نہیں کر سکتیں۔ مگر میں۔۔۔ میں ضرور کروں گی۔"

زارا کو ان کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔

"آپ کیا کریں گی۔"

"وقت آئے گا تو بتاؤں گی۔"

"آخر یہ وقت کب آئے گا۔۔۔" زارا جھنجلا سی گئی۔

"بہت جلد۔ اب تو بہت جلد آئے گا۔" وہ مبہم سا مسکرا رہی تھیں۔ زارا نے الجھ کر انہیں دیکھا۔ کچھ پوچھنا چاہا مگر نجانے کیا سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ شاید وہ جانتی تھی کہ مما اسے کچھ نہیں بتائیں گی۔ تب ہی اٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں کل جاؤں گی زین کی طرف۔۔۔"

"ضرور جانا۔ میں بھی جاؤں گی۔ اس وقت اسے صرف ہماری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے ورنہ وہ بکھر جائے گا۔"

"اور ہم اسے کبھی بکھرنے نہیں دیں گے۔" زارا نے ذرا سا جھک کر ان کے گال پر پیار کیا۔ پھر شب بخیر کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ماے مقبول نے انہیں بہت کچھ کہا تھا۔ مگر دوسری طرف ڈھٹائی تھی۔

"شرم کر۔۔۔ شرم کر' یتیم کا مال کھا رہا ہے۔" ماے مقبول کا سانس پھول گیا تھا۔ ظہور نے کان میں ماچس کی تیلی چلاتے ہوئے بے زاری سے اسے دیکھا۔

"اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ضرورت ہے مجھے۔۔۔"

"اور اپنی ضرورت کے لیے اس پر ظلم کر رہے ہو۔ تہمتیں لگا رہے ہو۔"

"کون تہمتیں لگا رہا ہے۔" ظہور بھڑک اٹھا۔ "تمہاری اپنی لاڈلی کے کرتوت ہیں جو سامنے آئے ہیں۔ کل کلاں کو کسی اور کے نام لکھ دے گی تو؟ ہمارے باپ دادا نے اس لیے خون پسینہ ایک نہیں کیا۔"

"تمہارے دادا نے یہ مکان خود اس کے نام کیا ہے۔"

"ہاں تو اس بہشتی کو کیا معلوم تھا کہ یہ گل کھلائے گی۔"

"ایک بات یاد رکھ ظہور! میں یہ مکان تمہارے نام نہیں ہونے دوں گا۔"

"تو کیا اپنے نام لکھوائے گا۔۔۔" اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"یتیم کا مال کسی کو ہضم نہیں ہوتا۔ خدا کے قہر کو آواز نہ دے۔" غصے کی شدت سے ماے مقبول کا بوڑھا جسم کانپ کانپ گیا۔ اندر نین تارہ کا دل تنکے کی طرح لرز رہا تھا۔ اسے پتا تھا' ماے مقبول کا سہارا بس تنکے جتنا ہے۔ پھر بھی آس لگائے بیٹھی تھی۔ کیا معلوم ماما اسے اس جہنم سے نکال ہی لے۔

"کیا ہنگامہ ہے یہ۔۔۔؟" نیاز اندر داخل ہوا۔ تو بتول لپک کر آگے ہوئی اور ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔

"اوہ ماما! کھپ نہ ڈال۔ جو کام تجھے کہا ہے جا کر وہ

کر۔" اس نے گویا کان سے مکھی اڑائی۔

"کون سا کام؟۔۔۔"

"رشتہ ڈھونڈ اس کے لیے۔۔۔"

"میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ جہاں مناسب سمجھوں گا' بیاہ بھی کر دوں گا۔" ماما مقبول نے دو ٹوک لہجے میں بات کی۔

"نہ۔۔۔ نہ یہ بات نہ کرنا۔ اس دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی چھوڑنا ہے یا نہیں۔ لوگ کیا نہیں کہیں گے یہی کہ بیاہ کا خرچ نہ اٹھایا گیا تو ماما کے ہاں نکال پھینکا۔"

"لوگ تو یہ کہیں گے غیرت مند بھائیوں نے جان چھڑائی۔" ماما زیر لب بڑبڑایا۔

"ہاں جان تو چھڑانی ہے۔ پر کسی طریقے سے۔ ماما! تو رشتہ ڈھونڈلا' ہم بیاہ کر دیں گے۔"

"اور مکان۔۔۔" ماما نے چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"مکان کی پھر دیکھی جائے گی۔" نیاز نے لاپروائی دکھائی۔

"اسے میرے ساتھ نہیں بھیجو گے۔" ماما مقبول نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

"دیکھ ماما! ہے تو تو تارہ کا ماما۔ ہمارا تمہارا کوئی رشتہ بنتا نہیں ہے۔ پر میں نے ہمیشہ تمہاری عزت کی ہے۔ پر ایک بات کہوں' بندے کی عزت اپنے ہی ہاتھ ہوتی ہے۔ ایک بار ہم نے جو بات کہہ دی سو کہہ دی۔"

نیاز نے گویا بات ہی ختم کر دی اور ماما مقبول کمزور تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہیں سے پلٹ گیا کہ تارہ کو تسلی دینے کے لیے دو حرف بھی نہ تھے۔

"یہ بڈھا کوئی پھڈا نہ کر دے۔" ظہور کے لہجے میں تشویش تھی۔

"نہیں کرے گا۔ پر اب یہ کام تھوڑا جلدی کرنا ہوگا۔" نیاز نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ انکار کس کی شہ پر کر رہی ہے۔" ظہور جھنجلا کر بولا۔

"خیر دستخط کرتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ۔۔۔"

"ورنہ۔۔۔" ظہور اور بتول دونوں چونک گئے۔

"ٹھکانے لگا دیں گے۔ مکان تو اس صورت میں بھی ہمارے پاس ہی آئے گا۔۔۔" نیاز نے اطمینان سے کہا جبکہ بتول اور ظہور دم بخود سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥
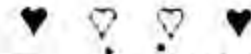
"کیا ہوا' پاپا کو آج آفس نہیں جانا۔۔۔" زارا تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل تک آئی۔ تو فاطمہ کچن سے ٹرے میں ناشتہ لگائے باہر نکلی تھی۔ زارا کے پوچھنے پر کہنے لگی۔

"صاحب کے لیے ہے۔ وہ ناشتہ اپنے کمرے میں کریں گے۔" زارا نے بے اختیار وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو ہو رہے تھے۔ اس کے پہلے دو پیریڈ فری تھے۔ اس لیے وہ خود بھی لیٹ اٹھی تھی۔

"پتا نہیں جی۔ ویسے مجھے لگتا ہے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اچھا۔ رات کو کب آئے تھے پاپا۔۔۔"

"پتا نہیں۔ میں تو اپنے کوارٹر میں جا چکی تھی۔ لگتا ہے خاصی دیر سے آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے لیے بھی ناشتہ وہیں لے آؤ۔" زارا نے ٹرے اس کے ہاتھ سے تھام لی۔ ہلکی سی دستک کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی۔

"گڈ مارننگ۔"

"گڈ مارننگ جانو۔" پپا تکیے کے سہارے نیم دراز تھے اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔ مما سائیڈ ٹیبل کی دراز سے شاید کوئی میڈیسن نکال رہی تھیں۔ پلٹ کر دیکھا پھر خفگی سے پوچھنے لگیں۔

"فاطمہ کہاں ہے؟۔۔۔"

"فاطمہ میرے لیے ناشتہ لا رہی ہے۔ آج میں اور پاپا اکٹھے ناشتہ کریں گے' لیکن پاپا! آپ ابھی تک بیڈ پر کیوں ہیں؟۔" زارا نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔

"یونہی طبیعت ذرا بوجھل سی تھی۔" انہوں نے پیشانی مسلی۔

"رات کو خاصی خراب تھی طبیعت۔ ساری رات بے چین رہے ہیں۔" مما کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ساری رات جاگتی رہی ہیں۔

"ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے۔" زارا نے تشویش سے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"ڈاکٹر کا کیا ہے' فوراً "بیڈ ریسٹ" بتا دیں گے۔"

"بالکل ٹھیک کریں گے۔" زارا نے تائید کی پھر مما کی طرف پلٹی۔ "مما! آج پاپا کو گھر سے نہیں نکلنے دینا۔ نو فون کالز نو میٹنگ اینڈ نو لیسٹ۔ او کے۔۔۔"

"تم اور تمہاری مما۔۔۔" پاپا سر پکڑ کر رہ گئے۔ "آج بہت اہم میٹنگ ہے۔"

"پاپا! یہ بزنس' یہ میٹنگز' یہ پیسہ ہم تب تک انجوائے کر سکتے ہیں جب تک ہماری صحت ہے اور آپ کی صحت ہمارے لیے سب سے امپورٹنٹ ہے۔ اب آپ ناشتہ کریں۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں۔" بات کرتے کرتے اس کی نگاہ وال کلاک پر پڑی تو وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

"اور ناشتہ۔" مما نے ٹوکا۔

"اب وقت نہیں ہے' وہیں سے کچھ لے لوں گی۔ گڈ بائے پاپا' گڈ بائے مما۔" وہ انہیں پکارتے ہوئے باہر نکلی۔ فاطمہ ناشتہ لیے آرہی تھی۔

"بی بی جی! ناشتہ۔۔۔"

"تم کر لو۔۔۔" وہ جواب دے کر باہر نکل گئی۔ کچھ اہم کلاسز تھیں جن کے بعد افتخار نے ایک دم کھڑے ہو کر پوچھا۔

"روپٹے کون کون چل رہا ہے۔" ساری کلاس تیار تھی۔

"روپٹے کیا ہوتی ہے۔۔۔" مریم نے قدرے حیرت سے دریافت کیا۔ افتخار کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"مجھے پتا تھا' یہ ضرور بولیں گی۔ گنے کے رس کو کہتے ہیں بی بی۔"

"تو سیدھی طرح بولو نا۔" وہ قدرے خجل سی ہو کر بولی۔ "پر میں تو دہی بھلے کھاؤں گی۔"

"میں بھی۔۔۔" شملا نے اس کا ساتھ دیا۔

"اور میں دونوں چیزیں۔۔۔" انعم بولی۔ پھر عظمیٰ کو ٹہوکا دے کر بولی۔ "چل رہی ہو؟۔"

"نہیں بھئی' مجھے سر سہیل سے کچھ کام ہے۔ میں ان کے آفس جا رہی ہوں۔" وہ یوں بھی ایسی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوتی تھی۔

"عظمیٰ چلو نا مزا رہے گا۔" زارا نے بھی زور دیا۔ پھر بھی وہ نہیں مانی۔ افتخار گویا ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ تھا۔ تب ہی پکار کر بولا۔

"جو نہیں جائے گا۔ اس کے لیے دہی بھلے پیک کروالیں گے۔"

"میں جا رہی ہوں۔۔۔" عظمیٰ تلملا کر اٹھ گئی۔ آصف چندہ کرنے لگا تھا۔ جب حیدر بول اٹھا۔

"یہ دعوت میری طرف سے ہے۔۔۔" اس کی حال ہی میں اپنی خالہ زاد کے ساتھ منگنی ہوئی تھی۔ وہ لوگ کب سے اس کے پیچھے پڑے تھے اور وہ ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔

"ہرے" سب نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔ جو نہیں جا رہے تھے۔ وہ بھی ساتھ چل دیے۔

"سستے چھوٹ رہے ہو یار۔" کسی نے جملہ کسا۔ حیدر نے والٹ نکال کر پیسے گنے۔ آصف سے سو روپیہ ادھار لیا۔ جو اس نے حیدر کو گھورتے ہوئے اور سب کو گواہ بنا کر دیا۔ ٹھیک ٹھاک سردی تھی۔ مگر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ سڑک اور نہر کے کنارے کھلے پھولوں پر ابھی خزاں نہیں آئی تھی۔ بہت سے بے فکرے بوٹنگ کا شوق پورا کر رہے تھے۔ وہ لوگ کیمپس سے نکل کر شاپنگ سینٹر کی طرف آگئے۔ بے فکری' خوش گپیاں' قہقہے اور چھیڑ چھاڑ۔ آصف بار بار حیدر سے پوچھ رہا تھا۔

"یار! تیری منگنی ہو کس طرح گئی۔ لڑکی والوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔"

اور جواباً حیدر سے گھونسے کھا رہا تھا۔

آدھے لوگوں نے گنے کے رس والے کو گھیر لیا اور کچھ نے دہی بھلے والے کو۔ حیدر نے بڑے جوش میں دعوت دی تھی اور اب اس کے ہوش اڑے جا رہے تھے۔ وہ سب لوگ یوں کھا اور پی رہے تھے۔ جیسے ان

کی زندگی کی آخری دعوت ہو۔

"کوئی رعایت نہ برتنا۔" افتخار کے نعرے پر ان لوگوں اور خاص طور پر لڑکوں کی اسپیڈ میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ حیدر کبھی آصف اور مریم کے گروپ کے پاس جا کر کہتا تھا۔

"کچھ خیال کرو۔ اتنا تیز مرچ مسالہ ہے۔ کیوں اپنے معدے پر اتنا ظلم کر رہے ہو۔" تو کبھی افتخار کی طرف پلٹتا۔

"یار! سردی بہت ہے۔ اتنا رس پیو گے تو نزلہ ہو جائے گا۔"

مگر کوئی اس کی بات سن ہی کہاں رہا تھا۔ سب کے سب مصروف تھے۔ آخر تھک کر وہ بینچ پر بیٹھا اور خود بھی رس پینے لگا۔

"بے چارہ حیدر۔" زارا نے مسکرا کر انعم کو دیکھا۔ تیز مرچوں نے اس کا حشر کر دیا تھا۔

"اتنا رو رو کر وہی بھلّے کیوں کھا رہی ہو۔"

"تم بھی ٹرائی کرو۔" اس نے پلیٹ زارا کی طرف بڑھائی اور دوسرے ہاتھ سے آنسو پونچھے۔

"مجھے تو معاف ہی کرو۔" اس نے خالی گلاس رضا کو تھما دیا۔

"اور لاؤں؟" رضا نے پوچھا' زارا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ کیا آپ ابھی سے میدان چھوڑ گئیں۔" افتخار ان کے قریب آیا۔

"خدا کا خوف کرو۔ کیوں حیدر کا ہارٹ فیل کرواؤ گے۔"

"اتنا کمزور دل نہیں ہے۔" پھر مسکرا کر انعم کو دیکھا۔

"اور انعم بی بی! کچھ نئی تازی۔"

انعم نے خالی پلیٹ بینچ پر رکھی۔ پھر ٹشو سے منہ پونچھتے ہوئے افتخار کو گھورا۔

"کیا سننا چاہتے ہیں افتخار بھائی۔" اسے غصہ تھا' افتخار آگے کیوں نہیں بڑھتا۔ تب ہی لہجہ کچھ چڑا ہوا تھا۔

"کیا ہوا مرچیں زیادہ لگ گئی ہیں۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا۔ ذرا آس پاس کے موسموں کی خبر رہتی ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"موسموں کا تو مجھے پتا نہیں۔ ہاں عظمیٰ کی منگنی ہونے والی ہے۔" انعم کا لہجہ قدرے مدھم ہو گیا تھا۔ جبکہ افتخار کا قہقہہ خاصا بلند تھا۔ انعم نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے۔" زارا نے قدرے حیرت سے افتخار کو دیکھا۔ اس کا خیال تھا افتخار کو یہ خبر سن کر شاک لگے گا۔

"بس یونہی۔" اس نے مسکراہٹ کو روکا پھر انعم سے پوچھنے لگا۔ "کب ہو رہی ہے۔؟"

"عنقریب۔" انعم جزبز ہو کر بولی۔ وہ کچھ لمحے انگوٹھے سے اپنی مونچھیں سنوارتا ہوا سوچتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر متبسم نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

"پھر تو مبارک باد دینے ان کے گھر جانا پڑے گا۔"

انعم نے سٹپٹا کر زارا کو دیکھا۔

"افتخار! تم عظمیٰ کے گھر مت جایا کرو۔" زارا نے کہا تو افتخار نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟......"

"عظمیٰ کو اچھا نہیں لگتا......"

"اچھا......" اس کا اچھا خاصا معنی خیز تھا۔ "لیکن میں عظمیٰ سے ملنے تو نہیں جاتا......"

"تو اور کیا اس کے ابا سے ملنے جاتے ہو۔" انعم بری طرح چڑ گئی۔

"ہاں۔ بہت اچھے انسان ہیں۔ پاکستان بننے سے قبل ضلع ہوشیار پور میں ان کا اور ہمارا خاندان جس گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے پاس ہی تھے۔" وہ سادگی سے بتا رہا تھا۔

"اور یہ بات تمہیں عظمیٰ کے ابا نے بتائی ہے۔"

"نہیں ہمن کی اماں نے۔ بہت شفیق ہیں۔ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔"

"افتخار......!" زارا نے ٹوکا تو وہ جیسے ہنس پڑا۔

"ٹھیک ہے زارا جی! نہیں جائیں گے۔ مگر میری بے بے ضرور جائیں گی انہیں مبارکباد دینے کے لیے۔"

"افتخار......!" زارا نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر وہ ہنستے حیدر کے پاس جا پہنچا تھا۔ "یہ......" انعم نے جوش میں اس کا ہاتھ دبایا۔ "تم دیکھنا۔ اب وہ اپنا پرپوزل ضرور بھجوائے گا۔"

"مگر تم اس کی اتنی سائیڈ کیوں لے رہی ہو۔" زارا نے اس کے جوش کو پوری طرح محسوس کیا۔

"کیونکہ میرا دل کہتا ہے۔ وہ عظمیٰ کے لیے بہترین ساتھی ثابت ہو گا۔"

"خدا کرے۔ آؤ نیو ایئر کارڈ دیکھتے ہیں۔" وہ شہلا وغیرہ کے ساتھ شاپنگ سینٹر میں جا گھسیں۔

اور جب عظمیٰ نے سنا تو بھڑک اٹھی۔

"اگر اس کی بے بے میرے گھر آئیں۔ تو میں خودکشی کر لوں گی۔"

"ضرور کرنا۔" انعم کا اطمینان ہنوز قائم تھا۔ "مگر ان کی خاطر مدارت میں کوئی کمی مت کرنا۔ بلکہ ایسا کرنا۔ مجھے آواز دے لینا میں کچھ زیادہ بہتر......"

"میں دیکھ لوں گی۔" عظمیٰ پاؤں پٹختی چلی گئی۔

"مت تنگ کیا کرو انعم۔" زارا نے گھورا تو وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"میں نے کیا کیا ہے۔ صرف اس کی مدد کرنا چاہی تھی۔"

"وہ اپنی مدد خود کر سکتی ہے۔" زارا نے کلائی موڑ کر گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ پھر بیگ سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔

"آج میں ڈراپ کر دوں تم لوگوں کو۔"

"آج یہ مہربانی کیوں؟......"

"مجھے زین کی طرف جانا ہے۔" زارا مسکرا دی۔ اس صورت میں ان کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔

"زین شاید آج آیا نہیں۔"

"ہاں......!"

"عجیب قنوطی سا ہے تمہارا یہ کزن۔ سال بھر میں کسی کو دوست بھی نہیں بنا سکا۔ جب دیکھو' تنہا کسی نہ کسی کتاب میں سر دیے بیٹھا ہوتا ہے۔ کیا یونیورسٹی کے سارے اگلے پچھلے ریکارڈ اسی کو توڑنے ہیں۔"

"پتا نہیں۔" زارا مسکرا دی۔ "پھر تم چل رہی ہو۔"

"نہیں بھئی۔ ابھی تو میں عظمیٰ کو ڈھونڈوں گی۔ اسے مناؤں گی اور تمہیں تو پتا ہے اب کے وہ باقاعدہ مجھ سے ناک سے لکیریں کھنچوائے گی۔ تب جا کر مانے گی۔" وہ بڑی بے چارگی سے کہہ رہی تھی۔

"تمہارے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔" وہ اسے خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔ پاپا آج گھر میں تھے اور وہ فوراً گھر جانا چاہتی تھی مگر اسے معلوم تھا۔ کل اس نے زین سے کہہ دیا تھا۔ تو اب وہ ضرور ہی اس کا انتظار کر رہا ہو گا اور وہی ہوا، سلیم اسے دیکھتے ہی بولا تھا۔

"خدا کی قسم باجی! اگر آج آپ نہ آتیں تو بھائی جان نے مجھے کڑاہی میں ڈال کر تل دینا تھا۔"

"ہیں کہاں تمہارے بھائی جان......؟" وہ اندر داخل ہوئی۔

"کہاں ہوں گے۔ کچن میں ہیں۔"...... سلیم کا موڈ بگڑا ہوا تھا اور کچن سے زین کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"سلیم کے بچے! دو منٹ کے اندر اندر ادھر آؤ۔ ورنہ مچھلی کی جگہ تمہیں تل دوں گا۔" اس کی دھمکی پر سلیم فوراً "اڑنچھو" ہو گیا۔

"سلیم تمہاری دھمکیوں سے ڈر کر غائب ہو گیا ہے۔"

وہ زارا کی آواز پر پلٹا۔

"آپ کچھ جلدی نہیں آ گئیں۔" اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"ہاں کیونکہ مجھے جلدی جانا ہے۔" وہ اس کے قریب آ کر کڑاہی میں جھانکنے لگی۔

"کیوں؟......" وہ پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

"پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ گھر پر ہی ہوں گے۔ اس لیے ذرا جلدی جانا ہے۔"

"آتے ہی......" وہ منہ ہی منہ میں نجانے کیا

بڑبڑانے لگا تھا۔
"کیا کہہ رہے ہو۔" زارا کے کچھ پلے نہیں پڑا۔
"اور یہ تم تل کیا رہے ہو؟....."
"مگر مچھ....."
"لگ رہا ہے۔" زارا نے اسے سرتاپا دیکھا۔ وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ بال پریشان، آستینیں کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی، بٹن کھلے۔
"اچھا۔ اب آپ مذاق نہ اڑائیں میرا۔ یہ بتائیں، کچھ کھایا تو نہیں آپ نے۔" اس نے مچھلی کے قتلے پلٹے۔
"ناشتہ بھی نہیں کیا۔ صرف ایک گلاس گنے کا رس پیا ہے۔" اسے شدید بھوک کا احساس ہوا۔
"مجھے پتا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا، آپ کو اپنے ہاتھوں سے مچھلی فرائی کر کے کھلاؤں گا۔"
"اور جو میں نہ آتی تو....." زارا نے چھیڑا۔
"نہ آتیں پھر دیکھتیں میں کیا کرتا ہوں۔" وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔
"کیا کرتے؟....."
"یہی مچھلی لے کر آپ کے گھر پہنچ جاتا۔"
"اچھا....." زارا نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔
"اچھا آپ کھڑی کیا کر رہی ہیں۔ یہ پکڑیں، پلیٹیں لے کر ٹیرس پر چلیں۔ میں فش لے کر آتا ہوں۔ موسم اچھا ہے وہیں انجوائے کریں گے۔"
زارا نے پلیٹیں پکڑیں پھر اوپر آ گئی۔ پلیٹیں اور بیگ میز پر رکھ کر وہ خود ریلیکس انداز میں چلتی گرل تک آ گئی۔ دونوں ہاتھ گرل پر ٹکا کر اس نے سامنے پھیلے دریا کے چوڑے پاٹ کو دیکھا۔ آسمان صاف تھا مگر ہلکی سرد ہوا چل رہی تھی۔
"سنیں....."
ہلکی نسوانی آواز پر زارا نے گردن گھما کر دیکھا۔ ساتھ والے ٹیرس پر تیس بتیس سالہ خوبصورت سی عورت پر تجسس انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔
"آپ زین العابدین کی کیا لگتی ہیں۔" اس نے فوراً سوال کیا۔
"وہ میرے ماموں کا بیٹا ہے۔"
"اچھا، جمشید صاحب آپ کے ماموں تھے، سگے ماموں۔"
"جی ہاں۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔"
"ہم لوگ پانچ سال سے یہاں ہیں۔ اس سے پہلے کبھی آپ کو یہاں آتے نہیں دیکھا نا اس لیے۔"
"ہاں بس....." زینے پر سے زین کی آواز آرہی تھی۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"یہ لیں گرماگرم ڈیپ فرائیڈ فش۔ کھائیں گی تو داد دیں گی۔ میں نے بابا سے سیکھی تھی۔" زارا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ عورت اب وہاں نہیں تھی۔
"لوگ اب متجسس ہونے لگے ہیں کہ ہمارا اور تمہارا رشتہ کیا ہے۔" زارا اس کے قریب آئی۔ زین نے چونک کر اسے دیکھا۔
"ابھی ایک خاتون مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے زارا نے ساتھ والے گھر کی طرف اشارا کیا۔ زین نے سامنے دیکھا۔
"ہاں تو ٹھیک ہے نا۔ لوگوں کو خبر ہونی چاہیے کہ زین العابدین اتنا بھی اکیلا نہیں۔" وہ قدرے لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔
"اور اسی طرح کسی دن یہ بات سلیمان بھائی تک بھی پہنچ جائے گی۔" زارا متفکر سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ زین نے اسے دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر آہستگی سے بڑبڑایا۔
"مجھے اس دن کا انتظار رہے گا۔"
"کیا کہا؟....."
"کچھ نہیں۔ یہ فش ٹرائی کریں۔ پھر آپ کو جلدی جانا بھی تو ہے۔" زین نے ڈش اس کے آگے کی تو زارا کو بے تحاشا بھوک کے احساس نے مزید کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا۔
"یہ تو واقعی بہت مزے کی بنی ہے۔" پہلا نوالہ لیتے ہی اس نے بے اختیار تعریف کی۔

"بابا سے سیکھی ہے۔"

"تم آج یونیورسٹی کیوں نہیں آئے؟" زارا کو اچانک یاد آیا۔

"بس موڈ نہیں تھا۔"

"زین! تم اسٹڈیز پر ذرا دھیان نہیں دے رہے ہو۔" زارا کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"تو یہ کیا ہے؟ یونیورسٹی نہیں آتے ہو۔ اگر آتے ہو تو کلاسز چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہو۔ اس طرح تو اسٹڈیز نہیں ہوتیں۔"

"سارا دن تو لائبریری میں۔۔۔" وہ ذرا سا جھنجلایا۔

"نوٹ بک پر لکیریں کھینچتا رہتا ہوں۔"

"یہی کام ایگزامز میں بھی کرنا زین العابدین! میں اچھی طرح جانتی ہوں تم ذرا بھی نہیں پڑھ رہے۔ تمہیں تو یہ بھی فکر نہیں کہ تمہاری اس ڈگری پر تمہارا کیریئر کا انحصار ہے۔ اگر یہ ڈگری بھی نہ ہوئی تو کیا کرو گے۔ اب تک تو میں نے تمہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ مگر اب اگر تمہاری لاپروائی دیکھی تو مما سے شکایت کر دوں گی۔"

زین العابدین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر مسکرا دیا۔

"اچھا لگا۔"

"کیا؟"

"آپ کا یوں ڈانٹنا۔ بالکل بابا کی طرح ڈانٹتی ہیں۔ وہ بھی جب خفا ہوتے تھے تو پورے نام سے پکارتے تھے مجھے۔ زین العابدین۔۔۔ تم اسٹڈیز پر دھیان نہیں دے رہے۔"

"زین العابدین! تم مجھے بنا بتائے گھر سے غائب کیوں ہو گئے تھے۔"

"زین العابدین! تم انتہائی بے حس لڑکے ہو۔ تمہیں میرا ذرا خیال نہیں۔"

"زین العابدین۔۔۔"

"زین۔۔۔!" زارا نے اسے بے اختیار ٹوکا۔ تو وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

"بابا! کیوں مر گئے۔" بہت دیر کے بعد ہواؤں نے ایک ہلکی سی سرگوشی سنی۔ زارا نے تاسف سے اسے دیکھا اور ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ٹیبل پر رکھ دی۔

"تم بھول کیوں نہیں جاتے زین۔۔۔"

زین نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"کیا یہ بھولنے والی بات ہے۔ میرے پاس تو ان کے سوا کچھ بھی نہ تھا زارا! خدا نے انہیں بھی مجھ سے چھین لیا۔" زین کا لہجہ آزردہ تھا۔ زارا خاموش ہی رہی۔ اس کے پاس تسلی دینے کو الفاظ ہی نہ تھے۔ زین نے خود ہی سر جھٹک کر خود کو اس کیفیت سے نکالا۔

"میں بھی بس۔۔۔ آپ کھائیں نا۔"

"ہم تمہاری اسٹڈیز کی بات کر رہے تھے۔" زارا نے یونہی پلیٹ اٹھا کر بات بدلی۔

"بس دو تین دن کچھ ڈسٹرب سا رہا تھا۔ اس لیے۔۔۔"

"ڈسٹرب کس لیے؟ اینی پرابلم۔۔۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ ڈسٹرب رہنے کی تو عادت سی پڑ گئی ہے اب۔۔۔" اس نے ہنس کر بات ٹال دی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ہر صبح ایک نئی آس بن کر طلوع ہوتی تھی اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گرتی۔

"کچھ لوگ اس دنیا میں صرف دکھ سہنے کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔" ایک مایوس و تلخ سی سوچ اس کے تپتے دکھتے دماغ میں اپنے نوکیلے پنجے گاڑ دیتی اور وہ سر جھٹک جھٹک کر اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے پھر سے انتظار کی گھڑیاں گننے لگتی۔

اسے ماموں مقبول کا انتظار تھا۔

"کیا پتا۔ کیا پتا وہ کچھ دن میں آجائے اور اسے اپنے ساتھ لے جائے۔"

بتول جھنجلائی پھرتی' با آواز بلند اسے کوسنے دیتی۔ وہ کان بند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کے مرے ہوئے والدین اور دادا کو گالیاں دیتی۔ وہ تب بھی کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ سنتی رہتی اور ٹھنڈی دیوار سے لگ کر روتی جاتی۔ یہ دیوار اس کی دمساز و ہمراز تھی۔ اس دیوار نے وہ ساری گالیاں سنی تھیں جو اس نے بتول' ظہور اور نیاز کو دی تھیں۔

اس دیوار پر وہ ساری بددعائیں آنسوؤں سے لکھی گئی تھیں۔ جو اس نے خود پر ظلم ڈھانے والوں کو دی تھیں۔

اس دیوار نے اس کے سارے آنسو مہربان ماں کی طرح اپنے اندر جذب کر لیے تھے۔

"کیوں ضد کر رہی ہے تو۔ یہ تیرے بھائی نہیں جلاد ہیں پورے۔ گلا دبا کر اسی آنگن میں دبا دیں گے یا دریا میں بہا دیں گے۔ کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔ نین تارہ کہاں گئی۔"

اور وہ حیران ہو کر سوچتی۔

کیا واقعی۔ وہ بے گناہ بے قصور ماردی جائے گی اور کہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ یہاں کسی کونے میں دبا دی جائے گی تو کیا اس گھر کی دیواریں نہ لرزیں گی۔ اس کا وجود دریا میں بہا دیا جائے گا تو کیا دریا کی روانی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

وہ ان کی ماں جائی نہ تھی۔ مگر باپ تو ایک تھا۔ جس باپ نے انہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا اسی باپ نے نوالے بنا بنا کر نین تارہ کے منہ میں ڈالے تھے۔

وہ معصوم تھی' پاکیزہ تھی۔ تو کیا مومن عورتوں پر تہمت لگانے والے کو عذاب کی خبر دینے والا خدا بھی یونہی خاموشی سے دیکھتا رہے گا۔ اسے یقین نہیں آتا۔ مگر ہر نیا دن خوف و دہشت اور ظلم کی نئی صورت اسے دکھاتا۔ پہلے اس پر دروازے بند ہوئے۔ پھر وہ ایک چنگیر جو بتول بڑی عنایت سے اس کے سامنے دھرتی تھی۔

اس کی انتڑیاں سکڑ گئیں۔ آنکھیں کھنچنے لگیں۔ ایک دن۔۔۔ دو دن۔۔۔ نیم جاں وجود میں اتنی طاقت ہی کہاں تھی۔

اس نے ہر ظلم سہا تھا۔ ذلت و بے عزتی برداشت کی تھی۔

ہر قسم کے طعنے سنے تھے۔ مگر وہ بھوک سے ہار گئی۔

وہ کھڑکی کی سلاخوں سے ہاتھ بڑھا بڑھا کر روٹی مانگتی تھی مگر دوسری طرف بدترین بے حسی تھی۔

"بھائی۔۔۔ بھائی!"

کیسا لفظ تھا جو غیر بھی سنتا تو بے اختیار سر کی چادر بن جاتا۔

نجانے یہ کون شقی القلب تھے۔

اس کے بار بار چیخنے پر وہی کاغذ سامنے آتے تھے اور اب کے اس نے کچھ بھی نہ سوچا تھا۔ بس خاموشی سے سائن کر دیے تھے۔ پھر بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔ انہوں نے ایک حقارت بھری نظر اس کے بے مایہ وجود پر ڈالی اور خود فاتحانہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ بتول نے چنگیر میں روٹی رکھی تو زندگی پھر سے اس کی آنکھوں میں جاگنے لگی تھی۔

دروازہ بہت دنوں کے بعد آج کھلا ہوا تھا۔ نین تارہ نے بے حد حیرت سے کمرے کے اندر آتی سورج کی کرنوں کی روشنی کو دیکھا۔ اس کی کرنوں نے بہت بار تاریک کمرے میں اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ مگر آج وہ بڑی آزادی کے ساتھ کمرے کے کونے کونے کو منور کر رہی تھیں۔

"کیا بھابھی بھول گئی۔" نین تارہ نے تعجب سے دروازے کو دیکھا۔ تب ہی روشنی کے درمیان بھابھی کا بھاری بھرکم وجود حائل ہو گیا۔

"اب کب تک سیوا کروں تمہاری۔ مہارانی جی! اب باہر نکل آؤ۔ کسی کام دھندے سے لگو۔" کیسی طنز اور تحقیر بھری آواز تھی۔

"بھابھی! ماما نہیں آیا۔۔۔؟" کسی موہوم سی امید کے سہارے وہ پوچھ بیٹھی۔

"کیوں اس نے تیرے یار کا سندیسہ لے کر آنا تھا۔" کتنے گھٹیا الفاظ تھے اور اس سے بھی گھٹیا لہجہ۔

نین تارہ کی آنکھیں اذیت سے بند ہو گئیں۔ بس ایک آنسو تھے جو کسی لمحے اس کا ساتھ نہیں چھوڑتے

تھے۔ پلکوں کی باڑھ پھلانگی اور چہرے پر پھسل گئے اور یہاں یہ بھی بندش تھی۔ "نجانے لوگوں کے دل پتھر کیسے ہو جاتے ہیں۔"

ہتھیلیوں سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اس نے کئی بار سوچی گئی بات کو ایک بار پھر دہرایا۔

بھابھی کی بربڑاہٹیں اپنے عروج پر تھیں۔

وہ جو کچھ کہتی تھی۔ نین تارہ کو ایک نیا زخم لگا دیتی تھی اور یہ وہ زخم تھے۔ جنہیں کبھی مندمل نہیں ہونا تھا۔ وہ گناہ گار ہوتی تو اس سب کو اپنے کیے کی سزا سمجھ کر قبول کر لیتی۔ مگر اب؟ کبھی کبھی اس کے اندر بڑی شدت کا احتجاج اٹھتا۔ اس کا دل چاہتا۔ وہ یہاں سے بھاگ جائے۔

"مگر کہاں۔۔۔؟"

وہ بتول کی اگلی بات سننے سے پہلے ہی کھڑی ہو گئی۔ اس کی ایڑی کا زخم بہت بری حالت میں تھا۔ پاؤں گھسیٹتے ہوئے اس نے سرسوں کے تیل کی بوتل اٹھائی اور چولہے کے پاس آ گئی۔ بتول نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر اسے ہلدی نکالتے دیکھ کر خاموش ہو رہی۔ اس کا پاؤں ٹھیک ہوتا وہ تب ہی اس سے کام نکلوا سکتی تھیں۔ اس نے تو بس ایک عبارت لکھی تھی سارے کا سارا مضمون خود ہی تیار ہو گیا تھا۔ اسے ضرورت سے زیادہ کامیابی ملی تھی۔ مکان بھی ہاتھ آ گیا۔ نین تارہ کی پڑھائی بھی چھوٹی' خوامخواہ مفت کا خرچ تھا۔ پھر بے دام خادمہ بھی ہاتھ لگ گئی۔ جو کبھی اس کے سامنے نہ تو سر اٹھا سکتی تھی۔ نہ جواب دے سکتی تھی اور وہ جو چاہتی اس کے ساتھ سلوک روا رکھتی۔

تیل میں ہلدی جلا کر ایڑی پر لگاتے ہوئے اس کا ہاتھ ایک پل کو تھم گیا۔

"کسی نے مسیحائی کرنا چاہی تھی۔ مگر یہ ذرا سا زخم۔۔۔ یہ ذرا سا زخم عمر بھر کا ناسور بنا دیا۔ کاش تم نے مجھ پر یہ مہربانی نہ کی ہوتی اجنبی۔"

اس سے کام کہاں ہوتا تھا۔ قدم اٹھاتی تو ایڑی سے لے کر گھٹنے تک درد کی لہریں اٹھنے لگتیں۔ نجانے کون کون سے زخم تھے جو لو دینے لگتے۔ ہاتھ پاؤں میں کپکپی سی اتر آتی۔ بخار مستقل ہڈیوں میں ڈیرے جمائے بیٹھا تھا۔ اس پر لوگوں کی بظاہر ہمدردیوں کی آڑ میں تحقیر اور مذمت کرتی نگاہیں اور باتیں۔ وہ جتنا سوچ رہی تھی۔ زندگی اس سے زیادہ مشکل اور ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

وہ سب کے لیے قابل نفرین تھی۔

مگر کیوں؟

کیا کیا تھا اس نے۔

اس کی سہیلیاں اس سے منہ موڑے بیٹھی تھیں۔

وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی بن گئی تھی۔

لوگ اس کے قریب آتے تو ایک گھٹیا سے تجسس کے تحت۔ انہیں صرف یہ جاننے کا تجسس ہوتا کہ وہ "اس" سے کہاں ملتی تھی کون کون سے وعدے وعید ہوئے تھے اور اس کے علاوہ "کیا کچھ" ان کے درمیان ہو چکا ہے۔

نین تارہ کچھ بھی کہتی۔ ان کی نگاہوں میں ڈولتی بے یقینی کم ہی نہ ہوتی اور لبوں پر بکھری استہزائیہ مسکراہٹ۔ انہیں اپنی داستانیں خود گھڑنے کی عادت پڑ گئی تھی اور نین تارہ کی پارسائی کی گواہی کے لیے آسمان سے وحی نہیں اتر سکتی تھی۔

وہ چارپائی سے جا لگی۔

"کہیں مر نہ جائے۔۔۔" بتول نے تشویش سے کہا تھا۔ ظہور نے قدرے بیزاری سے چارپائی پر پڑے وجود کو دیکھا پھر اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ ذرا سا جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ مانو انگارہ چھو لیا ہو۔ وہ پہلے بھی کئی بار اس کیفیت سے گزری تھی۔ اب کے نجانے کہاں سے لہری اٹھی تھی ہمدردی کی کہ وہ محلے کے ڈاکٹر کو بلا لایا۔

"اس پر تشدد کیا ہے آپ لوگوں نے۔۔۔" بتیس سالہ ڈاکٹر اجمل نے انہیں گھور کر دیکھا۔

"توبہ کریں جی۔۔۔" ظہور نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ڈاکٹر توبہ کیا کرتا۔ اس کے جسم کا جو حصہ بھی عیاں تھا نیلو نیل تھا۔

"گر گئی تھی کوٹھے کی سیڑھیوں سے۔" بتول نے تیزی سے کہا۔ ڈاکٹر نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموشی سے معائنہ کرنے لگا۔

"اسے اسپتال لے جانا پڑے گا۔"

"نہ ڈاکٹر صاحب! ہم تو غریب آدمی ہیں۔ اسپتال کا خرچا نہیں کر سکتے۔"

"مر جائے گی یہ۔۔۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"مر جائے پر خرچا نہیں ہے۔" ظہور ڈھٹائی سے بولا۔ ڈاکٹر اجمل دنگ رہ گیا۔ بے حد حیرت سے ان دونوں پھر بے ہوش پڑے وجود کو دیکھا۔

"کیا لگتی ہے تمہاری؟ بیٹی۔۔۔" اس نے بتول کو ٹھنڈا پانی لانے کو کہا اور خود ظہور سے پوچھنے لگا۔

"بہن ہے۔۔۔" ظہور کے لہجے میں بیزاری در آئی۔ جسے اجمل نے پوری طرح محسوس کیا۔ بتول ٹھنڈا ٹھنڈا پانی اور پرانا تولیہ لے آئی۔ وہ اس کے ہاتھ سے لے کر خود ہی تولیہ بھگو بھگو کر پٹیاں رکھنے لگا۔ اجمل کوالیفائڈ ڈاکٹر نہ تھا۔ پہلے ایک ڈاکٹر کے پاس کمپاؤنڈر کے طور پر کام کرتا تھا۔ جب کچھ دوائیوں اور بیماریوں کے نام یاد ہو گئے تو اس محلے میں آ کر ایک دکان کرائے پر لے لی۔ باہر ڈاکٹر اجمل ایم بی بی ایس کا بورڈ لگا کر کلینک کھول لیا۔ چھوٹی موٹی بیماریاں خود دیکھ لیتا ورنہ جواب دے دیتا۔ جو لوگ کوالیفائڈ ڈاکٹر کی فیسیں افورڈ نہیں کر سکتے تھے ان کے لیے اجمل رحمت سے کم نہ تھا۔

ٹمپریچر ذرا کم ہوا تھا۔

اس نے پیڈ نکال کر دوائیاں لکھنی چاہیں۔

"ایک ہی بار اچھی سی دوا لکھ دیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔ میں بار بار۔۔۔"

ڈاکٹر اجمل بری طرح جھنجھلا گیا۔ اس نے پیڈ بند کر کے بکس میں رکھا۔

"میڈیسن میں کلینک سے بھجوا دوں گا۔"

"بہت شکریہ۔" ظہور خوش ہو گیا۔

"میں اب چلتا ہوں' شام کو آ کر۔۔۔" وہ بس چلنے کو تھا۔ جب نگاہ بھٹک کر پاؤں پر جا رکی۔ اس نے پنجے سے پکڑ کر پیر کو ذرا سا موڑا۔

"مائی گاڈ۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ زخم میں پیپ پڑ رہی تھی۔ سارا پاؤں سوج گیا تھا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟۔۔۔" زمین پر رکھ کر اس نے اسٹول کھینچا اور پھر سے بیٹھ گیا۔

"بتایا تو تھا' سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ نیچے کانچ پڑا تھا' ایڑی میں لگ گیا۔" بتول نے جلدی سے بتایا۔

"کب لگا تھا۔۔۔"

"تھوڑے دن ہوئے۔"

"زخم خراب ہو رہا ہے۔ پٹی کیوں نہیں کروائی۔" فطرتاً" وہ ایک حساس دل جوان تھا۔ ان لوگوں کے رویے اسے سخت جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہے تھے مگر وہ بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا سوال یونہی ٹال دیا گیا۔ اجمل نے بینڈیج کی۔ ایک ہمدردانہ سی نگاہ اس کے غافل وجود پر ڈالی۔ کچھ ضروری ہدایات جن کے پورا ہونے کا اسے مطلق یقین نہ تھا' بتول کو دیں اور کھڑا ہو گیا۔

"شام کو دیکھنے آؤں گا۔"

"پیسے۔۔۔" ظہور نے کچھ کہنا چاہا۔

"ضرورت نہیں۔" اجمل نے مختصراً" کہا۔ "آپ میرے ساتھ آئیں میں دوائیاں دے دوں۔" ظہور فوراً" اس کے ساتھ نکل گیا تھا۔ بتول نے ایک نظر تارہ پر ڈالی۔

"مصیبت۔۔۔ گلے ہی پڑ گئی ہے۔"

زیر لب بڑبڑاتی چولہے تک آئی اور بیٹھ کر گوبھی کاٹنے لگی۔ شام کو اجمل پھر آیا تھا۔

"دوائی کھلا دی تھی؟۔" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"ہاں' کھلا دی تھی۔" ظہور گھر پر نہیں تھا۔ بتول نے بتایا۔ پھر پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"بخار کب تک اترے گا۔" وہ یوں پوچھ رہی تھی جیسے بخار نے اجمل کو فکسڈ ڈیٹ بتا رکھی ہو۔

"جلد ہی۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ نین تارہ ابھی بھی

نیم غنودہ سی حالت میں تھی۔ گرم سانسیں بے ترتیب سی تھیں۔ اس نے ٹمپریچر چیک کیا ایک انجکشن دیا۔ بتول بڑی دلچسپی سے ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔

"آپ کے بچے کہیں باہر گئے ہیں۔" اجمل کا سوال خاصا بے محل تھا۔ بتول سٹپٹا گئی۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"میرے بچے نہیں ہیں۔"

"اوہ آئی ایم سوری۔ میں سمجھا شاید کہیں کھیلنے نکلے ہیں۔" وہ فوراً معذرت کرنے لگا۔ بتول کو اس کا لہجہ اچھا لگا تو تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے اسے بتانے لگی۔

"بس خدا کو ہی منظور نہ تھا۔ پندرہ برس ہوگئے ہیں شادی کو۔ کہاں کہاں منت نہیں مانی۔ کس کس دربار پر نہ گئی۔ ہم پر تو داتا صاحب نے بھی کرم نہ کیا۔ نجانے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔"

اجمل نے ایک نظر نین تارہ کی آنکھ کے نیچے اور گردن کے پاس والے نیل کو دیکھا تو مبہم سا مسکرا دیا۔

"اس میں بھی اللہ کی مصلحت ہوگی۔ آپ بس دعا کیا کریں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ "رات تک انشااللہ بخار اتر جائے گا۔ میں صبح چکر لگا جاؤں گا۔"

بتول نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ویسے آپ بہت اچھی ہیں۔" وہ جاتے جاتے دروازے میں رک کر کہنے لگا۔ "بالکل میری بڑی بہن کی طرح۔ ان کی شادی فیصل آباد میں ہوئی ہے۔ ماشااللہ ان کے چار بچے ہیں۔ کیا میں آپ کو باجی کہہ لیا کروں۔"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔" بتول خوش ہو کر فوراً بولی۔

"شکریہ۔ میں صبح چکر لگاؤں گا۔"

وہ چلا گیا تو بتول دروازہ بند کرتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔

"اچھا لڑکا ہے۔ اپنی کوثر کے لیے اچھا رہے گا۔" کوثر اس کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے نجانے کون سے منصوبے بنانے لگی۔ رات کو ظہور آیا تو اس سے بھی ذکر کر بیٹھی۔

"ہاں اچھا نوجوان ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا اسے اس محلے میں آئے ہوئے۔ مگر سب اس کی تعریفیں ہی کرتے ہیں۔ آیا تھا شام کو۔؟"

"ہاں ٹیکا لگا گیا ہے۔ کہتا ہے بخار اتر جائے گا۔"

"کچھ کھایا تھا اس نے۔"

"رکا ہی کہاں۔" اس کی تان ابھی تک اجمل پر جمی تھی۔

"تارہ کا پوچھ رہا ہوں۔" ظہور کو پتا نہیں کیسے خیال آگیا تھا۔ ورنہ اس کی بھوک پیاس یا کسی بھی ضرورت سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

"ہاں۔ دلیے کا کہہ گیا تھا ڈاکٹر۔ وہی پکا کر دیا تھا۔" وہ بد مزا سی ہو گئی۔

"اچھا۔" ظہور تکیہ ٹھیک کر کے لیٹ گیا۔

"تم ذرا پتا تو کرنا۔ کس خاندان کا ہے۔ لگتا تو کسی شریف خاندان سے ہے۔" بتول دوبارہ سے اجمل پر آئی۔

"تو نے کیا کرنا ہے۔" ظہور نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"اماں بہت پریشان رہتی ہے۔ کوثر کے رشتے کے لیے۔"

"تو نہ خاندان کا پتا' نہ برادری کا اور تم چلی ہو رشتہ جوڑنے۔"

"یہی تو کہہ رہی ہوں' ذرا پتا تو کرو۔ خاندان برادری کا پتا چلے تو باقی میں خود سنبھال لوں گی۔ اب کوثر کے سر پر باپ ہوتو وہی کچھ کرے۔ بھائی اپنی اپنی دنیا میں گم ہو چکے ہیں اور تمہیں وہ اپنے باپ کی جگہ بھی سمجھتی ہے اور بھائی کی جگہ بھی۔ اس کے سر پر ہاتھ تم نہیں رکھو گے تو اور کون رکھے گا۔"

ظہور کا دھیان بھٹک کر تارہ کی طرف چلا گیا۔ ایک خیال ساذہن میں آیا اگر اجمل۔ مگر وہ اپنے خیال کا تذکرہ بتول سے نہیں کر سکتا تھا۔ جو ابھی تک کوثر کی مظلومیت کا رونا روتے ہوئے بہنوئی کے فرائض بیان کر رہی تھی۔

"اچھا دیکھتے ہیں کچھ۔ تم روٹی لے آؤ۔"

اس نے ٹالا تو وہ اٹھ کر روٹی لینے چلی گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

تین دن کے بعد اسے کچھ ہوش آیا تھا۔ بخار کا زور ٹوٹا تھا۔ سارا بدن پسینے پسینے ہو رہا تھا' حلق میں گویا کانٹے پڑ رہے تھے۔

"پانی۔" اس کے لب بے آواز پھڑپھڑائے۔ ساتھ ہی اک کراہ کے ساتھ آنکھیں کھل گئیں۔

"لو۔"

اس نے ذرا سا سر اونچا کرنے کی کوشش کی۔ کسی نے اس کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر سہارا دیا۔

"شاباش پی لو۔"

وہ غٹاغٹ پانی چڑھا گئی۔

"بخار اتر گیا ہے' انشاءاللہ اب نہیں ہوگا۔" کسی کی تسلی دیتی آواز ابھری۔ تارہ نے آنکھیں بند کیں اور دونوں آنکھوں پر بازو رکھ لیے اسے اپنے زندہ بچ جانے پر افسوس ہو رہا تھا۔

"تارہ۔ تارہ۔ پتر۔!" مامے مقبول کی آواز ابھری۔ وہ اس پر جھکا اس کے بازو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تارہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"تارہ۔ پتر۔ میری بات تو سن۔"

"نہیں۔ بزرگوار! آپ اس کو سونے دیں۔" اجمل نے مامے مقبول کو روکا۔

"یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا۔" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اجمل کو دیکھا۔

"یہ اللہ کے فضل سے اب ٹھیک ہے بالکل۔" اجمل نے تسلی دی۔ ان تین دنوں میں یہ پہلا شخص تھا جو اس لڑکی کے لیے رو رہا تھا۔ ورنہ اس نے تو کسی کی آنکھ میں تشویش کی ہلکی سی لہر بھی نہ دیکھی تھی۔

"تم مجھے اطلاع نہیں بھجوا سکتی تھیں۔" ماما مقبول بتول پر الٹ پڑا۔

"ہاں تمہارے ہاں تو جیسے بڑے ٹیلی فون لگے ہیں ماشاللہ کوئی آیا نہ گیا۔ اطلاع کس سے بھجواتی۔ اور پھر کوئی مر تو نہ گئی تھی جو اطلاع کرتے۔ ہم بیٹھے جو ہیں اس کی خدمتیں کرنے کے لیے۔"

بتول کو لمبی بات کرنے کی عادت تھی۔ ماما چپ ہو گیا۔ اجمل تاسف سے سر ہلانے لگا۔

"آپ اس کے کیا لگتے ہیں؟"

"ماما ہوں اس بدنصیب کا۔" اس نے صافے سے آنکھیں پونچھیں۔

"آپ میرے ساتھ آئیں۔" اجمل نے آہستگی سے کہا۔ پھر میڈیکل بکس اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

"اجمل۔ چائے پی کر جانا۔" بتول کے لہجے میں شیرینی گھلی۔

"باجی! پھر آؤں گا چائے پینے۔" اس نے پلٹ کر کہا اور مامے کو لے کر باہر نکل گیا۔ اسے اپنے کلینک لے گیا اور تارہ کی حالت کے بارے میں بتانے لگا۔ کمزوری اور نقاہت بہت زیادہ تھی۔ اسے اس وقت خوراک کی بہت ضرورت تھی اور بتول سے اجمل کو کوئی امید نہیں تھی کہ وہ ان تین دنوں میں اس کی خصلت اچھی طرح جان گیا تھا۔

"یہ لوگ اسے مارتے پیٹتے بھی ہیں۔"

"سوتیلے ہیں سارے۔" مامے مقبول نے آہستگی سے جواب دیا۔

"تو یہ بات ہے۔" اجمل اب ان کے رویوں کو سمجھا۔

"وہ سوتیلے سہی آپ تو اس کے سگے ہیں۔ کتنا ظلم ہو رہا ہے اس پر' آپ اسے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے۔"

"یہ لوگ بھیجیں تب نا۔"

"تو ایک میری بات مانیں' آپ کچھ دن یہاں رہیں۔ اس کا تھوڑا خیال رکھیں۔ اپنی نگرانی میں کھلائیں پلائیں۔ ورنہ اس کی حالت بگڑ جائے گی۔ یہ لوگ تو مجھ سے علاج بھی صرف اس لیے کروا رہے ہیں کہ میں نے ان سے کوئی پیسہ نہیں لیا۔ ورنہ شاید وہ یونہی۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ گیا۔ ماما مقبول اس کی لمبی

چوڑی ہدایات لے کر واپس آیا تو اس کے پاس پھل بھی تھے اور گوشت بھی۔ اس نے گوشت کی تھیلی بتول کو دی۔

"کیا کروں اس کا۔"

"یخنی بنانی ہے۔"

"ہاں ہم تو جیسے اس کو بھوکا مارتے ہیں۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے تھیلی پکڑی تھی۔ ماما مقبول نے گرم پانی کر کے تارہ کا ہاتھ منہ دھلایا۔ ایک کیلا تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔

"تیرا حال کیا ہو رہا ہے تارا!۔ لا تیرے بال بنا دوں۔"

وہ اس سے بار بار باتیں کر رہا تھا اور وہ اس کی ہر بات مان رہی تھی۔ مگر جواب نہیں دیتی تھی۔ شاید اس سے بہت خفا تھی۔ ماما مقبول اسے اپنی مجبوریاں بتانے لگا۔ اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

لمبے بالوں کی چوٹی بہت الجھی ہوئی تھی۔ مامے مقبول نے خود تیل لگا کر بال سلجھائے اور چوٹی بنا دی۔ وہ پھر سے آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ ماما اس کے پاس بیٹھ کر سر دبانے لگا۔ یخنی بننے میں ضرورت سے زیادہ وقت لگا تھا۔ جب بن گئی تو بتول نے پیالے میں انڈیل کر پیالا اسٹول پر پٹخ دیا اور خود گھر سے باہر نکل گئی۔ مامے مقبول نے چکھی انتہائی بد مزہ یخنی تھی۔ وہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"نین تارہ! لے یخنی پی لے۔ جسم کو طاقت ملے گی۔" مامے مقبول نے پیار سے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ مگر تھوڑی سی پی کر پیالہ ہٹا دیا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ گاؤں لے جاؤں گا۔" مامے نے گویا تسلی دی۔

"مجھے نہیں جانا۔" یہ واحد جملہ تھا جو اس کے منہ سے نکلا، ماما مقبول دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ بہت ناراض تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

گاڑی اچانک رک گئی تھی۔ اور اس کی خرابی بھی سمجھ سے بالاتر تھی۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ جھنجلا کر گاڑی لاک کرنے لگی۔ موبائل وہ آج گھر بھول گئی تھی۔ ورنہ فون کر کے دوسری گاڑی منگوا لیتی۔

"کیا ہوا۔؟" زین کی بائیک اس کے قریب رکی۔

"گاڑی خراب ہو گئی ہے۔" اس نے بے چارگی سے بتایا۔

"تو اب۔" زین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کوئی ٹیکسی دیکھتی ہوں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

"آئیں۔ میں چھوڑ آتا ہوں۔"

"تم۔" زارا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیوں یہ خادم آپ کا ڈرائیور بننے کے لائق بھی نہیں۔"

"مگر بائیک پر۔" وہ متذبذب تھی۔

"ہاں یہ سواری آپ کے شایانِ شان تو نہیں مگر مجبوری ہے۔"

"اُفوہ میں یہ نہیں کہہ رہی۔ اکچولی میں کبھی بائیک پر بیٹھی نہیں۔"

"تو آج یہ مزا بھی چکھ لیں۔"

وہ کچھ متذبذب سی اسے دیکھتی رہی۔

"کسی کے دیکھ لینے کا خوف ہے۔ مگر ہم اچھے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں۔" وہ بظاہر ہنس کر بولا تھا مگر اس کی مسکراہٹ پھیکی سی تھی۔

"صرف دوست ہوتے تو میں کبھی نہ بیٹھتی۔ مگر پلیز آہستہ چلانا۔"

زین نے واقعی رفتار خاصی ہلکی رکھی تھی۔ زارا کو مزا آنے لگا۔

"پتا ہے جب ہم لوگ لاہور آئے تو اس بائیک پر میں اور بابا پورا لاہور گھومے تھے۔ بہت انجوائے کیا تھا۔ ہم لوگوں نے۔"

"تم لوگ ہمیشہ سے لاہور میں نہیں تھے۔" زارا نے قدرے بلند آواز سے پوچھا۔

"نہیں، بابا ساہیوال چلے گئے تھے۔" وہ ایک پل کو

خاموش ہوا۔ "انہیں چھپنے کے لیے کسی چھوٹے شہر کی ضرورت تھی۔ جہاں انہیں کوئی نہ جانتا ہو۔ میں نے گریجویشن وہیں سے کیا۔ بابا کو وہاں جاب مل گئی تھی۔ لاہور تو ڈیڑھ سال قبل آئے تھے وہ بھی میری ضد پر کیونکہ میں ماسٹرز پنجاب یونیورسٹی سے کرنا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ بابا کی ضد تھی کہ ہم ملتان جائیں مگر وہ کبھی میری بات نہیں ٹالتے تھے۔" آخری جملے پر اس کا لہجہ افسردہ سا ہو گیا تھا۔

"تم ہاسٹل میں کیوں نہیں رہے۔" زارا نے اڑتے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ان کے قریب سے گزرتی مرسڈیز کی رفتار ایک پل کو ہلکی ہوئی اور پھر سے ہوا ہو گئی۔ زارا کی توجہ مکمل طور پر زین اور اپنے اڑتے دوپٹے کی سمت تھی۔

"اس شہر میں اور بابا مجھے تنہا بھجوا دیتے۔ امپاسبل، آپ نے دیکھا نہیں انہوں نے گھر کتنی دور لیا ہے۔"

"شاید قدرت ہمیں ملانا چاہتی تھی۔" زارا نے زیرِ لب کہا۔

"میں رفتار بڑھانے لگا ہوں، ذرا سنبھل جائیں۔" زین نے کہا تو وہ بے اختیار اس کی جیکٹ دبوچ کر بولی تھی۔

"بس مجھے زندہ سلامت گھر پہنچا دینا۔"

زین کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"خاصی ڈرپوک واقع ہوئی ہیں آپ؟"

وہ خاموش ہی رہی۔ بائیک عین گیٹ کے سامنے رکی تو چوکیدار نے خاصی حیرت سے انہیں دیکھا۔ زارا اسے خدا حافظ کہنے کو پلٹی تو وہ بے حد معصومیت سے پوچھنے لگا۔

"کیا یہیں سے واپس چلا جاؤں۔"

زارا نے کچھ سوچ کر نفی میں سر ہلا دیا پھر مسکرا کر بولی۔

"مما سے مل کر جانا۔"

"خفا تو نہیں ہوں گی وہ۔" زین یوں بولا جیسے آنا بھی چاہتا ہو اور پھپھو کی خفگی سے ڈرتا بھی ہو۔

"نہیں ہوں گی بابا آپ آ بھی جاؤ۔"

وہ فوراً بائیک سے اتر آیا۔ گویا اس کے کہنے کا منتظر ہو۔

"تم ماما کی خفگی سے اتنا۔" گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی زارا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ پورٹیکو میں مما کی بلیک کرولا کے ساتھ مرسڈیز بھی کھڑی تھی۔ وہ ساکت سی رہ گئی، زین کو اس کے عقب میں رکنا پڑا۔

"کیا ہوا۔؟"

زارا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ کچھ لمحے متذبذب سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر سر جھکا کر آہستگی سے بولی تھی۔

"سلیمان بھائی ہیں۔"

وہ گویا زین کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ زین کا چہرہ ایکدم سرخ ہوا تھا۔ آگ کی لپٹیں تھیں جو اسے اپنے چہرے کے گرد محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا پھر لب بھینچ کر ایکدم واپس پلٹ گیا اور جس اسپیڈ میں اس کی بائیک نظروں کے سامنے سے غائب ہوئی تھی، زارا اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ خوف نہیں، غصہ تھا۔ بہت شدید غصہ۔

وہ بے حد دل گرفتی سے اندر آ گئی۔ مما اور سلیمان لاؤنج میں ہی موجود تھے۔ وہ نجانے کون سی بات کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

"السلام علیکم۔" زارا نے بے حد بیزاری سے کہا۔ وہ فوراً اپنے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔

"زارا۔!" سلیمان بھائی کی آواز پر اسے رکنا پڑا۔ ایک بازو صوفے کی پشت پر پھیلائے وہ سنجیدہ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"جی سلیمان بھائی!"

"یہاں آؤ۔" انہوں نے نظروں کے زاویے سے اسے اپنے سامنے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ حیران سی ان کے سامنے آ گئی۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟" ان کے ٹھنڈے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ زارا نے بے اختیار سٹپٹا کر مما کو دیکھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

کرتے ہیں اور زین کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہیں اور بالآخر مین تارا پر ظلم و ستم کرکے اپنا مقصد یعنی مکان کی منتقلی کے کاغذات پر دستخط کروالیتے ہیں۔ ایک خدا ترس ڈاکٹر اجمل اس کا مفت علاج کررہا ہے۔

زارا، عظمٰی اور انعم کلاس فیلو ہیں' انعم کی اپنے خالہ زاد سے نسبت طے پاگئی ہے۔ جب کہ عظمٰی کو افتخار بے حد پسند کرتا ہے لیکن عظمٰی اپنی خاندانی پابندیوں کی وجہ سے اس کے التفات کا جواب انتہائی رکھائی سے دیتی ہے۔

۵
پانچویں قسط

"کس کے ساتھ آئی ہو زارا۔۔۔؟" سلیمان بھائی نے اپنا سوال دہرایا۔ لہجہ اب بھی ٹھنڈا تھا۔ زارا نے ایک لمحے کو سوچا۔ انہوں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ وہ ہنوز منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک طویل سانس لے کر اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے زارا نے اپنی فطری خود اعتمادی کے ساتھ انہیں دیکھا۔

"میرا کلاس فیلو تھا۔"

مما نے **متشکک** کر اسے دیکھا۔

"بائیک پر۔۔۔" سلیمان کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"مجبوری تھی۔ اس کے پاس گاڑی نہیں ہے۔"

"اور تمہاری گاڑی۔۔۔؟" سلیمان بھائی نے بے حد غور سے اس کے انداز کو دیکھا۔ وہ ایک پل کی گھبراہٹ رخصت ہوگئی تھی اور اب وہ بے حد سکون اور اعتماد سے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سی ناگواری در آئی۔

"خراب ہوگئی تھی۔"

"ہوں۔۔۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ وہ اندر ہی اندر ان کے انداز پر پزل سی ہونے کے باوجود اسی انداز میں کھڑی رہی تھی۔

"ڈرائیور کو ساتھ لے کر جایا کرو۔ واپسی پر بھی وہی لے آیا کرے گا۔ اسے ٹائمنگ بتا دینا۔" ان کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔ اس کے بعد وہ مما کی طرف پلٹے۔

"میں چلتا ہوں۔"

"ہاں۔" مما جو زارا کو دیکھ رہی تھیں۔ چونک کر پلٹیں۔ پھر سنبھل کر پوچھنے لگیں۔

"اب کب آؤ گے؟"

"آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ اب جاکر گاؤں کے معاملات دیکھنا ہیں۔ زارا۔۔۔ چلو گی گاؤں۔" اب ان کا لہجہ بالکل نارمل تھا۔

"ابھی تو میرے پاس فرصت نہیں۔" اس نے انکار کردیا۔

"ہوں۔ ایگزامز سے فارغ ہو جاؤ تو تمہیں گاؤں لے کر جائیں گے۔ رائے خاندان کی **اصل شان** و شوکت کا اندازہ تو وہیں ہوتا۔"

زارا جانتی تھی۔ انہوں نے یہ جملہ کیوں کہا ہے اور وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ سلیمان بھائی کسی **مصلحت** کی بنا پر نرم رویہ اختیار کرگئے ہیں اور زارا بھی **مصلحتاً** خاموشی سے کھڑی رہی۔ سلیمان کے جانے کے **فوراً بعد** مما اس کی طرف پلٹیں۔

"تم زین کے ساتھ آئی ہو۔"

"جی۔۔۔"

"سلیمان نے اسے دیکھ لیا۔"

"ظاہر ہے۔ تب ہی تو پوچھ رہے تھے۔" **زارا نے بیگ کاؤچ پر رکھا اور چابی مما کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی تھی۔ "ڈرائیور سے کہئے گا گاڑی سروس کے لیے دے آئے۔" مما نے ہاتھ بڑھا کر غائب دماغی سے چابی پکڑی۔ پھر جھنجلا کر بولیں۔**

"تم اپنے پپا سے کہہ کر گاڑی بدلوا کیوں نہیں لیتیں۔"

زارا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ مما ڈر گئی ہیں۔ تب وہ ہی قصداً "مسکرائی۔" اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ نئی گاڑی خراب نہیں ہوسکتی۔"

"ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ زین اور سلیمان کا سامنا نہیں ہونا چاہیے تھا۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائیں۔

"مما! ابھی نہ بھی تو ایسا ہونا تھا اور زین کے چہرے پر تو نہیں لکھا کہ وہ جمشید حیات کا بیٹا ہے۔ سلیمان بھائی کو غصہ صرف اس بات پر تھا کہ میں اس کے ساتھ بائیک پر کیوں آئی۔ اپنے خاندان کی عظمت اور شان و شوکت کا بہت احساس ہے انہیں۔۔۔ آپ بلاوجہ پریشان مت ہوں۔"

مما نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں ڈرائیور سے کہوں گی کہ۔۔۔"

"مما۔" زارا نے سنجیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ "سلیمان بھائی نے کہہ دیا اور میں نے خاموشی سے سن لیا۔ لیکن میں کوئی اسکول جانے والی بچی نہیں ہوں کہ ڈرائیور کے ساتھ آیا جایا کروں۔"

"لیکن سلیمان۔۔۔"

"وہ پوچھیں گے تو میں جواب دے دوں گی۔ آپ پریشان مت ہوں۔"

"پریشان۔۔۔ اب تو چوبیس گھنٹے ذہن الجھن کا شکار رہتا ہے۔" انہوں نے کنپٹی کو انگلیوں سے مسلا۔

"فائدہ؟۔۔۔"

"زین باہر ہی سے چلا گیا۔" مما کو اچانک خیال آیا۔

"اور کیا کرتا۔ سلیمان بھائی کو بھی تو ابھی آنا تھا۔" وہ جھنجلا گئی۔ زین کا اس طرح چلے جانا اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔

"اور زین کے لیے۔۔۔" اس کے اندر سے سوال ابھرا تو دل کسی گہرے تاسف کی لپیٹ میں آگیا۔

"یہ سب کب تک چلے گا۔۔۔؟" اس نے خود سے سوال کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس طرح دروازے سے لوٹ جانا زین کے لیے کتنا اذیت ناک ہوگا۔ تب ہی وہ بیگ اٹھا کر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

دروازہ آہستگی سے کھلا تھا۔ زارا نے پلٹ کر دیکھا۔ مما کھڑی تھیں۔

"مما! آپ سوئیں نہیں ابھی تک۔"

"نیند کہاں آتی ہے۔" وہ بہت مضطرب اور بے چین نظر آرہی تھیں اور اسی انداز میں وہ اندر آکر اس کے بیڈ پر آبیٹھیں۔

"نیند کیوں نہیں آرہی؟" زارا نے نائٹ کریم کھولتے ہوئے سوال کیا۔ مما نے گویا اس کا سوال سنا ہی نہیں۔ سر جھکائے نجانے کیا سوچتی رہیں۔ پھر زیرِ لب بڑبڑائیں۔

"کہاں چلا گیا یہ لڑکا؟"

"کون زین؟۔۔۔" زارا نے چونک کر پوچھا۔

"تم نے اسے فون کیا تھا؟" مما نے پوچھا۔

"سچ پوچھیں مما میری تو ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بہت ہرٹ ہوا تھا۔" زارا نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ گھر پر نہیں ہے' بلکہ یونیورسٹی کے بعد گھر گیا ہی نہیں اور اب کتنی رات ہوگئی ہے۔" وہ کتنی پریشان تھیں۔ زارا اندازہ کرسکتی تھی۔

"میں جانتی تھی وہ گھر نہیں جائے گا۔" زارا آہستگی سے گویا ہوئی۔

"تو کہاں چلا گیا۔ وہ تو کہتا تھا اس کا کوئی دوست نہیں۔"

زارا کیا جواب دیتی۔ سست روی سے ہاتھوں پر کریم لگاتے ہوئے نجانے کیا سوچتی رہی۔

"زارا! یوں کب تک چلے گا؟" مما نے پوچھا تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔"

"ہاں۔ اب تو کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائیں۔ پھر کھڑی ہوگئیں۔

"سوجاؤ تم۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" زارا جانتی تھی مما نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

وہ واپس اپنے بیڈ روم میں آگئیں۔ کمرے میں نیم

کی گری تھی۔ وہ آہستگی سے چلتیں بیڈ کے قریب آئیں۔ مگر اس پر بیٹھنے یا لیٹنے کی بجائے وہیں کھڑی محوِ خواب رائے عمیر کو دیکھتی رہیں۔ پھر طویل سانس لے کر بڑبڑائیں۔

"تمہارے ساتھ میں نے عمر کے چوبیس برس گزار دیے۔ حالانکہ جس پل جمشید بے گھر ہوا تھا۔ میرا دل کہتا تھا یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤں۔ مگر۔۔۔ نجانے یہ تمہاری اور زارا کی محبت تھی جو میرے قدموں کو زنجیر کر گئی۔ یا اس بدنصیب کی لگائی پابندی۔

"نہیں آئمہ! جب تک تم آئمہ حیات تھیں۔ تب تک تو ٹھیک تھا۔ مگر اب تم آئمہ عمیر ہو۔ تمہارے سارے مفادات اب اسی گھر سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ تمہاری سوچ تمہاری قربانی ہر صورت اسی شخص اور اسی گھر سے وابستہ ہونی چاہیے۔"

"شادی کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں تم سے سارے رشتے سارے تعلق ختم کر دوں۔ بھائی ہو تم میرے۔ کیا میں تمہارے لیے لڑ بھی نہیں سکتی۔"

"میرے لیے اپنا گھر تباہ کرو گی؟"

"اگر تم میرے لیے نورین سے شادی کر سکتے ہو تو میں۔۔۔"

وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"آئندہ ایسی بات مت کرنا۔" اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"کیوں جمشید! کیوں نہ کروں۔ میں سب کچھ کروں گی۔ جو بھی کر سکی۔"

"اگر تم نے کچھ کیا۔ کچھ بھی ایسا جس سے تمہارے گھر پر آنچ آئی۔ تو تم مجھے کھو دو گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔"

"جمشید!"

"تمہیں صرف زارا کے بارے میں سوچنا ہے آئمہ۔ عورت جب ماں بنتی ہے تو باقی سارے رشتے ثانوی ہو جاتے ہیں۔ تم عمیر کی بیوی اور زارا کی ماں ہو۔ بس اتنا یاد رکھو۔ ورنہ مجھے کھو دو گی۔"

"کھو تو میں نے تمہیں دیا جمشید۔۔۔!" ان کے لبوں سے سسکی نکلی۔ رائے عمیر نے کروٹ بدلی تھی۔ اسے کھڑے دیکھ کر اسی غنودگی کے عالم میں بولے تھے۔

"سو بھی جاؤ آئمہ۔"

"آپ سو جائیں عمیر۔۔۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔ اور وہ تو ان کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی نیند میں کھو گئے تھے۔ وہ کچھ لمحے کھڑی انگلیاں چٹخاتی رہیں۔ پھر سائیڈ ٹیبل پر پڑا موبائل اٹھایا اور گلاس ڈور کھول کر ٹیرس پر چلی آئیں۔

رات بہت ہو چکی تھی۔ مگر انہیں چین نہیں آرہا تھا۔ تب ہی انگلیاں پھر سے زین کا نمبر پریس کرنے لگیں۔ موبائل کان سے لگائے وہ ہر بار منتظر رہیں کہ اب زین ریسیور اٹھائے گا مگر دوسری طرف بار بار چیختی گھنٹیوں کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ موبائل آف کر کے وہ ٹیرس کی گرل کے پاس آگئیں۔

"کہاں۔۔۔ کہاں چلا گیا زین! کیا رات کو بھی گھر نہیں آیا۔ اتنی سردی ہے۔" ان کے سامنے سارا علاقہ محوِ خواب تھا۔ ایک ایک کر کے کئی وسوسے ان کے دل میں جاگنے لگے۔

"مجھ میں اب زین کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے۔۔۔"

ان کے اندر بار بار اسی جملے کی گردان ہو رہی تھی۔ انہوں نے دوبارہ نمبر پریس کرنے چاہے۔

"آئمہ۔" عقب سے ابھرتی آواز نے ان کی انگلی کو نمبر کیس پر ساکت کر دیا تھا۔ پھر ایک ہاتھ ان کے شانے پر آرکا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" رائے عمیر ان کے سامنے آگئے۔

وہ خاموش ہی رہیں۔

"نیند نہیں آرہی؟۔۔۔" ان کی اپنی آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید کچی نیند سے جاگے تھے۔

"نہیں۔"

"کیوں؟۔۔۔" انہوں نے حیرانی سے آئمہ کو دیکھا۔ "کوئی پریشانی ہے؟"

آئمہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہیں۔ اپنی پریشانی وہ ان کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔

"نیند نہیں آرہی تھی تو ٹی وی کھول لیتیں یا میگزین دیکھ لیتیں۔ اتنی سردی میں باہر کیوں نکل آئیں اور کوئی گرم شال بھی نہیں لی تم نے۔" ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"پتا نہیں عمیر! مجھے تمہاری اپنے لیے یہ تشویش اچھی نہیں لگ رہی۔" وہ موبائل پر نظریں جمائے بولی تھیں۔ رائے عمیر کی آنکھوں میں تحیر سا اتر آیا۔ انہیں آئمہ سے اس جملے کی بالکل توقع نہ تھی۔

"یہ ذرا سی سردی میرے اندر لگی آگ نہیں بجھا سکتی عمیر!"

"کیسی آگ؟۔۔۔" وہ پہلے چونکے۔ پھر سوال کرنے کے بعد نظریں چرا گئے تھے۔ آئمہ بالکل خاموش رہی تھیں۔ مگر ان کے چہرے پر مترشح اضطراب وہ بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

"آؤ اندر چلیں۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔ تب ہی نگاہ ہاتھ میں پکڑے موبائل پر پڑی تھی۔

"اس وقت کسے فون کر رہی تھیں۔"

آئمہ نے اضطراری انداز میں انہیں دیکھا۔

"آئیں۔ اندر چلتے ہیں۔۔۔" وہ فوراً پلٹ گئیں۔

"زین العابدین کو۔" رائے عمیر کی آواز پر جہاں ان کے قدم ٹھٹھک گئے۔ وہیں موبائل ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ انہوں نے ایک نظر نیچے گرے موبائل پر ڈالی اور اگلا سوال کیا۔

"تم اس سے ملتی ہو نا۔" وہ آئمہ کے سامنے آئے۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ بس ساکت نظروں سے انہیں دیکھتی رہیں۔ پھر دھیرے دھیرے ان کی نگاہوں میں خوف سمٹ آیا۔

"آپ سلیمان کو بتائیں گے؟۔۔۔"

رائے عمیر نے بے حد تاسف سے انہیں دیکھا۔

"تم نے مجھ پر کبھی اعتبار نہیں کیا آئمہ۔"

ان کی آنکھوں کے گوشے یک بیک بھیگ گئے۔

"عمیر! میں۔۔۔ میں اسے یہاں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اپنے پاس۔" ان کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ رائے عمیر نے بغیر کچھ کہے بے حد خاموشی سے ان کے کندھے پر بازو پھیلایا۔ پھر آہستگی سے بولے تھے۔

"آؤ اندر چلتے ہیں۔"

♥ ♡ ♡ ♥

صبح ان کی حالت دیکھ کر زارا پریشان ہو گئی۔

"آپ رات بھر نہیں سوئیں مما۔۔۔" اور وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اٹھیں۔

"مما۔۔۔ مما۔۔۔ کیا ہو گیا۔۔۔؟"

"زارا! وہ رات کو گھر نہیں لوٹا۔"

"کون زین؟۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ بہت غصے میں تھا نا وہ۔"

"غصے میں تو تھا۔ مگر اس طرح پریشان ہونے سے کیا ہوگا مما۔۔۔" زارا ان کے قریب بیٹھ کر تسلی آمیز لہجے میں بولی۔ وہ زین سے محبت کرتی تھی مگر مما جیسی

دیوانگی اس کے حصے میں نہ آئی تھی۔ وہ تو گویا زین میں جمشید کو دیکھتی تھیں۔

"کسی دوست کی طرف چلا گیا ہو گا۔ میں دوبارہ فون کرتی ہوں۔۔۔" وہ اٹھنے لگی، مگر مما نے اسے روک دیا۔

"میں نے ابھی کیا ہے۔ سلیم نے ہی بتایا تھا کہ وہ رات کو گھر نہیں آیا۔"

زارا کو بھی تشویش تو ہوئی تھی مگر وہ اسے چھپا کر مما کو دلاسہ دیتی رہی۔

"تمہارے پاپا کو معلوم ہو گیا ہے۔" بہت دیر کے بعد انہوں نے آہستگی سے بتایا۔

"کیا۔۔۔؟"

"یہی کہ ہم زین سے ملتے ہیں۔"

"اوہ۔۔۔" زارا چونکی۔ پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "میں جانتی تھی۔ پاپا یہ بات بہت جلد جان لیں گے۔"

"ان کا ری ایکشن کیا تھا۔؟"

"کچھ بھی نہیں۔ خاموش ہو گئے تھے۔"

"پاپا یہ بات بہت پہلے ہی جان گئے تھے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو۔۔۔؟"

"مجھے احساس تھا کہ وہ مصلحتاً "خاموش" ہیں۔"

"اور اس سے پہلے کہ یہ بات سلیمان کو معلوم ہو۔ میں اسے لے کر بہت دور چلی جانا چاہتی ہوں۔ مگر وہ غائب کہاں ہو گیا ہے۔؟"

"شاید وہ یونیورسٹی آئے۔"

"ہاں۔۔۔ تم جاؤ نا یونیورسٹی۔۔۔!" وہ بے تابی سے بولیں۔ زارا کو پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ پریشان سی یونیورسٹی چلی آئی مگر وہ یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ زارا نے اس کے کلاس فیلو شیراز سے پوچھا تھا۔

"زین تو نہیں آیا۔ حالانکہ آج خاصی اہم کلاسز تھیں۔" شیراز نے بتایا تو وہ جھنجلا گئی۔

"انتہائی جذباتی نوجوان ہے۔ یوں فرار ہونے سے کیا ہو گا۔" اس کا پہلا پیریڈ مس ہو گیا تھا۔ دوسرے پیریڈ کے شروع میں ہی انعم نے اسے گھیر لیا۔

"کہاں ہو تم زارا کی بچی۔۔۔"

"ہاں تھوڑا لیٹ ہو گئی میں۔ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔ سر رضا کی کلاس نہیں لینی ؟۔"

"سر رضا آج نہیں آئے۔" عظمیٰ بھی اس کے قریب آئی۔

"چلو چھٹی ہوئی۔" زارا نے گلاسز سر پر ٹکائے۔ وہ تینوں چلتی ہوئی لان میں آ گئیں۔

"یار زارا! میں نے تمہیں ایک خبر سنانی ہے۔" سفید گلابوں کے تختے کے پاس انعم ایک دم اس کے سامنے آئی۔ ہلکے سبز سوٹ میں وہ معمول سے زیادہ کھلی کھلی لگ رہی تھی۔

"سچ سچ بتاؤں۔ میں تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم آج مجھے کیا خبر دو گی۔" زارا مسکرائی۔ انعم کا چہرہ تیزی سے سرخ ہوا۔ پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی چلی گئی۔

"یہ لڑکی گئی کام سے۔۔۔" عظمیٰ بیگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

"تمہاری منگنی ہو گی تو پوچھوں گی۔" انعم بھی چوکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"ہمیں اپنی فیلنگز چھپانا نہیں آتیں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"اب بتا بھی دو۔ کب آ رہی ہیں تمہاری خالہ انگوٹھی پہنانے۔" زارا نے پوچھا۔

"اگلی اتوار کو۔ تم آؤ گی نا زارا!۔" انعم نے ساتھ ہی پوچھا۔

"فنکشن ارینج کر رہے ہو۔"

"یونہی دو چار لوگ اکٹھے ہو جائیں گے اور میری فرینڈز ہوں گی بس۔"

"یہ تم نے شادی کر کے گھر ہی بیٹھنا تھا تو ماسٹرز کسی بھی سبجیکٹ میں کر لیتیں۔ یہ جرنلزم کی سیٹ ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" عظمیٰ نے عینک کے عقب سے اسے گھورتے ہوئے لتاڑا۔ اسے انعم کا منگنی پر اتنا ایکسائیٹڈ ہونا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

"ہا۔۔۔ ہائے۔" انعم کا منہ کھلا۔ "اس وقت تو میری باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر منتیں ہو رہی تھیں کہ انعم میں اکیلی یونیورسٹی کیسے جاؤں گی۔" اس نے نقل اتاری۔

"ہاں تو مجھے کیا پتا تھا کہ آخر میں تم ڈگری کے بجائے شادی کے لیے مرنا شروع کر دو گی۔"

"یہ صرف۔۔۔ مجھ سے جیلس ہو رہی ہے۔" وہ منہ بنا کر زارا کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ "تم آؤ گی نا!۔"

"ظاہر ہے۔" زارا مسکرائی پھر پوچھنے لگی۔ "دانیال بھی آئے گا؟۔"

"اسے اپنی ٹانگیں تڑوانی ہیں۔ منگنی کے بعد ہمارے خاندان میں شریف لڑکے سسرال تو کیا سسرالی شہر میں بھی قدم نہیں رکھتے۔"

"ہاں مگر منگنی کے وقت تو۔۔۔ انگوٹھی تو وہ پہنائے گا نا۔" زارا نے پوچھا تو انعم نے ایک لمبی سی آہ کھینچی۔

"ہماری ایسی قسمت کہاں زارا بی بی۔"

"یہ لڑکی۔" عظمیٰ نے اسے غصے سے گھورا۔ پھر دانت پیس کر بولی تھی۔ "پتا نہیں اس کا دماغ کب خراب ہوا۔ حالانکہ پہلے اچھی بھلی ہوتی تھی۔"

"سچ سچ بتاؤں۔" وہ نچلا لب دانتوں تلے دبا کر متبسم و شریر لہجے میں بولی۔

"بولو۔" بادل نخواستہ کہا گیا۔

"جب میں نے تین سال قبل دانیال کو ریحان بھائی کی شادی میں دیکھا تھا۔"

"اوہ نو۔" عظمیٰ کے لیے یہ بات غیر متوقع تھی اور اس نے کبھی ذکر بھی نہیں کیا تھا۔

"او یس۔۔!" وہ کھلکھلا اٹھی۔ پھر لاڈ بھرے لہجے میں بولی۔ "چلو نا مجھے چاٹ کھلا دو۔۔۔" فرمائش زارا سے کی گئی تھی۔

"میں نے تو سنا ہے۔ شدید خوشی اور غم میں بندے کی بھوک مر جاتی ہے۔" عظمیٰ نے کہا۔

"شدید خوشی تو مجھے ہو رہی۔ یہ شدید غم کیا افتخار کے نہ آنے کا ہے۔" انعم نے اس کی سمت جھک کر سرگوشی کی۔ پھر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی تھی کہ عظمیٰ کا بیگ اس کے ہاتھوں سے اسکڈ میزائل کی طرح نکلا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

یہاں سے بہت دور بھاگ جانے کی خواہش نے اسے نجانے کہاں بھٹکایا تھا۔ مگر وہ جو اندر ایک اذیت اضطراب بن کر لہو میں سرایت کر گئی تھی۔ وہ اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ موٹر سائیکل بہت دور کھڑی کر کے وہ یہاں تک پیدل آیا تھا اور اب اس سوکھے درخت سے ٹیک لگائے اپنی اندر اٹھتی تلخ سوچوں کو سن رہا تھا۔ خزاں گزیدہ موسموں کی زد میں آئے درختوں سے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر برس رہے تھے۔ اس کا دل چاہا یہ خشک و زرد پتے یونہی برستے رہیں۔ یہاں تک کہ اس کا وجود ان پتوں میں چھپ جائے اور کوئی اسے ڈھونڈ نہ پائے۔ اس نے سر اٹھا کر خود پر جھکی برہنہ شاخوں کو دیکھا۔

"لیکن کون ہے جو ان خزاں گزیدہ موسموں میں مجھے آواز دے۔"

"کوئی نہیں۔۔۔ کوئی بھی تو نہیں۔"

"کون ہو تم۔۔۔؟" نجانے کون تھا اور اس کے قریب رک رک کر کیوں ایسا سوال کر رہا تھا جس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ اس کے اندر پھر سے وہی الاؤ جلنے لگا۔ تو وہ مضطرب سا کھڑا ہو گیا۔ اس کے قدموں کے نیچے خشک پتے چلا چلا کر ایک ہی سوال دہرانے لگے۔

"کون ہو تم؟۔۔۔"

اس نے ایک وحشت کے عالم میں بائیک اسٹارٹ کی تھی اور خود کو ایک نامعلوم سفر کے حوالے کر کے بھول جانے کی ایک ناکام سی کوشش کی۔ اسے خبر نہیں تھی وہ کہاں ہے؟ زمین پر، آسمان پر یا پھر کسی خلائے بسیط میں گم۔ وہ رکا تھا یا چل رہا تھا مگر ایک اضطراب مسلسل تھا جو اسے شہر کی ہر ہر سڑک پر بھگائے جا رہا تھا۔

دن کی روشنی بجھنے لگی۔ شام کی آنکھ میں رات اتری تو ایک تھکی تھکی سی سوچ نے اس کے مضطرب دل و دماغ میں سناٹا سا بھر دیا، تو اس نے خود سے اعتراف کیا تھا۔

"ہاں!۔ میں ہوں زین العابدین۔ ایک شکست خوردہ انسان کا بزدل بیٹا۔ اور بزدلی کا وصف شاید مجھے ورثے میں ملا ہے۔"

وہ گھر نہیں جانا چاہتا تھا کہ اپنے گھر کے ساکت درودیوار سے لڑتے لڑتے تھک گیا تھا اور وہ جانتا تھا آج کی رات بھی وہ سو نہ پائے گا۔

"لیکن میں کہاں جاؤں۔"

سڑکوں پر اترتی دھند اس کی منزل کو بے نشاں کر رہی تھی اور جب اس کے اعصاب شل ہو گئے اور سرد ہوائیں اس کے وجود کو منجمد کرنے لگیں تو نجانے کیوں...... مگر اس نے خود کو افتخار کے گھر کے سامنے پایا۔ افتخار بیٹھک میں ابا کی ٹانگیں دبا رہا تھا اور اس کے ابا حقے کی نے منہ میں دبائے لحاف میں دبکے بابا بلھے شاہ کی کافیاں سنا رہے تھے۔ انگیٹھی میں دہکتے سرخ انگاروں نے کمرے کی فضا میں ہلکی سی حدت پیدا کر دی تھی۔

"ارے زین العابدین......!" وہ اپنی روایتی گرم جوشی کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوا۔ پھر پلٹ کر اپنے اباجی سے تعارف کروانے لگا۔ زین پہلے بھی دو بار اس کے گھر آیا تھا۔ مگر اس کے اباجی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ یونہی غائب دماغی سے جھک گیا۔ انہوں نے مشفقانہ انداز میں اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ تحیر سے اسے دیکھا۔

"کیا اندر اتنی آگ دہکا رکھی ہے کہ باہر کی سردی کا احساس ہی نہیں پتر۔" اس کے وجود پر کوئی جرسی کوئی سوئیٹر نہ تھا۔

افتخار کو اس کی حالت عجیب سی لگی۔ خود سے لاپروا تو وہ ہمیشہ تھا مگر یہ خاموشی یہ خود فراموشی کی حالت پہلے کبھی نہ تھی۔

"افتخار پتر! اپنے دوست کو دوسرے کمرے میں لے جا۔"

انہوں نے اشارہ کیا تو افتخار نے اس کا سرد ہاتھ تھاما اور بائیں ہاتھ والے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر لحاف اوڑھے، کتاب سامنے کھولے بارہ، تیرہ سالہ لڑکا اپنا سبق رٹنے میں مصروف تھا۔

"باسط! تم اباجی کے پاس چلے جاؤ۔"

اس نے ایک نظر زین پر ڈالی اور بغیر کوئی سوال کیے اپنی کتاب بند کی اور چپل پہن کر کھسڑ کھسڑ کرتا دوسری بیٹھک میں چلا گیا۔

"میرا بھانجا ہے۔ بیٹھو تم......" افتخار نے پلٹ کر کہا۔ وہ خاموشی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں بھی اوپر کر لیں۔ نجانے کیوں...... مگر وہ منجمد کیفیت اب ختم ہو رہی تھی۔ سردی کا احساس ایک دم بڑھ گیا تھا اور وجود پر کپکپی سے طاری ہو گئی تھی۔ اس نے کھینچ کر لحاف اپنے اوپر کر لیا۔

"کیا ہوا زین؟......" افتخار نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر سر جھکا لیا۔ مگر وہ اس کی آنکھوں میں چھائی دھند دیکھ چکا تھا۔

"رونا چاہتے ہو...... رو لو...... رونا بزدلی سہی مگر کبھی کبھی ہمارے اندر چھائی دھند چھٹ جاتی ہے۔"

اور زین نے بے اختیار اپنا چہرہ بازو میں چھپایا تھا۔ غصہ، نفرت، یا اپنی بے بسی کا احساس تھا، سب کچھ بہہ گیا تھا۔

افتخار خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو وہ خاموشی سے دیوار پر لگا نئے سال کا کلینڈر دیکھ رہا تھا۔ افتخار نے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھا۔ پھر قدرے بشاشت سے بولا تھا۔

"تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر لایا ہوں۔ کیونکہ بے بے سو گئی تھیں۔"

اس نے دودھ پتی کا پیالہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ جس میں تین ابلے ہوئے انڈے تھے۔ زین کو ایک دم شدید بھوک کا احساس ہوا اور جب وہ ان سے فارغ ہوا تو افتخار اس کے پلنگ پر نیم دراز دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے آنکھیں موندے بلھے شاہ کی کافی گنگنا رہا تھا اور جیسے ہی اس نے خالی پلیٹ اور پیالہ پاس پڑی چھوٹی میز

پر رکھا تو اس نے آنکھیں کھول کر زین کو دیکھا۔

"اب کہو دوست! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

زین نے تذبذب سے اسے دیکھا۔ مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے جن کے سامنے آپ بلا خوف وخطر بڑی لاپروائی اور اعتماد کے ساتھ اپنی زندگی کی کتاب کا ورق ورق کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ جو کبھی کسی کے ساتھ دوستی کے دعوے نہیں کرتے۔ مگر ہر کوئی انہیں اپنا دوست سمجھتا ہے اور زین نے بھی اسی اعتماد کے ساتھ اس سے اپنی زندگی کے ہر راز کو شیئر کیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

چپ کر کے کریں گزارے نوں
سچ سن کے لوگ نہ سہندے نی
سچ آکھیے تاں گل پیندے نی
سچ مٹھا عاشق پیارے نوں
چپ کر کے کریں گزارے نوں

لحاف کو سر تک اوڑھے وہ بے حد خاموشی میں ابھرتی آواز کو نیم غنودگی میں سن رہا تھا۔ یہ افتخار کے اباجی کی آواز تھی۔ پھر وہ خاموش ہوئے اور ہلکا ہلکا کھانسنے لگے۔ پھر حقے کے گڑگڑانے کی آواز۔

زین نے لحاف سر سے ہٹا کر دیکھا۔ سامنے دیوار پر لگے کلاک میں دس بج رہے تھے۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

"کیا میں رات کو یہیں سو گیا تھا۔"

اس نے بے حد حیرت سے سوچا۔ پھر گردن گھما کر دوسرے پلنگ پر نظر ڈالی۔ وہ خالی تھا لحاف تہہ کر کے پائنتی کی طرف رکھا تھا۔ اسی لمحے افتخار اندر داخل ہوا۔

"اٹھ گئے ہو۔؟"

"عجیب بے خبری تھی۔ میں یہیں سو گیا۔ آپ کو بھی خوامخواہ ڈسٹرب کیا۔" زین کے لہجے میں ہلکی سی شرمندگی تھی۔ افتخار اس کا دوست تو نہ تھا۔

"مجبوری تھی شہزادے! رات تمہاری حالت ایسی تھی کہ میں تمہیں باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ مگر اب نکال سکتا ہوں۔ لیکن ناشتہ کرنے کے بعد۔" افتخار

نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔
"اٹھ جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو لو۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"
زین نے ممنونیت سے افتخار کو دیکھا۔ رات وہ نہ ہوتا تو شاید وہ پاگل ہو جاتا۔ باتھ روم میں گرم پانی رکھا تھا۔ منہ ہاتھ دھوتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے افتخار کو کیا کچھ بتایا تھا۔
"آ بھی جایار......"
افتخار کی آواز پر وہ تولیے سے چہرہ صاف کرتا باہر نکل آیا۔ افتخار ناشتے کی ٹرے میز پر رکھے منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔
"میں تو تمہارے لیے حلوہ پوری لانے والا تھا۔ مگر بے بے نے پراٹھے بنالیے۔"
گرما گرم پراٹھے تھے۔ آملیٹ اور آلو کی بھجیا۔ گرما گرم چائے۔ زین کا سر بھاری بھاری سا تھا۔ ناشتہ کرنے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر افتخار کے اصرار پر جب کھانے پر آیا تو کھاتا چلا گیا۔ پراٹھے گرم اور خستہ تھے۔ چائے مزیدار۔ افتخار اسے اپنی زمینوں اور باغ کے بارے بتا رہا تھا۔ وہ دلچسپی سے سنتا رہا یا شاید دلچسپی لینے کی شعوری کوشش کرتا رہا۔
"کسی دن تمہیں اپنا باغ دکھانے لے جاؤں گا۔"
"ہاں چلوں گا۔" زین نے خالی کپ میز پر رکھا۔ افتخار نے اس پورے عرصے میں نہ تو کوئی تبصرہ کیا تھا اور نہ ہی کوئی مشورہ دیا تھا۔ بس زین کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ حالانکہ سر بوجھل تھا آنکھیں جل رہی تھیں شاید رات کی سردی اثر دکھا گئی تھی کہ پورے جسم میں اینٹھن اور سلگتی سی کیفیت تھی۔ مگر اس نے افتخار سے ذکر نہیں کیا۔
"بے بے سے کہیے گا۔ میں نے ایسا مزیدار ناشتہ زندگی میں پہلی بار کیا ہے۔"
"بے بے کہہ رہی ہیں تم روز آجایا کرو۔" افتخار ہنسا۔ پھر اسے کھڑے ہوتے دیکھ کر پوچھنے لگا۔
"جارہے ہو۔"
"ہاں......"

افتخار نے اپنی گرم چادر اسے دی۔
"سر اچھی طرح لپیٹ لینا۔ ہوا سرد ہے۔" اس نے ہدایت کی۔ پھر اسے چھوڑنے باہر تک آیا تھا۔ وہ سیدھا گھر پہنچا۔ سلیم لان میں ہی کھڑا تھا۔ وہ اسے نظرانداز کرکے اپنے بیڈ روم میں آگیا۔ سلیم اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔
"بھائی جان کہاں تھے آپ......" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔
"کیوں......؟" زین نے چابی اور والٹ نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔
"رات میں دیر تک آپ کا انتظار کرتا رہا۔ پھر گھر لاک کرکے چلا گیا۔ صبح آیا تو چابی وہیں رکھی تھی۔ بھائی جان آپ رات کو بھی گھر نہیں آئے؟"
"ہاں......" زین نے وارڈ روب کھول کر اپنے کپڑے نکالے۔
"کیوں۔ پہلے تو کبھی رات کو گھر سے باہر نہیں رہے۔"
"اپنا کام کرو۔"
سلیم نے خفگی سے اسے دیکھا۔ پھر اسی انداز میں بڑبڑایا۔
"بابا جان ہوتے تو میں دیکھتا۔"
زین نے اسے پلٹ کر دیکھا۔ پھر بگڑے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "بابا جان نہیں ہیں اور تم ان کی جگہ سنبھالنے کی کوشش مت کرو۔"
سلیم اس کے لہجے سے خائف ہو کر خاموش ہو گیا۔ پھر آہستگی سے بتانے لگا۔
"صبح آپ کی پھپھو کا فون آیا تھا۔ آپ کا پوچھ رہی تھیں۔"
"تم نے کیا کہا......" ڈریسنگ روم کی طرف جاتے جاتے وہ رک گیا۔
"میں نے بتا دیا کہ آپ رات کو بھی گھر نہیں آئے...... وہ پریشان ہو رہی تھیں۔" سلیم نے قدرے ڈرتے ہوئے بتایا۔ اس کا خیال تھا زین اسے ڈانٹے گا۔ اس کا برعکس وہ خاموشی سے کپڑے لے کر

ڈریسنگ روم میں چلا گیا تھا۔
"کمال ہے......" سلیم کو حیرت ہوئی تھی۔ وہ کندھے اچکا کر کچن میں چلا گیا۔ دودھ چولہے پر ابلنے ہی والا تھا۔ ایک دو ابال دے کر اس نے برنر بند کیا۔ کمرے میں آیا تو زین بیڈ پر کمبل اوڑھے لیٹا تھا۔ کمرے میں ہیٹر چل رہا تھا۔
"طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی جان۔" وہ پوچھے بنا رہ نہ سکا۔
"نہیں۔ لگتا ہے بخار ہے' خیر میں نے ٹیبلٹ لے لی ہے۔" وہ بائیں ہاتھ سے کنپٹی دباتے ہوئے بولا۔
"ناشتے کے بغیر ہی......" سلیم کے لہجے میں تشویش تھی۔
"ناشتہ کر چکا ہوں۔ اب تم جاؤ' میں آرام کروں گا۔" زین کا لہجہ سپاٹ تھا۔
تب ہی فون کی بیل گونج اٹھی۔ زین نے گردن گھما کر فون کو دیکھا۔ سلیم نے اٹھانا چاہا۔ مگر زین نے روک دیا۔ ذرا سی دیر کے بعد بیل خاموش ہو گئی تھی۔
"یہ فون اٹھا کر لاؤنج میں لے جاؤ۔ کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں۔" سلیم نے فون سیٹ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔
"پھپھو کا آیا تب بھی یہی کہوں......"
"ہاں......"
سلیم نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔ کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ کمبل منہ پر ڈال چکا تھا اور شام تک بخار مکمل طور پر اسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

♥ ♥

نرم حدت لیے اوائل سرما کی دھوپ اس کی چارپائی پر بکھر گئی تھی۔ وہ بہت دنوں کے بعد اٹھ کر بیٹھی تھی۔ بخار تو اتر گیا تھا۔ مگر نقاہت اور کمزوری ہنوز برقرار تھی۔ پھر پاؤں کا زخم۔ ماما مقبول اس سے باتیں کر رہا تھا۔ کبھی اس کے ماں باپ کی' کبھی اپنی زمینوں اور گائے بھینسوں کی۔ کبھی اپنے بیٹے اور پوتے کی۔ مامی کو مرے تو ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ وہ

خاموشی سے سن رہی تھی۔
ماما مقبول اس کے لیے سارے کام بھلائے بیٹھا تھا۔ کسی محلے کی عورت کو اس کے پاس نہ پھٹکنے دیتا۔ نین تارہ کے کتنے ہی کام تھے جو اپنے ہاتھوں سے کرتا یا بتول سے کہہ کر کرواتا تھا۔ وہ طوعاً" کرہاً" انجام دے دیتی کہ اس لڑکی سے اب ساری عمر خدمتیں تو لینی تھیں۔ ابھی بھی وہ ٹوکری بھر سنگترے لے کر چھت پر چڑھ گئی تھی۔ جہاں اپنی پڑوسن کے ساتھ کھٹے میٹھے سنگترے کھاتے ہوئے آس پڑوس کی چٹخارے دار خبریں سنی بھی تھیں اور سنائی بھی تھیں۔
"تارہ! تو بولتی کیوں نہیں ہے......" ماما مقبول تھک کر پوچھنے لگا۔ نجانے کیسی چپ تھی جو ٹوٹتی ہی نہ تھی۔

"انہوں نے پھر تجھ سے مکان کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا۔" نین تارہ نے پلکیں اٹھا کر ساکت نظروں سے اسے دیکھا اور پھر سے جھکالیں۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔
"کون ہے؟......" ماما مقبول نے وہیں سے پکار کر پوچھا۔
"ڈاکٹر اجمل......" نین تارہ نے تیزی سے سرہانے پڑا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھ لیا۔
"آجاؤ...... اندر آجاؤ۔"
اجمل دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ پہلی نظر نین تارہ پر ہی پڑی۔ ایک ہلکی سی خوشی کا احساس اسے یوں بیٹھا دیکھ کر ہوا تھا۔ ماما مقبول کو سلام کرکے وہ قریب پڑی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔
"کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔" وہ خوش دلی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو گھورتی رہی۔ جواب ماما مقبول کی طرف سے آیا تھا۔
"اللہ کا کرم ہوا۔ بخار تو اتر گیا ہے۔"
"یہ تو اچھا ہوا۔" اجمل نے نبض چیک کرنا چاہی۔ اسے گویا انگارہ چھو گیا۔ اس نے ہاتھ کھینچ کر کلائی چھڑالی اور دوپٹے میں چھپالی۔ اجمل کے لیے اس کی حرکت

خاصی غیر متوقع تھی وہ گڑبڑا سا گیا۔ پھر الجھن بھرے انداز میں ماما مقبول کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نبض دیکھنا چاہ رہا تھا۔"

ماما مقبول نظریں چرا گیا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"ڈاکٹر بیٹا! رہنے دو۔"

(اس کی مسیحائی بھی کہیں زخم نہ لگا جائے اور ایسے زخم تو مندمل بھی نہیں ہوتے۔ اندر ہی اندر سارے وجود کو گلا کر رکھ دیتے ہیں۔)

اس کا بازو پھر بھی باہر نہ آیا۔ دوپٹے کی اوٹ سے چہرے کی جو جھلک نظر آرہی تھی۔ اس کے تاثرات ساکت و جامد تھے۔

"بخار تو نہیں ہے۔ مگر کمزوری بہت زیادہ ہے۔ چکر آتے ہیں۔" ماما مقبول جانتا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولے گی۔ خود ہی بتانے لگا۔

"کھائے پیئے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ بھوک تو کھل کر لگتی ہے۔" وہ پھر پوچھ رہا تھا۔ وہاں وہی چپ تھی۔

"کہاں۔ کچھ بھی نہیں کھاتی۔" ماے نے جواب دیا۔

"میں شربت لکھ دوں گا۔۔۔ پاؤں کا زخم زیادہ تکلیف تو نہیں دیتا۔" اس نے زخم کا معائنہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

(جہاں پورا وجود زخم بن گیا ہو۔ وہاں یہ دو انچ کا زخم کیا کرے گا۔) ایک تلخ سی سوچ نے پھر ڈنک مارا۔

"زخم ہے' درد تو ہوتا ہو گا۔" ماے مقبول نے جلدی سے کہا۔ اجمل کو یہ جامد چپ عجیب سی لگ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے میں کچھ طاقت کی دوائیاں لکھ۔۔۔ بلکہ کلینک سے بھجوا دوں گا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔ تب ہی بتول نے اوپر سے جھانکا۔ پھر تیزی سے نیچے اتری۔

"تم کب آئے اجمل۔" بتول کا استقبال ہمیشہ کی طرح پرجوش اور غیر معمولی تھا۔

"اب تو جا رہا ہوں۔"

"تو خوامخواہ ہی۔ بیٹھو۔ میں چائے بنواتی ہوں۔ پی کر جانا۔"

"کلینک کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ پھر کبھی سہی۔" اس نے شائستگی سے انکار کیا۔ بتول مایوس سی ہو گئی۔ وہ کبھی زیادہ دیر تک رکا نہیں تھا۔ اجمل نے ایک ہمدردانہ سی نگاہ نین تارہ پر ڈالی۔ پھر قصداً مسکرا کر بتول سے کہنے لگا۔

"کسی دن فراغت سے آؤں گا۔ تو آپ کے ہاتھ کی بنی چائے ضرور پیوں گا۔"

"پتا نہیں تم کس دن فارغ ہو گے۔ مجھے تو لگتا ہے پورا محلہ ہی بیمار ہو گیا ہے۔" بتول نے شکوہ کیا۔ ماے مقبول نے بے حد حیرت سے بتول کو دیکھا۔ ڈاکٹر کے ساتھ اتنی بے تکلفی اور عنایت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اجمل نے نجانے کیا کہا تھا۔ بتول اسے چھوڑنے دروازے تک گئی تھی۔ پھر دروازہ بند کر کے ان پر نگاہ ڈالے بغیر کمرے میں گھس گئی۔ ماے مقبول نے ایک طویل سانس لے کر نین تارہ کو دیکھا۔ وہ تھک کر پھر سے لیٹ گئی تھی۔

"تم کچھ ٹھیک ہو جاؤ تو میں بھی ایک چکر گاؤں کا لگا آؤں۔" اسے فصل کی بھی فکر ہو رہی تھی۔

"تم چلے جاؤ ماما۔ میری فکر نہ کرو۔" نین تارہ نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لی تھیں۔ ماے مقبول کو اس کے منہ سے یہ جملہ سن کر خوشی ہوئی۔ اس نے کچھ تو کہا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ماے مقبول نے جیب تھپتھپا کر روپوں کی موجودگی کا یقین کیا۔ پھر ذرا جھک کر نین تارہ سے کہنے لگا۔

"میں شام تک آجاؤں گا نین تارہ! تم فکر نہ کرنا۔۔۔"

نین تارہ نے چادر اتار کر اسے دیکھا۔ وہ یونہی چادر منہ پر ڈالے سارا دن پڑی رہتی۔ دھوپ کا بادل اس پر برستا رہتا اور اس کی گرمی ہڈی ہڈی میں سرایت کر کے سکون بخشتی۔ اس کے ایڑی کے زخم سے اب بھی ٹیسیں اٹھتیں۔ مگر اب ان میں وہ چبھن نہ تھی یہ درد اب اسے سکون دینے لگا تھا۔

"ماما! تم بھلے مت آنا۔ میں اب ٹھیک ہوں۔" اس کی آواز میں بے زاری نہیں بلکہ ہلکی سی نرمی در آئی تھی۔

ماما مقبول مسکرا دیا۔ اس کے بوڑھے چہرے پر یہ مسکراہٹ نین تارہ کو بہت بھلی لگی۔ اس دنیا میں یہ واحد شخص تھا۔ جو اس کے درد پر تڑپ اٹھتا تھا۔ جو اس کے لیے رو بھی سکتا تھا اور لڑ بھی۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا ہو۔ شاید اس نے بہت دنوں کے بعد ماے مقبول کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔

"میں شام تک ضرور آجاؤں گا۔" ماے مقبول نے دھیرے سے اس کا سر تھپتھپایا۔ پھر پلٹ آیا۔ بتول کے پاس وہ ذرا رک گیا۔

"ذرا خیال رکھنا دھیے۔۔۔"

دوپٹے پر کروشیے کی بیل بناتے ہوئے بتول بس لاپروائی سے "اچھا" بولی تھی۔

نین تارہ نے ماے مقبول کو دروازے سے باہر نکلتے دیکھا۔ درخت پر بیٹھی چڑیوں نے شور مچا دیا تھا اور اس شور کے باوجود اسے لگا۔ چہار سو گہری خاموشی اور سناٹا ہے۔ ٹھہری ٹھہری سی ہوا' گرد آلود فضا اور اس پر جھکا آسمان۔

اسے لگا۔ وہ پھر سے تنہا ہو گئی ہے۔ گھونسلے سے گرے چڑیا کے بچے جیسا خوف اس کے اندر اترا تو اس نے گھبرا کر چادر میں چہرہ چھپا لیا تھا۔

ماما مقبول سیدھا اجمل کے پاس آیا تھا۔ کلینک پر کوئی مریض نہ تھا۔ صفائی کرنے والا لڑکا اسٹول پر بیٹھا دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ ڈاکٹر اجمل کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ ماے مقبول کو دیکھ کر کتاب میز پر رکھ کر تیزی سے کھڑا ہو گیا۔

"آپ۔۔۔ آیئے نا۔" اور اس کے لہجے میں موجود سادگی اور خلوص اور اپنی اس پذیرائی سے ماما مقبول خاصا متاثر ہوا تھا۔ وہ صافہ کندھے سے اتار کر گود میں رکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیسی طبیعت ہے اب نین تارہ کی۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ میں جا رہا ہوں' سوچا تم سے ملتا جاؤں۔" ماے مقبول نے کہا۔

"گاؤں جا رہے ہیں۔" اجمل نے پوچھا ساتھ ہی لڑکے کو آواز دی۔ وہ ہڑبڑا کر جاگا تھا۔

"دو چائے لاؤ۔"

"نہ۔۔۔ نہ پتر۔ چائے کی ضرورت نہیں۔" ماے مقبول نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے منع کرنے کی کوشش کی۔ مگر اجمل کے اشارے پر لڑکا تیر کی طرح نکل گیا۔

"ایویں تکلف میں پڑ گئے پتر۔"

"ایک چائے کا کپ بھی تکلف میں شمار ہوتا ہے ماما جی؟۔۔۔" اجمل نے مسکرا کر کہا ساتھ ہی بات بدل دی۔

"آپ گاؤں جا رہے ہیں۔۔۔"

"ہاں۔ میرے پتر کا بلاوا آرہا ہے بار بار۔ میں نے بھی سوچا ایک نظر فصل پر ڈال آؤں۔ پانی بند ہے۔ بارشیں بھی نہیں ہوئیں۔ فصل کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔"

"کتنے دنوں تک لوٹیں گے۔" اجمل کا دھیان اس خاموش لڑکی کی طرف گیا۔ تو بے اختیار پوچھنے لگا۔

"دن کہاں پتر۔ دل تو ادھر نین تارہ میں اٹکا رہے گا۔ شام تک آجاؤں گا۔" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا تھا۔

"میں بھی یہی چاہتا تھا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ابھی اس کی حالت ایسی نہیں کہ اسے تنہا چھوڑا جا سکے۔"

ماما مقبول تاسف سے سر جھٹکنے لگا۔

"قسمت ہی خراب ہے اس کی تو۔۔۔"

ڈاکٹر اجمل نے وضاحت کے لیے سوال کرنا چاہا۔ پھر خاموش ہو کر پیپر ویٹ گھمانے لگا۔ وہ نین تارا کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بتول سے اس لیے نہیں پوچھ سکتا تھا کہ اس کا رویہ وہ پہلے ہی دن سمجھ چکا تھا۔ ماے مقبول سے پوچھتے ہوئے لحاظ مانع تھا۔ تعلق ہی کیا تھا اس کا۔ بس اتنی ہی بات ہوئی

جتنی ایک مریضہ کے بارے میں ہو سکتی تھی۔

مامے مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر روپے نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ اجمل کا پیچ وینٹ گھماتا ہاتھ رک گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مامے مقبول کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟——"

"تم اتنے دنوں سے اس کا علاج کر رہے ہو۔ پھر دوائیوں کا خرچا——"

"ماما جی! مجھے اگر پیسے لینے ہوتے تو میں پہلے ہی لے لیتا——" نجانے کیوں اجمل کو افسوس سا ہوا تھا۔

"نہ پتر! یہ تو تمہارا حق ہے۔ فیس ہے تمہاری۔"

"میں آپ کو ماما جی کہتا ہوں۔ اب کیا آپ سے پیسے لوں گا۔" وہ کسی صورت لینے پر آمادہ نہ ہو رہا تھا۔

"اچھا دوائیوں کے تو——"

"ہرگز نہیں——" اجمل نے سنجیدگی سے کہا۔

تب ہی وہ لڑکا چائے لے آیا۔ ایک کپ اجمل اور دوسرا مامے مقبول کے سامنے رکھ کر دوبارہ اسٹول پر جا بیٹھا۔

"چائے پئیں ماما جی۔"

چائے ختم ہونے تک بھی وہ اجمل کو پیسے لینے پر آمادہ نہیں کر پایا تھا۔ اسے اجمل کے طرزِ عمل پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ مگر پھر مجبوراً اسے پیسے دوبارہ جیب میں رکھنے پڑے تھے۔

♥ ♥ ♥ ♥

کچھ سوچ کر زارا نے گاڑی کا رخ زین کے گھر کی طرف موڑ دیا تھا۔ دروازہ سلیم نے کھولا تھا۔

"زین گھر لوٹا یا نہیں——؟" اس نے وہیں کھڑے کھڑے سوال کیا۔

"آ گئے ہیں باجی——" سلیم نے بتایا۔ تو زارا نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کب آیا تھا؟——" سلیم ایک پل کو جھجکا۔ پھر آہستگی سے بتانے لگا۔

"کل صبح ہی آ گئے تھے——" اندر کی طرف قدم بڑھاتی زارا ایک جھٹکے سے رک گئی پھر بے یقینی سے پوچھنے لگی۔

"کیا کہا۔ وہ کل صبح ہی آ گیا تھا۔"

"میں کیا کرتا باجی! بھائی جان نے منع کر دیا تھا کہ کسی کا بھی فون آئے کہہ دوں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔" سلیم نے تیزی سے وضاحت کی۔

"تو اب اس نے ہمیں بھی کسی میں شمار کر لیا۔"

"وہ اپنے کمرے میں ہیں اور انہیں بخار بھی ہے——"

زارا بیڈ روم کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی تو وہ نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ زارا نے ایک جھٹکے سے کتاب کھینچی۔ وہ گویا اس کی آمد سے واقف تھا۔ تب ہی ایک نظر بھی اس پر ڈالے بغیر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

وہ کچھ لمحے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتی رہی۔ پھر کتاب اس کی گود میں پھینک کر آہستگی سے بولی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے نا۔ تم کر سکتے ہو——"

"میں——" زین نے کچھ کہنا چاہا۔

"جب ہم تمہاری توقعات پوری نہیں کر سکتے تو ہمیں بھی کوئی حق نہیں تم سے کوئی توقع وابستہ کرنے کا۔ تم نے جو کیا، ٹھیک کیا زین! امی—— تم نے تو دیکھا تھا۔ سمجھا تھا۔ اپنے بابا کی تڑپ کو محسوس کیا تھا۔ پھر بھی تمہیں ایک پل کے لیے اس عورت کا خیال نہیں آیا کہ وہ ان دو دنوں میں کس اذیت سے گزری ہوگی۔ وہ ان دو دنوں میں سو نہیں سکی ہیں زین! اور مجبوری یہ کہ وہ کسی کے ساتھ شیئر بھی نہیں کر سکتیں۔"

زارا کا لہجہ مدھم مگر سنجیدہ تھا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ نظریں کتاب پر جمی رہی تھیں، یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئی۔

"آپ مجھے ایک کپ چائے کا بنا دیں گی؟۔" اس نے نظریں اٹھا کر ڈرتے ڈرتے زارا کو دیکھا اور زارا کو غصہ آ گیا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی گویا اس نے سنا ہی نہ تھا۔ کوئی فکر ہی نہ تھی۔

"سلیم سے کہہ دو——" وہ چڑ گئی۔

"نہیں آپ—— پلیز——" اور زارا کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس سے خفا بھی نہیں رہ سکتی تھی۔

"کیا چیز ہو تم زین العابدین——" وہ اسے غصے سے گھورتی کچن میں چلی گئی، جبکہ زین نے فون جو کہ صبح ہی اس نے کمرے میں رکھوایا تھا، اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

"پھپھو آ رہی ہیں۔" زارا چائے لے کر آئی تو زین نے بتایا تھا۔

"فون آیا تھا——"

"نہیں۔ میں نے کیا تھا——"

"تھینک گاڈ! خیال تو آیا——" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ "میں نہ آتی تو شاید آج بھی خیال نہ آتا۔"

"شاید——" زین کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"جی تو چاہتا ہے، اتنا ماروں کہ ہوش ٹھکانے آ جائیں۔" زارا نے مگ سائیڈ ٹیبل پر پٹخا۔

"تو ماریں نا——" زین کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جاگی۔

"انتہائی ڈھیٹ ہو تم——" وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ زین ذرا سا مسکرایا۔

"بیٹھیں——"

"نہیں میں جا رہی ہوں۔"

"کیوں؟——"

"زین! تم نے ماما کو بہت رلایا ہے۔ وہ آئیں گی اور پھر روئیں گی۔ اس بار انہیں خاموش تم کرواؤ گے۔ میرے لیے ہر بار انہیں اس حالت میں دیکھنا آسان نہیں۔" زارا کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

زین خاموش ہو گیا۔

"تمہیں بخار ہے۔" دروازے تک جا کر زارا کو خیال آیا تو پلٹ کر پوچھنے لگی۔

"نہیں ٹھیک ہوں میں۔" اس نے آہستگی سے کہہ کر مگ اٹھا لیا تھا۔

وہ کب سے پھپھو کے نرم ہاتھوں کا لمس اپنے ماتھے پر محسوس کر رہا تھا۔ ان کی گود میں سر رکھ کر اسے لگا، اندر بھڑکتی آگ سرد ہونے لگی ہے۔ وہ بار بار ہاتھ ہٹا کر پوچھتیں۔

"کچھ کھاؤ گے زین——؟"

وہ ہر بار بنا کچھ کہے ان کا ہاتھ تھام کر پیشانی پر رکھ لیتا اور وہ پھر سے دبانے لگتیں۔

"پھپھو! آخر کب تک—— کب تک یہ سب یوں ہی چلتا رہے گا۔" اس نے اچانک آنکھیں کھول کر پوچھا تھا۔ ان کا ہاتھ تھم گیا۔ وہ کچھ لمحے یوں ہی اس کی آنکھیں دیکھتی رہیں۔

(یہ آنکھیں—— یہ آنکھیں جمشید کی ہیں——)

"پھپھو——!" زین نے پکارا تو وہ چونک گئیں۔

زین اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"زارا کی شادی ہو جانے دو——"

"پھر—— اس کے بعد—— اس کے بعد کیا ہو گا؟——"

"میں اور تم امریکہ چلے جائیں گے——"

"فرار——" وہ آہستگی سے ہنسا۔ "پھپھو! یہ کہانی کبھی اپنا عنوان نہیں بدلے گی۔"

"تم کچھ بھی کہو۔ میں اور تم زارا کی شادی کے بعد امریکہ شفٹ ہو جائیں گے۔" ان کے لہجے کی مضبوطی پر زین نے الجھ کر انہیں دیکھا۔

"یہ لوگ جانے دیں گے؟"

"میں سب کو چھوڑ دوں گی۔" وہ مصمم ارادے سے گویا ہوئیں۔

"پھپھو——" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"چوبیس برس میں انگاروں پہ چلی ہوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے، میرے لیے یہ آسان تھا۔ سلیمان سے بات کرنا، بھابھی کی خدمت، میں نے اپنا دل آپ اپنے قدموں میں روندا ہے۔ میں جب ان لوگوں سے ملتی ہوں میرے اندر غضب کا احتجاج اٹھتا ہے۔ برداشت کا کڑا امتحان تھا۔ چوبیس برس اس جہنم میں جلی ہوں۔ صرف تمہارے باپ سے کیا گیا وعدہ نبھانے کے لیے لیکن اب میں بھول جانا چاہتی ہوں کہ میں اس خاندان کی بہو، زارا کی ماں اور عمیر کی بیوی ہوں۔" ان کے لہجے میں وحشت سی تھی۔ "میں

جمشید کی بہن اور تمہاری پھپھو بھی تو ہوں۔ کب تک خود کو مارتی رہوں گی۔"

"آپ نے زارا کو ان لوگوں کے حوالے کیوں کر دیا؟۔" اس نے آہستگی سے سوال کیا اور یہ سوال سینکڑوں بار اس کے اندر اٹھا تھا۔

"میں نے کہاں کیا تھا۔ مجھے تو صرف بتایا گیا تھا۔ ڈرتے تھے وہ مجھ سے۔ حالانکہ میں کیا کر سکتی تھی۔" ان کے لہجے میں بے بسی در آئی۔

"مجھے بتائیں نا۔ کیا ہوا تھا؟۔۔۔"

"تمہیں جمشید نے کچھ نہیں بتایا؟۔"

"انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا لیکن میں آپ سے سننا چاہتا ہوں۔"

"چھوڑو زین! کیا کرو گے۔"

"ہرگز نہیں' آپ مجھے بتائیں۔ سب کچھ جو آپ کو معلوم ہے۔" وہ ضدی لہجے میں بولا تھا۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر آہستگی سے بولی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔۔۔"

اور زین خود کو کچھ نئے انکشافات کے لیے تیار کرتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

چٹختی چنگاریوں کی طرح وقفے وقفے کے بعد بتول اور ظہور کی آوازیں اس کے کانوں میں چیخ رہی تھیں۔ فضا میں شام کی اداسی گھل مل گئی تھی۔ وہ دونوں چولہے کے پاس بیٹھے تھے۔ ظہور بہت خوش تھا۔ گرما گرم جلیبیاں لایا تھا۔ نین تارہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سردی ہو رہی تھی۔ اب وہ اندر کمرے میں جانا چاہ رہی تھی۔

"چودہ لاکھ لگائی ہے مکان کی قیمت نیاز نے۔" ظہور بتا رہا تھا۔

"چودہ لاکھ میں بک جائے گا؟۔" بتول نے حیرت سے پوچھا۔ وہ دودھ کے بھرے ہوئے پیالے میں جلیبیاں ڈال رہی تھی۔

"آٹھ دس میں تو بکے گا۔" اس نے نین تارہ کو دیکھا۔ پھر بے اختیار پوچھا تھا۔ "جلیبیاں کھائے گی تارہ۔"

نین تارہ نے خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بھی رخ بدل کر بتول کی کسی بات کا جواب دینے لگا اور وہ سر جھکا کر سوچنے لگی تھی۔

"ماما مقبول ابھی تک نہیں آیا۔"

ظہور جلیبیاں کھا کر باہر نکل گیا۔ بتول گاجریں کاٹنے لگی۔ تب ہی ڈاکٹر اجمل آ گیا۔

"لو' ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔"

"اور آج میں چائے پیے بغیر جاؤں گا بھی نہیں۔"

"شکر ہے تمہیں فرصت تو ملی۔ دیکھ لو اپنی مریضہ کو۔ میں تب تک چائے بناتی ہوں۔" بتول اٹھ کر اندر چلی گئی۔ شاید چائے کا سامان لینے۔ اجمل اس کے قریب آ گیا۔

"کیسی ہو نین تارہ؟۔۔۔" اس کے لہجے کی نرمی نین تارہ کو دہلا دیتی تھی۔ سو خاموشی سے نچلا لب کاٹنے لگی۔

"لاؤ پٹی بدل دوں۔"

نین تارہ نے پاؤں کھینچ لینا چاہا۔ مگر اجمل نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔

"لوگوں کے رویے تو سمجھ میں آتے ہیں۔ مگر اپنی ذات کے ساتھ اتنی دشمنی۔۔۔ میں کرنے نہیں دوں گا۔" اس کی گرفت میں سختی اور لہجے میں بلا کی نرمی تھی۔ نین تارہ کا دل چاہا۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہے۔

"مت کرو ایسا۔ تمہاری ہمدردی میری جان لے لے گی۔"

"تمہارا نام بہت خوبصورت ہے۔ کس نے رکھا تھا؟۔" وہ آہستگی سے بینڈیج اتارتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"لیکن جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مزید کیا ہونا باقی ہے۔" نین تارہ نے بے حد یاسیت سے سوچا تھا۔ اجمل کیا پوچھ رہا تھا۔ وہ نہ سن رہی تھی اور نہ سننے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔

"اتنی چپ کیوں رہتی ہو۔ ان سے ڈرتی ہو۔؟"

نین تارہ کی سماعتوں پر بتول کے قدموں کی چاپ ہتھوڑے کی طرح گری۔ اجمل بھی خاموش ہو گیا۔ پھر پٹی باندھ کر اٹھ گیا اور بتول کے پاس جا بیٹھا۔

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ اندر چل کر بیٹھو۔ میں چائے ادھر ہی لے آتی ہوں۔" بتول نے بوکھلا کر کہا۔

"یہیں ٹھیک ہے۔" وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آگ سینکنے لگا۔

"یہ ٹھیک کب تک ہو گی؟۔" بتول نے بے حد ناگواری سے پوچھا۔

"کون؟۔۔۔" وہ چونکا۔

"یہی۔۔۔ میری جان کا عذاب۔۔۔" تارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے آخری جملہ منہ ہی منہ میں کھا لیا۔ وہ اجمل کے سامنے خود کو ظالم ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ حالانکہ جملوں سے کیا ہوتا ہے۔ نین تارہ سے نفرت اور بیزاری تو اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر تھی۔ اجمل نے گردن گھما کر نین تارہ کو دیکھا۔ وہ ان سے یکسر بے نیاز اندر جانے کے لیے پاس والی دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی تھی۔

اجمل کے اندر چھپی خواہش نے آہستگی سے سر اٹھایا اور پلکیں جھپک کر اسے دیکھنے لگا۔۔۔ اس کا سہارا بن جانے کی خواہش۔ اجمل کو اس خواہش کے جاگ اٹھنے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا ایسا ہی ہو گا۔ یہ اور آگ اسے تب ہی ہو گیا تھا۔ جب اس نے نین تارا کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ کچھ لوگ پہلی نظر میں ہی اپنے وجود کا گمشدہ حصہ لگتے ہیں۔ کچھ لوگ نہیں۔۔۔ بس ایک۔۔۔ ان سب لوگوں میں سے بس کوئی ایک۔۔۔

مگر وہ بے حد خاموشی سے اسے اندر جاتے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ کمرے کی نیم تاریکی میں گم ہو گئی۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بتول کی طرف متوجہ ہوا۔ چائے ابل گئی تھی اور بتول اپنا سوال بھی بھول گئی تھی۔ بتول نے کیتلی چولہے سے اتاری اور پیالی میں چائے نکالنے لگی۔ اس میں سے اٹھتی گرم بھاپ پر نظریں جمائے ہوئے وہ ہزاروں بار کی سوچی ہوئی بات سوچ رہا تھا۔

"یہ لڑکی کبھی مسکرائی بھی ہو گی؟۔۔۔"

"تمہارے گھر میں کون کون ہے؟۔۔۔"

وہ جو بے حد انہماک سے یہ تصور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان ہونٹوں پر مسکراہٹ کیسی لگتی ہو گی' بری طرح چونک گیا۔ بتول نے چینی کی سفید پلیٹ میں جلیبیاں نکال دی تھیں اور اب کے وہ اپنا سوال بھولی نہیں تھی بلکہ جواب کی منتظر تھی۔ اجمل نے ذرا سا کھنکھار کر پیالی اٹھالی۔ پھر بتانے لگا۔

"امی' ابو اور میں۔۔۔"

"بہن بھائی کوئی نہیں۔۔۔؟" بتول نے پوچھا۔

"تین بہنوں کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ تینوں بڑی تھیں مجھ سے۔ ایک بڑا بھائی ہے پچھلے برس جدہ چلا گیا۔ کہتا ہے امی' ابو کو بھی وہیں بلا لے گا۔"

بتول کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔

"بھائی کی شادی نہیں ہوئی ابھی تک۔۔۔؟"

"منگنی ہو گئی ہے۔ چھٹی لے کر آئے گا تو شادی بھی ہو جائے گی۔" وہ قصداً مسکرایا۔

"اور تم۔۔۔ تمہاری کہیں بات طے نہیں ہوئی؟۔" بتول اصل اور اہم سوال کی طرف آئی اور ہمہ تن گوش ہو گئی۔ اجمل نے ایک پل کو کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر مبہم سا مسکرایا۔

"پہلے تو کبھی خیال ہی نہیں آیا۔۔۔"

"تو یہ کیا بات ہوئی۔ شادی کی عمر ہے تمہاری۔"

"بس بہنیں اپنے اپنے گھروں میں خوش' امی بیمار۔۔۔ میرے لیے لڑکی کون ڈھونڈتا۔" وہ اب قدرے سہولت سے چائے پی رہا تھا۔

"تو اس میں کیا مشکل ہے۔ مجھے بھی تو باجی کہا ہے تم نے۔ میں دیکھوں گی اپنے بھائی کے لیے لڑکی۔" بتول بہت خوش تھی۔ معلومات خاصی تسلی بخش تھیں۔ خود اجمل بھی بہت سادہ مزاج نوجوان لگتا تھا۔ بات بن جائے تو کوثر ساری عمر عیش کرے گی۔ اجمل مسکرا کر خاموش ہو گیا تھا۔ بتول نے پلیٹ اس کے سامنے کی۔

"نونا۔ ابھی گرم ہیں۔"

اجمل نے ایک جلیبی اٹھالی۔ تو وہ مطمئن سی ہو کر اس کے خاندان کے بارے میں مزید سوالات کرنے لگی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

زین نے ساری رات بیٹھ کر پھپھو سے حاصل شدہ معلومات کو بابا کی بتائی گئی باتوں کے ساتھ ملا کر ایک ترتیب دے کر کمپیوٹر میں فیڈ کیا تھا۔ اسے لگا' بابا کے ماضی کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے اور اسے ورق ورق سمیٹنا اور ترتیب دینا ہے۔ پھپھو اپنے ذہن ودل کے سمندر میں ڈوب کر باہر آتیں۔ تو کچھ ہاتھ آتا' اسے دیکھ کر کبھی روتی تھیں تو کبھی ہنستی' کبھی بس مسکرا دیتیں تو کبھی اداس ہو جاتیں۔ اور ایک کے بعد دوسرا ورق اسے تھماتی جاتیں اور جو کتاب اس کے سامنے ترتیب پائی تھی۔ اس کے بہت سے صفحات غائب تھے۔ کچھ ادھورے اور کہیں سے یادداشت کی روشنائی اڑی ہوئی اور آخری باب... آخری باب سرے سے ہی غائب تھا۔

وہ ہر روز اسے از سر نو پڑھتا اور گمشدہ صفحات پر قیاس تحریر کرتا رہتا۔ اس دن جب دھوپ ساری دھرتی پر کھل کر برس رہی تھی۔ افتخار چلا آیا۔ وہ بے تکلفی سے سیدھا اس کے بیڈ روم میں آگیا تھا۔ کچھ لمحے کمپیوٹر اسکرین پر لکھی تحریر پڑھتا رہا۔ زین نے بھی اسے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ افتخار سے کیا چھپا تھا۔ وہ کچھ لمحے پڑھتا رہا۔ پھر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر جماتے ہوئے بولا تھا۔

"کسی دانا کا قول ہے۔

"خوش رہو اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو کہ ماضی راکھ کا ڈھیر ہے۔ پاؤں مضبوط رکھو کہ حال سمندر کی ریت کی طرح لمحہ بہ لمحہ پھسل رہا ہے اور آنکھیں کھلی رکھو کہ مستقبل تاریک خلا ہے۔"

"خلیل جبران؟"

"ہاں..."

"راکھ کا ڈھیر' سمندر کی ریت' تاریک خلا۔" وہ بہت دیر ان لفظوں کو دہراتا رہا۔ پھر ایک مجروح سی مسکراہٹ کہر کی طرح اس کے لبوں پر جم گئی۔

"ہاں' میری زندگی کا گوشوارہ ان ہی الفاظ سے تشکیل پایا ہے۔ اس سے زیادہ خوبصورت تشریح ہو ہی نہیں سکتی۔"

"Pessimists (قنوطیوں) کا المیہ..."

"مطلب۔"

"میرے جیسے لوگ اس میں ان تین باتوں پر عمل کرتے ہیں بادشاہو۔" افتخار کی دھپ اس کے کندھے پر پڑی۔

"تین باتیں؟..." زین نے کمپیوٹر آف کیا اور مکمل توجہ افتخار کی طرف مرکوز کی۔

"پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔

پاؤں مضبوط رکھو۔

آنکھیں کھلی رکھو۔" اپنی مونچھیں سنوارتے افتخار کا لہجہ متبسم و معنی خیز تھا۔

زین کچھ لمحے افتخار کو دیکھتا رہا۔ پھر بے بسی سے پوچھنے لگا۔

"میں کیا کروں افتخار بھائی۔؟"

"یہ سوال ہر کسی سے کرتے ہو۔ کبھی خود سے بھی کیا ہے۔"

زین نے لب بھینچ لیے تو وہ ہنس دیا۔

"میری نصیحت پر عمل کرو گے۔"

"کیسے؟..."

"پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔"

"ماضی راکھ کا ڈھیر ہے اور مجھے اس بجھی راکھ میں کچھ چنگاریاں تلاشنی ہیں۔"

"اس وقت پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔" افتخار نے "اس وقت" پر زور دے کر بات دہرائی۔ زین نے الجھن بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اس سے کیا ہوگا؟۔"

"یہ بھی بتادوں گا یار! یہ تم گھر آئے مہمان کی خاطر نہیں کرتے۔ اتنی دور سے تمہارا گھر ڈھونڈتا آرہا ہوں۔" وہ بڑے آرام سے بات بدل گیا۔

"ہاں میں کچھ لاتا ہوں..." زین تیزی سے کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا گھر بہت خوبصورت اور پُرسکون جگہ پر ہے۔ مگر دور بہت ہے یار..."

"جگہ سے کیا ہوتا ہے افتخار بھائی! سکون تو دل میں ہونا چاہیے۔" زین نے آہستگی سے کہا۔ افتخار نے اس کی بات پر غور کیا۔ پھر حسب عادت قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"چلو یار! کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"مگر چائے..."

"پھر سہی۔ ابھی تو تمہارے ساتھ کہیں گھومنے نکلتے ہیں۔" افتخار نے اسے ساتھ لیا۔ تو پھر وہ رات گئے واپس لوٹ سکا تھا اور خلاف معمول وہ خود کو فریش بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مخصوص جگہ سے چابی اٹھا کر لاک کھولا۔ سلیم جاچکا تھا۔

"کیا جادو ہے اس بندے کے پاس..." فریش ہو کر بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔ "مجھے یاد بھی نہیں کہ کچھ گھنٹے پہلے کس ٹینشن کا شکار تھا میں۔"

پھر وہ میگزین کھولتے ہوئے زارا کا تازہ آرٹیکل ڈھونڈنے لگا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

زین کو خبر بھی نہ ہوئی اور افتخار اسے مصروفیت کے جال میں پھنسا کر زندگی کی طرف کھینچ لایا تھا۔ وہ جو ہمہ وقت اپنی ہی ذات کی گتھیاں سلجھانے اور اپنے دماغ کی گرہیں کھولنے میں لگا رہتا تھا۔ ماضی کے تاریک دروازوں پر دی جانے والی دستکوں پر قفل پہنا کر خاموشی سے افتخار کے ساتھ ہو لیا تھا۔ افتخار وہ انگلی تھا۔ جسے تھام کر وہ ہجوم کے خوف اور کھو جانے کے ڈر سے آزاد ہو جانا چاہتا تھا۔

"پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔"

وہ یہ بات کبھی گرہ سے نہ باندھتا۔ مگر افتخار نے اسے موقع ہی کہاں دیا۔ وہ اچانک آتا۔ اسے کھینچ کر لے جاتا۔ کبھی ابا کی بیٹھک میں... جہاں سارا دن حقہ تازہ رہتا' ایک کے بعد دوسرا... دوسرے کے بعد تیسرا... تیسرے کے بعد... دھیرے دھیرے ساری بیٹھک حقے کی گڑگڑاہٹ اور گرما گرم باتوں سے بھر جاتی۔ صوفی دکان دار بار بار بازار کے اتار چڑھاؤ' چیزوں میں ملاوٹ اور مہنگائی کا رونا روتا۔ انور ماسٹر کوئی نسل میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور تعلیم کے لیے غیر سنجیدہ رویے کا افسوس ستاتا۔ غلام نبی صاحب کیونکہ ریٹائر ہو چکے تھے' انہیں کوئی موضوع نہ ملتا تو ملکی سیاست کو کھینچ لاتے۔ موضوع پلٹتا تو تصوف کے مسئلے شروع ہو جاتے اور اگر اس وقت مولوی اللہ دتا موجود ہوتے تو صوفی ازم کے شائق اور مولوی صاحب کے درمیان گرما گرمی ہو جاتی۔ ان کے ازلی رقابت باہر آتی تو لہجوں میں تندی اور بحث میں تیزی آجاتی۔ جسے ختم کرنے کے لیے افتخار کے اباجی زور سے کھنکھارتے... ایک پل کو خاموشی ہوتی اور وہ سرہانے کے نیچے ہاتھ ڈال کر "کلیات بلھے شاہ" نکال لیتے۔ افتخار اباجی کو عینک تھماتا اور زین کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل جاتا اور اس پورے عرصے میں زین کونے والی کرسی پر بیٹھا رہتا اور افتخار اباجی کے پلنگ پر بیٹھا ٹانگیں دباتا رہتا۔ یونیورسٹی میں سینہ تان کر چلنے والا افتخار اباجی کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی نہ کرتا تھا۔ زین کو اس کا یہ روپ بہت عجیب مگر بہت خوبصورت لگتا۔

اور کبھی کبھی وہ اسے مولانا شہاب الدین کے ہاں لے جاتا۔ وہ ایک بزرگ صحافی تھے۔ ایک بڑے سے کمرے میں بچھی ہوئی دری' اخبارات کے ڈھیر' ادبی جرائد' سیاسی و فلمی رسائل' اسپورٹس میگزین' پانی کا کولر' گولڈ لیف کے پیکٹ' چائے کی پیالیوں اور نئے پرانے صحافیوں کے درمیان گھرے شہاب الدین بے اختیار استقبال کرتے ہوئے کہتے۔

"آؤ بھئی افتخار میاں۔"

اور افتخار ایک انگڑائی لے کر اباجی کے پلنگ سے اٹھتا اور شہاب الدین کے مقابل جا بیٹھتا اور بھول جاتا کہ اس کے ساتھ کوئی زین العابدین بھی ہے۔

شاید وہ جانتا تھا اسے کہاں زین کی انگلی پکڑنی ہے اور کہاں اپنا دامن جھاڑ کر ایک طرف ہو جانا ہے۔
اس نے ایک بار کہا تھا۔
"میں لوگوں کا ساتھ وہیں تک دیتا ہوں جہاں تک انہیں میری ضرورت ہوتی ہے۔ میں دوسروں کے لیے فیصلہ کرنے اور ان کے فیصلوں پر مسلط ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔"
جرنلزم زین کا سبجیکٹ تھا۔ وہ پہلے پہل خاموشی سے سنتا رہا پھر دھیرے دھیرے گفتگو میں حصہ لینے لگا۔ افتخار کی آواز میں زور اور انداز میں جوش ہوتا۔ بحث پنگ پانگ بال کی طرح ان سب کے درمیان ٹاپ کرتی رہتی۔
ورلڈ ٹریڈ سینٹر' امریکہ کے حملے' افغانستان کی صورت حال' اسرائیل کی ہٹ دھرمی' بھارت کی دھمکیاں' کشمیری مجاہدوں کے حوصلے' سیاست دانوں کے فیصلے' چشم پوشیاں' چین کا اکنامک کلچر' عثمان فاروقی اسکینڈل' کیبل کے نقصان' کلوننگ' بھارت کی ثقافت سے ہو کر جب گفتگو فلمی اداکاروں تک پہنچتی تو زین اٹھ جاتا۔
"چلیں افتخار بھائی۔" افتخار تیزی سے اٹھتا۔
"ہاں اب کچھ پڑھ لینا چاہیے۔ میرا تو فائنل ایر ہے۔"
وہ لوگ کتابیں اور نوٹس اٹھا کر جناح باغ آجاتے اور ان کی ورق گردانی کرتے ہوئے وہ پلٹ کر دیکھنا چاہتا پھر گڑبڑا کر افتخار کو دیکھنے لگتا۔ وہ مسکرا دیتا گویا اس کی کیفیت سمجھ رہا ہو۔
"میں نے کہا ناں پیچھے مڑ کر مت دیکھو۔"
"مگر کیوں؟۔ میں ماضی سے کیسے ہاتھ چھڑا سکتا ہوں۔ جبکہ میرا نام میری شناخت ماضی کے دھندلکوں میں کھو چکی ہے۔"
اس کے ہاتھ پھر سے دستک دینے کو اٹھ جاتے تو افتخار بول اٹھتا۔
"میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ ماضی کے پیچھے بھاگتے ہوئے تم اپنا حال بھی کھو دو گے' آج کے فیصلوں پر تمہارے مستقبل کی عمارت تعمیر ہونا ہے۔ اپنے قدم مضبوط رکھو یہ آج کا تقاضا ہے۔ بہت ریلیکس ہو کر ایگزام دو۔ پھر دیکھیں گے تمہارے لیے کیا کرنا ہے۔"
افتخار سے ملنے کے بعد اسے لگتا۔ اس دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو حل نہ ہو سکے۔ مگر ایک مناسب وقت۔۔۔ اور وہ جو اس بات پر ہمیشہ بھڑک اٹھتا تھا۔ خاموشی وتن دہی سے ایگزام کی تیاری میں مصروف ہو گیا تھا۔ یہ مصروفیت بھی ایک نعمت تھی۔ لوگوں سے ملنا' تعلقات' دوستیاں دوسروں کی مشکلات' ان کے غم' اپنی اسٹڈی۔ اسے اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا کہ وہ بند دروازوں پر دستک دے۔ ایسا نہیں کہ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ مگر ذہن کا تناؤ کم ہو رہا تھا۔ بہت سی ناانصافیوں اور الجھنوں کے ساتھ ساتھ اسے زندگی کی خوبصورتیاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔
بے بے کے ہاتھ کے پراٹھے۔
افتخار کی بڑی بہن آپا فاطمہ سے چھیڑ چھاڑ۔
اباجی کے ساتھ گپ شپ۔
باسط کی شرارتیں۔
"زندگی خوبصورت بھی ہوتی ہے۔"
نجانے کتنے عرصے کے بعد اس نے یہ بات سوچی تھی اور جب یہی بات زارا سے کہی۔ تو وہ ہنس دی۔
"تھینک گاڈ! تمہیں بھی زندگی میں خوبصورتی نظر آئی۔ اسی لیے ہمیں اگنور کر رہے ہو۔"
"نہیں' میں اگنور تو نہیں کر رہا۔ بس میں وہاں جاتا ہوں تو یہ خوف ساتھ نہیں ہوتا کہ مجھے کوئی دیکھ لے گا یا کسی کو مجھے چھوڑ کر جلدی گھر جانا ہے۔"
زارا نے چھیڑا تھا تو اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔
"او ہو تو اب طنز بھی کرو گے۔"
"طنز نہیں حقیقت بیانی۔۔۔" وہ اطمینان سے گویا ہوا۔ زارا اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے قدرے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہو۔"

"کیا سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟۔۔۔"
"نہیں۔ تھوڑے خوش۔۔۔ تھوڑے مطمئن۔ یہ افتخار کیا جادوگر ہے؟"
"کہہ سکتے ہیں۔"
"تمہاری دوستی کیسے ہو گئی؟۔۔۔"
"بس ہو گئی۔"
"اب تم اوور ہو رہے ہو۔" زارا نے گھورا۔ تو وہ ہنسنے لگا۔ پھر قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔
"میں نے آپ کا آرٹیکل پڑھا تھا۔"
"کون سا؟"
"وہی جو آپ نے جنید انصاری پر لکھا تھا۔ افتخار بھائی کہتے ہیں "آپ بہت اچھی جرنلسٹ ثابت ہوں گی۔ آپ کے قلم میں بہت کاٹ ہے۔"
"تمہیں کیسا لگا؟۔۔۔"
"جنید انصاری پر ہونے والا ظلم۔۔۔" زین نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔
"آرٹیکل کی بات کر رہی ہوں۔۔۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔
"اچھا تھا۔۔۔" وہ سر اٹھا کر آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھنے لگا۔ "ایک بات تو بتائیں۔"
"پوچھو۔۔۔"
"اگر میں بھی یونہی قتل ہو جاؤں تو۔۔۔ تو کیا کریں گی آپ۔۔۔؟"
"زین۔۔۔ کیا فضول بات ہے۔"
"سوال کو ٹالیں نہیں۔ جواب دیں۔"
"کوئی اور بات کرو۔۔۔" زارا نے ٹالنا چاہا۔
"نہیں' اگر میں واقعی قتل کر دیا جاؤں تو آپ کیا کریں گی۔ یونہی ایک آرٹیکل لکھ کر خاموش ہو جائیں گی۔؟" وہ اس کے سامنے کھڑا اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زارا نے بے حد سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"کیا تمہارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔"
"آپ ڈر گئیں۔ میں تو صرف آپ کا ردِعمل جاننا چاہتا تھا۔" وہ آہستگی سے ہنسا۔
"ردِعمل واقعہ رونما ہونے کے بعد سامنے آتا ہے۔"
"اس کے لیے تو مجھے قتل ہونا پڑے گا۔" وہ کان کھجاتے ہوئے بولا۔
"کچھ مشکل نہیں۔ سلیمان بھائی کے سامنے جا کھڑے ہو۔۔۔" وہ چڑ کر کھڑی ہو گئی۔ زین کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔
"تم انتہائی احمق لڑکے ہو۔" اسے غصہ آگیا۔
"آپ کا کزن ہوں۔۔۔" وہ ہنسی روک کر بولا تھا۔
"حالانکہ کہیں سے نہیں لگتے۔۔۔"
"ہاں جی۔۔۔ کہاں آپ کہاں ہم۔۔۔" وہ کرسی سے اٹھ گیا اور خاموشی سے چلتا ہوا ٹیرس تک آگیا۔
"پتا ہے میں اور بابا آپس میں یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑا کرتے تھے' بلکہ لڑائی لڑائی کھیلا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے روٹھنے اور منانے کا ایک اپنا ہی مزا ہے۔"
"اچھا۔۔۔" زارا نے سر اٹھا کر زین کو دیکھا۔ وہ آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔
"خلیل جبران کہتا ہے' ماضی راکھ کا ڈھیر ہے۔" وہ بابا سے خلیل جبران پر آگیا۔
"تم آج کل خلیل جبران کو پڑھ رہے ہو۔"
زین نے گویا اس کی بات نہیں سنی۔
"لیکن۔۔۔ شاید وہ یہ نہیں جانتا کچھ لوگ۔۔۔ کچھ واقعات اور کچھ لفظ کبھی ماضی نہیں بنتے' ہمیشہ آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔"
زارا اٹھ کر اس کے قریب آئی پھر ساتھ والی عورت کو۔۔۔ جو ٹھٹھک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔ نظرانداز کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"تم کیا سوچ رہے ہو؟۔۔۔" وہ مبہم سا مسکرا دیا۔ دونوں ہاتھ گرل پر جما کر نیچے جھانکنے لگا۔
"کبھی کبھی وہ لڑکی مجھے بہت یاد آتی ہے۔"
"کون۔۔۔؟" زارا نے اس کی نظروں کے تعاقب میں نیچے دیکھا۔ وہاں ایک بوڑھا چھابڑی لیے گزر رہا تھا۔

"یہیں سے گزرتی تھی کالی چادر لیے۔۔۔۔ پتا نہیں کہاں ہوگی۔"

"کس کی بات کررہے ہو زین؟" زارا نے حیرت سے پوچھا تو وہ چونک سا گیا۔ پھر قصداً" مسکرایا۔

"کسی کی نہیں۔ آئیں' آپ کو کافی پلاتے ہیں۔" وہ بات بدل گیا تھا۔ زارا نے کرید نامناسب نہیں سمجھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

بہت دنوں کے بعد اس نے پاپا کو گھر پر دیکھا تھا۔ وہ اندر جانے کے بجائے ان ہی کے قریب چلی آئی۔ وہ نجانے کس سوچ میں گم تھے۔ اسی زاویے پر بیٹھے رہے۔ زارا نے پکارا تو چونک گئے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے پاپا۔۔۔"

"ہاں۔ یونہی موڈ نہیں تھا آج دفتر جانے کا۔"

"ماما کہاں ہیں۔؟"

"یہ تو تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔" پاپا کی شاکی نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ وہ چونکی پھر شرمندگی سے سر جھکالیا۔ پھر آہستگی سے بولی۔

"وہ وہاں نہیں گئیں۔۔۔۔"

پاپا نے سگار سلگاتے ہوئے اسے دیکھا اور خاموش ہوگئے۔ زارا نے ان کے سامنے بیٹھ کر دونوں ہاتھ ان کے گھٹنوں پر رکھ دیے۔

"آئی ایم ساری پاپا۔۔۔۔"

"مجھے صرف اس بات پر افسوس ہے کہ تم لوگوں نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔"

"ایسی بات نہیں ہے پاپا! میں تو چاہتی تھی مگر ماما۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ تمہاری ماما نے مجھے کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔"

"ایسا نہیں ہے۔ بس وہ خوفزدہ تھیں۔۔۔۔" اس نے ماما کی حمایت کی۔

"ہاں۔۔۔" وہ نجانے کس سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر قصداً" مسکرا کر بولے۔ "جاؤ تم آرام کرو۔"

"آرام کہاں پاپا! آج انعم کی منگنی ہے۔ ابھی وہیں جانا ہے۔"

"اوکے۔ جاؤ' تیار ہو جاؤ۔ واپس آؤگی تو ہم دونوں ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔" پاپا نے اس کا سر تھپتھپایا تو وہ مسکرا کر اٹھ گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

صحن میں کرسیاں لگی تھیں۔ کچھ خواتین ان پر بیٹھی دھوپ سینکتے ہوئے منگنی پر آنے والے متوقع سامان پر سیر حاصل تبصرہ کررہی تھیں۔ خالی کرسیوں کو اکٹھا کرکے انعم کی بھابھیوں کے بچے میوزیکل چیئر کھیل رہے تھے۔ زارا آئی تو سب ہی نے بے حد دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔ انعم کی بھابھی اسے صحن میں ہی مل گئی تھیں۔

"کتنی دیر سے آئی ہو زارا۔ انعم بار بار پوچھ رہی تھی۔"

"کہاں ہے۔۔۔۔؟"

"اپنے کمرے میں۔ عظمیٰ اسے تیار کررہی ہے۔"

"غضب خدا کا۔ ایک اکلوتی میری منگنی ہو رہی ہے۔ لوگوں کو اس پر بھی اعتراض ہے۔" گلابی لہنگے سوٹ میں جس پر موتیوں کا نازک اور خوبصورت کام ہوا تھا۔۔۔۔ لمبے بالوں میں برش چلاتے ہوئے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"اپنی چونچ بند کرو۔ کسی نے سن لیا تو اس اکلوتی منگنی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوگی۔" عظمیٰ نے لتاڑا۔ وہ اس کے لیے پھولوں کے گجرے نکال رہی تھی۔

"خاندان کا سب سے خوبصورت اور ایجوکیٹڈ بندہ چرا لیا ہے انعم بی بی۔ اور لوگ اپنے جلے دل کے پھپھولے بھی نہ پھوڑیں۔" انعم کی دوسری بھابھی نے مسکرا کر کہا۔ وہ وہیں بیڈ پر بیٹھی اپنے چھوٹے بیٹے کو دودھ پلا رہی تھیں۔ تب ہی ان کی نگاہ زارا پر پڑی۔ تو فوراً" بولیں۔

"لو زارا بھی آگئی۔"

"تم سے بھی برداشت نہیں ہوئی میری منگنی۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔" زارا ٹھٹک گئی۔

"وہ نکاح شدہ ہے۔" عظمیٰ نے مسکرا کر یاددہانی کرائی۔

"تو پھر اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟"۔

"تمہیں عقل نہیں آئے گی انعم! تو زارا بیٹھو۔۔۔۔" ان کی بھابھی نے کہا اور سوئے ہوئے بیٹے کو بیڈ پر منتقل کرنے لگیں۔

"کم کیوا۔۔۔ میں اندر آجاؤں۔" انعم کے چھوٹے بھیا نے کھلے دروازے سے جھانک کر پوچھا اور سگنل ملنے پر مٹھائی' پھلوں اور میوہ جات کی خوبصورت پیکنگ والی ٹوکریاں اندر رکھوانے لگے۔

"یہ کیا ہے عاصم بھائی۔۔۔۔؟" عظمیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

"خالہ نے یہ سب یہیں سے منگوایا ہے۔"

"لیکن یہ آپ نے ہمیں کا کیو کیوں کہا ہے۔۔۔۔" انعم نے پلٹ کر غصے سے پوچھا۔

"ہاں عاصم! کم از کم اس کو کا کی مت کہیں۔ اب یہ منگنی شدہ ہونے والی ہے۔" بھابھی نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر دوپٹہ سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

"بھابھی!" انعم جھینپ گئی جبکہ عاصم نے بے حد حیرت سے ادھر ادھر جھانکا۔

"ایک گھنٹہ قبل میں یہاں اپنی بیوی کو چھوڑ کر گیا تھا۔"

"عاصم بھائی خیر تو ہے۔ آج آپ بھابھی کو پہچاننے سے انکار کررہے ہیں۔" عظمیٰ نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیا مطلب ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ ہماری بیوی ہیں۔"

"عاصم!" بھابھی نے انہیں تنبیہی نگاہوں سے گھورا۔

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ تم عام دنوں میں بھی منہ ہاتھ دھو لیا کرو تاکہ تمہاری اصلی شکل نظر آتی رہے۔ عام دنوں میں تو یہ سر جھاڑ منہ پہاڑ والے محاورے پر پورا پورا عمل کرتی ہیں۔"

"ہاں' چھوٹے چھوٹے بچے سنبھالنے پڑیں تو میں پوچھوں آپ سے۔" وہ چڑ کر بولیں۔

"ویسے آج دوسری بار احساس ہوا ہے کہ ہم ایک خوبصورت بیوی کے مالک ہیں۔" وہ کہاں باز آنے والے تھے۔

"پہلی بار کب احساس ہوا تھا۔" عظمیٰ نے یونہی پوچھ لیا۔

"اپنی شادی والے دن۔۔۔۔" وہ کہہ کر رکے نہیں فوراً" باہر نکل گئے تھے۔ پیچھے جھنجلاتی ہوئی بھابھی بھی تھیں۔

"اب عاصم بھائی کی خیر نہیں۔" انعم ہنسنے لگی تھی۔

"تمہاری خالہ آگئی ہیں۔" زارا اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"وہ تو کل شام ہی آگئی تھیں۔ ساتھ میں خالو' ان کا بیٹا اور بہو اور دو عدد بیٹیاں بھی شامل ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ ارے۔ تمہارا گفٹ دینا تو بھول ہی گئی میں۔" زارا کو اب تک ہاتھ میں پکڑے پیکٹ کا خیال آیا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔"

"نہ لاتی تو تم کہتیں آنے کی کیا ضرورت تھی۔" عظمیٰ نے لقمہ دیا۔

"تو میں کوئی ایسی ہوں۔" وہ خفا ہوگئی۔

"نہیں بھئی' تم ایسی نہیں ہو بلکہ بہت اچھی ہو اور اس وقت بالکل گڑیا سی لگ رہی ہو۔" پیچھے سے جھک کر اس کا گال چومتے ہوئے عظمیٰ نے کہا تھا۔ تب ہی ایک باوقار سی خاتون اندر داخل ہوئیں۔

"بھئی بچیو! ہماری بٹی تیار ہو گئی ہے تو اسے باہر لے آؤ تاکہ رسم کی جاسکے۔ ماشاءاللہ۔" انعم پر نگاہ پڑی تو فوراً" آگے بڑھ کر پیار کیا۔ انعم کے چہرے کا رنگ سوٹ کے ہم رنگ ہو گیا تھا۔

"یہ انعم کی خالہ تھیں۔"

ان کے جانے کے بعد عظمیٰ نے بتایا تھا۔

"اس کی خالہ اتنی گریس فل ہیں تو دانیال کیسے ہوں گے۔" زارا نے کہا تو انعم کی زبان پھسل گئی۔

"خالہ کے موچھیں لگا دو۔" پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر

کھلکھلا اٹھی۔

"مجھے نہیں سے گوندلا دو۔ اس کے ہونٹ چپکا دوں۔ یہ وہاں بھی بکواس کرنے سے نہیں رکے گی۔" عظمیٰ نے چڑ کر کہا۔ مگر اس کی زبان خود ہی بند ہو گئی تھی۔ جب اس کی کزنز اسے لینے آئیں۔ رسم بڑے کمرے میں ہونا تھی۔

خالہ نے انگوٹھی پہنائی۔ اس کی کزنز اور ہونے والی نندوں نے پھولوں کے گجرے پہنائے۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا اور منہ میٹھا کروانے کی رسم شروع ہوئی تو زارا، عظمیٰ کی امی کے پاس آ بیٹھی۔ تب ہی اسے عظمیٰ کے پرپوزل کا خیال آیا۔

"آنٹی! عظمیٰ کا کوئی پرپوزل آیا تھا اس کا کیا بنا۔"

"بننا کیا تھا۔ جھوٹ کا پلندہ تھا سارا۔" اتنی زمینیں، اتنی دکانیں، جب اس کے ابا نے معلوم کیا تو خاک بھی نہ نکلا۔" وہ دل گرفتی سے بتانے لگی تھیں۔

"آپ فکر مت کریں۔ عظمیٰ اتنی پیاری اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ انشاءاللہ بہت اچھی جگہ بات طے ہوگی اس کی۔" زارا نے تسلی دی۔

"دیکھو۔" انہوں نے ایک طویل سانس لے کر انعم کو دیکھا۔ "انعم قسمت کی دھنی نکلی۔"

"عظمیٰ کی قسمت بھی بہت اچھی ہوگی۔"

"ہاں۔" وہ کچھ لمحے کسی سوچ میں ڈوبیں۔ پھر آہستگی سے پوچھنے لگیں۔ "وہ ایک لڑکا پڑھتا ہے تمہاری کلاس میں افتخار۔"

"جی ہاں پڑھتا ہے۔"

"کیسا لڑکا ہے؟"

"اچھا ہے۔ بہت محنتی اور ذہین۔"

"وہ تو ہے کیا شریف بھی ہے؟" انہوں نے تیزی سے زارا کی بات کاٹی۔ زارا نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی۔

"جی آنٹی! بہت شریف۔ کسی لڑکی سے بات بھی نہیں کرتا۔"

"اچھا۔ پہلے تو میں سمجھی تھی کہ وہ یہاں۔ پر عظمیٰ۔ وہ تو اس رشتے پر بھی راضی تھی۔" وہ الجھن بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ زارا ان کی بات بخوبی سمجھ گئی تھی۔

"آنٹی! ایسا تو سوچیے گا بھی مت۔ عظمیٰ تو بہت چڑتی ہے اس سے۔ اور شادی۔ شادی کے بارے میں تو ایک ہی نظریہ ہے اس کا۔ جہاں والدین کہیں گے، وہیں کرے گی۔ آپ کو تو پتا ہے فرینڈز کے درمیان ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ عظمیٰ نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ افتخار یونہی آجاتا ہوگا۔"

"ہاں۔ وہ تو مجھے پتا ہے۔ میں نے سوچا یونہی تم سے بات کرلوں۔ سہیلیوں کو دل کی بات کا پتا ہوتا ہے۔" ان کے لہجے میں اطمینان سا جھلکنے لگا تھا۔

"جی اسی لیے تو۔"

"زارا بیٹا!" انعم کے ابو اس کے قریب آئے۔

"جی انکل۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"باہر تمہیں کوئی لینے آیا ہے۔ رضوان نام ہے۔" انہوں نے آہستگی سے بتایا۔

"رضوان اور یہاں۔" وہ متحیر سی کھڑی ہو گئی۔ رضوان کا یہاں آنا اچنبھے کی بات تھی جبکہ اسے آئے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی۔

"مجھے چلنا ہوگا۔" اس نے اشارے سے عظمیٰ کو بلا کر بتایا تو وہ رونے لگی۔

"رضوان بھائی کو اندر بلا لیتے ہیں۔ اتنی جلدی چلی جاؤ گی۔ انعم خفا ہو جائے گی۔"

"نہیں عظمیٰ! کوئی ایمرجنسی لگتی ہے۔ رضوان اس طرح نہیں آسکتے۔ تم انعم سے معذرت کرلینا۔" اس نے رشتے داروں میں گھری انعم کو دیکھا اور اس کی امی سے مل کر باہر نکل آئی۔ رضوان گاڑی میں بیٹھا بے چین و بے تاب نگاہوں سے دروازے کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کے نکلتے ہی گاڑی اسٹارٹ کردی۔

"خیریت رضوان؟"

"بیٹھو۔" اس نے دوسری سمت کا دروازہ کھول دیا۔ زارا کو اس کا انداز کھٹکا گیا۔ تو تیزی سے پسنجر سیٹ کی طرف آئی۔

"رضوان کیا ہوا۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟" اس کے چہرے کی سنجیدگی۔

"زارا۔" وہ ایک پل کو خاموش ہوا۔ پھر گاڑی روڈ پر ڈالتے ہوئے آہستگی سے گویا ہوا۔

"انکل عمیر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"کیا؟" وہ پوری کی پوری اس کی طرف گھوم گئی۔

"ہم ہاسپٹل جارہے ہیں۔"

"کب، کیسے۔ وہ ٹھیک تو ہیں؟ ابھی تو میں ان سے مل کر آئی تھی یہی کوئی آدھا گھنٹہ پہلے۔"

"تفصیلات تو وہیں جا کر معلوم ہوں گی۔"

"مائی گاڈ۔" وہ خوفزدگی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔

"خود کو سنبھالو زارا! انکل ٹھیک ہوں گے۔" رضوان نے اسے تسلی دینا چاہی۔ حالانکہ اس کا لہجہ بتاتا تھا۔ بات اتنی بھی ٹھیک نہیں۔ گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ رضوان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔

"زارا دعا کرو۔" رضوان نے اتنا کہہ کر اسے خاموش کروا دیا تھا۔

ابھی گاڑی آدھے رستے میں تھی۔ جب موبائل کی آواز نے خاموش فضا میں ہلچل مچا دی۔ رضوان نے جھپٹ کر موبائل اٹھالیا۔ زارا پوری حسیات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ تھی۔ وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات۔ اس کی رنگت۔

"ہم آرہے ہیں۔" رضوان کی آواز، اس کا لہجہ۔

اس نے آہستگی سے موبائل آف کیا۔ پھر گاڑی کی رفتار کم کی۔

"ر۔ رضوان!" زارا کا سارا خوف اس کی آواز میں سمٹ آیا۔

کچھ ہو گیا ہے۔ اس کی چھٹی حس سگنل دے رہی تھی۔

گاڑی کا رخ بدل گیا تھا۔

"رضوان۔"

"ہم گھر جارہے ہیں۔" اس کی آواز مدھم اور لہجہ غیر معمولی تھا۔

"ہاسپٹل کیوں نہیں؟"

"اب۔" اس نے ایک پل کو اپنی ہمت مجتمع کی۔ زارا کا دل اس کی سماعتوں میں دھڑکنے لگا۔

"اب ہاسپٹل جانے کی ضرورت نہیں۔ انکل اب۔ نہیں رہے۔" رضوان نے بمشکل جملہ پورا کیا۔ اس کے اعصاب پر کئی بم ایک ساتھ گرے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

کا بیٹا ہے۔ جن پر اس کے تایا کے قتل کا الزام تھا۔ زارا کی ماں کو اپنے بھائی کی موت کا علم ہوتا ہے تو وہ غم سے نڈھال ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ اپنے بھائی کو بے قصور سمجھتی ہیں۔ زارا اور اس کی مما زین سے ملنے لگتی ہیں۔ مگر وہ ساتھ ہی رائے سلیمان سے خوف زدہ ہیں۔ سلیمان ہی نے رائے جمشید حیات پر اپنے باپ کے قتل کا الزام لگایا تھا اور ہر حالت میں اس سے بدلہ لینے کا عہد کیا تھا۔ اس کے برعکس رضوان سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک انسان ہے اور ان تمام معاملات سے دور بیرون ملک تعلیم کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اس کے لوٹ آنے پر ان کی رخصتی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔

زین تارا ایک مظلوم لڑکی ہے۔ جس کا سگا رشتہ صرف ایک ماما مقبول ہے۔ ایک روز زین تارا کے پیر پر کانچ سے زخم آجاتا ہے تو زین اس کے پیر کی مرہم پٹی کر دیتا ہے جس پر اس کے سوتیلے بھائی بھابھی اس پر الزام لگا کر اسے زدوکوب کرتے ہیں اور زین کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہیں اور بالآخر زین تارا پر ظلم و ستم کر کے اپنا مقصد یعنی مکان کی منتقلی کے کاغذات پر دستخط کروا لیتے ہیں۔ ایک خدا ترس ڈاکٹر اجمل اس کا مفت علاج کر رہا ہے۔

زارا، عظمیٰ اور انعم کلاس فیلو ہیں۔ انعم کی اپنے خالہ زاد سے نسبت طے پا گئی ہے۔ جب کہ عظمیٰ کو افتخار بے حد پسند کرتا ہے لیکن عظمیٰ اپنی خاندانی پابندیوں کی وجہ سے اس کے التفات کا جواب انتہائی رکھائی سے دیتی ہے۔

٦
چھٹی قسط

"یہ نہیں ہو سکتا۔" اس کی آنکھوں اور لہجے میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ رضوان کے لیے بھی یہ بہت بڑا شاک تھا۔ اتنا اچانک یہ سب ہوا تھا کہ دل و دماغ ماؤف سے ہو رہے تھے۔ نجانے وہ ڈرائیونگ کس طرح کر رہا تھا۔ اس نے زارا کی سمت دیکھا وہ عالم بے یقینی میں نفی میں گردن ہلا رہی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے رضوان۔۔۔ ابھی۔۔۔ ابھی ایک آدھ گھنٹہ پہلے میں پاپا کو زندہ سلامت چھوڑ کر آئی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا تم واپس آؤ گی تو باتیں کریں گے۔ اتنی جلدی۔ اتنی اچانک۔۔۔ نو۔۔۔ نیور۔۔۔ کوئی غلط فہمی ہے۔ ابھی کس کا فون تھا رضوان؟ آپ دوبارہ فون کریں۔" آنسو تواتر سے اس کا چہرہ بھگونے لگے تھے جس کا اسے بالکل احساس نہ تھا۔

"زارا۔۔۔!" رضوان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر وہ ضبط سے کام لے رہا تھا۔ زارا نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا اور پاپا کا نمبر ملانے لگی مگر دوسری طرف جامد خاموشی تھی۔ رضوان اس وقت اسے تسلی نہیں دے سکتا تھا کہ سارے لفظ بے معنی ہو گئے تھے۔ وہ بار بار نمبر ملا کر ہار گئی۔

رضوان نے اسے گھر سے باہر اتارا تھا۔ ایک امید کے ساتھ اس نے تیزی سے گیٹ عبور کیا۔ پورٹیکو میں پاپا کی گاڑی نہیں تھی۔ ایک موہوم سی آس نے اسے پلٹ کر لان کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا پھر اس کا دل ڈوب گیا۔ سارے گھر پر چھائے ہولناک سناٹے کو اس کی اپنی ہی آواز نے توڑا تھا۔ نجانے کتنا وقت گزرا تھا اور کس نے اسے وہاں سے اٹھایا تھا۔

"میت کو گاؤں لے جانا ہے۔۔۔" سلیمان بھائی کی آواز تھی۔ اس نے روتی کرلاتی مما کو دیکھا اور ان سے لپٹ گئی۔

"شیراز کو فون کرو۔۔۔" پتا نہیں کس نے کہا تھا۔ بہت سے لوگ تھے۔ ایمبولینس ایک پل کو دروازے کے سامنے رکی اور وہیں سے گاؤں کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔ سلیمان نے ان دونوں کو بھی ایک گاڑی میں بٹھایا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"تم بے بے کو عظمیٰ کے گھر لے جاؤ گے؟" کارڈ پر نام لکھتے لکھتے افتخار نے سر اٹھا کر زین سے پوچھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی مہمانوں کی لسٹ پر نظر دوڑا رہا تھا۔ جو ابھی ابھی افتخار کے ابا جی نے لکھوائی تھی۔ چونک کر پوچھنے لگا۔

"کون عظمیٰ۔۔۔؟"

افتخار کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ بکھری پھر دوسرا کارڈ اٹھاتے ہوئے وہ سنجیدہ و سرسری سے انداز میں بولا تھا۔

"زارا کی فرینڈ ہے۔"

"اچھا۔۔۔ ہاں۔" اسے یاد آیا۔

"آپا کی شادی کا کارڈ دینا ہے۔"

"آپ کی رشتہ دار ہیں عظمیٰ۔۔۔" زین نے پوچھا۔

"کچھ دور نزدیک کی رشتہ داری ہے تو۔۔۔" اس کی نگاہیں متبسم اور لہجہ عام سا تھا۔

"تو آپ چلے جائیں۔ مجھے تو ان کا گھر بھی نہیں معلوم۔" زین نے لسٹ میز پر رکھ دی اور کارڈ اٹھا کر اس کا ڈیزائن دیکھنے لگا۔

"میرے جانے پر تو پابندی عائد ہو گئی ہے۔" افتخار زیر لب بڑبڑایا۔ زین نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو چین بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"بہت کام ہیں یار! میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے اور بے بے نہ جانے کب تک وہاں بیٹھیں۔ مجھے تو فرنیچر والے کے پاس بھی جانا ہے۔ ایڈریس میں سمجھا دیتا ہوں۔ زیادہ مشکل نہیں ہے بلکہ ایسا کرو۔" اس نے ایک اور کارڈ اٹھا کر اس پر کچھ لکھا۔

"یہ کارڈ آتے آتے انعم رحمان کے ہاں بھی دے دینا ورنہ خفا ہو جائے گی۔ اس کا گھر بھی وہیں نزدیک ہی ہے۔ یہ حیدر، آصف اور سلیم کے کارڈ ہیں یہ میں خود دے آؤں گا۔"

تب ہی بیٹھک کے کھلے دروازے سے باسط اندر داخل ہوا۔

"اف ماموں! پکڑیں جلدی ورنہ میری گردن میں بل آجائے گا۔" اس کے کندھوں پر مالٹوں سے بھرا ٹوکرا تھا۔

"یہ کیوں اٹھائے لا رہے ہو۔" افتخار نے بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ زین نے آگے بڑھ کر ٹوکرا اتروایا۔

"اف۔!" وہ گردن مسلتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اتنا بھاری تھا۔ میں نے عبدل چاچا سے کہا بھی تھا کہ خود دے آئے مگر میری بات تو وہ مانتا ہی نہیں۔"

"مگر لائے کیوں ہو۔ ابھی کل تو میں نے منگوائے تھے گھر کے لیے۔" افتخار نے پوچھا۔

"پتا نہیں بے بے نے کہا تھا۔"

تب ہی بے بے آگئیں، بادامی چکن کے سوٹ پر کڑھائی والی چادر لپیٹ رکھی تھی، باسط کو دیکھا تو ڈانٹنے لگیں۔

"کب سے انتظار کر رہی ہوں، تم تو جا کر بیٹھ جاتے ہو۔"

"بے بے! سائیکل کا پنکچر ہو گیا تھا۔ سر پر اٹھا کر لایا ہوں۔" وہ احتجاجاً چیخا۔

"اچھا بس، اب اٹھو لڑکے! دیر ہو رہی ہے۔" انہوں نے افتخار سے کہا۔

"زین لے جاتا ہے آپ کو۔ مجھے فرنیچر والے کی طرف جانا ہے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"مگر یہ ٹوکرا کیا ساتھ لے جانا ہے؟"

"خالی ہاتھ جاتے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ موسم کی سوغات ہے پھر اپنے باغ کے ہیں۔" بے بے نے رسانیت سے کہا تو وہ سر ہلا کر باسط کی طرف متوجہ ہوا۔

"جاؤ، ٹیکسی پکڑ لاؤ۔"

"ماموں! میں۔۔۔" باسط نے احتجاج کرنا چاہا، مگر افتخار کے گھورنے پر پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

"بے بے! آپ نے وہاں کوئی کوئی بات نہیں کرنی۔" افتخار نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"بس چپ۔۔۔ زیادہ پٹیاں مت پڑھاؤ۔ پتا ہے مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں۔" بے بے نے ڈپٹ کر کہا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔ ٹیکسی آنے پر زین نے ٹوکرا اندر رکھا۔ افتخار نے ٹیکسی ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا دیا۔ ٹیکسی روانہ ہونے پر اندر آیا تو فاطمہ آپا برتن دھوتے دھوتے پوچھنے لگیں۔

"چلی گئیں بے بے۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے کولر پر رکھا گلاس اٹھا کر پانی سے بھرا پھر وہیں پنجوں کے بل بیٹھ کر پینے لگا۔

"میں نے کہا بھی تھا بے بے سے' مجھے ساتھ لے جائیں' اسی بہانے میں بھی اسے دیکھ لیتی۔"

"پھر دیکھ لیجیے گا۔۔۔ کیا جلدی ہے۔۔۔" اس نے باقی پانی کیاری میں ڈال دیا۔

"تمہیں نہیں' مجھے تو ہے۔ بے بے بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔" وہ اپنے جانے کے خیال سے اداس سی ہو گئیں تو افتخار نے بات بدل دی۔

"سدرہ آپا کا فون آیا تھا۔ میں شام کو جا کر انہیں لے آؤں گا۔" سدرہ ان کی بڑی بہن تھیں' ان کی شادی گاؤں میں ہوئی تھی۔ باسط ان ہی کا بیٹا تھا۔ گاؤں میں ڈھنگ کا اسکول نہ تھا سو وہ اسے یہاں اس کے بہتر مستقبل کی خاطر چھوڑ گئی تھیں۔

"سنو! عظمیٰ شادی پر آئے گی نا۔" فاطمہ آپا کا سارا دھیان وہیں پر تھا۔

"کبھی نہیں۔۔۔" وہ فوراً بولا۔ "البتہ اس کے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا شاید آجائیں۔"

"ایک تو مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ جھنجلا سی گئیں۔

"اگر تم اسے اتنا پسند کرتے ہو اور ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے تو سیدھے سیدھے رشتہ کیوں نہیں بھیجنے دیتے؟"

"میں چاہتا ہوں یہ کام اسی طرح ہو جیسے عظمیٰ چاہتی ہے۔ یہ رشتہ صرف میرے اور عظمیٰ کے درمیان نہیں بلکہ دو گھرانوں کے درمیان ہونا چاہیے۔" وہ مسکرا دیا۔

"تمہاری اس سے کبھی اس سلسلے میں بات ہوئی ہے؟" فاطمہ آپا نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا تو افتخار ہنس دیا۔

"وہ مجھ سے کسی بھی سلسلے میں کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتی۔"

"اس کے باوجود تم جانتے ہو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔" فاطمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔۔۔" افتخار کا لہجہ پُر یقین تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئیں۔

"چلو اچھا ہے۔ تب تک تم یونیورسٹی بھی چھوڑ دو گے اور دونوں گھر ایک دوسرے کو جان بھی لیں گے۔ اللہ کرے وہ تمہارا ہی نصیب بنے۔"

"ایسا ہی ہو گا انشاءاللہ۔۔۔"

"بڑا یقین ہے۔" انہوں نے چھیڑا۔

"اپنے رب پر یقین ہے۔" وہ مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔

"میں ذرا فرنیچر والے کی طرف جا رہا ہوں۔ ابا جی آئیں تو بتا دیجیے گا۔"

♥ ♥

دروازہ عظمیٰ نے کھولا تھا۔ وہ ابھی ابھی انعم کے ہاں سے آئی تھی۔ امی اور دوسرے بہن بھائی ابھی تک وہیں تھے کہ مہمانوں کے جانے کے بعد منگنی کا سامان از سرِ نو دیکھا جا رہا تھا۔ زین کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"تم۔۔۔" پہلا خیال یہی آیا کہ وہ زارا کا پیغام لایا ہو گا۔ پھر سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ زارا اس طرح پیغام نہیں بھجوایا کرتی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔!"

"وعلیکم السلام۔۔۔" اس نے قدرے حیرت سے ساتھ کھڑی شفیق صورت خاتون کو دیکھا۔ زین العابدین کا خیال تھا ایک دوسرے کو جانتی ہیں کہ افتخار نے انہیں رشتے دار ہی بتایا تھا۔ مگر جب عظمیٰ کے چہرے کا تذبذب اور حیرت دیکھی تو کچھ پزل سا ہو کر کہنے لگا۔

"افتخار بھائی کی والدہ آئی ہیں۔" عظمیٰ بری طرح بوکھلا گئی۔ افتخار سے کچھ بعید نہ تھا مگر والدہ۔۔۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گی بیٹی!" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھیں' اس نے بری طرح پزل ہوتے ہوئے پورا دروازہ کھول دیا۔

"آئیے نا۔۔۔!" وہ ابھی بھی نئے سوٹ میں ملبوس تھی۔ لمبے بال کھلے تھے مگر سلیقے سے دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ کچھ گھبرائی گھبرائی عظمیٰ کو بے بے نے بے حد پسندیدگی سے دیکھا۔ دل نے کہا "یہی عظمیٰ ہے۔" کہ افتخار نے بتایا تھا وہ گھر میں سب سے بڑی ہے۔ باقی بہنیں چھوٹی ہیں پھر بھی تصدیق کے لیے پوچھنے لگیں۔

"تم عظمیٰ ہو۔۔۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈیوڑھی میں کھلنے والا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے جبکہ بے بے نے دل ہی دل میں بیٹے کی پسند کو سراہا تھا۔ زین نے تو کرا ڈیوڑھی میں رکھا۔

"آپ بیٹھیں خالہ! میں امی کو بلاتی ہوں۔ انعم کی منگنی تھی آج۔ سب وہیں گئے ہوئے ہیں۔" عظمیٰ نے ہتھیلیاں مسلتے ہوئے بتایا تو زین بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔

"پھر تو زارا بھی آئی ہوں گی۔"

"ہاں آئی تو تھی مگر رضوان بھائی اسے لینے آگئے۔ شاید کوئی ایمرجنسی تھی۔"

"کیسی ایمرجنسی۔۔۔؟" زین چونک کر پوچھنے لگا۔

"معلوم نہیں' اس نے جا کر فون بھی نہیں کیا' میں ابھی کروں گی فون پھر کچھ پتا چلے گا۔" عظمیٰ نے کہا۔ پھر بے بے کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ "میں امی کو بلا کر لاتی ہوں۔"

دیوار کے ساتھ اوپر جاتی سیڑھیوں پر چڑھ کر اس نے دوسری طرف جھانکا۔ صحن میں کھیلتے انعم کے بھتیجے کو آواز دے کر امی کو بھیجنے کو کہا۔

"کہہ دینا۔ مہمان آئے ہیں۔" اسی صورت میں وہ جلدی اٹھ سکتی تھیں۔ وہ خود وہیں صحن میں ٹہلنے لگی۔ پزل تو تھی ہی مگر افتخار پر غصہ بھی آرہا تھا۔

"انتہا درجے کا ڈھیٹ انسان ہے۔" وہ جھنجلا رہی تھی۔ تب ہی امی آگئیں اور ان کے عقب میں انعم کو دیکھ کر وہ جزبز ہو کر ہتھیلیاں مسلنے لگی۔ جانتی تھی اب وہ کتنا ریکارڈ لگائے گی۔

"کون آیا ہے؟" امی نے پوچھا تھا جبکہ انعم تو کمرے کا معائنہ کر رہی تھی۔

"افتخار کی امی آئی ہیں۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"ہیں!" انعم جھٹ سے اس کے قریب آئی۔ وہ منگنی کا سوٹ بدل چکی تھی اور اس وقت سادہ سے لباس میں ملبوس تھی۔ "کیا سچ۔۔۔" اس کے بتیس کے بتیس دانت باہر تھے۔

"اچھا تم چائے بناؤ۔" امی اس سے کہہ کر ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔

"سچ مچ اس کی والدہ ہی ہیں نا۔۔۔؟" لہجے میں اشتیاق ہی اشتیاق تھا جبکہ عظمیٰ چڑ کر کہنے لگی۔

"تمہارا آنا ضروری تھا' آج کے دن تو گھر میں ٹک جاتیں۔۔۔"

"منگنی ہوئی ہے۔ کوئی مایوں تو نہیں بیٹھی میں جو گھر سے نکلنا ہی بند ہو جائے۔" وہ آرام سے بولی۔ پھر شرارت سے اسے کچن کی طرف دھکیلا۔

"تم ذرا اچھی سی چائے بناؤ۔ میں افتخار کی بے بے سے مل آؤں۔"

عظمیٰ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں گھس گئی۔ چائے تو بہرحال بنانا ہی تھی۔ انعم آئی تو عظمیٰ کی امی کہہ رہی تھیں۔

"بھلا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی بہن۔"

"تکلف کیسا' اپنے باغ کا پھل ہے۔" بے بے نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا مگر افتخار تو بتا رہا تھا کہ آموں کا باغ ہے آپ کا۔۔۔؟" امی نے حیران ہو کر پوچھا۔ بے بے ان سے زیادہ حیران ہوئی تھیں۔

"نہیں۔ ہمارے تو ہمیشہ سے۔۔۔"

انعم گڑبڑا کر بول اٹھی۔

"باغ تو باغ ہوتا ہے' کیا مالٹے کیا آم۔ آپ

سنائیں خالہ کیسی ہیں آپ۔ افتخار بھائی تو بہت تعریفیں کرتے ہیں اپنی بے بے کی، مجھے تو بہت اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔"

ان کا دھیان بٹانے کو وہ بولتی چلی گئی تب ہی نگاہ زین پر پڑی۔ بے بے کو دیکھنے میں ایسی محو تھی کہ پہلے اس کی سمت توجہ ہی نہ گئی تھی۔

"زین تم۔۔۔۔"

"تھینک گاڈ۔ آپ نے مجھے دیکھا تو میں بے بے کو لایا تھا۔" وہ مسکرایا۔

"یہ زارا کو کیا ایمرجنسی ہوگئی تھی۔ اتنی جلدی واپس چلی گئی۔"

"مجھے نہیں معلوم۔۔۔" وہ کندھے اچکا کر بولا پھر ہاتھ میں پکڑا کارڈ اسے تھمادیا۔

"افتخار بھائی نے آپ کے لیے دیا ہے۔"

وہ کارڈ کھول کر دیکھنے لگی۔

"یہ بھی آپ کی بیٹی ہے۔۔۔" بے بے پوچھ رہی تھیں۔

"عظمیٰ کی سہیلی ہے۔ آج اس کی بات طے ہوگئی ہے۔" امی نے بتایا۔

"ماشاءاللہ' اللہ نصیب اچھے کرے۔ میں بھی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ دینے آئی تھی۔ افتخار نے اتنی تعریفیں کیں آپ لوگوں کی، میں نے کہہ دیا خود دینے جاؤں گی۔"

"بہت اچھا کیا۔" امی نے جلدی سے کہا۔

"ماشاءاللہ بہت سلجھا ہوا بیٹا ہے آپ کا۔"

"میں تعریف کروں گی تو لوگ کہیں گے ماں ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔ اکلوتا تھا، بہتیرے لاڈ پیار بھی کیے۔ پر اللہ کا شکر ہے، بہت ہی فرماں بردار ہے۔ چھوٹا ہی تھا جب زمینوں اور باغ کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ اپنی پڑھائی کا شوق بھی ساتھ ساتھ ہی پورا کر رہا ہے۔ اس کے ابا کو تو کوئی فکر ہی نہیں۔ سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔۔۔۔"

انعم باہر نکل آئی۔ کچن کے دروازے میں کھڑے ہو کر عظمیٰ کو اطلاع دی۔

"افتخار کی بہن کی شادی ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔۔۔؟" وہ رکھائی سے بولی۔

"جانے کی تیاری کرو۔ مجھے بھی کارڈ آیا ہے۔ بہت ہی چالاک بندہ ہے۔"

"میرا دماغ خراب ہے جو جاؤں گی۔" اس نے چینی کا ڈبہ پٹخا۔

"اچھا مت جانا مگر چائے اچھی بنانا۔ یہ کیا۔۔۔ ساتھ میں صرف سوکھے بسکٹ۔ کیا علاج کروں تمہارا عظمیٰ۔۔۔" وہ سر پیٹ کر رہ گئی۔ عظمیٰ کچھ نہیں بولی۔ بسکٹ پلیٹ میں نکالنے لگی۔ انعم پلٹی تو فوراً بول اٹھی۔

"جا کہاں رہی ہو، چائے لے کر جاؤ، میں نہیں جاؤں گی۔"

"مجھے تم سے کبھی بھی کوئی اچھی امید نہیں ہے، ابھی آتی ہوں۔" وہ سیڑھیوں سے دیوار اور دیوار سے دوسری طرف چارپائی پر کود گئی تھی۔

"اس لڑکی کا کوئی کام سیدھا نہیں۔" عظمیٰ زیرلب بڑبڑاتی ہوئی کپ دھونے لگی۔ انعم واپس آئی تو ساتھ میں بھری ہوئی ٹرے تھی۔ چکن رول، سموسے، بیکری کے مزے دار بسکٹ۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟" عظمیٰ نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔

"بہت کچھ بچ گیا تھا۔ یونہی ضائع ہی جاتا میں نے سوچا۔۔۔" اس کا لہجہ صاف چڑانے والا تھا۔

"اسے اٹھاؤ اور دفع ہوجاؤ۔ مجھے تمہاری چیزوں کی ضرورت نہیں۔" عظمیٰ دانت پیس کر بولی تھی۔

"لیکن مجھے ہے۔" انعم نے اس کے ہاتھ سے کپ جھپٹ لیے۔ وہ کچھ لمحے اسے بری طرح گھورتی رہی جبکہ انعم اسے یکسر نظرانداز کرتی ٹرے میں برتن لگاتی رہی اور جب اپنی مسکراہٹ ضبط کرنے میں ناکام رہی تو سر اٹھا کر پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا۔۔۔ بہت غصہ آرہا ہے۔"

عظمیٰ نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ ٹرے میں پٹخی اور دھپ دھپ کرتی کمرے میں گھس گئی۔ انعم جانتی

تھی اب وہ باہر نہیں آئے گی اس نے اطمینان سے چائے تھرماس میں نکالی ٹرے میں باقی چیزیں رکھیں۔ ڈرائنگ روم میں آئی تو امی اور بے بے نجانے کہاں کہاں سے شجرہ نسب کھنگال رہی تھیں۔ بے بے انتہائی جوش اور خوشی میں بتا رہی تھیں کہ جس گاؤں سے ہجرت کر کے وہ لوگ پاکستان آئے تھے وہاں ان کے چچا کی سسرال تھی۔

"میں تو اس وقت پانچ برس کی تھی پر میرے ابا کو سب پتا ہے۔ انہیں ضرور معلوم ہوگا لیکن وہ تو پچھلے سال اللہ کو پیارے ہوگئے۔" عظمیٰ کی امی نے آخر میں بے حد افسردگی سے بتایا تھا۔ انعم نے دیکھا زین بیزار سا پرانا اخبار ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ ظاہر ہے اسے ان خواتین کی باتوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

"اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی بہن! ہم کوئی غیر ہیں۔"

"تکلف کیسا! مجھے تو اتنی خوشی ہو رہی ہے آپ کے آنے کی۔"

انعم مسکراہٹ دباتی چائے سرو کرنے لگی۔

"عظمیٰ کہاں رہ گئی۔۔۔؟" عظمیٰ کی امی نے پوچھا تھا اور انعم جانتی تھی اب وہ ہاتھ پاؤں جوڑنے سے بھی نہیں آئے گی۔

"ابھی آتی ہے۔" وہ انہیں ٹال کر زین کی طرف متوجہ ہوئی۔ "تم بور ہو رہے ہو؟"

"نہیں تو۔۔۔" وہ قصداً مسکرایا۔

"افتخار کے ساتھ بہت دوستی ہوگئی ہے تمہاری۔ چلو اچھا ہوا اس پورے عرصے میں کسی کو تو دوست بنا پائے تم۔۔۔" وہ اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

زین نے بس مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ انعم اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ افتخار کی بے بے ان سے شادی پر آنے کا پکا وعدہ کر کے ہی اٹھی تھیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے عظمیٰ کا پوچھا، امی کی آواز پر اسے آنا ہی پڑا۔ بے بے نے اسے پیار کیا، شادی پر آنے کی تاکید کرتی ہوئی چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی امی عظمیٰ کی طرف پلٹیں۔

"یہ کیا طریقہ تھا۔ تمہیں کوئی تمیز بھی ہے یا نہیں۔ گول گپے جیسا منہ بنا کر سامنے آگئی تھیں۔" انعم کے منہ سے ہنسی کا فوارہ نکل پڑا۔ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ چھلک گیا۔ عظمیٰ کو مزید تاؤ آگیا۔

"مجھے نہیں اچھے لگتے یہ لوگ۔" وہ تن فن کرتی پھر سے کمرے میں جاگھسی۔ امی اس کی یونیورسٹی کو کوسنے لگیں جہاں جاکر لڑکیوں کے منہ میں زبان آجاتی تھی۔ پھر بڑبڑاتے کر پلٹیں، انعم ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا لڑکی۔۔۔؟" ایسا بے شرموں کی طرح ہنسنا انہیں ذرا نہیں بھایا تھا۔

"بھول گیا۔۔۔" وہ بمشکل ہنسی ضبط کر کے بولی اور پھر سے شروع ہو گئی۔ امی نے بمشکل مسکراہٹ روکی پھر عظمیٰ کو آواز دے کر برتن اٹھانے کا کہنے لگیں۔

♥ ♡ ♡ ♥

لائی بے قدراں نال یاری
تے ٹٹ گئی تڑک کر کے

سنک صاف کرتے ہوئے وہ زور و شور سے گا رہا تھا۔ زور سنک پر اور شور گانے میں تھا۔ زین کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے وہ کچن تک چلا آیا۔ سلیم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بے نیازی سے پھر گانے لگا تھا۔

"شہزادہ سلیم! کچھ کھانے کو ملے گا۔" وہ دروازے کے درمیان کھڑا پوچھ رہا تھا، سلیم کی تان ایک پل کو ٹوٹی۔

"نہیں۔" خاصا کورا جواب تھا۔

"کیوں۔۔۔؟" زین کو حیرت ہوئی۔

"میں نے کچھ بھی پکانا چھوڑ دیا ہے۔" جواب دے کر وہ پھر سے رگڑنے لگا۔

"کیوں بھئی۔ پیسے تو میں تمہیں ہر مہینے دیتا ہوں۔" وہ اندر چلا آیا۔

"پیسوں کی بات مت کریں صاحب۔۔۔"

"صاحب۔۔۔؟" زین نے اس طرز تخاطب پر گھور کر دیکھا۔ سلیم نے برتن چھوڑا اور ہاتھ نچاتے ہوئے جارحانہ انداز میں بولا۔

"بھائی صاحب۔ پکاؤں کس کے لیے ان در و دیوار یا باہر لگے پیڑ پودوں کے لیے۔ آپ کہیں تو لنگر خانہ کھول لوں، کیونکہ دن کی روشنی میں آپ تو گھر میں نظر آتے نہیں۔"

زین مسکرا دیا۔

"اپنے لیے پکا لیا کرو یار!" وہ فریج کھول کر جائزہ لینے لگا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

"میری فکر مت کریں۔ میرا گزارہ تو دو روپے کے نان میں بھی ہو سکتا ہے۔" وہ جل کر بولا۔

"بہت قناعت پسند ہو۔۔۔" زین نے فریج بند کرتے ہوئے سراہا۔

"قناعت پسند ہوں۔ تب ہی سب کچھ سلامت ہے ورنہ جس طرح آپ سارا گھر کھلا چھوڑ کر پورا پورا دن غائب رہتے ہیں، کوئی اور ہو تو سب سمیٹ کر لے جائے۔"

"تمہارا کچھ ایسا ہی ارادہ تو نہیں بن رہا۔" زین نے چھیڑا تو وہ تڑپ اٹھا۔

"بابا جان کی نوازشیں اور محبتیں ہیں جو اب تک روکے ہوئے ہیں ورنہ جا چکا ہوتا۔"

"اچھا بھئی! اب ان ہی محبتوں کے بدلے کچھ بنا دو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ صلح جو لہجے میں گویا ہوا۔

"جہاں سے آئے ہیں وہاں کچھ نہیں ملا۔۔۔" سلیم بڑبڑایا تو زین نے اسے گھور کر دیکھا۔

"زیادہ اوور ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں شاور لے کر آرہا ہوں۔"

"گھر میں بس انڈے ہیں۔" سلیم نے پیچھے سے آواز دی۔

"آملیٹ بنا دو، ڈبل روٹی کے ساتھ چلے گا۔" زین نے شرٹ اتار کر بیڈ پر پھینکی۔ وارڈ روب سے شلوار قمیص نکال کر باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر آیا تو سلیم سب تیار کیے بیٹھا تھا۔

"تھینک یو سلیم میاں! تمہارا دم کسی فرماں بردار

بیوی سے کم نہیں میرے لیے۔" ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکر برش اٹھاتے ہوئے زین نے بے اختیار سراہا۔

"مجھے بھی اپنا آپ ایسی بیوی کا ہی لگتا ہے۔ جو دوپہر میں کھانا بنا کر سارا دن آوارہ اور نکھٹو شوہر کا انتظار کرتی اور اس کی واپسی پر جھڑکیاں کھاتی ہے۔ اسی لیے میں نے کھانا بنانا چھوڑ دیا ہے۔"

سلیم منہ بنا کر بولا تو زین ہنس دیا۔ اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ سلیم کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے بابا جان کو اس کے ناز کسی ننھے بچے کی طرح اٹھاتے دیکھا تھا۔ ان کے حلق سے لقمہ نہیں اترتا تھا جب تک زین کھانا نہ کھا لیتا۔ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے وہ بے اختیار کہنے لگا۔

"اپنا خیال رکھا کریں بھائی جان! کم از کم کھانا تو ڈھنگ سے گھر پر کھایا کریں۔"

"بخشو بھی بابا! آئندہ گھر پر ہی کھاؤں گا۔" زین اس کے احساسات سے بے خبر لاپروائی سے بولا۔ "یہ فون تو قریب کرو۔۔۔"

سلیم فون سیٹ اس کے قریب رکھ کر خود باہر نکل گیا۔ اس نے نمبر ملایا، دوسری طرف بار بار بیل جانے کے بہت دیر بعد کسی نے فون اٹھایا۔

"ہیلو جی!" دوسری طرف کی آواز پر وہ ذرا سنبھل کر پوچھنے لگا۔

"زارا ہیں۔۔۔"

"نہیں جی۔ وہ تو گاؤں گئی ہیں۔"

"گاؤں! خیریت تو ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ واپس رکھا۔

"رائے صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ "کب۔۔۔ کیسے۔۔۔؟"

ملازمہ نے اسے ساری تفصیل بتائی۔

"پھپھو۔۔۔ میرا مطلب ہے ان کی بیگم۔۔۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ پھپھو اور زارا پر اتنی بڑی قیامت ٹوٹ گئی اور وہ بے خبر تھا۔

"سب ہی رائے پور چلے گئے۔ صاحب کو وہیں دفن کرنا ہے۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ انگلیاں اپنے سر کے بالوں میں الجھا کر وہ کتنے ہی لمحے یونہی بیٹھا رہا۔ پھپھو اور زارا کے دکھ کا احساس پوری شدت سے ہو رہا تھا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، وہ حویلی میں ہوتا پھپھو کے آنسو پونچھتا۔ زارا کو تسلیاں دیتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان دونوں نے اس کا غم بانٹ لیا تھا وہ بھی بانٹ لیتا مگر۔۔۔ وہ اضطراری انداز میں کمرے میں چکرانے لگا۔ سلیم کمرے میں داخل ہوا تو وہ فیصلہ کن انداز میں الماری کی طرف بڑھا۔ کچھ پیسے نکال کر اس نے والٹ میں رکھے سلیم برتن سمیٹ رہا تھا۔

"اور چائے بنا دوں بھائی جان۔۔۔"

"سلیم۔" زین نے جوتے پہنے۔ "افتخار بھائی کا فون آئے تو بتا دینا میں گاؤں گیا ہوں۔ شاید صبح تک لوٹ آؤں۔"

"گاؤں۔۔۔؟" سلیم نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں زارا کے والد کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" زین نے آہستگی سے بتایا۔ پھر اس کا کندھا تھپتھپا کر "گھر کا خیال رکھنا" کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ویگن نے اسے سڑک پر اتارا تھا۔ دھوپ میں دو تین تانگے کھڑے تھے۔ وہ ایک کی طرف بڑھ گیا۔

"کہاں جانا ہے باؤ۔۔۔" بوڑھے کوچوان نے چابک لہرایا۔

"حویلی۔" وہ مختصراً کہہ کر تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگا گاؤں کی کچی پکی سڑک پر دوڑنے لگا۔ گاؤں کی فضا اس کے درختوں، کھیتوں اور عقب سے بہتی نہر پر سوگ کا رنگ نمایاں تھا۔ جب وہ حویلی پہنچا تو جنازہ قبرستان جانے کو بالکل تیار تھا۔ فضا وقفے وقفے سے ابھرتی کلمۂ شہادت کی آوازوں سے لرز رہی تھی۔ وہ

خاموشی سے ساتھ ہولیا۔ مشہور سیاسی وسماجی شخصیات موجود تھیں۔ جنازے کو کندھا دینے، میت کو لحد میں اتارنے اور آخر میں مٹھی بھر مٹی قبر پر ڈالنے تک وہ خاموشی کے ساتھ رضوان اور سلیمان کے ساتھ تھا۔ پھر اسی خاموشی سے الگ ہوگیا۔

قبرستان خالی ہوگیا مگر وہ پھر بھی ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے وہیں کھڑا رہا۔ اس کے سامنے تازہ قبر پھولوں کے ڈھیر سے بھری ہوئی تھی اور کانوں میں پھپھو کے بین اور زارا کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

یہ ان کا آبائی قبرستان تھا۔

بابا کی کتنی خواہش تھی کہ وہ اپنے آبائی قبرستان، اپنی زمین، اپنے لوگوں کے درمیان دفن ہوں مگر وہ کس قدر بے بسی اور خاموشی کے ساتھ وہیں دفن کردیے گئے تھے۔

"اپنے لوگ۔۔۔" وہ آہستگی سے چلتا ہوا مختلف قبروں کے کتبے پڑھنے لگا۔ پھر ایک بڑی قبر کے پاس جا رکا۔

"رائے اکبر علی۔"

اس کے دائیں اور بائیں دو قبریں تھیں۔ رائے اکبر علی کے دونوں بیٹوں کی۔

رائے حیات اکبر۔ رائے حیدر اکبر۔

"پتا نہیں کیا بات ہے پر اس خاندان کے کسی فرد کو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب نہیں ہوئیں۔" ایک بوڑھا سا شخص اس کے قریب کھڑا ہو کر بے حد تاسف سے ان قبروں کو دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب۔" درخت کے سائے میں سانس لیتے نورحسن نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"پتا نہیں کس بددعا کا سایہ ہے اس خاندان پر۔ رائے اکبر کے دونوں بیٹے بھی یونہی حادثاتی طور پر مارے گئے تھے۔ میں نے ان کی قبریں کھودی تھیں۔" وہ لرزیدہ آواز میں کہہ کر خاموش کھڑے زین کی طرف متوجہ ہوا اور بے اختیار پوچھنے لگا۔

"تم کون ہو پتر۔۔۔؟"

"میں۔۔۔" زین چونکا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار رائے حیات اکبر کی قبر کی طرف اٹھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔

"میں رائے حیات کا پوتا ہوں بالکل ویسے ہی جیسے رضوان اور سلیمان رائے حیدر کے پوتے ہیں۔" مگر اس نے ہاتھ گرادیا اور لب بھینچ کر رائے نواز حیدر کی قبر دیکھنے لگا۔

"رائے نواز۔۔۔ رضوان اور سلیمان کے والد۔۔۔ وہ شخص جس نے مرنے کے بعد اس کے باپ کو دربدر بھٹکنے پر مجبور کردیا۔

"رائے اکبر نے اپنے دونوں بیٹوں کی اولادوں کی پرورش کی۔ ان کے خاندان میں زمین کبھی تقسیم نہیں ہوئی اس کے بڑے پوتے رائے نواز نے ساری جاگیر سنبھالی تھی۔ رائے اکبر کی وفات کے بعد جب زمین کی تقسیم کا معاملہ ہوا تو رائے حیات کے بیٹے جمشید نے اپنے تایا کے بیٹے کو قتل کروا دیا اور خود غائب ہوگیا۔"

"ضروری تو نہیں۔" زین تڑپ کر ان کی طرف پلٹا۔ "یہ ضروری تو نہیں بزرگوار کہ رائے جمشید نے واقعی رائے نواز کو قتل کیا ہو۔"

بوڑھے نے بے حد حیرت سے اس کا تڑپنا دیکھا پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"غیب کا علم تو رب سوہنے کو ہے پر حقیقت تو یہی ہے پتر! اس نے زمین کی خاطر اپنے بھائی کو مروادیا۔ زر، زن اور زمین کے جھگڑے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"وہ پکڑا نہیں گیا ابا۔۔۔؟" اس کا بیٹا پھر سوال کررہا تھا۔

"یہ بڑے لوگ اپنے معاملے دوسروں کے سپرد نہیں کرتے۔ سلیمان نے قسم کھائی تھی، باپ کی موت کا بدلہ خود لے گا۔ سارا ملک کھنگال ڈالا پر پتا نہیں وہ کہاں غائب ہوگیا تھا۔" بوڑھا سر جھٹک کر نئی قبر پر ڈالے پھولوں کو دیکھنے لگا۔ پھر تاسف سے گویا ہوا۔

"رائے حیدر کے تو پوتے ہیں اس کی نسل چلانے کو، پر رائے حیات کا تو کوئی نام لیوا نہ رہا۔ سارا خاندان ہی سمجھو ختم ہوگیا۔ بیٹیاں ہیں پر نسل تو بیٹوں سے چلتی ہے۔"

"رائے جمشید کی شادی نہیں ہوئی تھی۔"

"ہوئی تھی، رائے نواز کا بہنوئی تھا۔ وٹہ سٹہ تھا۔ جمشید کی بہن رائے عمیر کے گھر تھی اور ان کی بہن جمشید کے ساتھ بیاہی گئی پر وہ نمانی اپنے بچے کے ساتھ مرگئی۔ پتر تھا پر کون جانے اب رہا یا نہیں۔"

"ہوسکتا ہے وہ زندہ ہو۔" زین سے خاموش رہنا ممکن نہ رہا۔ "ہوسکتا ہے وہ کبھی واپس آئے۔"

وہ بوڑھا ہلکی سی ہنسی ہنس دیا۔

"ہوسکتا ہے۔ پر یہاں آکر وہ کیا کرے گا۔ اس گاؤں میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔"

"اس کے باوجود وہ آئے گا۔ یہ بتانے کہ اس کا باپ بے قصور تھا۔"

بوڑھے نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس سے بے اختیار پوچھا تھا۔

"تم کون ہو۔۔۔؟"

زین نے رخ بدل لیا اور بے حد خاموشی سے شام کے اندھیرے میں درختوں کی اوٹ میں غائب ہوگیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہی گھر تھا، وہی درودیوار، وہی لان اور وہی کرسی مگر وہ کرسی خالی تھی۔

"پاپا مجھے آخری بار یہیں ملے تھے۔"

رضوان نے گردن موڑ کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا پھر آہستگی سے اس کا کندھا تھپتھپا کر بولا۔

"اندر چلو۔۔۔"

مگر وہ ست روی سے چلتی وہاں تک آئی۔ سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر یوں دیکھنے لگی جیسے پاپا وہاں موجود اس سے بات کررہے ہوں۔

"مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ تم لوگوں نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔"

اس نے پاپا کے لہجے میں اتنی افسردگی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

"تمہاری ماں نے مجھے کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔"

انہوں نے اس سے قبل کبھی شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔ پاپا اور مما کا کپل پرفیکٹ کپل سمجھا جاتا تھا۔

"پھر اتنی بدگمانیاں اپنے ساتھ کیوں لے گئے پاپا۔۔۔"

ایک سسکی ٹوٹ کر لبوں پر بکھری۔

"واپس آؤ گی تو ہم دونوں ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔" ان کے ہاتھ کا لمس اس نے پوری طرح محسوس کیا۔ وہ اس کا سر تھپتھپا رہے تھے اور اس سے قبل انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔

"کون سی باتیں تھیں پاپا، جو آپ مجھ سے کرنا چاہتے تھے۔"

وہ پھر سے رو پڑی۔ رضوان مضطرب سا ہو کر اس کے پاس آیا۔

"صبر کرو زارا۔۔۔"

"یقین کیوں نہیں آتا رضوان! پاپا اب ہم میں نہیں ہیں۔"

"یقین تو واقعی نہیں آتا زارا! مگر حادثے اچانک ہی ہوتے ہیں۔ اور ہم تقدیر سے لڑ نہیں سکتے۔" وہ افسردگی سے کہہ رہا تھا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔

"چلو اٹھو، جو چیزیں لینی ہیں لے لو۔ باقی سامان بعد میں آجائے گا۔"

زارا نے سر اٹھا کر گھر کے درودیوار کو دیکھا۔ یہ گھر پاپا نے بہت چاہت سے بنوایا تھا اور اب اسے بند ہو جانا تھا کہ وہ اکیلی یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ مما کو اپنی عدت گاؤں میں پوری کرنی تھی کہ وہیں ان کا سسرال بھی تھا اور میکہ بھی۔ زارا کو رائے ہاؤس شفٹ ہونا تھا۔ شیراز بھائی دو دن کے بعد پاکستان آئے تھے کیونکہ وہ نیویارک سے باہر کسی کام کے سلسلے میں گئے تھے۔ زارا اور مما چاہتی تھیں کہ اب وہ بیوی اور بچے کے ساتھ واپس آجائیں کہ یہ گھر اسی صورت میں آباد ہو سکتا تھا مگر انہیں واپسی کی جلدی نہیں تھی۔ وہ تو شاید باقاعدہ

زارا کی رخصتی ہی کروا دیتے مگران حالات میں ممکن نہیں تھا۔ آئمہ اور زارا شیراز کی اس بے حسی پر بجھ سی گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا ان کا سب کچھ اب امریکہ میں ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ وہ محض رشتے داری نبھانے آئے ہیں۔ ان سے زیادہ اپنائیت تو رضوان اور سلیمان کے رویوں میں تھی۔ ان دس دنوں میں رضوان نے اپنا ہر کام چھوڑا ہوا تھا۔ اس کا پورا وقت آئمہ اور زارا کی دل جوئی میں گزر جاتا تھا۔

اس نے اپنی ضروری چیزیں اور کتابیں بیگ میں رکھیں۔ ملازمہ نے دوسرے سوٹ کیس میں اس کے کپڑے وغیرہ ڈال دیے۔ رضوان بھی اس کی مدد کرتا رہا۔

''سنو! پاپا اس دن کہاں گئے تھے۔'' اس نے پاپا کے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھا۔

''کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ آپ کے جانے کے بعد گاڑی لے کر نکل گئے تھے۔'' ملازمہ افسردگی سے بتانے لگی تو وہ بیڈ روم کی طرف بڑھی۔ مگر رضوان نے آگے بڑھ کر راستہ روک لیا۔

''خالی کمرے کو دیکھ کر کیا کرو گی زارا! آؤ چلتے ہیں۔''

وہ بے بس سی ہو کر پلٹی۔ ملازمہ کو ضروری ہدایات دیں اور ڈبڈبائی آنکھوں سے گھر پر الوداعی نگاہ ڈال کر اس کے ساتھ چلی آئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

بتول کی ماں اور بہن کوثر آئی تھیں۔ ایک گھنٹے سے بند کمرے میں نجانے کیا صلاح مشورے ہو رہے تھے۔ نین تارہ چائے دینے گئی تو تینوں ایک دم چپ ہو گئی تھیں۔ بتول کی ماں نے بے حد ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ کوثر پلنگ پر بیٹھی پاؤں جھلا رہی تھی۔ لبوں پر چمکتی ہوئی مسکان تھی۔ نین تارہ چائے رکھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

''ہائے آپا! یہ تو بتا دو۔ دیکھنے میں کیسا ہے؟'' کوثر اشتیاق سے بتول کے کندھے پر جھول گئی۔

''اچھا ہے' بہت اچھا ہے' آمدنی بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ سیدھا سادا نوجوان' گھر میں صرف ماں باپ ہیں۔ وہ بھی چلے جائیں گے۔ عیش کرے گی کوثر۔''

''بس کسی طرح بات بن جائے۔'' اس کی ماں بھی راضی تھی۔

''بات بن جائے گی' میری تو مٹھی میں ہے۔ پہلے اس کو دیکھنے آتا تھا۔ اب مجھ سے ملنے آتا ہے' باجی کہتا ہے۔ میں بھی اکثر کچھ نہ کچھ پکا کر اس کے کلینک بھجوا دیتی ہوں۔'' بتول نے اپنی کارگزاری سنائی۔

''آئے گا کب؟۔ ایک نظر میں بھی دیکھ لیتی۔'' بتول کی ماں نے پوچھا۔

''دوسرے تیسرے دن چکر لگا لیتا ہے۔ آئے گا' دو تین دن تو تم یہیں ہو۔'' بتول نے کہا تو اس کی ماں اچھا کہہ کر نجانے کیا سوچنے لگی۔ کوثر بتول کی طرف جھکی۔

''یہ تارہ کے عشق کا کیا بنا؟''

اماں کے دو ہتڑ اس کے کندھے پر پڑے۔ ''تجھے بہت چسکا ہے ایسی باتوں کا۔''

''لو اماں! میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔'' وہ کندھا سہلاتے ہوئے بڑبڑائی پھر اٹھ کر باہر نکل آئی۔

نین تارہ چارپائی پر بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ چولہے پر گوشت وہ پہلے ہی چڑھا آئی تھی۔ ایڑی کا زخم مندمل ہو گیا تھا' بخار بھی اتر گیا۔ وہ سارا دن گونگی بہری بنی گھر کے کاموں میں خود کو الجھائے رکھتی۔ کون آتا ہے کون جاتا ہے' لوگ کیا کہتے ہیں اسے کن نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اسے گویا کسی سے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ بس ایک روبوٹ کی طرح یہاں سے وہاں کام کرتی رہتی۔ اجمل آتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں خلوص اور لہجے میں نرمی و ہمدردی ہوتی۔ اس کا حال پوچھتا۔ وہ نظریں جھکا کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتی۔ جواب نہ دیتی۔ اسے اجمل کے ہمدردانہ رویے سے خوف آتا تھا۔ وہ ظہور کے سامنے حال پوچھتا اس کا پورا وجود کانپ اٹھتا۔

''کیا پکا رہی ہو؟'' کوثر دھپ سے اس کے قریب بیٹھی۔

"چاول اور مرغی کا سالن۔" نین تارہ نے آہستگی سے جواب دیا۔ ساتھ ہی سر اٹھا کر چولہے کی طرف دیکھا کہ کہیں آگ تو نہیں بجھ گئی۔ کوثر کچھ لمحے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اسے کہنی مار کر پوچھنے لگی۔

"سن' وہ کیسا تھا؟"

نین تارہ نے سر اٹھا کر تحیر سے اسے دیکھا۔ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھنے لگی۔ "کون؟"

"اب بھولی مت بنو۔ وہی جس سے ملنے جاتی تھیں۔"

اس کی آنکھوں میں منجمد تحیر کی اوٹ سے دکھ کی لہر سی ابھری اور وہ سر جھکا کر خاموشی سے چاول چننے لگی۔

"اچھا! یہ تو بتا۔ وہ سچ مچ تجھ سے پیار کرتا تھا؟" کوثر کے لہجے میں اشتیاق ہی اشتیاق تھا۔ نین تارہ کو لگا وہ کنکر زمین پر پھینکنے کے بجائے آنکھ میں ڈال بیٹھی ہے۔ اس نے دونوں آنکھیں بے دردی سے مسل ڈالیں۔

"کبھی کوئی تحفہ دیا اس نے تمہیں۔ سنا ہے پیسے والا ہے۔"

نین تارہ نے کان بند کر لیے۔

"اچھا ٹھیک ہے مت بتا پر اس نے کوئی سندیسہ تو ضرور بھجوایا ہو گا۔ کوئی کبوتر دیوار پر اترا کہ نہیں۔۔۔" وہ اسے کندھا مار کر خود ہی ہنس دی پھر جلدی سے بولی۔ "اللہ کی قسم' باجی سے نہیں کہوں گی۔ وہ کیا جانے پیار کیا ہوتا ہے؟ تو نے چوڑیاں فلم دیکھی ہے اس میں۔۔۔"

کوثر کی محبت کے بارے میں ساری معلومات پنجابی فلموں تک محدود تھی۔ نین تارہ نے سر اٹھا کر سنجیدہ نظروں سے کوثر کو دیکھا۔

"کوثر! اگر میں کہوں یہ سب جھوٹ ہے۔"

"لو' جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔" وہ منہ بنا کر بولی جیسے نین تارہ کا مکرنا اچھا نہیں لگا۔ نین تارہ خاموشی سے چاولوں کا برتن اٹھا کر نلکے کے پاس چلی آئی۔ اس کے پاس نہ وہ زبان تھی نہ لفظ جس پر لوگ اعتبار کرتے۔ وہ کچھ بھی کہتی کوثر اسے جھوٹ ہی سمجھتی۔

"توبہ ہے کتنے نخرے ہیں اس کے۔" کوثر زیر لب بڑبڑاتی چولہے کے پاس آ گئی۔ ڈھکن اٹھا کر چمچ ہلاتے ہوئے اس نے کلیجی نکال لی۔ نین تارہ چاول بھگو کر آئی تو وہ پھونکیں مار مار کر کلیجی ٹھنڈی کرتے ہوئے کھا رہی تھی۔ اس سے فارغ ہوتے ہی اسے پھر سے کچھ خیال آیا۔

"سن تارہ! وہ ڈاکٹر جو تیرا علاج کرنے آتا ہے کیسا ہے وہ۔۔۔؟"

"پتا نہیں۔۔۔" نین تارہ نے لکڑیاں کھینچ کر آگ بجھائی۔

"تو تم نے کبھی دیکھا نہیں۔۔۔" وہ چمک کر پوچھنے لگی۔

"نہیں۔۔۔"

کوثر نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر تنفر انداز میں بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئی۔

"توبہ ہے لوگ بھی کتنے پارسا بنتے ہیں۔"

نین تارہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ سارا دھواں گویا آنکھوں میں گھس آیا تھا۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"بھائی منظور ہو گا۔" کوثر درمیان سے پلٹی اور بنا پوچھے دروازہ کھول دیا مگر سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھ کر جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اجمل خود بھی اجنبی صورت دیکھ کر ذرا رک سا گیا۔

"باجی بتول ہیں۔"

"ج۔۔۔ جی ہیں۔"

"ان سے کہیں ڈاکٹر اجمل آیا ہے۔" اس نے تعارف کروایا تو کوثر بوکھلا کر ایک طرف ہوئی۔

"اندر آ جائیں جی! میں ان کی بہن ہوں۔" ساتھ ہی اپنا تعارف کروایا۔

"اچھا! خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اندر آ کر رسمی جملہ رسمی انداز میں کہتے ہوئے اجمل کی نگاہوں نے چولہے تک سفر کیا اور مسکرا دیں۔ کوثر شرما سی گئی۔

"میں باجی کو بتاتی ہوں۔۔۔" وہ اندر گھس گئی۔

"کیسی ہو نین تارہ!" اس سے بات کرتے ہوئے سارے خوبصورت جذبے لہجے میں چھلکنے لگتے تھے۔ نین تارہ نے چولہے میں جلتی دوسری لکڑی بھی باہر کھینچی اور پانی کا چھینٹا مار دیا۔ دھوئیں کا مرغولہ نیچے سے اوپر گیا اور اس کے چہرے کے تاثرات دھندلے ہو گئے۔

"میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟۔ مجھ سے کس بات کی خفگی؟۔" اس کے لہجے میں شکوہ سا اتر آیا' نین تارہ کی اتنی بے اعتنائی اور بے رخی اسے دکھ دیتی تھی۔

"بڑی لمبی عمر ہے اجمل تمہاری' ابھی میں اماں سے تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی۔" بتول تیز تیز بولتی ہوئی باہر نکلی۔

"آپ کی امی آئی ہیں۔۔۔؟" وہ قصداً مسکرایا۔

"ہاں اور بہن بھی' آؤ اندر ان سے ملواتی ہوں۔"

اجمل نے ایک شکوہ بھری نگاہ خاموش و بے نیاز سی نین تارہ پر ڈالی اور سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

رائے ہاؤس میں اس کا کمرہ بہت خوبصورتی سے سیٹ کیا گیا تھا مگر اسے اجنبیت کا احساس ہوتا۔ رات بھر وہ بے چین سی رہتی۔ عظمیٰ اور انعم آئی تھیں' تعزیت کے لیے۔ یونیورسٹی آنے کی تاکید کر گئی تھیں۔ مگر اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ ہر روز رات کو مما کو فون کرتی اور ان کی باتیں بس رائے عمیر کے گرد گھومتی تھیں۔ بھابھی کی باتیں' رضوان کی محبت اور سعد کی شرارتیں' کچھ بھی اچھی نہیں لگتیں۔ شیراز بھائی کی نجانے کون سی مصروفیات تھیں جو ختم ہونے میں نہ آتیں۔ اسے لگتا ایک پاپا کے جانے سے سب کچھ بدل گیا۔

اس دن ناشتے پر جب سلیمان اور شیراز بھائی بھی گاؤں سے آئے تھے تو انہوں نے اچانک بتایا۔

"سنڈے کو میری فلائٹ ہے۔" سب ٹھٹھک کر انہیں دیکھنے لگے جبکہ سلیمان بھائی نے بے حد اطمینان سے سر ہلا دیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔۔۔"

مگر زارا کے لیے یہ اچھی بات نہیں تھی۔ تب ہی گویا تصدیق کے لیے پوچھنے لگی۔

"آپ واپس جا رہے ہیں بھائی۔۔۔؟"

"ہاں! واپس تو جانا ہی تھا۔"

"لیکن یہاں۔" وہ کچھ حیرت سے رضوان اور بھابھی کو دیکھنے لگی۔ رضوان اس کی مشکل سمجھ گیا تھا۔

"ہمارا خیال تھا شیراز! تم اب واپس آنے کی بات کرو گے۔ یہاں تمہارا گھر ہے اور انکل کا اتنا بڑا بزنس' فیکٹری کون دیکھے گا۔ پھر زارا اور آنٹی کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔"

وہ زارا کی زبان بن گیا تھا۔ شیراز نے اطمینان سے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے۔ اور بولا۔

"میرا فی الحال یہاں آنا ممکن نہیں ہے رضوان! میرا کمپنی کے ساتھ تین سال کا کنٹریکٹ ہے پھر رابعہ کی بھی وہاں جاب ہے۔ پھر تم لوگ یہاں ہو نا مما اور زارا کے پاس۔ جہاں تک فیکٹری کی بات ہے تو تم اور زارا دیکھ لینا۔"

"میں نے ابھی اپنا بزنس اسٹارٹ کیا ہے۔ میرے پاس بالکل وقت نہیں۔ اور زارا۔۔۔" رضوان نے ایک نظر زارا پر ڈالی جو تحیر سے شیراز کو دیکھ رہی تھی۔ "بزنس زارا کی فیلڈ نہیں ہے۔"

"تم خوامخواہ بحث کر رہے ہو۔" سلیمان نے رضوان کو ٹوکا پھر شیراز کی طرف متوجہ ہوئے۔ "تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ یہاں سب معاملات ٹھیک ٹھاک چلتے رہیں گے۔"

زارا احتجاجاً اٹھ کر باہر آ گئی۔ شیراز نے سلیمان کی طرف دیکھا۔

"شاک میں ہے' ٹھیک ہو جائے گی۔" سلیمان بھائی اطمینان سے بولے پھر مسکرا کر رضوان کو دیکھا۔

"رضوان ہے نا! سنبھال لے گا اسے۔"

رضوان نے سنجیدہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔

"زارا کو اس وقت میری نہیں شیراز کی ضرورت ہے۔"

"آئمہ آنٹی کی عدت ختم ہو جائے ہم باقاعدہ رخصتی کرلیں گے۔ چند ماہ کی بات ہے۔ زارا کے ایگزامز کا چکر بھی ختم ہو جائے گا۔" سلیمان نے گویا رضوان کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

"تم اور چائے لو گے۔۔۔؟" بھابھی دانستہ ان کی باتوں میں دخل نہیں دیتی تھیں۔ اب بھی خاموشی سے ان کی گفتگو سنتی رہی تھیں۔ جب شیراز اور سلیمان اپنی باتوں میں مگن ہو گئے تو انہوں نے رضوان کی توجہ بٹانے کو پوچھا تھا۔

"نہیں، میں ناشتہ کر چکا ہوں۔" وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہوا تو سلیمان نے چونک کر اسے دیکھا اور رضوان سے کہنے لگا۔

"زارا کا خیال رکھو رضوان! وہ بالکل مرجھا گئی ہے۔ ہو سکے تو شام میں آؤٹنگ کے لیے لے جانا۔" رضوان نے ٹیبل سے چابی اور اپنا بریف کیس اٹھایا اور قدرے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"میں اپنی ذمہ داری اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

سلیمان بس اسے دیکھ کر رہ گئے۔ رضوان باہر آیا تو وہ لان میں ادھر سے ادھر چکرا رہی تھی۔ رضوان رک گیا۔ اپنے خیالوں میں گم وہ پلٹی مگر فوراً" رکنا پڑا تھا۔ رضوان ہنس دیا جبکہ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔ کچھ لمحے اس کی شرٹ کے بٹن کو گھورتی رہی پھر نظروں کا زاویہ بدل کر بولی۔

"تم نے دیکھا رضوان! شیراز بھائی کتنے بدل گئے ہیں۔ بالکل کوئی فکر نہیں ہے انہیں۔ پاپا نے اتنی محنت کی تھی مگر انہیں اپنی بیوی کی جاب اور اپنے کنٹریکٹ کی فکر ہے۔ کس قدر عجیب رویہ ہے انہیں تو یہ بھی فکر نہیں کہ مما کو ان کی کتنی ضرورت ہے۔ وہ کچھ دن اور نہیں رک سکتے تھے۔"

"زارا! ہمیں شیراز کو بھی تو انڈراسٹینڈ کرنا ہوگا۔ وہ تم لوگوں سے بے حد محبت کرتا ہے مگر حقیقت پسند بن کر سوچو۔ اس کے بھی کچھ پرابلم ہو سکتے ہیں پھر یہاں سب لوگ ہیں تمہارے پاس۔"

"پاپا کی ساری محنت برباد ہو جائے گی۔" وہ سر جھکا کر زیر لب بڑبڑائی۔

"زارا۔۔۔" رضوان نے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ "مجھ پر اعتبار ہے نا۔۔۔!"

وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بے اختیار بولی۔

"خود سے بھی زیادہ۔۔۔"

"بس پھر کوئی ٹینشن مت لو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں نا۔" اس کے تسلی آمیز محبت بھرے لہجے پر وہ پرسکون سی ہو گئی۔

"میں آفس جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔ کچھ منگوانا ہو تو بتاؤ۔"

"رضوان! اتنا وقت ضائع مت کریں۔"

"میں ہر کسی کے لیے ایسا نہیں کرتا۔۔۔" وہ اس کی طرف ذرا سا جھک کر گویا ہوا پھر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

"کب سے کھڑی ہوں کہ ہیرو صاحب کے ڈائیلاگ ختم ہوں۔" بھابھی مسکراتی ہوئی سامنے آئیں زارا جھینپ سی گئی۔

"سلیمان اور شیراز گاؤں جا رہے ہیں آنٹی کے لیے کچھ بھجوانا تو نہیں؟"

"ہاں میں نے بیگ تیار کر دیا تھا۔ میرے کمرے میں ہے۔۔۔" پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

"بھابھی! میں بھی ساتھ نہ چلی جاؤں۔۔۔"

"ابھی تو آئی ہو۔ کل سے یونیورسٹی جانا شروع کر دو، تمہاری اسٹڈیز کا حرج ہو رہا ہے اور فائنل ایگزام کتنے نزدیک ہیں۔ ویک اینڈ پر چلی جانا۔" انہوں نے پیار سے سمجھایا تو وہ خاموش ہو گئی۔ بیگ شیراز بھائی کو دیا تو وہ اسے ساتھ لگاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"خفا تو نہیں ہو۔۔؟"

"خفگی کیسی، آپ کی اپنی زندگی ہے جیسا بھی مناسب سمجھیں۔" وہ سنجیدگی و متانت سے گویا ہوئی۔ شاید سمجھ گئی تھی کہ وہ انہیں روک نہیں سکتی۔

"اگلی بار تمہاری بھابھی اور بھتیجے کو بھی لاؤں گا۔" انہوں نے گویا بہلایا تھا۔ وہ بھی یونہی مسکرا دی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"تم گاؤں گئے اور زارا سے نہیں ملے۔ تعزیت بھی نہیں کی۔۔۔" افتخار نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

"بہت دیر تک حویلی کے سامنے کھڑا رہا مگر اندر نہیں جا سکا۔" زین ناخن سے میز پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

"ڈر گئے تھے۔۔۔" افتخار نے گہری نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس نے انگلیاں اپنے بالوں میں الجھا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ افتخار منتظر رہا مگر اس نے کوئی اور وجہ بھی نہیں بتائی۔ وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کے تاثرات سمجھنے میں ناکام رہا تو بات بدل دی۔

"تم نے اپنا گاؤں دیکھا۔۔۔"

"اپنا گاؤں۔۔۔" زین نے زیر لب دہرایا پھر سر اوپر کرتے ہوئے طویل سانس بھری۔ "وہ گاؤں میرا تھا مگر میں اس کے لیے اور وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا اور اس گاؤں کی فضا، اس کے لوگ، اس کے کھیت کھلیان سب مجھے اجنبی نظروں سے گھور رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں ان ہی کا ایک گمشدہ حصہ ہوں۔ سب مجھ سے پوچھتے تھے میں کون ہوں۔؟"

اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکایا۔ نگاہوں کی زد میں چھت پر بنا مکڑی کا جالا تھا اور لہجے میں دل گرفتگی۔

"میں جواب کیا دیتا۔ میری شناخت تو وہیں کسی دیوار کے سائے، درخت کی کھوہ، کھیت کے کنارے یا نہر کے پانیوں میں گم ہوئی تھی۔ مگر لوگ۔۔۔ یہ لوگ صرف سنی سنائی پر یقین کیوں کرتے ہیں۔؟"

افتخار خاموش ہی رہا۔ اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ "بدگمانی تھی ان کے لہجوں میں اور تنفر تھا ان کے چہروں پر۔ میں جانتا ہوں۔ بابا ہمیشہ گاؤں اور زمینوں سے دور رہے۔ انہیں نئی دنیا دریافت کرنے کا شوق تھا مگر کوئی تو کہتا۔۔۔"

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ "میں اتنے بہت سے لوگوں سے ملا مگر کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ ضروری نہیں قتل جمشید حیات نے کیا ہو۔ حقیقت کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔"

"ایک بات کہوں تم سے زین۔۔۔" افتخار کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ زین نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔

"ضروری تو نہیں کہ تمہارے بابا نے تم سے سچ ہی بولا ہو۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"ہو سکتا ہے وہ تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف نہ کر سکتے ہوں مگر اشتعال میں آ کر یا۔۔۔" زین کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میں نے ایک دفعہ ایسی ہی بات بابا سے کہی تھی۔" بہت دیر خاموش رہنے کے بعد زین آہستگی سے گویا ہوا۔

"تو۔۔۔"

"وہ ایک دم خاموش ہو گئے تھے اور افتخار بھائی! سچ وقتی طور پر خاموش ہو سکتا ہے مگر جھوٹ کبھی خاموش نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ چیختا ہے شور کرتا ہے اور خود کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

"ہوں۔۔۔!" افتخار کچھ سوچنے لگا۔ "تمہارے بابا نے تمہیں کبھی اس بارے میں کچھ تو بتایا ہوگا۔"

"وہ تو یہ چیپٹر ہمیشہ کے لیے کلوز کر چکے تھے۔ میں لاہور آنے کی ضد نہ کرتا، یونیورسٹی میں مجھے زارا نہ ملتی تو شاید ہم ایک مختلف زندگی گزار رہے ہوتے۔ بہرحال میں پھر وہاں جاؤں گا۔ کبھی نہ کبھی کچھ تو سرا ہاتھ آئے گا ہی۔"

"ہاں ایگزام دے لو۔ تب تک زارا بھی وہاں چلی جائے گی۔"

"زارا کیا کرے گی۔" زین نے حیرت سے پوچھا افتخار مسکرا دیا۔

"جاگیرداروں کی حویلیاں بہت اونچی ہوتی ہیں۔ اندر کے راز اندر ہی دفن ہو جاتے ہیں۔ زارا تمہاری

اتنی سی مدد تو کرے گی۔"
"ہاں یقیناً"۔۔۔" وہ مسکرا دیا۔ "نہ صرف وہ بلکہ۔۔۔"
"اب تم لوگ باتیں ہی کرتے رہو گے۔ گھنٹہ بھر پہلے باسط کو بھجوایا تھا کہ دسترخوان بچھ گیا ہے۔" فاطمہ آپا جھنجلائی ہوئی اندر آئی تھیں۔
"پکا کیا ہے۔۔۔؟" افتخار نے پوچھا۔
"شعلہ۔۔۔"
"شعلہ۔۔۔ یہ کیا بلا ہے۔۔۔؟" زین نے بے حد حیرت سے پوچھا۔
"آج شعلہ کھلا رہی ہیں، کل کو انگارے چبوائیں گی۔۔۔" افتخار ہنس دیا۔ فاطمہ آپا نے اسے گھور کر دیکھا۔
"تمہیں تو اچھی طرح پتا چلے گا جب۔۔۔"
"جب۔۔۔" افتخار کا لہجہ متبسم و شریر ہوا تو وہ جھینپ کر زین کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"بہت مزے کی ڈش ہے۔ جلدی آجاؤ۔ ٹھنڈی ہو گئی تو مزا نہیں دے گی۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئیں۔
"چل یار! ان کا شعلہ بھی چکھ لیں۔" افتخار نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔
"میرا خیال ہے فرنیچر والے کو ایک کندھے کا بھی آرڈر دے دیں۔" زین نے کندھا سہلاتے ہوئے کہا۔
"یار! کچھ کھایا کرو تھوڑی جان شان بناؤ۔ تم تو ایک گلاس لسی بھی نہیں پی سکتے پڑا ڈال کر۔"
"لسی سے مجھے یاد آیا۔ آپ تو کہتے تھے عظمیٰ لوگ آپ کے رشتے دار ہیں۔" زین نے ایک دم پوچھا۔
"لسی اور عظمیٰ میں کیا مماثلت ہے۔" افتخار کے لہجے میں لطیف سی حیرت تھی۔
"میرا سوال مت ٹالیں۔"
"یار! دور پرے کی رشتہ داری ہے۔۔۔" افتخار نے پھر ٹالنا چاہا۔
"مجھے باقاعدہ ان کا تعارف کروانا پڑا۔۔۔"
"زیادہ آنا جانا نہیں ہے۔" وہ اب بھی گریزاں تھا۔
"آپ نہیں بتانا چاہتے تو مت بتائیں ورنہ وہاں ہونے والی گفتگو سے بہت کچھ سمجھ میں آگیا تھا۔ میں تو حیران ہوں آپ نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔۔۔" حالانکہ اسے یہ سوال افتخار جیسے بندے سے نہیں کرنا چاہیے تھا۔
"تم بھی مت کرنا۔ میں عظمیٰ کی عزت پہلے کرتا ہوں۔" افتخار کے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔
"میں تو نہیں کروں گا مگر بے بے جس طرح عظمیٰ پر فدا ہو رہی تھیں۔ مجھے یقین ہے وہ جلد ہی یہ ذکر ضرور کریں گی۔"
"ان کی بات اور ہے آؤ چلیں۔ ورنہ آپا خفا ہوں گی۔۔۔"

♥ ♡ ♡ ♥

"تم یہ سب اب کہہ رہے ہو زین۔۔۔"
زارا نے تاسف و دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ رخ بدل کر درخت کی ٹہنی توڑنے لگا۔
"اور میں نے سوچا تھا کہ تم۔۔۔"
"میں آیا تھا۔۔۔" اس نے آہستگی سے بات قطع کی۔
"کہاں۔۔۔؟"
"گاؤں۔۔۔"
"تم گاؤں آئے تھے۔" زارا نے حیرت سے پوچھا پھر اس کے سامنے آئی۔ "کب۔۔۔؟"
"میں انکل کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔"
"تم آئے اور مما سے نہیں ملے۔۔۔"
"کس حیثیت سے ملتا۔" اس نے الٹا سوال کیا پھر ہاتھ میں پکڑی ٹہنی چھوڑ دی۔ وہ ایک دم اوپر کو اٹھی اور لرزنے لگی تو وہ اسے دیکھتے ہوئے آہستگی سے گویا ہوا۔
"میں تو پل پل آپ کے اور پھپھو کے ساتھ تھا۔ میں نے آپ کی آواز سنی تھی، پھپھو کے آنسو پونچھے تھے، آپ لوگوں کے ساتھ مل کر رویا تھا مگر ان بہت سے لوگوں میں بیٹھ کر اجنبی اور رسمی انداز میں یہ کہنا کہ مجھے واقعی بہت افسوس اور دکھ ہے۔ خدا مرحوم کو جنت میں جگہ دے میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرا بھی تو آپ سے وہی رشتہ ہے جو ان لوگوں کا۔"

"ہاں۔۔۔!" زارا اس کی کیفیت سمجھ گئی تھی تب ہی خاموش ہو گئی۔
"پھپھو کیسی ہیں۔۔۔؟" زین نے آہستگی سے پوچھا۔
"بس ٹھیک ہیں۔۔۔"
"واپس کب آئیں گی۔۔۔؟"
"عدت گزار کر۔۔۔" زارا نے بتایا تو وہ بے اختیار بولا۔
"اتنے دن۔ اتنے دن میں ان سے مل نہیں سکوں گا۔۔۔" اسے ایک دم خالی پن کا احساس ہوا۔ پھپھو سے مل کر ان کی محبتیں پا کر وہ سرشار ہو جاتا تھا اور کہتا تھا۔
"جب سے میں پھپھو سے ملا ہوں مجھے کبھی لگا ہی نہیں کہ میں نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔
"پتا ہے زین! اس سے قبل میں نے کبھی تمہارے اس دکھ کو محسوس نہیں کیا جو تم نے بابا کو کھو کر اٹھایا۔ ہاں۔۔۔ اس کی شدت میں اب محسوس کر سکتی ہوں۔ اتنا خالی پن۔۔۔ جیسے سب ختم ہو گیا ہو۔ جیسے کچھ بھی اپنے ٹھکانے پر نہیں۔۔۔ پھر پاپا نے تو بہت جلدی کی۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
"صبر آجاتا ہے زارا! دکھ بھولتے نہیں مگر ان کے ساتھ جینا آجاتا ہے۔" زین کو خود اپنے الفاظ پر حیرت سی ہوئی جبکہ زارا خاموشی سے آنسو صاف کرنے لگی۔ وہ بہت دنوں کے بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ پروفیسرز، کلاس فیلوز سب نے تعزیت کی تھی پھر زین آیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دوبارہ انعم اور عظمیٰ کے پاس آگئی۔
"کیا ڈسکس ہو رہا ہے۔" وہ قصداً مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔ اپنا دکھ اپنا ہی ہوتا ہے۔ لوگ زیادہ دیر آپ کے ساتھ اداس شکلیں بنا کر نہیں بیٹھ سکتے۔
"یار! فیئر ویل پارٹی ہے، ایول ڈنر بھی آرہا ہے اور کوئی ڈھنگ کا سوٹ نہیں ہے۔" انعم منہ بنا کر بولی۔
"خیر، تم تو ایسا مت کہو۔ ابھی تو اتنے سوٹ آئے ہیں۔" عظمیٰ نے ٹوکا۔
"منگنی کا پہن کر آجاؤں۔"
"پہن سکتی ہو کیونکہ تم پر لوگوں کو کوئی حیرت نہیں ہوگی۔" عظمیٰ نے عینک ٹھیک کرتے ہوئے کہا پھر زارا سے پوچھنے لگی۔
"تم آؤ گی نا؟۔"
"دیکھوں گی۔"
"ہائے نہیں زارا۔۔۔!" انعم فوراً چیخ اٹھی۔ "تم ضرور آؤ گی۔ آخری فنکشن ہے۔ پھر کہاں ہم اس طرح روز مل سکیں گے اور کون جانے ہم میں سے کون کہاں ہو گا آؤ گی نا۔" وہ اصرار بھرے لہجے میں کہنے لگی۔
"اچھا بھئی آجاؤں گی۔" زارا کو کہنا ہی پڑا۔ "تم یہ بتاؤ۔ دانیال کا بھی فون آیا۔۔۔"
"کہاں یار! انتہائی بور بندہ ہے۔ البتہ خالہ ہر اتوار کو فون کرتی ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی تو عظمیٰ ہنس دی۔
"اچھا ہے نا! ساس کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے گی اور میرے خیال میں دانیال بور نہیں شریف انسان ہیں۔"
"شریف انسان۔۔۔" زارا زیر لب مسکرائی۔
"کیا ہوا۔۔۔؟" عظمیٰ نے پوچھا۔
"تمہاری امی بھی مجھ سے افتخار کے بارے میں یہی پوچھ رہی تھیں کہ وہ شریف تو ہے۔"
"کب۔۔۔؟" عظمیٰ بری طرح چونکی۔
"انعم کی منگنی کے روز۔۔۔"
"یہی سب کچھ انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا ہے۔ لگتا تھا انہیں مجھ پر اعتبار نہیں آیا۔ ویسے یہ افتخار بہت چالاک اور زیرک ہے پتا ہے زارا۔۔۔"
عظمیٰ کو پتا تھا انعم اب زارا کو کیا قصہ سنانے والی ہے۔ وہ اٹھنے لگی تو انعم نے کھینچ کر بٹھا لیا۔
"مت اتنا بھاگو۔ تمہیں ہارنا ہی ہے عظمیٰ بی بی! وہ

شخص تمہیں جیت لے گا۔ اسی طرح تمہیں حاصل کرے گا جیسے تم چاہتی ہو۔ مجھے آثار نظر آرہے ہیں۔"

وہ اس کا بازو قابو کیے زارا کو بے بے کی آمد کا قصہ سنانے لگی۔ اس کا انداز بیاں اتنا شوخ و شریر تھا کہ عظمٰی کے لبوں پر بھی مدھم سی مسکان جاگ اٹھی۔

"تم جاؤ گی شادی میں ــــ؟" زارا نے انعم کے خاموش ہونے پر عظمٰی سے پوچھا۔

"نہیں یار!" وہ گھبرا کر بولی۔

"میں تو جاؤں گی اور اس کی امی کو بھی لے کر جاؤں گی۔ آخر ہم نے بھی ان کا گھر بار اور رہن سہن دیکھنا ہے۔ یونہی تو عظمٰی کو دھکا نہیں دے سکتے۔"

"تم نہیں مگر میں تو دے سکتی ہوں۔" عظمٰی نے اسے دھکیل کر اپنا بازو چھڑایا تھا۔ وہ ایک طرف کو لڑھک گئی۔ پھر منہ بنا کر بولی۔

"نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے ــــ"

"تم ساری نیکیاں میرے ساتھ مت کیا کرو ــــ" عظمٰی دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

کبھی دن نہیں، کبھی شب نہیں
کبھی لفظ گم، کبھی لب نہیں
کبھی بات کرنے کا ڈھب نہیں
کبھی تب نہیں، کبھی اب نہیں
یونہی چل رہے ہیں قطار میں
کبھی بے زبانی کی مار میں
کبھی بد نصیبی کی جیت میں
کبھی خوش نصیبی کی ہار میں

آج یونہی اس کی انگلیاں اپنی کتابوں کو چھوتے چھوتے اس ڈائری پر رک گئی تھیں۔ اس ڈائری کے اوراق پر اس کی اٹھارہ سالہ زندگی بکھری تھی۔ جس کا ہر دن سلگتا ہوا اور ہر رات انگارہ تھی۔ اس کے آخری صفحات خالی تھے اور اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان پر اپنے آنسوؤں سے بد نصیبی کی داستان رقم کرسکے۔

اس کی انگلیوں نے بڑی حسرت سے کتابوں کے وجود کو محسوس کیا۔ ان پر جمی گرد انگلیوں سے لپٹ گئی۔ تارہ نے اپنے دوپٹے سے ساری کتابوں کو ایک ایک کرکے صاف کیا۔ کتابوں کے ٹائٹل جگمگانے لگے اور اس کے دل میں انہیں کھولنے کی خواہش نے پھر سے قدم رکھا۔ مگر اس نے آہستگی سے الماری بند کردی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ انہیں کھولنے کی اجازت اسے کبھی نہیں ملے گی۔

"تارہ۔ او تارہ!" باہر بتول اسے متواتر آوازیں دے رہی تھی۔ وہ آنکھوں میں اترے غبار کو دل میں اتار کر باہر نکل آئی۔

"ایک گھنٹے سے آوازیں دے رہی ہوں۔ بہری ہو گئی ہے کیا؟۔"

تارہ نے ان کے سامنے کبھی بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"ہم لوگ جارہے ہیں، ظہور گھر پر ہی ہے۔ ابھی جائے گا تو دروازہ بند کرلینا اور دودھ والا آئے گا۔ ایک کلو زیادہ دودھ لے لینا۔ آج اماں کے لیے کھیر بنانی ہے۔"

اس کی ماں اور بہن کئی دنوں سے یونہی ڈیرے ڈالے بیٹھی تھیں۔ اجمل کو گھیرنے کے منصوبے بناتی رہتیں۔ وہ تینوں چلی گئیں۔ تو وہ صحن کے کونے میں آبیٹھی۔

"زندگی نے کیا کیا میرے ساتھ ــــ؟" بہت بار سوچی گئی بات کو اس نے پھر بے حد حیرت و بے یقینی سے سوچا تھا۔ زندگی کبھی بھی اس کے لیے سہل نہیں رہی تھی مگر وہ پھر بھی خوش گماں تھی۔ وہ بہت سا پڑھے گی اور یہ تعلیم اسے کسی نہ کسی منزل تک ضرور پہنچا دے گی۔

درخت پر چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ ظہور باہر نکلا اسے یوں بیٹھے دیکھ کر رک گیا۔

"تمہیں کچھ چاہیے تارہ؟" وہ کبھی کبھی یونہی پوچھ لیتا تھا۔ تارہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر گردن جھکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ اب ان لوگوں سے کیا چاہ سکتی تھی۔

ظہور باہر نکل گیا۔ چڑیاں کچھ اور شور کر رہی تھیں۔ تارہ نے اٹھ کر چنگیر سے روٹی کا ٹکڑا اٹھایا پھر وہیں آکر بیٹھ گئی۔

"اور اب ــــ اب کیا ہوگا ــــ کیا زندگی اسی طرح گزرے گی؟۔" روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ "یا کوئی مسیحا آئے گا ان سارے زخموں کا مداوا کرنے ــــ"

اس نے ٹکڑے ڈالے، پھر سے دو چڑیاں درخت سے اتریں ــــ پھر تیسری ــــ چوتھی ــــ پوری گیارہ چڑیا تھیں۔ آنگن میں ادھر سے ادھر پھدکتی روٹی چگنے لگیں۔ پھر دیوار سے ایک لنگڑا کوا اترا ساری چڑیاں پھر سے اڑیں اور شاخوں میں جا چھپیں۔ کوا سیاہ چونچ اٹھائے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تارہ نے ایک بڑا ٹکڑا اچھالا۔ کوے نے ذرا سا اچھل کر اسے فضا میں ہی چونچ میں دبایا اور دیوار پر جا بیٹھا۔ بہت عرصے کے بعد تارہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اتری۔ بہت دیر تک وہ وہیں بیٹھی کوے اور چڑیوں کو روٹی ڈالتی رہی۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"دودھ والا آگیا ــــ" تارہ نے روٹی کا آخری ٹکڑا کوے کو ڈالا اور دھلی ہوئی پتیلی اٹھا کر دروازے تک آئی۔ دروازے کو ذرا سا کھول کر جھانکا پھر اجمل کو دیکھ کر تیزی سے پیچھے ہٹی۔

"بھابھی گھر پر نہیں ہیں ــــ؟"

"ظہور بھائی ــــ؟"

"نہیں ہیں ــــ" وہ کہہ کر واپس آگئی۔ اجمل نے کچھ لمحے سوچا پھر دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ پتیلی رکھتے ہوئے وہ پلٹی پھر خوف سے وہیں جم گئی۔

"کیا ہوا؟۔ تم مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو ــــ" وہ نرم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"تم ــــ تم اندر کیوں آئے؟ بھابھی گھر پر نہیں ہیں۔" اس کا لہجہ کپکپا رہا تھا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے تارہ ــــ!"

"مجھے نہیں کرنی، جاؤ یہاں سے ــــ" وہ دبے لہجے میں چیخی۔

"تارہ ــــ میں ــــ" وہ دو قدم آگے بڑھا۔ تارہ الٹے قدموں پیچھے ہٹی۔ پھر بھاگ کر کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرلیا۔ اجمل ششدر رہ گیا پھر کھلی کھڑکی کی طرف آگیا۔

"نین تارہ! ایک بار میری بات تو سنو ــــ"

نین تارہ نے کھڑکی بھی بند کرنا چاہی۔ مگر اس نے اس کی کلائی دبوچ لی۔

"کیوں کر رہی ہو تم اس طرح ــــ؟" وہ سخت جھنجلا گیا تھا۔ "کیا ہوں میں کوئی غنڈہ، بدمعاش کیا ہر لڑکی کے پیچھے میں یونہی خوار ہوتا ہوں۔ کیوں ڈرتی ہو تم اتنا؟۔"

"چھوڑو ــــ" نین تارہ کو لگا اس کی گرفت کلائی پر نہیں گلے پر ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا، سانس کہیں سینے میں اٹکنے لگی تھی۔

"مجھے سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ کیوں آتا ہوں میں بار بار یہاں، صرف تمہارے لیے۔" اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ "میں جانتا ہوں تم ایک جہنم میں زندگی گزار رہی ہو۔ میں تمہیں نکال لے جاؤں گا۔ شادی کروں گا تم سے ــــ"

نین تارہ ششدر سی رہ گئی۔ اجمل نے اس کی دم توڑتی مزاحمت کو دیکھا تو آہستگی سے کلائی چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہوا۔

"ہاں نین تارہ۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے امی، ابو سے بھی بات کرلی ہے۔ وہ بہت جلد آئیں گے۔"

نین تارہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کھڑکی بند کرنا چاہی۔ اجمل نے کھڑکی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اپنی ذات کی ساری کھڑکیاں بھی بند کردو گی، میں تب بھی تم تک پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے آہستگی سے کہا۔ اس کے بے یقین چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا جبکہ نین تارہ جہاں کھڑی تھی۔ وہیں ساکت ہوگئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

اجمل! کسی دن اپنا گھر تو دکھاؤ۔" بتول نے اشتیاق سے فرمائش کی۔

"باجی! آپ کا اپنا گھر ہے جس دن مرضی آجائیں۔"

"اس طرح نہیں آؤں گی۔"

"تو۔۔۔؟"

"لو۔ بن بلائے منہ اٹھائے چلی آؤں۔ بلاؤ گے تو تب آؤں گی۔"

اجمل ہنس دیا۔

"میری طرف سے تو آپ کل کی دعوت قبول کریں۔ امی اور کوثر کو بھی لے آئیے گا۔ دوپہر کا کھانا اکٹھے کھالیں گے۔"

"کھانے کا تکلف مت کرو۔ میں تو بس تمہاری امی سے ملنا چاہ رہی تھی۔ بہت ہی نیک خاتون لگتی ہیں۔"

"یہ اندازہ آپ کو کیسے ہوا۔۔۔؟"

"تمہیں دیکھ کر۔۔۔" بتول برجستہ بولی تو وہ ہنس دیا پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

"امی تو خود آپ لوگوں سے ملنا چاہ رہی تھیں۔"

"اچھا۔۔۔" بتول مزید سیدھی ہو بیٹھی۔ اماں تو اس سے پہلے کہہ چکی تھیں۔ لڑکا انہیں بہت پسند ہے' بس کسی طرح قابو کرلو' کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

"تو لے آؤ نا انہیں گھر۔ اماں بھی مل لیں گی۔ دو دن کے بعد تو وہ ویسے بھی جارہی ہیں۔" بتول نے جلدی سے کہا۔

"جی میں پرسوں لاؤں گا۔ شاید امی' ابو دونوں ہی آئیں۔" اس نے بند کمرے کے دروازے کو دیکھا۔ نین تارہ اب تک کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ پھر پوچھنا تو نین تارہ کا تھا مگر جھجکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کوثر کہاں ہے۔۔۔؟"

"اوپر' اوپر ہوگی۔" وہ اپنی بے پایاں خوشی پر قابو پاتے ہوئے کوثر کو آوازیں دینے لگی۔

"کیا ہے باجی؟ خالہ اتنے مزے کا قصہ سنا رہی تھی۔" کوثر نے جھنجلاتے ہوئے دیوار سے جھانکا۔ تب ہی اجمل پر نگاہ گئی۔ تو چہرے کا رنگ اور آنکھوں کے انداز بدل گئے۔ تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آئی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہیے۔" کوثر کو دیکھ کر وہ یونہی مسکرا دیتا۔ عجیب لطیفہ سی لڑکی تھی۔ اس سے فری ہونے کی کوشش بھی کرتی اور پھر شرماتی بھی تھی۔

"لو! آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے میرے ابا جی ہوں۔۔۔" کوثر کھلکھلائی۔ بتول نے اسے گھورا۔

"نین تارہ سے کہو۔ چائے بنادے۔"

"میں اپنے ہاتھوں سے بناتی ہوں۔" اس نے اپنی خدمات پھر پیش کیں۔

"چائے ہاتھوں سے ہی بنتی ہے' پاؤں سے نہیں۔"

کوثر پھر کھلکھلائی۔

"آپ تو بہت مذاق کرتے ہیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔"

"ارے نہیں۔" اجمل فوراً بول اٹھا۔ "ایک بار تمہاری بنائی چائے پی تھی' کمال ہے تم بس ہو باجی کی اور تمہیں ابھی تک چائے بنانی نہیں آئی۔"

اجمل اس پر ٹھیک ٹھاک اعتراض کر جاتا تھا مگر بتول کو اس کی پیار بھری ادا لگتی۔

"سکھا دوں گی۔ اب تو سکھانا پڑے گا سب کچھ۔۔۔" بتول نے پیار سے کوثر کو دیکھا۔ پھر تارہ کو آوازیں دینے لگی۔

"یہ تارہ کیا سارا دن اندر گھسی رہتی ہے۔ اس سے تھوڑا کام وام کروایا کریں۔ اب تو ٹھیک ہے نا۔" وہ اب تک باہر نہیں آئی تھی۔ اجمل جھنجلا کر بولا تھا۔

"سچ بات ہے بھائی میرے۔ سوتیلے کا نام برا۔ میں اچھا بھی کہوں گی تو بری ہی بنوں گی۔ میں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ خود کا دل ہو تو کرتی ہے۔" بتول نے کہا اور اتنے سفید جھوٹ پر اجمل بے اختیار کان کھجانے لگا۔

مگر منہ سے یہی بولا تھا۔

"اب آپ جیسی عقل مند خاتون اور کہاں ہوسکتی ہیں۔ تھوڑی عقل اس کو بھی دے دیں۔" اس نے پاس بلکہ سر پر کھڑی کوثر کی طرف اشارہ کیا۔

"تو میں کوئی بے عقل ہوں۔۔۔" وہ لڑنے لگی۔

بتول نے درمیان میں دخل نہیں دیا اور مسکرا کر نین تارہ کو آوازیں دینے لگی۔ وہ آنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کی متواتر آوازوں پر آنا پڑا۔ بنا ان پر نگاہ ڈالے سیدھا چولہے کی طرف آگئی۔ اجمل مسکرا دیا۔ آنے کا مقصد ہی اب پورا ہوا تھا۔ تب ہی سر پر کھڑی کوثر کو ٹالا۔

"جاؤ جا کر چائے بنانا سیکھو۔۔۔"

"لو' ابھی سے کیسے رعب جماتا ہے۔۔۔" وہ دل ہی دل میں پاؤں پٹختی تارہ کے پاس آگئی۔

"پتا نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو' جیسے مجھے چائے بنانا نہیں آتی۔ ہونہہ۔۔۔ پتا نہیں کس بات پر اتراتا ہے۔" اس کے پاس بیٹھی بڑبڑاتی رہی۔ پھر چپ کر گئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ وہ بتول سے باتیں کر رہا تھا۔ گندمی رنگت' کھڑی ناک' روشن پیشانی پر بکھرے بال' گہری سیاہ آنکھیں بے حد روشن تھیں۔ ایک دم اس کا دل اپنی لے بدل گیا۔

"ویسے ہے اچھا۔ ہے نا تارہ۔۔۔؟" اس نے نظروں کا زاویہ بدلے بغیر اس سے تصدیق چاہی۔

"پتا نہیں۔۔۔" نین تارہ کے پاس وہی جواب تھا کوثر جھنجلا گئی۔

"ہاں۔ تمہیں اپنے اس کے سوا کسی بات کا نہیں پتا۔"

نین تارہ نے گھبرا کر اجمل کو دیکھا۔ وہ اسی کی سمت دیکھ رہا تھا' تارہ کے یوں دیکھنے پر وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔ تارہ نے گھبرا کر رخ بدل لیا۔ چائے بنا کر وہ فوراً' کمرے میں جا گھسی تھی۔ اجمل نے بھی چائے ختم کرنے میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔

رات کو بتول نے ظہور کو کھانا دیا تو پاس ہی بیٹھ گئی۔

"اجمل کے ماں باپ آرہے ہیں پرسوں۔۔۔"

"کیوں۔۔۔؟" ظہور چونکا۔

"اپنی کوثر کے لیے۔" بتول بہت خوش تھی۔

"اچھا۔۔۔" ظہور نجانے کیوں چپ سا ہوگیا۔ سر اٹھا کر برتن دھوتی نین تارہ کو دیکھنے لگا۔

"تم کس سوچ میں ڈوب گئے؟۔"

"کچھ نہیں۔" اب کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا' خاموشی سے روٹی کھانے لگا۔

"تمہیں پسند نہیں اجمل!" بتول اس کی خاموشی سے خائف سی ہوگئی۔

"نہیں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ کوثر سکھی رہے گی۔"

"ہاں یہی تو میں کہہ رہی ہوں اور تم سے مشورہ کیے بغیر تو اماں کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔ تم کوثر کے باپ اور بھائی دونوں کی جگہ ہو۔"

نہ جانے کیوں ظہور کی بھوک اڑ سی گئی۔ اندر کہیں کچوکا سا لگا تھا۔ اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"بس۔۔۔" بتول نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ظہور کے انداز عجیب سے تھے۔

"ہاں سالن میں مرچیں کچھ تیز ہیں۔" اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگالیا۔

"تارہ! اٹھ اپنے بھائی کے لیے میٹھا انڈا بنالا۔ دیسی گھی میں۔۔۔" بتول نے پکار کر کہا۔ تارہ اٹھنے لگی تو ظہور نے روک دیا۔

"نہیں۔ میں کھا چکا ہوں۔"

"تو پرسوں تم ذرا جلدی آجانا۔" بتول نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں آجاؤں گا۔ اللہ مبارک کرے۔"

وہ اٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ پھر باہر جاتے ہوئے یونہی تارہ کے پاس رک گیا۔

"کچھ چاہیے تو نہیں تارہ۔۔۔"

تارہ نے سر اٹھا کر بے حد حیرت سے بھائی کو دیکھا۔ تو وہ بنا جواب لیے تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ وہ برتن ہاتھ میں لیے سوچتی ہی رہ گئی۔

"ان کو کیا ہوا ہے۔۔۔؟"

(باقی آئندہ)

کا بیٹا ہے جس پر اس کے تایا کے قتل کا الزام تھا۔ زارا کی ماں کو اپنے بھائی کی موت کا علم ہوتا ہے تو وہ غم سے نڈھال ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ اپنے بھائی کو بے قصور سمجھتی ہیں۔ زارا اور اس کی ممانی زین سے ملنے لگتی ہیں۔ مگر وہ ساتھ ہی رائے سلیمان سے خوف زدہ ہیں۔ سلیمان ہی نے رائے جشید حیات پر اپنے باپ کے قتل کا الزام لگایا تھا اور ہر حالت میں اس سے بدلہ لینے کا عہد کیا تھا۔ اس کے برعکس رضوان سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک انسان ہے اور ان تمام معاملات سے دور بیرون ملک تعلیم کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اس کے لوٹ آنے پر ان کی رخصتی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔
نین تارا ایک مظلوم لڑکی ہے۔ جس کا سگا رشتہ صرف ایک ماما مقبول ہے۔ ایک روز نین تارا کے پیر پر کانچ سے زخم آ جاتا ہے تو زین اس کے پیر کی مرہم پٹی کر دیتا ہے جس پر اس کے سوتیلے بھائی بھابھی اس پر الزام لگا کر اسے زدوکوب کرتے ہیں اور زین کو بھی ڈراتے دھمکاتے ہیں اور بالآخر نین تارا پر ظلم و ستم کر کے اپنا مقصد یعنی مکان کی منتقلی کے کاغذات پر دستخط کروا لیتے ہیں۔ ایک خدا ترس ڈاکٹر اجمل اس کا مفت علاج کر رہا ہے۔
زارا، عظمیٰ اور انعم کلاس فیلو ہیں۔ انعم کی اپنے خالہ زاد سے نسبت طے پائی ہے۔ جب کہ عظمیٰ کو افتخار بے حد پسند کرتا ہے لیکن عظمیٰ اپنی خاندانی پابندیوں کی وجہ سے اس کے التفات کا جواب انتہائی رکھائی سے دیتی ہے۔

ساتویں قسط

مگر وہ نہیں جانتی تھی۔ انسان اس زمین پر خدا بننے کی کوشش تو کرتا ہے۔ مگر ضمیر کی چبھن زیادہ دن اسے سکون سے سونے نہیں دیتی۔

♥ ♥

سارے گھر کی صفائیاں بہت تفصیل سے ہو رہی تھیں۔ کمروں سے دریاں نکال کر جھاڑی گئی تھیں۔ تکیے، غلاف، چادریں سب دھو دھا استری کر کے دوبارہ چڑھائے گئے تھے۔ کمرے، صحن سب دھو ڈالے تھے۔ فرنیچر رگڑ رگڑ کر چمکایا گیا تھا۔ مقامِ حیرت کہ بتول اور کوثر بھی اس کی مدد کر رہی تھیں اور ان کی ماں پلنگ پر بیٹھی ہدایات جاری کر رہی تھی اور سب سے زیادہ نین تارہ پر ہی برس رہی تھی پھر کوثر تو سب چھوڑ چھاڑ منہ پر بیسن لگا کر بیٹھ گئی۔

"اے بتول! ظہور سے تو کہا تھا جلدی گھر آنے کو۔۔۔" اس کی ماں نے پکار کر کہا۔

"اماں کہہ دیا تھا۔ آتے ہی ہوں گے۔" وہ پینیوں پر ڈھلے ہوئے کور ڈال رہی تھی۔

"چائے کے ساتھ کیا رکھنا ہے۔"

"ہاں! ظہور سے کہہ دیا تھا آتے ہوئے لیتا آئے گا۔ او تارہ! یہ کمرے کو ذرا اچھی طرح رگڑنا۔" اس نے صحن دھوتی تارہ کو آواز لگائی پھر ماں سے مخاطب ہوئی۔ "کون جانے اس کی ماں کتنی صفائی پسند ہو۔"

"کوئی وقت ہی بتا دیتے۔ کیا پتا اب دوپہر کو آئیں یا شام کو۔" اس کی ماں زیرِ لب بڑبڑائی پھر نظر کوثر پر پڑی۔

"تو کیوں بھوت بنی بیٹھی ہے اٹھ کر منہ دھو کر کپڑے بدل۔ کیا پتا وہ ابھی آ جائیں۔"

"اچھا اماں۔۔۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گئی تو اماں نے پیچھے سے آواز لگائی۔ "وہ مونگیا سوٹ پہننا تیرا رنگ گورا لگتا ہے اس میں۔"

کوثر مونگیا سوٹ اٹھا کر غسل خانے میں گھس گئی۔ نین تارہ صحن دھو کر باورچی خانے میں آئی تب ہی ظہور آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بہت سے لفافے تھے۔ باورچی خانے میں آ کر اس نے نین تارہ کو تھما دیے اور خود اندر چلا گیا۔ پھل، مٹھائی، سموسے اور بسکٹ۔

وقفے وقفے سے "وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔" کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مگر "کون لوگ؟" نہ تو اس کو کسی سے پوچھنا تھا اور نہ کوئی اسے بتاتا۔ سو وہ خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ظہور دیکھنے گیا تھا۔

"شاید وہ آ گئے۔" اماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ بتول نے جھانک کر دیکھا۔ پھر ظہور کے ساتھ قاسم کو آتا دیکھ کر منہ سا بن گیا۔

"قاسم آیا ہے۔۔۔؟"

"قاسم کون؟۔۔۔" اماں نے پوچھا۔

"مامے مقبول کا بیٹا۔ اسے بھی اسی وقت آنا تھا۔ پہلے باپ یہاں مہینہ بھر ٹکا رہا۔ اب یہ پتا نہیں کیوں آ گیا ہے۔" وہ منہ بناتی بڑبڑاتی رہی۔ ظہور کے ساتھ قاسم اندر داخل ہوا تو چہرے کے تاثرات ٹھیک کیے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام، کیسے ہو بیٹا ٹھیک ٹھاک۔" اماں نے قدرے خوش دلی سے پذیرائی کی۔

"ٹھیک ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔۔۔" وہ اماں کی چارپائی پر ہی بیٹھ گیا۔

"گاؤں میں سب ٹھیک ہے؟" ظہور اس کے سامنے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔ وہ مختصراً اسے گاؤں کا احوال بتانے لگا۔

"خیر سے تو آئے نا۔۔۔" بتول سے رہا نہ گیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ مجھے یہاں کسی کام سے آنا تھا۔ ابا نے کہا نین تارہ کی خیریت پوچھتے آنا۔"

"بھلی چنگی ہے نین تارہ۔ لو آ گئی پوچھ لو اس سے۔"

"سلام قاسم بھائی۔۔۔"

قاسم نے سرسری سا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر خیریت پوچھی۔

"ٹھیک ہوں میں۔۔۔ ماما نہیں آیا؟"

"ابا ذرا بیمار ہے۔"

"کیا ہوا۔" وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

"نہیں۔ فکر والی بات نہیں ہے۔ بس موسمی بخار ہے۔ کھانسی وانسی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"چائے بناؤ تارہ۔" ظہور نے کہا تو وہ باہر نکل آئی۔

"بس بسکٹ اور سموسے رکھ دو۔ باقی چیزیں رہنے دو۔" بتول نے پیچھے آ کر تاکید کی۔

چائے پینے کے بعد قاسم اپنے کام سے چلا گیا۔ اسے اب رات کو ہی آنا تھا۔ بتول نے شکر ادا کیا۔ کوثر نہا دھو کر مونگیا سوٹ پہنے باہر نکلی۔ لمبے بالوں کو سلجھا کر چوٹی بنائی، پاؤڈر کریم، کاجل۔

"باجی! تھوڑی سی لپ اسٹک بھی لگا لوں۔"

"نہ۔۔۔ نہ مجھے تو سیدھے سادے لوگ لگتے ہیں۔" بتول نے روک دیا۔

وہ لوگ جب آئے تو نین تارہ نلکا چلاتے ہوئے پانی بھر رہی تھی۔ گندے میلے ہوئے کپڑے، بالوں کی الجھی ہوئی چوٹی۔ وہ کوئی حور پری نہیں تھی۔ اگر اجمل اپنے والدین کو اس کی مظلومیت کے بارے میں نہ بتاتا تو شاید اس کی امی بھی نین تارہ کو پسند نہیں کرتی۔

"یہ نین تارہ ہے۔" اجمل نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے ابو نے بے حد ہمدردی اور محبت سے اسے دیکھا۔ لڑکی کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ اس گھر میں کن حالوں میں رہ رہی ہے۔

"تم نہ بھی بتاتے تب بھی پتا چل جاتا۔ بے چاری بچی۔" اس کی امی بڑبڑائیں۔ نین تارہ ہکا بکا کھڑی دیکھ رہی تھی۔

"اندر آئیں خالہ۔" بتول نے انہیں وہیں رکے دیکھا تو کہنا پڑا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں ہمارا اپنا گھر ہے۔" انہوں نے آگے بڑھ کر نین تارہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر حال پوچھا۔ وہ سمٹی سی گئی جبکہ اجمل ان کے عقب میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"یہ میری نند ہے۔" بتول نے تعارف کروایا۔ نین تارہ گھبرائی کھڑی تھی پھر بھاگ کر کچن میں گھس

گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ وہی مہمان تھے جن کے لیے صبح سے تیاریاں ہو رہی تھیں اگر وہ ہی تھے تو پھر کوثر اگر کوثر تو پھر اجمل۔۔۔ وہ سر پکڑ کر رہ گئی۔ تب ہی کوثر گنگناتی ہوئی آگئی۔

"اس کے والدین کیسے ہیں؟" آتے ہی پوچھنے لگی۔

"پتا نہیں۔۔۔"

"ہائے ہائے۔۔۔" وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ پھر منہ بنا کر بولی۔ "چائے رکھ دو۔ میرے ہاتھ کی چائے تو بیٹے کو پسند نہیں ماں کو کہاں آئے گی۔"

وہ الجھی الجھی سی چائے کا پانی چڑھانے لگی۔ کوثر نے سارے لوازمات پلیٹوں میں ڈالے۔ جب چائے تیار ہو گئی تو بتول آگئی۔ کوثر کو ہدایات دینے۔

"دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھو اور زیادہ بولنا نہیں۔"

کوثر چائے لے گئی۔ وہ ساکت سی بیٹھی سوچ رہی تھی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ تو کیا اس دن اجمل نے مجھ سے مذاق کیا تھا۔ یہ کوثر۔۔۔ اور میں سوچنے لگی کہ شاید یہی وہ مسیحا ہے جو۔۔۔" اس کے آگے ساری سوچیں تلخ اور زہریلی تھیں۔

"یہ میری بیٹی ہے۔" اماں نے تعارف کروایا۔

"ماشاءاللہ بڑی پیاری بچی ہے۔"

بتول نے خوش ہو کر ماں کا ہاتھ دبایا، وہ مسکرا دیں۔ کوثر چائے دے کر باہر نکلی، اور دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ لوگ چائے پیتے اور اپنے خاندان کے بارے میں تفصیلات بتاتے رہے۔

"تو پھر ظہور بیٹے ہمیں مایوس مت لوٹانا۔ ہم بہت آس لے کر آئے ہیں۔" اجمل کا رشتہ دیتے ہوئے اس کے ابو نے آخر میں کہا تھا۔

"اجمل تو ہمارا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ ماشاءاللہ سارا محلہ تعریفیں کرتا ہے۔"

"بس تو پھر ہم یہی سمجھیں کہ نین تارہ ہماری ہوئی۔" اجمل کی امی خوش ہو کر بولیں۔

"نین تارہ۔۔۔" ظہور نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"نین تارہ۔۔۔" بتول اور اس کی ماں نے سٹپٹا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"نین تارہ۔۔۔" کوثر نے بے اختیار دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ اجمل مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔" ظہور کے لیے اس غیر متوقع خوشی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ "وہ آپ ہی کی بیٹی ہے۔"

کمرے میں موجود باقی نفوس ساکت و صامت تھے۔

"بس تو پھر منہ میٹھا کیجیے۔" اجمل کی امی نے مٹھائی کی پلیٹ اٹھائی۔ اجمل خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ وہاں ساکت کھڑی کوثر کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا پھر اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تمہیں کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔"

کوثر نے بے حد شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ تذلیل کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ پلٹی اور بھاگ کر کمرے میں گھس گئی۔ اجمل کندھے اچکا کر کچن کی طرف آگیا۔ حسب توقع وہ وہیں موجود تھی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ان پر پیشانی لگائے رونے ہولے ہولے ہل رہی تھی۔

"تمہارے سارے حقوق اپنے نام لکھوانے کی تیاری کر آیا ہوں۔ تم اب بھی خوش نہیں ہو۔" نین تارہ نے گھبرا کر گھٹنوں سے چہرہ اٹھایا۔

"اب بھی بے یقین ہو۔" وہ اندر آکر اس کے قریب بیٹھا۔ قریب پڑا مٹھائی کا ڈبہ کھول کر گلاب جامن نکالی۔

"لو منہ میٹھا کرو۔ میری اور تمہاری بات پکی ہو گئی ہے۔"

"یہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ایسے کہ۔۔۔" پھر ایک دم بات ادھوری چھوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔ اس پر گلاب جامن رکھی اور باہر نکل گیا۔ شاید اس نے اندر اٹھتی آوازیں سن لی تھیں۔

سب باہر آرہے تھے۔

"لو ہماری بیٹی یہاں بیٹھی ہے۔"

نین تارہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اجمل کی امی نے اسے ساتھ لگا کر پیار کیا پھر بٹوے سے پانچ سو نکال کر دینے لگیں۔ وہ سٹپٹا کر ظہور کو دیکھنے لگی۔

"رکھ لو۔۔۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"سمجھیں۔ منگنی ہو گئی۔ میں اب شادی کی تاریخ لینے ہی آؤں گی۔" اجمل کی امی کہہ رہی تھیں پھر ان کی آوازیں صحن سے ہو کر بیرونی دروازے پر معدوم ہو گئیں۔ نین تارہ نے بے حد حیرت و بے یقینی سے ہاتھ میں پکڑے پانچ سو کے نوٹ کو دیکھا۔

"کیا زندگی کو مجھ پر رحم آگیا۔"

♥ ♡ ♡ ♥

ہال کے راستے میں پریولیس کے لڑکے لڑکیاں قطار بنائے کھڑے تھے۔ فائنل کے اسٹوڈنٹ اندر آتے۔ لڑکیاں لڑکیوں کو موتیے کے گجرے پہناتیں اور We will miss you کے خوبصورت کارڈ دیتی تھیں جو انہوں نے خود بنائے تھے۔ لڑکوں کے ہاتھ میں ادھ کھلے گلاب تھے۔ لڑکوں کو پیش کرتے ہوئے ان کے منہ سے ہائے ہائے کی آوازیں نکلتی تھیں۔ وہ دل پہ ہاتھ رکھتے، کن اکھیوں سے لڑکیوں کو دیکھتے اور بڑے ادب سے انہیں تھما دیتے جو فائنل کے لڑکے ان سے زیادہ منہ بنا کر قبول کرتے تھے۔

"یار الٹ ہونا چاہیے تھا۔" آصف زیر لب بڑبڑایا۔

"یعنی لڑکے لڑکیوں کو پھول پیش کرتے اور لڑکیاں ہمیں گجرے پہناتیں لاحول ولا قوۃ۔" حیدر بھنا کر بولا تھا۔ سلیم نے تو شائستہ کے ہاتھ میں گجرا دیکھ کر کلائی بھی سامنے کر دی تھی کہ پیچھے سے افتخار کی دھپ نے اس کی مردانگی کو جگا دیا۔

"ویسے پریولیس نے ہماری اتنی عزت پہلے کبھی نہیں کی۔"

"رج کے کروا لو۔ پہلی اور آخری بار ہے۔" زین ہنس دیا تھا، اور پھول افتخار کی طرف بڑھا دیا جو اس نے بڑے آرام سے اپنے کوٹ میں لگا لیا۔

سب ہی لوگ ہال میں اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ زارا کچھ لیٹ آئی تھی۔ مگر انعم اور عظمیٰ اس کی سیٹ رکھے ہوئے تھیں۔

"تھینک گاڈ۔ ہم سمجھے تم نہیں آؤ گی۔"

"میں تو نہیں آرہی تھی۔ رضوان زبردستی چھوڑ گئے۔"

"بہت اچھا کیا، ہماری طرف سے شکریہ کہنا ان سے۔۔۔" تب ہی لائٹ چلی گئی اوہ۔۔۔ کی آواز کے ساتھ سارا ہال گونج اٹھا۔ اس سے قبل کہ وہ مزید شور کرتے، اسٹیج کے عقب سے ایک کے بعد ایک نئی دیے گویا ہوا میں تیرتے ہوئے اور اسٹیج پر اکٹھے ہو کر، ویلکم لکھنے لگے۔ ہال میں دیوں کی روشنی مدھم سی چاندنی بن کر بکھر رہی تھی۔ انہوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر اس ویلکم کو قبول کیا۔ مگر ان کی تالیاں گلابوں کی خوشبو پا کر خاموش ہو گئیں۔ ان پر برسنے والی گلابوں کی نرم پنکھڑیاں گویا چھت سے برس رہی تھیں۔

"اوہ میرے خدا۔ یہ سب کتنا خوبصورت ہے۔"

وہ گویا مدہوش ہو رہے تھے۔ ان پنکھڑیوں کو اپنے دامن میں، ہاتھوں میں اور ان کی خوشبو سانسوں میں بسا رہے تھے۔ وہ وقت ان کی نگاہوں میں جاگنے لگا تھا۔ جب وہ لوگ پہلی بار اس یونیورسٹی میں آئے تھے۔ اپنی حماقتیں فائنل والوں کی شرارتیں یاد آرہی تھیں۔ مریم نے کچھ پتیاں ٹشو پیپر میں لپیٹ کر بیگ میں رکھ لیں۔

"یہ میری ڈائری کی زینت بنیں گی، اچھی یادوں کی طرح۔"

پھول برسنے بند ہو گئے تو ساتھ ہی لائٹس آن ہو گئیں۔

"یہ آ کہاں سے رہے تھے؟" انعم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ جیسی رفتار میں چلتے پنکھے رک گئے تھے۔ "میں سمجھی چھت میں سوراخ ہو گئے ہیں۔"

"تم اور تمہاری سمجھ۔" زارا ہنسنے لگی۔ سائیکاب

پرلویس کے عباس کے ہاتھ میں تھا۔ فنکشن بہت اچھا تھا۔ بھنگڑا' خاکے' خوبصورت الوداعی نظمیں' فائنل کے اسٹوڈنٹس کو ٹائٹل دیے جا رہے تھے۔ پھر فائنل کے اسٹوڈنٹس کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ آصف کی خوبصورت آواز نے پورے ماحول پر جادو سا کر دیا تھا وہ گا رہا تھا۔

کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے
جس طرح اور لوگ ہوتے ہیں
بے تعلق سے' بے تعارف سے
کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے
بے قراری نہ' بے کلی ہوتی
نامکمل نہ زندگی ہوتی
یوں نہ ہوتیں اذیتیں دل میں
زندگی بھی نہ ہوتی مشکل میں
آنسوؤں سے نہ دوستی کرتے
اپنے دل سے نہ دشمنی کرتے
یوں نہ لمحے ستاتے جدائی کے
دوسروں کی طرح ہم بھی خوش رہتے
کاش ہم تم بھی اجنبی ہوتے

"واؤ آصف! تمہاری آواز تو بہت خوبصورت ہے۔"

"زبردست بھئی... یہ تو سنگر بن سکتا ہے۔" سب لوگ اپنے اپنے انداز میں اسے سراہ رہے تھے۔

"لیکن اس نے تو ہمیں اداس کر دیا ہے۔" انعم منہ بسور کر بولی تھی۔

"بہت نازک دل ہے تمہارا۔"

فنکشن کے آخر میں عباس الوداعی فقرے کہہ رہا تھا۔

آؤ مل کر بیٹھیں کہیں کہ میرے پیارے دوست
چند لمحوں کی یہ رفاقت ہے' بڑے کام کی چیز
پھر تو شیرازہ بکھر جائے گا
اپنے خوابوں کو سمیٹیں گے' بچھڑنے والے
کون جانے کہ پھر اس شام دل افروز کے لیے
کون کدھر جائے گا
یادیں رہ جائیں گی

"سب کچھ یہی ہوگا... یہ در و دیوار' یہ ڈپارٹمنٹ' وہی پروفیسرز' وہی دوڑ دھوپ بس ہم نہیں ہوں گے۔" شہلا گہری افسردگی کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

افتخار بہت خوش تھا۔ اس نے بہت انتظار کیا تھا۔ یہ وقتی طور پر انہیں جدا کرتا وقت اسے اور عظمیٰ کو ہمیشہ کے لیے اکٹھا کرے گا۔ اسے پورا یقین تھا۔ وہ جانتا تھا عظمیٰ نہیں چاہتی ان کے رومانس کے قصے جامعہ کی در و دیوار پر لکھے جائیں۔ اپنی محبت کو مقدس راز کی طرح چھپا کر رکھا تھا اس نے۔

ڈنر کا انتظام بہت اچھا تھا مگر وہ ان دو سالوں کو دہرا رہے تھے۔ جھگڑے' دوستی' دشمنی' لیکچر' بحثیں' محبتیں' حماقتیں' شرارتیں۔ وہ مسکراتے لبوں اور نم آنکھوں کے ساتھ' ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ کون جانے انہیں پھر ملنا تھا یا نہیں۔ آنکھوں میں کچھ خواب تھے۔ نہیں معلوم ان میں سے کن کے خوابوں کو تعبیر ملنی تھی اور کن کے خوابوں کو راکھ ہونا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

کوثر اندر آئی اور بے حد خاموشی سے ان کے قریب آ بیٹھی۔ اس کا چہرہ اس کے اندرونی اضطراب کا عکاس تھا۔ لبوں کے گوشوں میں ہلکی سی لرزش' جیسے کوئی شکوہ کنارِ لب مچل رہا ہو۔ آنکھ میں پھیلتا کاجل' جیسے ایک نوخیز خواب بکھر گیا ہو۔ قصور کوثر کا بھی نہیں تھا۔ بتول نے اس کو کچھ اس طرح یقین دہانی کرائی تھی کہ اس کا دل بے حد خاموشی سے اجمل کے نام پر دھڑکنے لگا تھا۔ پھر اجمل کی چھیڑ خانیاں۔ مذاق اسے کیا معلوم تھا وہ نین تارہ کے لیے رستہ ہموار کر رہا ہے۔

ایک آہ اس کے لبوں سے نکلی اور خاموشی کی چادر پر سلوٹیں ڈال گئی۔

بتول نے چونک کر کوثر کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر لکھی تحریر وہ حرف حرف پڑھ سکتی تھی۔

"یہ کیا ہو گیا بتول... !تم تو کہتی تھیں۔" اس کی اماں اب تک عالمِ حیرت میں تھی۔

"بڑا ہی گھنا نکلا۔" بتول زیرِ لب بڑبڑائی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتحال میں اس کا فوری ردعمل کیا ہو۔

"تمہاری ناک کے نیچے یہ کھیل ہوتا رہا اور تم سمجھتی رہیں... واہ... بتول واہ... تیرا بھی جواب نہیں۔ لوگ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں اور وہ کل کی چھوکری تجھے ہاتھ دکھا گئی اور میں بھی پگلی کس کے کہنے میں آ گئی۔ ایک ہفتے سے یہاں ڈیرے ڈالے بیٹھی ہوں۔" اس کی اماں کے حواس ٹھکانے آئے تو بتول پر ہی برس پڑی۔

"اماں! بس کرو... تم تو مجھے ہی قصوروار سمجھ رہی ہو۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ ڈاکٹر پر اس منحوس کا جادو چل گیا ہے۔"

"چل اٹھ کوثر! سامان سمیٹ۔ بہت ہو گیا تماشا۔" وہ خاصی دلبرداشتہ ہو گئی تھیں۔

"اماں! میرا نام بھی بتول ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے میں یہ سب ہو جانے دوں گی۔" وہ سانپ کی طرح پھنکاری۔ حیرت و بے یقینی کی جگہ طیش و غصے نے لے لی تھی۔

"تو کیا کرے گی۔ وہ تمہارا کچھ لگتا ہاں کہہ بیٹھا ہے۔" اماں چڑ کر بولی۔

"ایک ہاں سے کیا ہوتا ہے۔ خیر... تم واویلا مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس گھر میں اجمل اگر کسی رشتے سے آئے گا تو وہ رشتہ کوثر کا ہو گا۔" وہ مصمم ارادے سے بولی۔

"اس تارہ میں ہے کیا۔ سوکھی چمرخ سی ہے اور ہر کسی کو اپنے بس میں کر لیتی ہے جادوگرنی نہ ہو تو..." اماں جھنجھلا گئی۔

"مظلوم بن بیٹھی ہو گی اس کے سامنے۔ اپنی مجبوریوں کی داستان سنائی ہو گی اور یہ مرد تو بس... جہاں عورت کے آنسو دیکھے... وہیں پھسل گئے۔ لیکن اجمل کو یہ نہیں پتا کہ اس کا واسطہ پڑا کس سے ہے۔ قدموں تلے سے زمین نہ کھینچ لی تو..." اپنی

شکست اس کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ ذہن بڑی تیزی سے اک نئی کہانی کا تانا بانا بن رہا تھا۔ تب ہی ظہور اندر آیا' خوشی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

"کمال ہو گیا ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا۔ خیر اللہ نے بڑا کرم کیا۔" اس نے اپنی دھن میں کہتے ہوئے چنگیر کا ڈھکن اٹھایا' پھر بتول کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔"

"ہاں!" بتول چونکی پھر کوثر کہنے لگی۔ "جاؤ' چائے گرم کر لاؤ۔"

بتول کا لہجہ نارمل ہی تھا۔ جیسے کوئی بات غیر متوقع نہیں ہوئی۔ کوثر فوراً ہی اٹھ گئی کہ آنسو چھلک جانے کو بے تاب تھے۔ وہ چنگیر اٹھا کر باہر نکل گئی۔ ظہور سموسہ کھانے لگا۔

"پر بتول! تم تو کہہ رہی تھیں۔" ظہور نے اچانک سر اٹھا کر بتول سے کچھ پوچھنا چاہا۔

بتول نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ بھی برا تو نہیں ہوا۔"

"برا... بہت اچھا ہو گیا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ ورنہ سچ پوچھو تو بہت پہلے سے دل میں ایک خیال سا تھا کہ اجمل سے تارہ کی بات طے ہو جائے۔"

بتول اور اماں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تارہ بھی میری بہن ہی ہے۔" دل پر پتھر رکھ کر یہ جملہ بولا تھا۔

"ہاں... ہاں سب کچھ تمہیں ہی تو کرنا ہے۔" ظہور خوش دلی سے بولا۔

"مگر تمہیں اتنی جلدی ہاں نہیں کہنا چاہیے تھی۔" بتول کے کہنے پر ظہور چونک گیا۔

"کیوں...؟"

"رسم دنیا بھی کوئی چیز ہے۔ سوچنے کے لیے تھوڑا وقت مانگ لیتے تو اچھا تھا۔ انسان تھوڑی بہت معلومات ہی کروا تا ہے۔"

"دیکھا بھالا لڑکا ہے اور معلومات تو تم ساری کی ساری کروا ہی چکی تھیں۔"

ظہور نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔ بتول کو لگا وہ طنز کر رہا ہے۔ تلملا کر رہ گئی۔

"یوں ہاں کہہ دینے سے سسرال میں بیٹیوں کی قدر نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں ایک بوجھ کی طرح اتار پھینکا۔" اس کی اماں ترنخ کر بولیں۔ ظہور خاموش سا ہو گیا پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"بوجھ ہی تو ہے میرے دل پر۔ بڑا بھاری بوجھ۔ اتر جائے تو مجھے بھی کچھ سکون ہو۔" پھر سر جھٹک کر بولا۔

"وہ شادی کی تاریخ لینے آئیں گے۔ زیادہ لمبی تاریخ نہیں دینی۔ جو بھی بن پڑا بس ایک دو ماہ میں رخصت کر دیں گے۔"

"نیاز سے مشورہ تو کرنا ہے۔"

"نیاز سے مشورہ بھی کر لوں گا۔ اس نے کون سا انکار کرنا ہے۔ وہ بھی یہی چاہے گا کہ اسے جلد رخصت کر دیں۔"

"تم اسے کل کے بجائے آج رخصت کر دو مگر اجمل کے ساتھ...؟ کبھی نہیں... یہ بات تم لکھ رکھو منظور..." بتول کا مکار ذہن ایک خاص فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

قاسم رات کو بہت دیر سے آیا تھا۔

"کھانا میں کھا آیا ہوں۔ بس سوؤں گا۔" وہ خاصا تھکا ہوا تھا۔ نین تارہ نے بستر وغیرہ بچھا دیے اور کمرے میں آ گئی۔ بتول' اس کی اماں اور کوثر کمرے میں بند نجانے کیا کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ نین تارہ نے توجہ نہیں دی۔ وہ اس وقت خوش ہونا چاہتی تھی۔ پانچ سو کے نوٹ کو ہاتھ میں لے کر وہ بہت دیر تک دیکھتی رہی۔

"کیوں آتا ہوں میں یہاں بار بار' صرف تمہارے لیے..."

ایک نرم مدھم سی مسکان نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا۔

"اپنی ذات کے ساتھ اتنی دشمنی... میں کرنے نہیں دوں گا۔"

اس نے تھوڑی گھٹنوں پر ٹکائی اور آنگن میں کھلتی چاندنی کو دیکھنے لگی' آج چاندنی بہت اجلی اور نکھری ہوئی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم ایک جہنم میں زندگی گزار رہی ہو۔ میں تمہیں نکال لے جاؤں گا۔"

"تم تو اپنی زبان کے بڑے پکے نکلے۔"

اس کی نرم آواز اور خوبصورت لہجہ تارہ کے گرد حصار کھینچنے لگا۔

"کیا واقعی زندگی اب بدل جائے گی؟" اس نے بے یقین کے ساتھ خود سے سوال کیا۔ اس سے قبل کہ جواب ہاں میں آتا۔ اس کے اور چاندنی کے بیچ ایک وجود حائل ہو گیا۔ اس نے سر اٹھا کر کوثر کو دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں سے بہتے قطار در قطار آنسوؤں کو۔

"بہت خوش ہو؟" وہ عجیب سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"کیا مجھے خوش ہونے کا حق نہیں۔" تارہ کا لہجہ اس سے زیادہ عجیب تھا۔ ابھی تو وہ اپنے دل کو یقین کی ڈور سے باندھ رہی تھی کہ یہ نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"میں اجمل کو اتنی آسانی سے تمہارا نہیں ہونے دوں گی۔" وہ پھنکاری۔

"میں نے اسے کسی سے چھینا تو نہیں کوثر!" وہ بے بس سی ہو کر بولی۔ اس نے کب چاہا تھا کہ اس کی خوشی کسی کی آنکھ کا آنسو بن جائے۔

"ایک وہ بنگلے والا کافی نہیں تھا..."

"کوثر!" وہ دبے دبے لہجے میں چیخی۔

"مگر جنہیں جگہ جگہ منہ مارنے کا شوق ہو۔ وہ کسی ایک پر اکتفا کس طرح کریں۔" وہ زہر زہر ہو رہی تھی۔

"بس کرو کوثر خدا کے لیے... ترس کھاؤ مجھ پر۔" وہ ہاتھ جوڑ کر چیخی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"یہی... یہی ڈرامے کیے تھے نا اجمل کے سامنے بھی۔" بتول دو دھاری تلوار بن کر سامنے آئی۔ "اسی مظلومیت کا رونا رویا تھا ڈاکٹر کے سامنے۔ یہی ڈھکوسلے کیے تھے..."

"بھابھی! وہ تمہارے سامنے آتا تھا۔"

"پر بھابھی کو کیا معلوم تھا' ڈاکٹر مریضہ عشق و عاشقی کے سبق پڑھا رہے ہیں ایک دوسرے کو۔" کوثر کی زبان نے ڈنک مارا۔

"میں مر کیوں نہیں جاتی۔" وہ بے بسی سے دونوں ہاتھوں میں بال نوچ کر رونے لگی۔

"تجھ میں حیا ہی نہیں ہے نین تارہ! ورنہ تو واقعی مر جاتی۔" بتول استہزائیہ ہنسی ہنس دی۔ "بس ایک بات یاد رکھ جو خواب تو دیکھ رہی ہے وہ پورے ہونے والے نہیں۔ اجمل تجھے کبھی نہیں ملے گا۔ کبھی بھی نہیں اور میں کیا کر سکتی ہوں اس کا اندازہ تجھے اچھی طرح ہے۔"

نین تارہ کے آنسو تھم سے گئے۔ وہ ساکت سی انہیں دیکھے گئی۔ بتول کوثر کا ہاتھ پکڑ کر پلٹ گئی۔ آنگن میں چاندنی زرد پڑ گئی تھی۔

"اور حقیقت یہ ہے نین تارہ! کہ تیری قسمت میں کوئی خوشی لکھی نہیں۔ تجھے صرف ذلیل ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اب ایک نیا کھیل شروع ہو گا۔"

بہت دیر ہونے کے بعد اس نے بے دردی سے آنسو پونچھے۔ وہ جانتی تھی... چند جملوں کی ایک چھوٹی سی کہانی... اس کے ناکردہ گناہ... اور اس کے بعد کون مرد ہے. جو پھر بھی یہی کہے۔ "میں شادی کروں گا تم سے۔"

"اور جس کی آنکھوں میں' میں نے اپنے لیے محبت اور احترام دیکھا ہے۔ ان آنکھوں میں اترتی بدگمانی اور حقارت دیکھ سکوں گی۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اپنے دوپٹے میں اپنے چند جوڑے اور کتابیں باندھ لیں۔

"اگر تم کمزور ہو تو اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دو کہ وہ بہتر

انصاف کرنے والا ہے۔" نین تارہ نے اپنا معاملہ واقعی خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ تب ہی جب صبح قاسم گاؤں جانے کو تیار ہوا تو وہ گٹھڑی اٹھا کر باہر نکل آئی۔

"میں قاسم بھائی کے ساتھ چلی جاؤں۔ ماما بیمار ہے۔" اس نے ظہور کو بھائی کہنا چھوڑ دیا تھا۔ ظہور نے بے حد حیرت سے اس کے ہاتھ میں موجود گٹھڑی کو دیکھا۔ مگر خوش دلی سے بولا تھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ مامے نے بڑا خیال رکھا تھا تمہارا۔ تھوڑی خدمت تمہارا بھی فرض بنتا ہے۔ چلی جاؤ۔" وہ کہہ کر قاسم کی طرف متوجہ ہوا۔

"مامے مقبول سے کہنا۔ ہم نے نین تارہ کی بات پکی کر دی ہے۔"

"کس کے ساتھ...؟" قاسم چونک گیا۔

"ڈاکٹر اجمل کے ساتھ' ماما جانتا ہے اسے۔ میں آؤں گا کسی دن گاؤں۔ پھر تفصیل سے بات ہو گی۔ کچھ صلاح مشورے بھی کرنے ہیں۔" ظہور قاسم کو تفصیلات بتا رہا تھا۔ نین تارہ زمین پہ نظریں گاڑے کھڑی تھی۔ پشت پر چبھتی ہوئی نظریں تھیں۔ دبی دبی تمسخر بھری سرگوشیاں۔

"جلدی آ جانا۔" ظہور نے کہا تھا۔

"یہ گھر' یہ لوگ' یہ گلیاں' یہ راستے میرے لیے سب اجنبی ہیں۔ خدا نہ کرے مجھے کبھی لوٹ کر یہاں آنا پڑے' جہاں میری عزت نفس' میرا مان' میرا وقار' مستقبل سب مٹی میں مل گئے۔"

شام ڈھلے وہ گاؤں پہنچے۔ ماما مقبول بکریوں کو چھپر کے نیچے باندھ رہا تھا۔ اسماء بھابھی نے ہنڈیا چڑھائی تھی۔ اسے دیکھ کر حیران کا حیران رہ گیا۔

"تارہ پتر... تو..."

"ماما! تمہیں تو بخار تھا..." وہ آہستگی سے مسکرائی۔ کیسی روتی' سسکیاں لیتی مسکراہٹ تھی۔ خود پہ ہنستی' ہزاروں نوحے پڑھتی مسکراہٹ۔

"بخار تو صبح ہی اتر گیا۔ پر تم کو... تم کو ظہور نے کیسے آنے دیا۔" وہ اسے ساتھ لگا کر پوچھنے لگا۔

"اتنے حیران کیوں ہو ماما! میں نے تمہیں تو آنا تھا اور ٹھکانہ بھی کیا ہے میرا..." دل تو دھاڑیں مار مار کر رونے کو کرتا تھا مگر وہ چپ تھی۔

"میں تو خوش ہوا ہوں پتر...! بہت خوش... اب آئی ہو تو جانے نہیں دوں گا۔" ماما واقعی بہت خوش تھا۔

"مجھے اب کہاں جانا ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑاتی اسماء بھابھی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے بھی اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ ان کا سال بھر کا بیٹا چارپائی کے ساتھ بندھے کپڑے کے جھولے میں محو خواب تھا۔ کھلے آنگن میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ کونے میں نلکا اور صحن میں ایک طرف چولہا' لپا لپایا کچا آنگن' تین کھلے کھلے کمرے' گاؤں کا روایتی سا ماحول' بھابھی اسماء مسور کی دال پکا رہی تھی۔ ساتھ میں زردہ پکا لیا۔ کھانے کے بعد جب اسماء برتن دھو رہی تھی۔ قاسم نے مامے مقبول کو اس کے رشتے کے بارے میں بتایا۔ وہ بے یقین سا اٹھ کر اندر آیا۔ نین تارہ گٹھڑی کھول رہی تھی۔

"قاسم کہتا ہے تیری بات پکی ہو گئی ہے' ڈاکٹر کے ساتھ..." نین تارہ کے ہاتھ رک گئے۔

"پانچ سو کا نوٹ ہاتھ میں دے دینے کو منگنی ہونا کہتے ہیں تب تو ہو گئی۔"

ماما مقبول نے الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھا پھر رسانیت سے بولا۔

"عزت دار لوگوں میں زبان دینا ہی سب کچھ ہوتا ہے۔"

"اور جسے زبان دی جا رہی ہے۔ اگر وہی عزت دار نہ ہو لوگوں کی نظر میں تو..."

"کیسی باتیں کر رہی ہے تارہ..."

"انتظار کرو ماما! میں بھی انتظار کر رہی ہوں۔ آنے والا وقت دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دے گا۔" وہ گرہ کھولنے لگی۔ مگر سخت تھی کھلنے میں نہ آ رہی تھی۔

اس نے کہا تھا۔

"اپنی ذات کی ساری کھڑکیاں بھی بند کر دو گی' میں تب بھی تم تک پہنچ جاؤں گا۔"

نین تارہ کے لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"اور اب میں سارے دروازے کھول بھی دوں۔ شاید تم تب بھی آنا پسند نہیں کرو گے..." مگر اندر ہیں امید کا ننھا سا جگنو من کے اندھیروں کو ہلکی ہلکی روشنی بخش رہا تھا۔

♥ ♥

عجیب اکتائے ہوئے بیزار دنوں کا سلسلہ تھا۔ آپا فاطمہ کی شادی کے بعد اب افتخار بھی وقت بے وقت ان کے ہاں نہیں آتا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ زین کو اب انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں رہی۔ زین گھر میں کتابیں کھولتا تو سوچوں کے سلسلے دراز ہونے لگتے۔ وہ کتابیں اٹھا کر لائبریری آ جاتا تو لائبریری کے پرسکون ماحول میں اونگھ آنے لگتی' جمائی پر جمائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ افتخار کی طرف جاتا تو وہ پنجابی شاعری کی تاریخ سنانے لگتا تھا۔ زین چڑ جاتا۔

"آپ کو ماسٹرز پنجابی ادب میں کرنا چاہیے تھا۔"

ایک دن یونیورسٹی میں انعم مل گئی۔

"اچھا ہوا زین تم مل گئے... یہ زارا کہاں غائب ہے' نہ ہمارے گھر آئی ہے نہ فون کرتی ہے۔ خود کرو تو پتا چلتا ہے محترمہ گاؤں گئی ہیں۔"

وہ بتا رہا تھا کہ وہ رائے ہاؤس میں مقید ہو کر رہ گئی ہے اس سے بھی ملنے نہیں آتی۔ بس مختصراً" فون پر ہی بات ہوتی تھی۔

"میرے پاس اس کے کچھ نوٹس ہیں۔ اتفاق سے اس وقت بھی فائل میرے پاس ہی ہے۔ تمہیں ملے تو اسے دے دینا۔ ہم لڑکیوں کا گھر سے نکلنا بھی بس پرابلم ہی ہے اور بھائی لوگ کوئی بات نہیں مانتے۔"

زین نے فائل پکڑ لی تھی۔

"اس تک میری شکایت بھی پہنچا دینا۔ گاؤں سے اگر فون ہی کر لیا کرے۔"

فائل دو دن تک اسی کے پاس رکھی رہی۔ اس نے فون کیا تھا۔ زارا گاؤں گئی تھی۔ ہفتے کو اسے واپس آنا تھا۔ ہفتے کو اس کا موبائل آف ہی ملا اور زین کچھ یوں اکتایا کہ فائل اٹھا کر رائے ہاؤس پہنچ گیا۔ خوشگوار سی شام پھولوں کی خوشبو میں نہا رہی تھی اور لان چیئر پر سلیمان شام کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

"مجھے مس زارا سے ملنا ہے..." سادہ و پراعتماد لہجہ' اسے سلیمان سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ سلیمان نے اخبار سے نظریں اٹھا کر بلیک پینٹ اور لیمن کلر کی شرٹ میں ملبوس نوجوان کو دیکھا۔ دوسرے پل ان کی آنکھوں میں ناگواری کا تاثر ابھر آیا۔ اس لڑکے کو انہوں نے زارا کے ساتھ بہت سی جگہوں پر دیکھا تھا' پھر وہ بائیک پر زارا کو گھر بھی چھوڑنے آیا تھا اور وہ جسے ایک بار دیکھ لیتے تھے اسے بھولتے نہیں تھے اور یہ لڑکا انہیں بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ انہوں نے نظریں دوبارہ سے اخبار پر ٹکا دیں۔ انہوں نے زین سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔ زین کے اندر غصے کی لہر سی ابھری۔

"مجھے مس زارا سے ملنا ہے۔" اس نے قدرے بلند آواز میں اپنی بات دہرائی۔

"کیوں...؟" سلیمان کے انداز ہی غصہ واشتعال دلانے والے تھے۔

"کام ہے ان سے..." لہجہ زین کا بھی نارمل نہ تھا۔ شاید دونوں کے احساسات ہی نارمل نہ تھے۔ ایک طرف شدید غصہ اور نفرت تھی۔ تو دوسری طرف ناپسندیدگی۔

"کیا کام...؟" نظریں اب بھی اخبار کی سرخی پر پھسل رہی تھیں۔ چہرہ سپاٹ اور ہر تاثر سے عاری تھا۔ زین سلگ اٹھا۔

"ان ہی کو بتاؤں گا۔"

سلیمان نے نظریں اٹھا کر زین کو دیکھا۔ اس کے لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"زارا رائے فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ ہرا ایرا غیرا منہ اٹھا کر اس سے نہیں مل سکتا۔"

بے حد نارمل لہجہ مگر زین کا وجود غصے کی آگ میں جھلس گیا۔ اس نے فائل سلیمان کے سامنے میز پر پھینک دی۔

"زارا سے کہیے گا۔ یہ فائل انعم نے بھجوائی ہے۔"

سلیمان نے ایک نگاہ فائل پر ڈالی اور زین کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس نگاہوں میں عجیب سی لپک اور چمک تھی۔ اپنی تمام تر بے خوفی کے باوجود زین کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہوئی۔

"تم جانتے نہیں ہو کہ کہاں کھڑے ہو ورنہ یہ گستاخی۔۔۔" اس کا یوں فائل پٹخنا سلیمان کو ناگوار گزرا تھا۔ "لیکن تمہارا بھی قصور نہیں ہے۔ تم جیسے چھوٹے گھروں کے لوگ کیا جانیں کہ تمیز و تہذیب بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ کیا کریں' دَور ہی ایسا آگیا ہے چیونٹی کے بھی پر نکل آئیں تو اڑنے کی کوشش وہ بھی کرتی ہے۔" اخبار لپیٹتے ہوئے پرسکون لہجے میں زین کی تذلیل کی تھی اس نے۔

"تو اب آپ مجھے تمیز و تہذیب سکھائیں گے۔۔۔ مسٹر سلیمان۔" دونوں ہاتھ کرسی کی پشت پر ٹکاتے ہوئے زین نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"رائے سلیمان۔۔۔ رائے سلیمان حیدر ہے میرا نام۔۔۔ اور تمیز تو تمہیں ایسی سکھائیں گے کہ تم ساری عمر نہ بھول سکو۔ مگر مجبوری ہے رائے سلیمان دشمنی بھی اپنے برابر کے لوگوں سے رکھتا ہے۔" کس قدر حقارت بھرا لہجہ تھا سلیمان کا۔ "جاسکتے ہو تم۔ زارا کو بتادوں گا اگر تمہارا نام یاد رہا تو۔"

وہ اخبار اٹھاتے اٹھاتے رک گئے۔ ایک محظوظ سی مسکراہٹ لبوں کی تراش میں مجسم ہوئی۔ گویا زین کی حالت سے لطف اٹھا رہے ہوں۔

"شاید تم نے اپنا نام نہیں بتایا ابھی تک۔۔۔"

(میں اسی جگہ تم سے اپنا تعارف کرواؤں گا رائے سلیمان۔۔۔ تھوڑا انتظار کرو۔)

وہ ایک جھٹکے سے پلٹا اور گیٹ کراس کر گیا۔ سلیمان اطمینان سے اسے جاتے دیکھتے رہے پھر ملازم کو آواز دے کر بلایا۔

"یہ فائل زارا کو دے آؤ۔۔۔"

زارا کو انعم سے ہی پتا چلا تھا کہ اس نے فائل زین کو دی تھی۔

"مائی گاڈ!" اس نے گھبرا کر زین کو فون کیا۔ خلاف توقع وہ گھر پر ہی موجود تھا اور خاصے خوشگوار موڈ میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"تم رائے ہاؤس آئے تھے؟" زارا نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ہاں۔۔۔"

"کیوں کرتے ہو تم ایسی حرکتیں۔۔۔"

"بے عزتی کروانے کے لیے۔۔۔"

"شٹ اپ۔۔۔" وہ جھنجلا گئی۔

"نہیں بھئی۔۔۔ ذرا لہو گرم رہتا ہے۔ مجھے یاد رہتا ہے کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ ورنہ بابا کی طرح میں بھی ٹھس ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔"

"عجیب نظریے ہیں تمہارے بھی۔۔۔"

"میرے اپنے ہیں اس لیے۔۔۔ ویسے۔۔۔ یہ سلیمان صاحب تو خاصے بے مروت انسان نکلے' چائے پانی پوچھنا تو ایک طرف مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔" وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

"سوری زین۔۔۔"

"کس کس بات پر معذرت کریں گی۔ ان کے حساب ان ہی کی طرف رہنے دیں۔ وقت آئے گا تو خود ہی چکا دیں گے۔ آپ اپنی بات کریں۔" وہ آرام سے بات بدل گیا۔

"اپنی کیا بات کروں۔ عجیب ڈل سی لائف ہو گئی ہے۔" زارا کا لہجہ اکتایا ہوا تھا۔

"کیوں' رضوان صاحب بہت مصروف ہو گئے ہیں آج کل۔" اس نے چھیڑا تو زارا مسکرا دی۔

"شکر ہے' تم نے رضوان کے ساتھ میرے رشتے کو تسلیم تو کیا۔"

"حقیقت تو حقیقت ہوتی ہے زارا بی بی! اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے' انسان کب تک سرابوں کے پیچھے بھاگے گا۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولا تھا۔

"ہوں۔۔۔" زارا نجانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

"پھپھو کے پاس جائیں گی؟" زین نے پوچھا۔

"سنڈے کو جاؤں گی اور کچھ دن وہیں رکوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ پھپھو سے کہیے گا۔ زین انہیں بہت یاد کرتا ہے۔"

"یہ کہنے کی بات نہیں۔ وہ جانتی ہیں۔ ویسے زین مجھے اچھا لگا میں تو سمجھی تھی تم اب بھی پہلے کی طرح۔۔۔"

"کب تک بھاگوں گا۔" زین نے اس کی بات قطع کی۔ پھر بات بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔۔۔؟"

زین کے ساتھ اپنی اسٹڈیز ڈسکس کرتی زارا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کیا سوچے بیٹھا ہے۔

♥ ♥

ویگن نے پہلے کی طرح اب بھی اسے سڑک پر اتارا اور ہارن بجاتی' نہر کے پل کو کراس کرتی دائیں طرف مڑ گئی۔ اس کے ساتھ اترنے والے شخص نے حیرت و تجسس کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے اپنا چھوٹا سا بیگ سنبھالا اور اکلوتے کھڑے تانگے پر بیٹھ گیا۔ اس کے بوجھ سے تانگا پیچھے کو جھولا تو یہاں تھوڑا جھنجلایا' وہیں اگلی سیٹ پر صافہ منہ پر ڈالے اونگھتا ہوا کوچوان بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کدھر جانا ہے باؤ؟"

"گاؤں۔۔۔"

"حویلی۔۔۔؟" کوچوان نے شاید اس کے حلیے اور وضع قطع سے اندازہ لگایا تھا۔ زین ہنس دیا۔

"حویلی بھی جائیں گے لیکن۔۔۔ ابھی تو صرف گاؤں جانا ہے۔"

"گاؤں میں کس کے گھر جانا ہے باؤ۔ بتا دو' سیدھا دروازے تک لے جاؤں گا۔" اس نے غور سے زین کو دیکھا۔

"منزل سامنے مگر رستہ بے نشاں ہے۔ تمہیں کہاں کا پتا بتاؤں۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ تب ہی اس کے ساتھ اترا شخص بھی تانگے پر آ بیٹھا۔

"سلام چاچا' سناؤ کیا حال چال ہے۔"

"اللہ کا کرم ہے۔ ہو آئے شہر سے۔" کوچوان نے تانگا آگے بڑھایا۔

"ہاں چاچا۔۔۔" وہ آپس کی باتوں میں لگ گئے۔

زین خاموشی سے کھیتوں میں پھولی سرسوں دیکھ رہا تھا۔ کچے پکے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اونچی نیچی گلیاں' دھول اڑاتے راستے' جگالی کرتی گائیں' نیم وا آنکھوں سے آنے والوں کو تکتی' اپنی دم ہلا ہلا کر مکھیاں اڑاتیں بھینسیں' گاؤں کا پرائمری اسکول' چھوٹی چھوٹی دکانیں' گوبر تھوپتی' بیرونی دیوار کی لپائی کرتی عورتیں' گھروں کے سامنے چارپائیاں ان پر حقہ گڑگڑاتے بوڑھے' گاؤں کا واحد آڈیو سینٹر اور اس کے سامنے کھڑے بے فکرے نوجوان۔

پیلے پھولوں کی تازگی' باغوں اور کھیتوں کی خوبصورتی اور دلکشی' گاؤں کی ٹیڑھے میڑھے راستے میں دھول ہو جاتی تھی۔

تانگہ رک گیا۔ اس کے ساتھ والے شخص نے پانچ روپے نکال کر تانگے والے کو دیے اور رب راکھا چاچا کہہ کر نیچے اتر گیا۔ زین نے بھی کرایہ دیا اور بیگ سنبھال کر اتر گیا۔ تانگے والا اب بھی متجسس سا وہیں رکا اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ شخص رک گیا۔

"کس کے گھر جانا ہے۔۔۔؟" زین کو وہیں کھڑے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ زین چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر ناسوچے سمجھے بول اٹھا۔

"میں رائٹر ہوں۔ اخباروں میں لکھتا ہوں۔ گاؤں کے پس منظر میں ایک ناول لکھ رہا ہوں تو سوچا سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لوں۔"

"اچھا۔ اچھا۔ تو گاؤں میں کوئی نہیں ہے آپ کا؟"

"نہیں۔"

"ویسے تو یہاں آنے والے مہمان حویلی میں ہی ٹھہرتے ہیں۔۔۔"

"نہیں حویلی نہیں۔۔۔" زین نے ایکدم ہاتھ اٹھا

کر اس کی بات کاٹی۔ "میں عام کسان کی کہانی لکھ رہا ہوں ان کے دکھ ان کی مشکلات۔"

"ہاں تو پھر میرا گھر حاضر ہے نا۔" اس نے پر خلوص انداز میں دعوت دی۔ تانگے والا جو آدھا ان کی طرف جھکا باتیں سن رہا تھا۔ اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

"باؤ! کہانی لکھ رہے ہو ہماری۔"

"ہاں۔"

"تصویر بھی چھپے گی۔"

"نہیں۔" زین ہنس دیا تو اس نے مایوس سا ہو کر تانگا آگے بڑھا دیا۔ زین دوبارہ اس شخص کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہوں گا۔"

وہ اپنا کان کھجانے لگا۔

"تھوڑا بہت پڑھا لکھا تو میں ہوں مگر یہ کیا بلا ہے دوست۔"

"میرا مطلب ہے اپنے کھانے پینے کا خرچ۔"

"نہ بھائی میرے نہ۔ کبھی دیکھا ہے کسی گاؤں میں کوئی ہوٹل ہو جہاں پیسے لے کر مہمان کو روٹی دی جاتی ہو۔ یہ شہر والوں کے چونچلے ہیں۔ ہمیں مہمان کی دو وقت کی روٹی بھاری نہیں۔" یہ پہلا شخص تھا جس نے اسے اپنائیت کا احساس دلایا تھا۔ ورنہ زین کو تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دشمن کے کسی علاقے میں قدم رکھ رہا ہے۔

"مجھے نجانے کتنے دن لگ جائیں۔" وہ اب بھی متذبذب تھا۔

"بھلے ساری زندگی رہو۔ ہم اتنے بھی تھوڑدل نہیں۔ چلو میرے ساتھ۔" اس نے ہاتھ سے بیگ لینا چاہا۔

"نہیں! یہ میں اٹھاؤں گا۔" زین نے سہولت سے منع کر دیا۔

(مجھے یقین تھا۔ میں پہلا قدم اٹھاؤں گا تو راستے خود بخود کھل جائیں گے اور یہ ایک اچھا شگون ہے۔) اس نے ساتھ چلتے شخص کو دیکھا۔ اس نے زین کو بیٹھک میں بٹھایا تھا۔ بڑے بڑے پایوں والے پلنگ پر کڑھائی والی میرون چادریں پڑی تھیں۔ داہنی دیوار کے ساتھ چھ کرسیاں اور میز جس پر سفید کور پڑے تھے۔ دیوار پر اللہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طغرے تھے۔ وہ ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔ کپڑے، جوتے سب مٹی مٹی ہو رہے تھے۔

"میں نے غسل خانے میں پانی رکھ دیا ہے۔ پہلے نہالو۔"

غسل خانہ صحن میں تھا۔ زین نہا کر آیا تو چائے آ گئی تھی۔ ناریل والے بسکٹ، ابلے ہوئے انڈے اور بیسن کے لڈو۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ گاؤں میں آج بھی۔"

"دلسی سے تواضع ہوتی ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "تم شہر والے آج بھی گاؤں کتابوں میں پڑھتے اور فلموں میں دیکھتے ہو۔ اچھا ہوا یہاں آ گئے۔ اب آج کے گاؤں کو دیکھنا۔"

"لیکن یہ سب۔" اس نے لوازمات کی طرف اشارہ کیا۔

"فکر نہ کرو۔ آئندہ ایسا اہتمام نہیں کریں گے یہ تو پہلی بار ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا پھر سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔؟"

"زین العابدین۔ آپ مجھے زین کہہ لیں۔"

"اور آپ کا۔؟"

"قاسم۔" وہ مسکرایا۔ پھر اس کے لیے کپ میں چائے نکالنے لگا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"مجھے اس حویلی سے وحشت ہوتی ہے زارا۔" مما کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ وہ خود بھی بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ سرخ و سپید چہرہ زردی مائل ہو رہا تھا۔ زارا کو خود بھی حویلی پسند نہیں تھی۔ اتنی بڑی حویلی میں نانی اماں کے ساتھ ملازماؤں کی فوج تھی۔ کتنے ہی کمرے تھے جو بند پڑے تھے اور ان کے مکین اب یہاں نہیں رہتے تھے۔

"کبھی یہاں بہت رونق ہو گی۔" اس نے البم میں گروپ فوٹو کو دیکھ کر کہا تھا۔ جس میں پوری رائے فیملی موجود تھی۔ حتی کہ رائے اکبر علی بھی۔ مما نجانے کہاں کھوئی تھیں خاموش ہی رہیں۔ زارا نے انہیں دیکھا۔

"کچھ لوگ، کچھ رشتے، کتنے اہم ہوتے ہیں چاہے توڑ دیں یا جوڑ دیں۔ تنہا انسان کچھ بھی نہیں۔"

"ان ہی رشتوں میں جب دراڑیں پڑتی ہیں تو سب بکھر جاتا ہے۔ کچھ بھی تو باقی نہیں رہتا۔ دلوں میں کدورت و نفرت اور بڑی بڑی حویلیوں میں تنہائی اور وحشت کے سوا۔"

وہ زیر لب بڑبڑائی تھیں۔

"ایک غلط قدم، غلط فیصلہ آنے والے وقت اور نسلوں کو الجھا کر رکھ دیتا ہے۔"

"نورین آنٹی بہت خوبصورت تھیں۔" زارا نے بات بدلنی چاہی۔ مما نے ہاتھ بڑھا کر نورین کی تصویر نکال لی۔ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں۔

"جہاں عورت اپنی فطرت کے خلاف جاتی ہے وہیں خود بھی تکلیف اٹھاتی ہے اور اپنے خاندان کو بھی اس میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

"عورت کی فطرت۔؟"

"سمجھوتا اور صبر۔"

"گویا عورت احتجاج بھی نہ کرے۔"

"احتجاج۔ کس سے؟ تقدیر کے خلاف کون جا سکا ہے؟ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکا ہے، کون ہے جو خدا کے فیصلوں سے منحرف ہو۔"

"ماموں اور نورین آنٹی کی شادی دونوں کی مرضی کے خلاف طے کر دی گئی۔ جبکہ وہ عمر میں ان سے بڑی بھی تھیں۔"

"جمشید نے اسے پوری دیانت داری سے اپنایا تھا۔"

"دیانت داری۔ اور مما محبت؟" اس نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"زارا! یہاں کتنے لوگ ہیں جو شادی سے قبل محبت کرتے ہوں گے۔ میں نے اور عمیر نے بھی تو میرج نہیں کی تھی۔ نورین کی طرح مجھے بھی صرف فیصلہ سنایا گیا تھا۔"

"محبت۔ مما محبت۔ پاپا نے آپ کو محبت، اعتماد اور وفا سب ہی کچھ دیا تھا۔"

"نورین کو بھی یہی سب ملتا وہ انتظار تو کرتی۔ جمشید کو تھوڑا وقت تو دیتی۔ جو عورت اپنے اندر ایک نئے وجود کی پرورش کر سکتی ہے، وہ ایک مرد کی محبت کا رخ اپنی طرف نہیں موڑ سکتی۔"

"یہ کوئی دلیل نہیں ہے مما! ورنہ دنیا کی کوئی عورت ناآسودہ زندگی نہیں گزارے۔ آپ کو ماننا ہو گا کہ نورین آنٹی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔"

"اس سے زیادہ اس نے خود پر ظلم کیا ہے۔ وہ تھوڑی سی سمجھ داری سے کام لیتی تو آج وقت کوئی اور ہی کہانی لکھ رہا ہو تا مگر نورین وہ چنگاری بن گئی جو گندم کے سارے کھیت کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔"

انہوں نے خاموشی سے ماضی کا ایک نیا ورق کھول کر زارا کے سامنے رکھ دیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"ازابیلا کون ہے۔؟"

نورین ابھی ابھی آئی تھی چھوٹتے ہی پوچھنے لگی۔ اس کا لہجہ۔ عمیر کو چائے دیتی آئمہ ایک پل کو گڑبڑائی۔ عمیر نے کپ تھام کر نورین کو دیکھا اور مسکرا دیے۔

"اتنی صبح صبح اور اتنا غصہ۔؟"

"میں اس سے پوچھنے آئی ہوں ازابیلا کون ہے۔؟" اس نے انگلی اٹھا کر آئمہ کی طرف اشارہ کیا۔ خاصا توہین آمیز انداز تھا اس کا۔ شادی سے قبل خاصی دوستی تھی دونوں میں۔ مگر اب لگتا تھا وہ صرف اس کی نند اور بھابھی بن کر رہ گئی ہے۔ ازابیلا ایک یہودی لڑکی تھی جو مسلمان ہو گئی تھی۔ جمشید سے اس کی ملاقات اسپین میں مسجد قرطبہ میں ہوئی تھی۔ سیاحت کا مشترکہ شوق ان دونوں کو قریب لے آیا۔

"دوست تھی جمشید کی۔" آئمہ نے آہستگی سے

بتایا۔ نورین ہر روز ایک نیا پرابلم کھڑا کر دیتی تھی اور آئمہ براہ راست اس کی زد میں آتی تھی۔

"شادی کرنا چاہتا تھا اس سے؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

"نورین! شادی تو اس کی تم ہی سے ہوئی نا..." عمیر نے رسانیت سے کہا۔

"تو پھر یہ کیا ہے...؟" اس نے چند لفافے سامنے میز پر پھینکے... آئمہ سر تھام کر رہ گئی۔ عمیر نے لفافہ اٹھا کر دیکھا۔

"پرانے ہیں شادی سے پہلے کے۔ فرینڈز کے درمیان خط و کتابت تو ہوتی ہی ہے۔" عمیر مطمئن سے لہجے میں بولے۔ جمشید ان کا بیسٹ فرینڈ تھا اور وہ اس کے ماضی کے ایک ایک لمحے سے واقف۔

"تو پھر سنبھال کر کیوں رکھے ہیں اس نے..." وہ چلائی۔

"وہ اپنی ہر چیز یونہی سنبھال کر رکھتا ہے..."

نورین نے ایک نظر انہیں دیکھا پھر جھپٹ کر خط اٹھا لیے۔

"میں دادا جان سے بات کروں گی۔"

آئمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

"نورین اس پر اعتبار تو کرو۔ وہ شوہر ہے تمہارا۔ یوں ہر کسی کے سامنے اسے ڈی گریڈ مت کرو۔"

"تم تو کہو گی آئمہ۔ بھائی ہے نا تمہارا۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

"اور تم میری بہنوں جیسی ہو۔ اسے اگر ازابیلا سے شادی کرنا ہوتی تو کون روک سکتا تھا۔"

"تم... تم تھیں نا اس کی سب سے بڑی مجبوری..." وہ ہاتھ چھڑا کر کئی قدم پیچھے ہٹی۔ "ورنہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"لیکن وجہ ازابیلا نہیں تھی۔"

"میں کئی سال بڑی تھی اس سے..."

آئمہ بے بس سی ہو گئی۔

"اسے موقع تو دو نورین۔"

"کس بات کا کہ وہ ازابیلا سے شادی کر لے... لیکن میں اسے کوئی موقعہ نہیں دوں گی۔" وہ متنفر سے لہجے میں کہہ کر باہر نکل گئی۔

"عمیر! نورین کو کیا ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈونٹ وری..." عمیر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ لیکن نورین نے یہ خط لے جا کر دادا جان کو دے دیے تھے۔ اکبر علی نے وہ خط پڑھے بغیر کئی ٹکڑے کر دیے۔

"ماضی کو مت کریدو۔ تم جمشید کا حال بھی ہو اور مستقبل بھی۔"

انہوں نے بات ہی ختم کر دی۔ لیکن نورین کے لیے یہ بات ختم کرنا آسان نہ تھا۔ وہ ازابیلا کا نام لے کر جمشید کو بہت دنوں تک تنگ کرتی رہی اور جمشید کے پاس واحد حل یہی ہوتا تھا کہ وہ کسی نئے علاقے کی سیاحت کو نکل جائے۔ وہ نورین پر سختی کر سکتا تھا مگر اس صورت میں آئمہ کے لیے پرابلم ہو سکتی تھی۔ وٹے سٹے کی اس شادی نے اسے ایک بڑی مصیبت اور ٹینشن میں مبتلا کر دیا تھا۔ نورین کے اپنے کمپلیکسز نے اسے ایک شکی مزاج عورت کا روپ دے دیا تھا۔ اس پر رائے نواز اور ان کی بیوی بھی نورین پر ہی اعتبار کرتیں۔ وہ جھوٹے سچے الزامات لگاتی تو ان لوگوں کے رویے آئمہ کے ساتھ تبدیل ہو جاتے۔ رائے اکبر اپنے بیمار وجود کے ساتھ حویلی کے ایک کمرے تک محدود تھے۔ ساری جاگیر عملی طور پر رائے نواز اور ان کے بیٹے سلیمان کے ہاتھوں میں تھی۔ عمیر اپنا بزنس شروع کر رہے تھے اور جمشید کو زمینوں کے معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ رائے نواز اور سلیمان صحیح معنوں میں سیاہ سفید کے مالک تھے۔ سلیمان سولہ برس کا نوجوان تھا مگر اٹھان ایسی تھی کہ بیس سے کم نہ لگتا۔ پھر رائے نواز نے بہت شروع سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ اسی لیے اس چھوٹی عمر میں وہ اپنے فیصلے خود کرنے کا عادی ہو گیا۔ رائے عمیر اور رائے جمشید جن معاملات کے بارے میں ابھی اپنی رائے ہی دے رہے ہوتے' وہ انہیں چٹکی بجاتے حل کر لیتا تھا۔ رائے عمیر اس کی

زیرک نگاہی اور خود اعتمادی کو ہمیشہ سراہتے ہوئے کہتے تھے۔

"یہ ہمارے اجداد کا صحیح جانشین ثابت ہوگا۔"

♥ ♡ ♡ ♥

"میں شہر منتقل ہو رہا ہوں۔" جمشید نے رائے اکبر کو آگاہ کیا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"یہاں رہنا ممکن نہیں ہے دادا جان! نورین چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر نت نئے پرابلمز پیدا کرتی ہے۔ آئمہ کے لیے ہر روز ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہم لوگ دور ہوں گے تو۔۔۔"

"تو کیا مسئلے حل ہو جائیں گے۔۔۔" آئمہ نے سب سے پہلے اختلاف کیا۔ "یہاں تم سب کی نظروں کے سامنے رہتے ہو۔ نورین کا جھوٹ سچ فوراً سامنے آجاتا ہے۔ وہاں سے تو نورین جو کچھ بھی کہے گی یہ لوگ اعتبار کرلیں گے۔ میرے لیے تو تب بھی مشکل ہی ہوگی۔"

"بس میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ بھائی نواز نورین کو شہ دیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بلا کر بازپرس کرتے ہیں مجھ سے۔ انہیں کیا حق ہے ہم میاں بیوی کے جھگڑوں میں دخل دینے کا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نورین سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا صرف عمروں کا ہی نہیں سوچ کا بھی فرق ہے ہمارے درمیان مگر دادا جان کی ضد۔۔۔"

"میں تو اس خاندان کو اور مضبوط کرنا چاہتا تھا۔۔۔" وقت نے رائے اکبر جیسے انسان کو بے بس اور کمزور کردیا تھا۔ جمشید نے ان کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیے۔

"خدا گواہ ہے میں نے بھی پوری ایمانداری سے آپ کے اس فیصلے کو اپنایا تھا۔ مگر وہ احساس کمتری میں مبتلا عورت۔۔۔ بہرحال ہم جلد ہی شہر چلے جائیں گے۔"

"اس مٹی سے اتنا دور مت جاؤ کہ یہ تمہیں قبول کرنے سے انکار کردے۔ تم اس جاگیر کے وارثوں میں سے ہو۔ یہ گاؤں یہاں کے لوگ تمہارے اپنے ہیں۔ ان کے قریب رہو۔ ان کے مسائل حل کرو کہ کل کو یہی لوگ تمہارے کام آئیں گے۔"

"میں مجبور ہوں۔"

رائے نواز بھڑک اٹھے۔ نورین نے بھی ہنگامہ کھڑا کردیا۔ کسی کو ان کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ **عمیر** خاموش رہے تھے۔ آئمہ نے پوچھا تو بس اتنا کہا۔

"میرے خیال میں یہی ٹھیک ہے۔"

نورین رو رو کر یہی کہتی رہی کہ جمشید اسے شہر لے جا کر مار ڈالے گا۔ **عمیر** نے سنا تو اسے ڈانٹ دیا۔ وہ مزید آئمہ کے خلاف ہوگئی۔ اس کے خیال میں یہ سب آئمہ کی شہ پر ہو رہا ہے۔

"گر میں سکون سے نہ رہی تو تمہیں بھی چین نہیں لینے دوں گی۔"

"عورت کا سکون، شوہر کی محبت میں پنہاں ہے نورین! اسے سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کرو۔ وہ تم سے مخلص ہے۔ تمہاری یہ حرکتیں اسے تم سے اور دور کردیں گی۔"

آئمہ نے اسے گلے لگا کر رسانیت سے سمجھایا مگر نورین نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔

"جو پاس ہی نہیں۔ اس کے دور جانے کا کیا خوف۔۔۔"

آئمہ طویل سانس لے کر رہ گئی۔ نورین کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔ کچھ عرصہ سکون سے گزرا۔ مگر نورین کے دل میں جو بات بیٹھ گئی تھی اسے نکالنا ممکن نہ ہو سکا۔ جمشید کی بھرپور توجہ بھی اس کے دل میں لگی گرہ نہ کھول سکی کہ جمشید نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا اور وہ محض آئمہ کی وجہ سے مجبور ہوا تھا۔ یہ حقیقت سہی مگر بعد کے حالات بگڑنے میں جمشید سے زیادہ نورین کا ہاتھ تھا یا شاید جمشید ہی اسے یہ یقین دلانے میں ناکام رہا تھا کہ وہ اس سے شادی کے بعد خوش ہے۔

♥ ♡ ♡ ♥

نورین پھر روٹھ کر میکے آئی تھی۔

"آگئی ہے وہ چڑیل واپس۔۔۔"

"کون۔۔۔؟" آئمہ زارا کو پالنے میں لٹا کر اس کی طرف لپکی۔

"میری سوکن ازابیلا۔" وہ دادا کی پٹی سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں جمشید کو فون کرتی ہوں۔" آئمہ گھبرا کر فون کی طرف لپکی۔

جمشید ہنس دیا۔

"ہاں۔ آئی ہے ازابیلا پاکستان۔۔۔ لیکن میری محبت میں نہیں۔۔۔ کے ٹو کی محبت میں۔"

"مطلب۔۔۔؟"

"وہ ایک کوہ پیما ٹیم کے ساتھ آئی ہے اور اس کی منزل کے ٹو کی چوٹی ہے، میرا دل نہیں۔۔۔"

"جمشید! مذاق کا وقت نہیں ہے۔ نورین نے یہاں آکر نجانے کیا کیا کہا ہے۔ بھائی نواز بہت غصے میں ہیں۔"

"اور عمیر۔۔۔"

"تمہیں تو پتا ہے وہ کتنے ٹھنڈے دماغ کے انسان ہیں، جب تک ہر معاملہ صاف ہو کر سامنے نہیں آجائے گا۔ وہ کچھ نہیں کہیں گے۔"

"تو پھر فکر کس بات کی۔۔۔"

"جمشید! تم جانتے ہو نورین کس حالت میں ہے۔۔۔"

"جانتا ہوں۔" وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ "لیکن لگتا ہے نورین کو اس کا احساس نہیں اسے اپنے ہونے والے بچے کی کوئی پروا نہیں ہے۔"

"جمشید! تم تھوڑی احتیاط۔۔۔"

"احتیاط۔۔۔ آئمہ! جہنم بنادی ہے اس نے میری زندگی۔۔۔ وہ ایک ضدی اور شکی مزاج عورت ہے۔ اب اتنی دور سے ازابیلا ایک پرانے دوست سے ملنے چلی آئی تو میں کیا ملنے سے انکار کردوں۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہہ کر بات ہی ختم کردی۔

"اچھا تم حویلی تو آؤ۔"

"آنا تو پڑے گا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ آئمہ کے دل کو تاسف نے گھیر لیا۔ اس کی وجہ سے جمشید کو کیا کچھ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"اس سے پوچھیں، یہ ہماری بہن کو بسانا چاہتا ہے یا نہیں۔۔۔؟" رائے نواز کا لہجہ سخت تھا۔ جیسے کوئی فیصلہ کرلینا چاہتے ہوں۔

"پہلے یہ سوال اپنی بہن سے کریں۔ وہ بسنا چاہتی ہے یا نہیں۔۔۔" جمشید اس ساری صورتحال سے اکتا چکا تھا۔ رائے اکبر نے بے بسی سے انہیں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا۔

"میں نے یہ رشتے تم لوگوں کو جوڑنے کے لیے باندھے تھے۔"

"میں چلتا ہوں۔ نورین کو چلنا ہے تو تیار ہو جائے۔" وہ بات سمیٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"انداز دیکھا ہے اس کا۔ ہماری بہن بھاری نہیں ہے۔ وہ نہیں جائے گی جب تک فیصلہ نہ ہو جائے۔" رائے نواز تلملا کر بولا۔

جمشید نے ایک نظر سب پر ڈالی۔

"ٹھیک ہے، کیسا فیصلہ قبول ہوگا آپ لوگوں کو۔ طلاق چاہیے۔۔۔ میں طلاق دے دیتا ہوں۔"

"رائے جمشید۔۔۔!" بوڑھے شیر کی دھاڑ پر حویلی کے در و دیوار لرز گئے۔ رائے اکبر اپنے کپکپاتے وجود کے ساتھ اٹھ بیٹھے۔ ایک پل کو سب ہی خاموش ہو گئے۔

"یہ مت بھولو کہ تمہارے اس فیصلے کی زد میں تمہاری بہن بھی آسکتی ہے۔" رائے نواز نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔ آئمہ نے دہل کر **عمیر** کو دیکھا۔

"مجھے اس معاملے میں گھسیٹنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے آئمہ سے کوئی شکایت نہیں۔"

"فیصلہ ہوگا تو دونوں طرف سے ہوگا۔" رائے نواز قطعی انداز میں بولے۔ رائے اکبر نے خشمگیں نگاہوں سے سب کو گھورا۔

"تم کون ہوتے ہو فیصلہ کرنے والے۔ میں ابھی مرا نہیں ہوں اور تم۔۔۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر جمشید کی طرف اشارہ کیا۔

"تم دفع ہو جاؤ یہاں سے اور جب تک تمہارا دماغ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا۔ یہاں مت آنا۔"

وہ اب تک جمشید کا ساتھ دے رہے تھے۔ مگر اس کی طلاق والی بات نے انہیں جمشید کے خلاف کر دیا۔ جمشید پھر آیا ہی نہیں۔۔۔ عمیر نے بالا ہی بالا ہی اس سے رابطہ کر کے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں نورین کو تھوڑا وقت دینا چاہتا ہوں۔ اسے احساس تو ہو کہ اس کی ہٹ دھرمی اور ضد اس کا گھر تباہ کر سکتی ہے۔"

نورین کو اس کا احساس تو تھا مگر وہ الزام اب بھی جمشید ہی کو دیتی تھی۔ ہمہ وقت روتی رہتی یا آئمہ سے جھگڑتی رہتی۔ ڈاکٹرز کہتے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں اسے خوش رہنا چاہیے۔ جمشید مصر چلا گیا تھا۔

"اسے میرا پروا نہیں۔ اپنی آوارگی سے پیار ہے۔"

اور جب وہ لوٹا تو نورین یہی شکوہ لیے منوں مٹی تلے جا سوئی تھی اور ایک ننھا سا وجود اس کی راہ تک رہا تھا۔ حویلی کے درودیوار میں اس کے لیے نفرت کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔

"یہ یہاں کیوں آتا ہے۔۔۔؟" رائے نواز اس کی شکل دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے اور ان کا پر تو سلیمان اس سے بات بھی نہ کرتا۔

"اسے منع کریں۔ مت آیا کرے یہاں۔۔۔"

انہوں نے دادا سے مطالبہ کیا۔

"میں اسے کیسے روک سکتا ہوں۔ وہ اس حویلی کے وارثوں میں سے ہے۔ اس جاگیر میں تم دونوں کے برابر اس اکیلے کا حصہ ہے۔۔۔" انہوں نے جواب دیا تھا۔

جمشید خاموشی سے آتا۔ زارا سے کھیلتا، زین العابدین کو پیار کرتا اور واپس چلا جاتا۔ اس حویلی کے لوگ اس سے ویسا ہی سلوک کرتے جیسا ایک اجنبی کے ساتھ کیا جاتا۔ آئمہ کا دل اس کی حالت دیکھ کر کڑھتا۔

"جمشید کو سمجھاؤ۔ یہاں رہے، اپنی جاگیر سنبھالے۔ یہ آوارگی اسے کچھ نہیں دے گی۔ صاحب اولاد ہے وہ۔ اپنی اولاد کے لیے سنبھل جائے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔"

رائے اکبر آئمہ سے کہتے۔ وہ اپنے بستر پر پڑے پڑے آنے والے وقت کی آہٹیں سن رہے تھے۔ جو کوئی اچھی نوید نہیں سناتی تھیں۔

"وہ تمہاری بات نہیں سنتا تو اسے میرے پاس بھیجو۔"

لیکن تقدیر نے انہیں مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اسے سمجھا سکیں۔ رائے اکبر کی وفات ایک مرکز کے ٹوٹ جانے کے مترادف تھی۔ رائے نواز اور سلیمان کے پاس مکمل اختیارات آگئے تھے۔ رائے عمیر یوں بھی جاگیر کے معاملوں میں دخل نہیں دیتے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

رضوان بورڈنگ سے جب بھی گھر آتا، زارا کے لیے چاکلیٹ اور چھوٹے چھوٹے کھلونے لایا کرتا تھا۔ اس کی دونوں بڑی بہنیں مریم اور عائشہ کبھی کبھی خفا ہو کر پوچھتیں۔

"رضوان ہمارے لیے کیوں نہیں لاتے۔"

تو ہاتھ اٹھا کر ایک اسٹائل سے کہتا۔

"تم کوئی بچی ہو جو کھلونوں سے کھیلو گی۔"

"اور زارا۔۔۔"

"شی از مائی بیسٹ فرینڈ۔" بہت متانت سے جواب ملتا۔ شروع شروع میں اسے زارا سے بہت الجھن ہوتی تھی۔

"یہ کیسی گڑیا ہے۔ سارا دن یا سوتی رہتی ہے یا روتی رہتی ہے۔"

مگر جیسے ہی اس نے چلنا سیکھا اور چھوٹی چھوٹی باتیں کرنا سیکھیں۔ اسے گویا کھیلنے کے لیے ایک جیتا جاگتا کھلونا مل گیا تھا کیا سے گاؤں میں عام بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ سلیمان سے وہ ڈرتا تھا۔ مریم اور عائشہ بھی اس سے خاصی بڑی تھیں۔ عائشہ کے ساتھ اکثر لڑائی ہی رہتی تھی۔ اب زارا کو وہ چاکلیٹ لا کر دیتا اور اپنی سائیکل پر بٹھا کر سیر بھی کرواتا تھا۔ زین پیدا ہوا تو اسے ایک ہی جلدی تھی کہ وہ زارا کی طرح باتیں کب کرے گا اور چلنا کب سیکھے گا۔ اسے یقین تھا کہ زین العابدین کے ساتھ اس کی دوستی زارا سے زیادہ ہوگی کیونکہ وہ لڑکا تھا۔ اس بار وہ گھر آیا تو زارا کی چیزوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا بھالو علیحدہ سے پیک تھا۔

"اسے مت کھولیں امی۔۔۔" جیسے ہی اس کی امی نے اسے ہاتھ میں لیا۔ وہ فوراً ہی بول اٹھا۔

"یہ کس کے لیے ہے؟"

"زین کے لیے۔" چاکلیٹ کا ریپر کھول کر زارا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے مصروف سے انداز میں بتایا۔ زین ہمک ہمک کر زارا کے ہاتھ سے چاکلیٹ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"لیکن آپ کو تو زین بہت برا لگتا تھا۔" اس کی امی نے مسکرا کر کہا۔

"اب یہ اچھا ہو گیا ہے۔" اس نے زین کا گال کھینچا۔ پھر بھالو کی پیکنگ کھولنے لگا۔

"رضوان تو بالکل اپنے چچا پر پڑا ہے۔ سنا ہے عمیر بھی ایسا ہی کیئرنگ ہوا کرتا تھا۔" اس کی امی ہنس دی تھیں۔

"ہوا کرتا تھا۔۔۔" عمیر نے مسکرا کر ان کا جملہ دہرایا۔ "بھابھی! میں اب بھی ویسا ہی کیئرنگ ہوں۔ کیوں جمشید۔۔۔؟" انہوں نے خاموش اور گم سم بیٹھے جمشید کو پکارا تو وہ چونک گیا۔

"ہوں۔۔۔"

"کن سوچوں میں ہو یار۔۔۔؟" ایک عمیر تھا جس کا رویہ نورین کے بعد بھی نارمل رہا تھا۔

"مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔۔۔" جمشید نے آہستگی سے بتایا۔

"ہاں تو اپنا اکاؤنٹ چیک کرو۔ ابھی۔۔۔"

"اس میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔۔۔" جمشید نے بات قطع کی۔ اس کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نواز بھائی ہمیشہ زمینوں کی آمدنی میں سے میرا اور تمہارا حصہ ہمارے اکاؤنٹس میں جمع کروا دیتے ہیں۔" عمیر نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ آئمہ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"میرے اکاؤنٹ میں پچھلے ایک سال سے کوئی پیسہ نہیں ہے۔" جمشید نے زور دے کر کہا۔

"میں نواز بھائی سے بات کروں گا۔"

"وہ کہتے ہیں جمشید ان کے ساتھ مل کر جاگیر سنبھالے۔" رضوان کی امی نے آہستہ سے بتایا۔

"تو آپ کو معلوم تھا کہ۔۔۔" آئمہ نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔

"میں نے سلیمان اور اس کے ابو کی باتیں سنی تھیں۔"

"جو وہ سوچ رہے ہیں وہ غلط تو نہیں ہے جمشید! تم ان کے ساتھ مل کر کام کیوں نہیں کرتے۔ جاگیر کے سو مسئلے اور جھگڑے ہوتے ہیں۔" عمیر نے کہا تو آئمہ بول اٹھی۔

"عمیر! نواز بھائی یہ بات جمشید سے براہ راست کر سکتے تھے، یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

"وہ صرف مجھے تنگ کرنا چاہتا ہے اور بس۔۔۔"

جمشید بڑبڑایا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے جمشید۔۔۔"

"غلط فہمی تمہیں ہے عمیر! کیونکہ تم ہفتے میں چھ دن شہر میں گزارتے ہو۔ تم نے ان کی آنکھوں میں وہ نفرت و حقارت نہیں دیکھی جو صرف مجھے دیکھ کر ابھرتی ہے۔ پچھلے ایک سال سے جو سلوک میرے ساتھ اس گھر میں روا رکھا گیا ہے وہ صرف میں نے برداشت کیا ہے اور وہ میرا بھتیجا سلیمان جو مجھ سے زیادہ اختیارات رکھتا ہے اور جسے یہ گمان ہے کہ وہ مجھ سے بلکہ اپنے باپ سے بھی بہتر فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سیاہ و سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ مجھ سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں اور۔۔۔"

"جمشید! آرام سے یار! میری بات۔۔۔"

"برداشت کی ایک حد ہوتی ہے عمیر۔۔۔" وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ "اور آج یہ حد ختم ہو گئی ہے۔"
"جمشید یار! تم ہر فیصلہ جذباتی ہو کر کرتے ہو۔" عمیر نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔
"تم اسے جو بھی کہو لیکن مجھے۔۔۔ جائیداد میں اپنا حصہ چاہیے۔"
گزشتہ تین سالوں نے اسے کس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ خود کو ان سے الگ سمجھنے لگا تھا۔
"اس سے کہنا دن میں خواب دیکھنا چھوڑ دے۔" رائے نواز کا لہجہ استہزائیہ تھا۔
"نواز بھائی! آپ بھی اپنے رویے پر غور کریں۔ کیا ضرورت تھی جمشید کے ساتھ یہ سب کرنے کی۔"
"اس نے ہماری بہن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بھول گئے ہو تم۔"
"نورین نے بھی کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا اس کے ساتھ اور آپ۔۔۔ آپ نے ہر بار اسے شہ دی۔"
"تمہارے منہ میں تمہاری بیوی کی زبان ہے۔"
"آئمہ کو درمیان میں مت لائیں۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے یا تو آپ جمشید کے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کرلیں یا پھر۔۔۔"
"جائیداد نہ تو پہلے تقسیم ہوئی تھی اور نہ اب ہو گی۔" رائے نواز نے ہاتھ اٹھا کر قطعی لہجے میں کہا۔
حالات بگڑنے تھے بگڑتے چلے گئے۔ رائے فیملی کی محبت اور اتحاد جو لوگوں کے لیے مثال بن گیا تھا۔ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ رائے نواز نہ تو اپنا رویہ تبدیل کر سکے اور نہ ہی جائیداد تقسیم۔ ان کی نظروں کے سامنے اپنی بہن کی ناآسودہ اور روتی بلکتی زندگی آجاتی۔ ہر کوئی رائے عمیر نہیں ہوتا جو خون کے رشتوں سے بالاتر ہو کر حالات و واقعات کا تجزیہ کرسکے۔
جمشید زین کو لے گیا۔ رائے نواز بپھر گیا۔
"وہ اس حویلی میں قدم نہیں رکھے گا اور نہ یہاں کا کوئی فرد اس سے ملنے جائے گا۔"
یہ تنبیہہ صرف اور صرف آئمہ کے لیے تھی۔ وہ بے بسی سے عمیر کو دیکھ کر رہ گئی۔ عمیر نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ کبھی کبھی عمیر کو لگتا۔ رائے نواز اس معاملے کو جان بوجھ کر الجھا رہے ہیں۔
"امریکہ چلو گی۔" آئمہ کو ہمہ وقت الجھتے دیکھ کر انہوں نے پوچھا تھا۔ "بہل جاؤ گی۔۔۔"
"چھوڑیں عمیر۔۔۔!" وہ بے زار تھی۔ مگر شیراز ہوسٹل سے آیا تو وہ بھی ضد کرنے لگا۔
"پاپا چلتے ہیں۔ بہت انجوائے کریں گے۔"
"اور مجھے کیا معلوم تھا۔ پیچھے یہ سب ہو جائے گا۔ سب کچھ ختم ہو گیا اور حویلی، جاگیر کا انتظام سلیمان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ واقعی رائے نواز کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔"
آئمہ ایک جھرجھری لے کر ماضی کی دلدل سے باہر نکلیں۔
"پاپا نے ہر موقع پر آپ کا ساتھ دیا تھا۔" زارا ایک طویل سانس لے کر بولی۔
"ہاں۔ انہوں نے ہمیشہ میرا مان رکھا تھا۔ بس میں ہی ان پر اعتماد نہ کر سکی۔" ایک پچھتاوا تھا جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا۔ "میں نے ان سے کہا "عمیر! مجھے کہیں دور لے چلو۔ میرا اس حویلی میں دم گھٹتا ہے۔ میں نہیں رہ سکتی یہاں۔"
"ہم شہر چلے جائیں۔"
"رائے ہاؤس میں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ان سب سے الگ۔۔۔ سب سے دور۔" اور انہوں نے الگ سے گھر لے لیا۔ سب کی مخالفت کے باوجود۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے، ہم زین کے معاملے میں انہیں اعتماد میں لے لیتے تو شاید۔۔۔ انہیں یہ احساس تو نہ ہوتا کہ ہم۔۔۔"
"مما۔۔۔" زارا نے انہیں دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔ "بہت رات ہو گئی ہے۔ اب سو جائیں۔ صبح آپ کی زین سے بات کرواؤں گی۔"
"وہ ٹھیک تو ہے نا۔۔۔"
"بالکل ٹھیک ہے، بلکہ خاصا سمجھ دار بھی ہو گیا ہے۔ آپ اس کی باتیں سنیں گی تو حیران ہو جائیں

گی۔" وہ ان کا دھیان بٹا گئی۔
"اللہ اسے اپنی حفاظت میں رکھے۔۔۔"

♥ ♥

رضوان نے دروازہ دھیرے سے ناک کیا۔
"کون ہے۔۔۔؟" اس کی سوئی جاگی سی آواز پر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔
"ابھی تک بستر میں ہو۔"
بلیک پینٹ، لائٹ گرین لائننگ والی شرٹ میں ترو تازہ چہرہ، بالوں میں نمی ابھی تک موجود تھی۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی کمرہ آفٹر شیو لوشن اور کلون کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اٹھا تھا۔
"آپ۔۔۔" وہ بیک سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ کوئی ملازمہ ہو گی۔ کچھ جھجک کر اس نے تکیے پر پڑا دوپٹہ اوڑھا تھا۔
"ہم آپ کی طرح دیر تک بستر پر پڑے رہنے کی عیاشی افورڈ نہیں کرسکتے۔" اس نے کرسی کھینچ کر بیڈ کے نزدیک کی۔ کی چین اور موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ کر بیٹھ گیا۔
"میں اور مما رات کو کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بہت دیر سے سوئے تھے۔" لمبے بکھرے بالوں کو اس نے ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش کی۔
"کمال ہے مجھ سے تو کبھی اتنی باتیں نہیں ہوئیں۔" لہجے میں ہلکی سی شرارت اور چھیڑ تھی۔
"جو بن کہے سمجھ لے اس سے کیا بات ہو۔"
"گویا میں ساری عمر ہی نقصان میں رہوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ زارا مدھم سا مسکرا کر اٹھنے لگی۔ رضوان نے روک دیا پھر گھڑی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔
"میرے پاس صرف دس منٹ ہیں۔۔۔"
"شہر جا رہے ہیں۔"
"ہاں اور تم۔۔۔" رضوان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"کچھ دن رکوں گی۔" اس نے مختصراً بتایا۔
"اب کیا ارادہ ہے تمہارا۔۔۔"
"شاور لوں گی، ناشتہ کروں گی۔۔۔"
وہ کچھ لمحے متبسم نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔
"میں۔۔۔ مستقبل کے پلان پوچھ رہا ہوں۔"
"تو یوں کہیں۔" وہ کچھ خجل سی ہوئی۔
"ایگزام کے بعد کوئی اخبار جوائن کرلینا۔ کوئی بڑا پروجیکٹ شروع کرنے سے پہلے، تجربہ تو ہونا چاہیے۔"
"میرا بھی یہی ارادہ ہے۔"
"اپنے ارادوں میں اس خاکسار کو بھی شامل کرلیں۔ ایک عرصے سے سراپا انتظار بنے بیٹھے ہیں۔"
وہ اس کی پرشوق نگاہوں سے بچ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔
"آپ کے دس منٹ ختم ہو گئے ہیں۔"
وہ بے ساختہ ہنسا۔ پھر اپنی چیزیں اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔
"میں تمہیں شیراز کے فون کے متعلق بتانے آیا تھا۔۔۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی سنجیدگی در آئی۔
"کیا کہہ رہے تھے۔۔۔"
"رابعہ کے کچھ رشتے دار۔۔۔ شاید اس کے تایا کی فیملی۔۔۔ پاکستان شفٹ کر رہے ہیں تو شیراز چاہتا ہے۔۔۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ زارا منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "تم لوگوں کی کوٹھی انہیں کرائے پر دینا چاہتا ہے۔"
وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔
"مما سے بات کی۔۔۔؟"
"نہیں۔۔۔"
زارا کچھ لمحے سوچتی رہی پھر سر جھٹک کر بولی تھی۔
"ٹھیک ہے رضوان! گھر انسانوں سے بنتے ہیں۔ ان خالی درودیوار میں رکھا ہی کیا ہے۔"
اس کے لہجے میں ہلکی سی اداسی در آئی تھی۔
"تم آنٹی سے بات کرلینا۔"
زارا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔
"پاپا کی فیکٹری کون دیکھ رہا ہے رضوان۔۔۔؟"
"ذمہ داری اٹھائی ہے تو نبھاؤں گا بھی۔ سب کام

ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ تم فکر مت کرو۔"
اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔
"تمہارے ہوتے ہوئے مجھے فکر کرنے کی ضرورت ہی کیا۔" وہ ایک خوشگوار سے احساس کے ساتھ بڑبڑائی تھی۔

♥ ♥

قاسم نے اس سے کہا بھی تھا۔ وہ کچھ لمحے آرام کرلے۔ زین مسکرا دیا۔
"میرے پاس وقت نہیں۔" کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ "مجھے جلد واپس جانا ہے بہت سے کام ادھورے ہیں۔"
وہ دونوں باہر نکل گئے۔ گاؤں کی گلیوں میں گہما گہمی سی شروع ہو گئی تھی۔ گھروں کو لوٹتے کسان اور بیل گاڑیاں چارے سے لدی ہوئیں۔ دودھ کی بالٹیاں اٹھا کر احاطے سے واپس آتیں گندمی رنگت اور چھریرے بدنوں والی عورتیں۔ بنٹے، اخروٹ اور بیٹ لے کر شور مچاتے چھوٹے بڑے بچے، کھلے دروازے، چولہوں سے اٹھتا دھواں، جھریوں زدہ چہروں والے بابے جن کے چہروں کی جھریوں میں صدیوں کا تجربہ بہتا تھا اور ان کی تازہ گرم کی چلمیں اور ان سب کے درمیان خاموشی سے اترتی شام۔ تنور خوب گرم اور روشن تھا۔ اپنی اپنی باری کا انتظار کرتی عورتیں پرات، کنالی سنبھالے اپنی باتیں بھول کر پلٹ کر اسے دیکھنے لگتیں۔
"عام کسانوں اور حویلی والوں کی زندگی میں بہت فرق ہو گا قاسم بھائی۔"
"زمین، آسمان کا۔ بادشاہت کرتے ہیں حویلی والے اس گاؤں پہ۔"
"آپ بھی ان ہی کی زمینیں کاشت کرتے ہیں۔"
"نہ، ہم کوئی کمی ہیں۔ جاٹ ہیں جاٹ اور ہم کسی کی زمینیں کاشت نہیں کرتے۔ تھوڑی ہے پر اپنی ہے۔" اس نے بے حد فخر سے بتایا تھا۔ زین مسکرا دیا۔ وہ بے حد خاموشی سے ان لوگوں میں مکمل مل جانا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا۔ وہ لوگ قاسم سے اس کا تعارف پوچھتے۔ پھر اپنے درمیان نمایاں جگہ دیتے۔ ایک سہولت اسے ہوئی تھی کہ رائے عمیر کی وفات اور اس حوالے سے حویلی والے ابھی تک ان کا موضوع گفتگو تھے۔ نوجوان اس سے فری ہونا چاہتے، مگر زین کی توجہ بزرگ تھے کہ جو کچھ زین معلوم کرنا چاہتا تھا اس کے بارے میں یہی بوڑھے اسے بتا سکتے تھے۔ گفتگو کا رخ پھر سے رائے نواز کی طرف ہوا تو زین نے بے حد احتیاط سے سوال کیا تھا۔
"رائے جمشید کون تھا۔۔۔؟"
"تھا ایک گھٹیا شخص۔۔۔" کوئی جلد باز متنفر سے لہجے میں بولا۔ زین کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ اس نے کڑے تیوروں سے کہنے والے کو دیکھا تھا۔ پھر لب بھینچ کر ضبط کرتا چاچا خوشیا کی طرف متوجہ ہوا۔ جس نے حقے کا لمبا کش لیا۔ پھر ہولے ہولے کھانسنے لگا۔
"چاچا! اب بس بھی کرو۔ تم تو پی ٹی وی جتنا لمبا وقفہ دیتے ہو۔" تنگ آکر چارپائی پر اکڑوں بیٹھے عباس نے کہا تھا چاچے خوشیا نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر ترخ کر بولا۔
"تیری گڈی نکلی چلی جارہی ہے۔ چل اٹھ حقے میں پانی ڈال کر لا۔۔۔"
"چاچا! اب حقہ چھوڑ بھی دے۔ کش تو تجھ سے لگتا نہیں۔ آدھا دم تیرا نے میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔" عباس اٹھتے ہوئے بولا۔ چاچے نے جھک کر اپنا کھسہ اٹھالیا۔ عباس حقے سمیت عقب میں کھلے دروازے میں غائب ہو گیا۔ چاچا اپنی پہلی بات بھول گیا تھا۔ اس نے اپنی جوانی کا کوئی قصہ شروع کردیا۔ جس میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی تھی بہ نسبت رائے جمشید کے۔ زین بات کا رخ نہ بدل سکا تو اکتا کر اٹھ گیا۔
گلیوں میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ کسی کسی گھر کے سامنے جلتے بلب کی زرد و ملگجی سی روشنی رستے کی نشان دہی کر رہی تھی۔ زین نے پلٹ کر دور حویلی میں جلتی

روشنیوں کو دیکھا۔
وہاں پھپھو تھیں۔۔۔ اور شاید زارا بھی۔
اتنے قریبی رشتے اور اتنے ہی دور۔
"اے کاش۔۔۔" اس نے طویل سانس کھینچی۔
قاسم چونک سا گیا۔
"کیا ہوا۔۔۔؟"
"کچھ نہیں۔ گھر چلتے ہیں۔"
"ہاں بھئی تمہاری بھرجائی تو مجھ پر برس پڑے گی۔ کھانا رکھے کب سے انتظار کررہی ہوگی۔"
"آپ کے بچے بھی ہیں۔"
"ایک ہی پتر ہے محمد علی۔۔۔"
چھوٹی چھوٹی باتوں میں رستہ کٹ گیا۔ زین بیٹھک میں ہی رک گیا۔ قاسم اندر چلا گیا۔ ابا چارپائی پر بیٹھا پاؤ دکھ رہا تھا۔
"سلام ابا۔۔۔!"
"وعلیکم السلام! کب آئے شہر سے۔"
"شام کو ہی آگیا ابا۔۔۔"
"سنا ہے کوئی مہمان ہے تیرے ساتھ۔۔۔"
"ہاں ابا مہمان تو ہے دوست سمجھ لے میرا۔ اسماء کھانا تیار ہے۔" اس نے چولہے کے پاس بیٹھی بیوی سے پوچھا۔
"ٹھنڈا بھی ہو گیا۔ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔" اسماء نے کہا اور سلگتی ہوئی لکڑیوں کو پھونکیں مار مار کر آگ جلانے لگی۔
"مہمان کو ادھر ہی بلا لو۔ ہاتھ دھولے۔"
"اچھا ابا۔۔۔!" قاسم اٹھ کر بیٹھک کے دروازے تک آیا۔ "آجاؤ یار۔ ادھر گاؤں میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ ادھر صحن میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔"
زین نے کتاب واپس بیگ میں رکھی اور اٹھ آیا۔
"ادھر نلکے پر ہاتھ دھولو۔" قاسم خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ زین نے صحن میں قدم رکھا۔ نین تارہ گلاس لے کر کمرے سے نکلی تھی۔ نگاہ سیدھی بیٹھک کے دروازے تک گئی۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ اس شخص کو اس نے غور سے نہیں دیکھا مگر وہ اسے لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ سب ہی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ خوف کے مہیب سائے اس کی آنکھوں میں لہرائے۔ دوسرے پل وہ بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ماسے مقبول کے ہاتھ سے بھی نوالہ چھوٹ گیا۔
"تم۔۔۔" ساکت کھڑے زین کے وجود میں جنبش ہوئی۔
"ابھی۔۔۔ ابھی جو لڑکی بھاگ کر اندر گئی۔" اسے شک سا ہوا تھا۔ پھر اس نے ملگجی روشنی میں اس بوڑھے کو بھی پہچان لیا تھا۔
اسے بھولی نہیں تھی اماوس کی رات جیسی گہری اور سہمی آنکھیں۔ مگر اس کے گمان میں بھی نہ تھا وقت انہیں پھر ایک دوسرے کے مقابل لے آئے گا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

آٹھویں قسط

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' وہ پلیٹ ہاتھ سے رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے کے ہر ہر انداز سے غصہ، ناگواری اور تلخی مترشح تھی۔ زین نے کچھ خفیف سا ہو کر قاسم کو دیکھا۔ جبکہ ماے مقبول نے اپنی بات کو دوبارہ قدرے بلند آواز میں دہرایا تھا۔ اس کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔ متحیر سا قاسم ذرا آگے ہوا۔ اسماء کے مصروف ہاتھ بھی رک گئے تھے۔

''ابا! مہمان ہے میرا۔''

''مہمان نہیں ہے یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو۔'' کچھ کہنے کی کوشش میں وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔ کچھ لمحے زین کو یونہی گھورتا رہا۔ پھر ایک جھٹکے سے صافہ کندھے پر ڈال کر باہر نکل گیا۔ قاسم الجھ کر زین کی طرف پلٹا۔

''اسے کو کیا ہوا؟''

زین اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ کیا جواب دیتا۔

''تم دونوں جانتے ہو ایک دوسرے کو؟'' قاسم نے اگلا سوال کیا۔

''ہاں۔۔۔ ایک بار ملاقات تو ہوئی تھی۔۔۔؟'' زین اب آگے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ شاید اب وہ اس گھر میں نہ ٹھہر سکے۔

''کہاں؟'' قاسم نے پوچھا اور ساتھ ہی بیوی کو کھانا لگانے کا اشارہ کیا۔ وہ قریب آئی اور ماے مقبول کی چھوڑی ہوئی پلیٹ اٹھا کر چلی گئی۔ مگر پلٹنے سے قبل بظاہر سرسری مگر بغور زین کو دیکھا تھا۔

''بس یونہی سرراہ۔۔۔ تھوڑا سا جھگڑا ہو گیا تھا۔'' زین نے بتانا مناسب نہیں سمجھا ماما مقبول چاہتا تو بتا دیتا۔

''اچھا۔۔۔ اچھا تم بیٹھو تو۔۔۔ اسماء! جلدی کرو۔'' قاسم کے کہنے پر وہ بیٹھ تو گیا مگر ذہن الجھ سا گیا تھا۔

''تارہ۔۔۔ تارہ۔'' اسماء نے پکارا۔ زین نے مضطرب سا ہو کر پہلو بدلا۔ مگر وہ باہر نہیں آئی تھی۔ اسماء نے میز درمیان میں رکھ کر کھانا لگا دیا۔

''شروع کرو یار۔'' پلاؤ کی خوشبو نے قاسم کی بھوک بڑھا دی تھی۔ مگر زین کو اب کھانے کی خواہش نہیں رہی تھی۔ اس نے بددلی سے تھوڑے سے چاول پلیٹ میں نکالے۔

''کیا ہوا، تم ٹھیک سے نہیں کھا رہے؟'' قاسم نے اس کی بے توجہی فوراً ہی محسوس کی تھی۔ زین نے چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔

''قاسم بھائی! مجھے لگتا ہے، بابا کو میرا یہاں رہنا اچھا نہیں لگے گا۔'' زین کے لہجے میں گہری سنجیدگی در آئی۔

''چھوڑو یار! ابا دل کا برا نہیں ہے۔ بس غصے کا تھوڑا تیز ہے۔ جب تک تمہارا کام نہیں ہو جاتا تم یہیں رہو گے۔'' قاسم نے لاپروائی مگر حتمی لہجے میں کہا تھا۔ مگر زین کے کانوں میں ماے مقبول کی آواز گونج رہی تھی۔

''اس پر یہ مصیبت تمہاری وجہ سے ٹوٹی ہے۔'' اور وہ سوچ رہا تھا۔ کہیں اس کا یہاں رہنا اس لڑکی کے لیے پھر مسئلہ نہ بن جائے۔

♥ ♡ ♥

وہ محمد علی کا کرتا سی رہی تھی۔ چوتھی بار بھی سلائی غلط ہوئی تو اس نے غصے سے کپڑا کھینچ کر دور پھینکا اور خود گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ صندوق سے پیسے نکالتے ماما مقبول نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ پھر رسانیت سے گویا ہوا۔

''پریشان کیوں ہوتی ہو۔؟''

نین تارہ نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا اور شکوہ کناں لہجے میں پوچھنے لگی۔

''اللہ اس طرح کیوں کر رہا ہے میرے ساتھ۔''

''اس کی مصلحت وہی جانے۔'' وہ صندوق کا ڈھکن بند کر کے اس کے قریب آیا۔ نیچے پڑا کپڑا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کے قریب رکھ کر دھیرے سے بولا۔

''میں قاسم کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ وہ مجھے گی۔''اس

نے ایک نظر نین تارہ کے چہرے پر ڈالی پھر نظر چرا گیا۔ ''وہ تجھے گا یہ تیرے پیچھے آیا ہے۔ میں اس سے کہوں گا وہ خود ہی یہاں سے چلا جائے۔''

''تمہیں مجھ پر اتنا اعتبار کیوں ہے ماما۔'' نین تارہ نے سر اٹھا کر عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''گنہگاروں کے چہرے بھلا ایسے ہوتے ہیں۔'' وہ تلخی سی ہنسی ہنس دی۔

''گناہ چہروں پر نظر آنے لگیں تو یہاں ہر کوئی چہرہ چھپا تا پھرے۔۔۔ پر ماما۔۔۔! اگر تم اور تمہارا اعتبار نہ ہوتا تو میں مر جاتی۔ سچ مچ مر جاتی۔''

''نہ پتر! ایسے نہیں بولتے۔ بس میرا دل کہتا ہے۔ اللہ نے تیرے لیے کچھ بہت اچھا لکھ رکھا ہے، کچھ بہت ہی انوکھا۔''

نین تارہ اس کی خوش گمانی پر مسکرا دی۔

''بس پتر! تو دعا کیا کر، وہ۔۔۔'' باہر کسی نے ماے مقبول کو پکارا تھا۔ وہ بات ادھوری چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''منشی بشیر علی آیا ہے۔ میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ قاسم آئے تو بتا دینا۔''

تب ہی اسماء اندر آئی۔

''ابا! چاچا بشیر بلا رہا ہے۔''

''ہاں بس میں جا رہا ہوں۔'' ماما چلا گیا۔ تو اسماء اس کے قریب بیٹھ کر کرتا دیکھنے لگی۔ وہ سلائی کڑھائی میں ماہر تھی۔ نین تارہ کو ہمہ وقت گم صم بیٹھا دیکھ کر سلائی سکھانے لگی تھی۔ مگر نین تارہ کا تو گویا من ہی مر گیا تھا۔ منتشر خیالی، ناامیدی، عدم اعتماد اور خوف اسے کچھ بھی ٹھیک نہیں کرنے دیتا۔

''کرتے کی پٹی ٹھیک نہیں بن رہی۔'' نین تارہ نے آہستگی سے بتایا۔

''یہ تو ٹیڑھی میڑھی سلائی ہے۔'' اسماء نے کرتا لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور پوچھنے لگی۔

''شام کو حویلی چلیں۔''

''کوئی کام ہے؟'' تارہ نے پوچھا۔

''چھوٹی زارا آئی ہے۔۔۔ اس سے مل کر آئیں گے۔'' وہ اسے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں آئیں۔ وہ کمرے میں گھس جاتی۔ وہ باتیں بناتی تھیں کہ مغرور اور نک چڑھی ہے۔ اسماء بلا بھی لیتی تو اتنی گم صم سی رہتی کہ مجبوراً اسے کسی نہ کسی بہانے اٹھانا پڑتا۔

''کیا کرنا ہے باجی! چھوڑیں۔'' نین تارہ بے زار سی ہو کر بولی تھی۔

''بس بس رہنے دو، شام کو چلیں گے۔'' اسماء اس کی بات نظرانداز کر گئی۔

♥ ♡ ♥

تھڑے پر چارپائیاں بچھی تھیں۔ حقہ گرم تھا۔ قاسم اور ماے مقبول کے ساتھ منشی بشیر علی بھی موجود تھا۔ قاسم کو قدرے غصے میں دیکھ کر زین اندر جانے کے بجائے وہیں بیٹھ گیا۔ ماے مقبول نے اضطراری انداز میں پہلو بدلا۔ منشی بشیر نے سوالیہ نظروں سے قاسم کو دیکھا۔

''دوست ہے میرا شہر سے آیا ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' منشی نے زور زور سے سر ہلایا۔

''گاؤں دیکھنے آئے ہو۔ کیسا لگا ہمارا گاؤں؟''

''ہمارا گاؤں۔'' زین زیر لب مسکرایا پھر مختصراً بولا۔ ''اچھا ہے۔''

''کب تک رکو گے۔''

''پتا نہیں۔'' وہ کچھ بیزار سا ہو گیا۔

''اچھا۔۔۔ اچھا۔'' منشی بشیر علی نے پھر سے سر ہلایا اور قاسم کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تو کیا سوچا ہے تم نے؟''

''پہلے مجھے یہ بتاؤ چاچا! میرے ٹیوب ویل لگانے سے حویلی کو کیا تکلیف ہے۔'' قاسم کا لہجہ تلخ تھا۔

''اس کو سمجھا مقبول!'' منشی بشیر علی نے ہاتھ اٹھا کر ماے مقبول سے کہا۔ ''مت لے رائے سلیمان سے ٹکر، نہ کوشش کر اس کی برابری کی۔''

''میں اپنی ہاتھ بھر زمین کے ساتھ کیا مقابلہ کروں گا اس کا۔ اپنے چوہدری سے کہنا دل بڑا کرے۔ میرے ٹیوب ویل لگانے سے اس کے سو مربعوں کو کیا نقصان ہو گا۔''

منشی چپ کر کے حقہ گڑگڑانے لگے۔

''تمہارے بندوں کا تو جب دل چاہتا ہے پانی کھول

دیتے ہیں، جب دل چاہتا ہے بند کردیتے ہیں' ہماری تو روزی بندھی ہے اس تھوڑی سی زمین سے۔" قاسم کھول رہا تھا۔

"اچھی بھلی قیمت دے رہا تھا رائے سلیمان۔ بیچ دیتے تو۔"

"میں بھی زمین بیچ دیتا اور پھر حویلی میں منشی گیری کرتا تمہاری طرح۔" قاسم نے خاصا گہرا طنز کیا تھا۔ ماے مقبول کو تو لنا پڑا۔

"آرام سے قاسم! آرام سے۔"

زین نے بے حد غور سے حقہ گڑگڑاتے منشی بشیر علی کو دیکھا۔

"آپ حویلی میں منشی ہیں۔؟"

"ہاں بیٹا جی۔ میرے باپ نے زمین بیچی اور حویلی میں منشی ہو گیا۔ مرنے سے پہلے یہی عہدہ مجھے دے گیا۔ میں تو پیدائشی منشی ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"گویا رائے فیملی کے ساتھ قریبی تعلق رہا ہے آپ کا۔"

"ایسا ویسا۔ اس حویلی میں ایسا کیا ہوا ہے جو مجھے نہیں معلوم۔" وہ اک فخر سے بولا۔

"ٹھیک کہا آپ نے' آپ تو چوہدریوں کی رگ رگ سے واقف ہوں گے۔" زین نے توصیفی نگاہوں سے اس مضبوط جسم والے بوڑھے شخص کو دیکھا۔ وقت صرف اس کے چہرے کو جھریوں اور بالوں کو سفیدی عطا کر گیا تھا ورنہ وہ آج بھی کمر سیدھی کر کے چلتا تھا۔

"رائے جمشید کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ قتل کر سکتا ہے؟"

زین نے اچانک مگر سرسری انداز میں پوچھا تھا۔ حقے کا دھواں منشی بشیر علی کے حلق میں پھنس گیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا اور اس کی کھانسی نے خاصا طویل وقفہ لیا تھا۔ زین کی منتظر نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ ذرا سانس بحال ہوا تو اس نے گردن گھما کر بہت غور سے زین کو دیکھا۔

"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

زین مبہم سا مسکرایا۔ (مجھے ایسے ایک شخص کی تلاش ہے۔ جو کہے کہ قتل رائے جمشید نے نہیں کیا)

"یونہی جب سے یہاں آیا ہوں بہت ذکر سنا ہے۔" زین کا لہجہ ہنوز سرسری تھا۔ "یہ بات عجیب نہیں لگتی کہ قتل ہو جائے اور پولیس میں رپورٹ درج نہ ہو۔ قاتل فرار ہو جائے اور ساری عمر گرفتاری نہ ہو۔"

"تم شہر والوں کو عجیب لگتی ہوگی۔ پر یہ گاؤں ہے' یہاں حکومت' بھی چوہدریوں کی اور قانون بھی چوہدریوں کا۔" منشی بشیر علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے کہا۔

"مگر۔" زین نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر منشی بشیر علی کے ہاتھ کے بڑھتے ہوئے دباؤ نے اسے خاموش کروادیا۔ وہ سپاٹ سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"جو بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے چھوڑ دو بچے! تم مہمان ہو۔ چند دن رہو گے' چلے جاؤ گے گڑے مردے کیوں اکھاڑتے ہو' کیوں مقبول؟" اس نے تائید طلب نظروں سے مقبول کو دیکھا۔ وہ نجانے کس سوچ میں ڈوبا تھا۔ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر یوں ہی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"اچھا تو پتر قاسم! تو سوچ لے اچھی طرح' میں چلتا ہوں۔" منشی بشیر علی کھڑا ہو گیا۔

"ہاں۔ پر چاچا! ایک بات سن میری۔" قاسم بھی اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ زین نے لب بھینچے ہوئے بہت غور سے قاسم کے ساتھ جاتے شخص کو دیکھا۔

"یہ یقیناً" بہت کچھ جانتا ہے۔"

اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔ پاس بیٹھے ماے مقبول نے اضطراری انداز میں پہلو بدلا۔ کچھ لمحے جوتے پر لگی نادیدہ مٹی جھاڑتا رہا۔ پھر ایک دم سر اٹھا کر چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔

"تم تو کہتے تھے' تمہارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

خود سے الجھتے زین نے چونک کر اسے دیکھا اس سے قبل کہ وہ کوئی وضاحت کرتا۔ ماما مقبول زہر خند لہجے میں بولا۔

"پھر کیوں پیچھے پڑ گئے ہو اس معصوم کے باپ کے پیچھے

ہی تمہاری ڈیوٹی ہوئی ہے۔ تم پھر چلے آئے۔"

"بابا! یہ محض اتفاق ہے۔" اسے وضاحت کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"سارے اتفاق تمہارے ساتھ ہی کیوں ہوتے ہیں۔" اس کا لہجہ چبھتا ہوا اور تلخ تھا۔ زین ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے محض اتنا ہی کہہ سکا۔

"میں یہاں آنے سے قبل بالکل بے خبر تھا۔ مجھے۔"

"ہاں! سارا کھیل اس بے خبری کا ہی تو ہے۔ بے خبری میں اس کے پاؤں میں کانچ لگ گیا۔ بے خبری میں تم نے مرہم پٹی کی۔ بے خبری میں اس پر الزام لگا اور بے خبری میں تم پھر یہاں تک چلے آئے۔ یہ بے خبری نجانے اور کیا کچھ دکھائے گی۔"

"میں کچھ بھی کہوں' آپ اعتبار نہیں کریں گے۔"

"اب بھی تم پر اعتبار کروں۔" غصے سے اس کا وجود لرز لرز گیا۔ "وہ گھر سے بے گھر ہو گئی۔ جو کچھ اس پر بیتی ہے کہتے ہوئے میری زبان کانپ جاتی ہے اور تم کہتے ہو' تم پر اعتبار کروں۔ تم سہارا دے نہیں سکتے تو سہارے چھین کیوں رہے ہو۔ میں نے تو ہاتھ باندھ کر تم سے کہا تھا۔ بے غیرت بن کر کہا تھا کہ اسے اپنے نام کا آسرا دے دو تم صاف مکر گئے۔ کیا بگاڑا ہے اس معصوم نے تمہارا' کیوں کر رہے ہو اتنی دشمنی۔"

"میں کیوں کروں گا اس کے ساتھ دشمنی۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"کر رہے ہو۔" ماما مقبول ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"آپ نے بھی میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔" زین بولا تو لہجے میں ہلکی سی تلخی اور خفگی تھی۔ "مجھ پر بے بنیاد الزامات عائد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں کیوں اس کے پیچھے یہاں خوار ہوں گا۔ جبکہ میرا اس لڑکی کے ساتھ کوئی تعلق' کوئی واسطہ ہے ہی نہیں۔ آپ نے بھی بس ان جاہل لوگوں کی باتوں پر اعتبار کر لیا۔ میرا اس کے ساتھ اگر کوئی تعلق ہے تو ثابت کریں میں انکار نہیں کروں گا۔ اتنا حوصلہ ہے مجھ میں کہ کسی سے وعدہ کروں تو اسے آخری سانس تک نبھاؤں۔۔۔ میں۔"

نادانستگی میں وہ اپنے خاندان کا حوالہ دیتے دیتے لب بھینچ گیا۔

"بہرحال۔۔۔ میں اگر یہاں آیا ہوں تو مقصد کچھ اور ہے اور اس سے کہیں زیادہ اہم ہے' یہاں آنا' قاسم کا ملنا اور آپ کے گھر ٹھہرنا' یہ صرف وقت کا مذاق ہے' محض ایک اتفاق' آپ یقین کریں نہ کریں' لیکن سچ یہی ہے۔"

ماے مقبول نے بے حد خاموشی سے اس کی بات سنی تھی۔ بولا تو لہجے میں پہلے جیسی تندی نہ تھی۔ بلکہ ہلکی سی بے بسی جھلکنے لگی تھی۔

"میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس بد نصیب کا آخری ٹھکانا ہے۔ یہاں کسی ایک فرد کی آنکھ میں اس نے اپنے لیے نفرت دیکھی تو وہ مر جائے گی۔ خودکشی کر لے گی اور تم ہم یقیناً" یہ نہیں چاہو گے۔"

"معلوم نہیں تقدیر نے ہم دونوں کے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیلا ہے۔" وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر الجھے الجھے لہجے میں بولا تھا۔ ماما مقبول لب بھینچ کر رہ گیا۔

"یہ نوجوان!" اس نے بغور زین کو دیکھا۔ "اسے دیکھ کر عجیب سا احساس دل میں پیدا ہوتا ہے۔ ایسا احساس جسے کوئی بھی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔"

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" ماے مقبول نے بے اختیار پوچھا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"میرے جواب پر یقین کریں گے یا وہ کہوں جو آپ سننا چاہتے ہیں۔"

ماما مقبول چپ سا ہو گیا۔

"ایک کام ہے' میری زندگی سے بھی زیادہ اہم' ہو گیا تو جلد ہی چلا جاؤں گا۔ ابھی تو میرا کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں ہے۔"

"کیسا کام؟" وہ اس لڑکے سے زیادہ بات نہیں کرنا

چاہتا تھا پھر بھی کر رہا تھا۔

"مجبوری ہے 'ابھی بتا نہیں سکتا۔" وہ آہستگی سے گویا ہوا پھر سر اٹھا کر ماموں مقبول کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں دھند سی پھیل رہی تھی۔

"لیکن آپ فکر نہیں کریں۔ میں چلا جاؤں گا۔"

ماما مقبول کچھ کہنا چاہتا تھا مگر قاسم کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ پھر اسی خاموشی میں پلٹ کر گھر کے اندر چلا گیا۔

"یہ منشی بڑا کائیاں بندہ ہے۔ ابے کا دوست ہے اس لیے تھوڑا لحاظ میں بھی کر جاتا ہوں۔ پر دیکھو نا' یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے کہ ہم اپنی مرضی سے اپنی ہی زمینوں پر ٹیوب ویل نہیں لگا سکتے۔"

وہ اکھڑ لہجے میں کہتا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"پچھلی بار بھی ساری فصل کا ناس ہو گیا تھا۔ سال بھر کی گندم بھی پوری نہ ہوئی۔ اب ہماری کوئی ملیں' فیکٹریاں تو چل نہیں رہیں کہ ادھر سے نقصان ہو تو ادھر سے پورا کریں۔ پر یہ جتنے بڑے لوگ ہوتے ہیں اتنے ہی تھوڑدلے ہوتے ہیں۔" خود ہی بولتے بولتے وہ ایک دم چپ ہوا پھر پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا یار؟"

"ہوں۔" زین چونکا۔ اس نے قاسم کا کوئی ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا۔

"کس سوچ میں ڈوبے ہو؟"

"نہیں۔ تمہاری بات سن رہا تھا۔" وہ سنبھل گیا۔

"کوئی تکلیف کوئی پریشانی تو نہیں یہاں۔؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہو قاسم بھائی۔ مجھے تو لگتا ہے میں اپنے گھر آ گیا ہوں اپنے لوگوں کے درمیان۔"

(کاش! میں واقعی ایسا محسوس کر سکوں۔ یہ اپنی ہی زمین پر' اپنے ہی لوگوں کے درمیان اجنبیت کا احساس۔)

"کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہنا۔" قاسم کہہ رہا تھا۔

"آپ ہی سے کہوں گا۔" وہ قصداً" مسکرایا تھا۔

♥ ♥

دروازہ کھول کر تائی اماں اندر آئی تھیں۔

"اب تم پڑھتی ہی رہو گی۔" زارا کے ہاتھ میں نوٹس دیکھے تو بے حد خفگی سے بولی تھیں۔ ان کے عقب میں ملازمہ دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھی۔

"رکھ دو' اب کیا سر پر سوار رہو گی۔" ملازماؤں سے بات کرتے ہوئے ان کا لہجہ یونہی نخوت زدہ ہو جاتا تھا۔ بچا تاں گلاس ٹیبل پر رکھ کر پلٹ گئی۔

"اب بس کرو زارا! دوپہر میں تھوڑا آرام کر لیا کرو۔"

"بس تھوڑے دنوں کی تو بات ہے تائی جان! اس کے بعد آرام ہی آرام ہو گا۔" زارا نے مسکرا کر کہا۔

"ایک تو یہ پڑھائیوں کے شوق نجانے کہاں سے لگ گئے ہیں تمہیں۔ اچھی بھلی گلابی رنگت جلا کر رکھ دی ہے۔ ہم نے کون سا تم سے منسٹری کروانی ہے۔"

"ہو سکتا ہے' مجھے منسٹری ہی کرنا پڑ جائے۔" وہ متبسم لہجے میں گویا ہوئی۔

"بس۔۔ بس۔" تائی اماں نے ہاتھ اٹھا کر خفگی سے ٹوکا۔ "یہ منسٹری کا شوق گھر کے مردوں کے لیے ہی رہنے دو۔ ذرا فارغ ہو جاؤ پرچوں سے۔۔ پھر ہم تم دونوں کی ایک نہیں سنیں گے۔ بڑوں کو تو بے وقوف ہی سمجھتے ہو تم لوگ۔"

"یہ کس کا غصہ مجھ پر نکالا جا رہا ہے تائی جان۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

"غصہ کس بات کا نکالوں گی۔ سیدھی سادی بات کی ہے میں نے۔"

"مما سو گئیں کیا؟" زارا نے فوراً" موضوع بدلنے کی ضرورت محسوس کی۔

"پتا نہیں ناشتے کے بعد سے اپنے کمرے میں بند ہے۔ زارا بٹی! ماں کا خیال رکھا کرو۔ وہ تو بالکل ہی خاموش ہو گئی ہے۔ نہ کسی سے ملتی ہے نہ ڈھنگ سے بات کرتی ہے اور نہ ہی کسی اور معاملے میں دلچسپی لیتی ہے۔"

"کوشش تو کرتی ہوں۔ مگر۔ ابھی زیادہ وقت بھی تو نہیں گزرا۔" وہ رنجیدہ سی ہو گئی۔

"بس بٹی! بعض دکھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وقت تھوڑا گزرے یا زیادہ ہمیشہ تازہ ہی رہتے ہیں۔"

زرا خاموش سی ہو گئی۔

"اچھا! یہ باداموں والا دودھ ہے۔ تم نے صبح ناشتہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔ ضرور پی لینا۔" تائی جان نے کہا۔ تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ تائی جان کے جانے کے بعد وہ کچھ لمحے یونہی بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر مما کے کمرے میں آ گئی۔ نیم تاریک کمرے میں مما بیڈ پر دراز تھیں۔

"مما! سو رہی ہیں۔؟"

مما نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"نہیں' یونہی لیٹی تھی ذرا۔" وہ مضمحل سے انداز میں اٹھیں اور بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

زارا نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردہ کھینچ دیا۔ سورج کی روشنی نے کمرے میں گھس کر نیم تاریکی کا گلا گھونٹ دیا۔ زارا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھیں۔ اک طویل رفاقت کا خاتمہ انھیں اندر تک توڑ گیا تھا۔ وہ معمول سے کچھ زیادہ مضمحل اور افسردہ نظر آ رہی تھیں۔

"مما! آر یو آل رائٹ؟"

"زارا! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

"کیا؟"

"میں نے گھر فون کیا تھا۔"

"اوہ۔" زارا کو خیال آیا۔ اس نے ابھی تک مما سے بات نہیں کی تھی۔ حالانکہ رضوان نے اس سے کہا بھی تھا۔

"وہاں کوئی پرانا ملازم موجود نہیں اور کون لوگ ہیں جو وہاں آئے ہیں اور کس سے پوچھ کے۔ شیراز نے کسی سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا۔" وہ بہت دلگرفتہ لگ رہی تھیں۔

"سوری مما۔" زارا ان کے قریب بیٹھ گئی۔ "رضوان سے بات ہوئی تھی میری۔ شیراز نے ہی ان کو فون کیا تھا۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ آپ سے بات کر لوں۔ آئی ایم ویری ساری۔"

"زارا! وہ گھر۔۔"

"کیا فائدہ مما! ان خالی در و دیوار میں رکھا ہی کیا تھا۔ جب پاپا ہی نہیں رہے۔"

"کتنی یادیں وابستہ تھیں اس گھر سے۔"

"یادیں تو دل میں بستی ہیں' دیواروں میں نہیں اور اب تو سب ہی کچھ بدل گیا ہے اور بہت کچھ بدل جائے گا۔ کمپرومائز تو کرنا پڑے گا۔"

مما خاموش ہی رہیں تو وہ لہجہ بدل کر بولی تھی۔

"چھوڑیں اس سب کو' چلیں زین سے بات کرتے ہیں۔" وہ جانتی تھی۔ ایک ہی چیز ان کا موڈ بدل سکتی ہے۔ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر ملایا۔ بہت دیر کے بعد سلیم نے فون اٹھایا تھا۔

"ہاں جی کے بچے' کہاں تھے؟ کب سے بیل جا رہی ہے۔"

"اوہ باجی! میں ذرا لان کی کاٹ چھانٹ کر رہا تھا۔"

"اپنے بھائی جان کو بلاؤ۔ ذرا اس کی بھی کاٹ چھانٹ کریں۔" وہ مما کو دیکھ کر مسکرائی۔

"وہ تو نہیں ہیں۔"

"اچھا۔ وہ آئے تو اسے۔۔"

"پتا نہیں بھائی جان نے کب آنا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اب پرچے دینے ہی آئیں گے۔ سارا گھر چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے۔ اب میں گھر بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اپنی اماں کو لے آیا ہوں یہاں۔"

"زین کہاں گیا ہے؟" زارا متفکر سی ہو گئی۔

"وہ تو ساہیوال گئے ہیں۔"

"ساہیوال۔۔ کیا مطلب؟" وہ بری طرح چونکی۔ مما بھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"ساہیوال کا مطلب تو مجھے بھی نہیں پتا۔" سلیم گڑبڑا سا گیا۔

"وہ کب گیا ہے اور کیا کہہ کر گیا تھا؟" زارا کے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔

"کہتے تھے ادھر پڑھائی نہیں ہوتی۔ وہاں جا کر پڑھوں گا۔" ♥

"کوئی فون نمبر یا ایڈریس وغیرہ چھوڑا ہے اس نے۔"

"نہیں۔ باجی جب سے گئے ہیں۔ خود بھی فون نہیں کیا۔"

"اچھا۔ افتخار آیا تھا اس کے جانے کے بعد؟" زارا نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

"نہیں اتنے دنوں سے تو وہ بھی نہیں آئے۔"

"کمال ہے۔ اچھا دیکھو یہ فون کے پاس ایک ڈائری پڑھی ہوگی۔ اس میں سے افتخار کا نمبر دیکھ کر بتاؤ۔"

"میں دیکھتا ہوں باجی۔" وہ ڈائری ڈھونڈنے لگا۔

"شاید اسی سے کچھ کہہ کر گیا ہو۔" زارا نے یہ جملہ مما سے کہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سلیم کی آواز دوبارہ آئی۔

"باجی! ادھر تو کوئی ڈائری نہیں۔ شاید ساتھ ہی لے گئے ہیں۔"

"کیا احمقانہ حرکت ہے یہ۔" زارا جھنجھلا گئی۔

"اچھا سلیم! اس کا جب بھی فون آئے یا وہ خود آئے اسے کہنا مجھے کال کرے۔"

"وہ وہاں کیا لینے گیا ہے۔" مما نے بے اختیار پوچھا۔

"ہو سکتا ہے یکسوئی سے پڑھنے کے لیے وہاں چلا گیا ہو۔ لیکن وہاں اس کا رہا کون ہے۔" خود زارا بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

"تم نے دیکھا زارا! وہ بھی بدل گیا ہے۔ کیا جانے ہے پہلے وہ مجھے بتا بھی نہیں سکتا تھا۔" مما بہت زود رنج ہو رہی تھیں۔

زارا کچھ نہ کہہ سکی تو تسلی آمیز انداز میں ان کا ہاتھ تھپتھپانے لگی۔

♥ ♡ ♡ ♥

شام کو کمرے سے باہر نکلی تو تائی اماں آرام کر رہی تھیں۔ مما کے پاس اسماء بیٹھی تھیں۔

"کیسی ہو زارا...! آج تو میں صرف تم سے ملنے آئی ہوں۔" اسماء اسے دیکھتے ہی بولی تھیں۔

"میں بھی مما سے پوچھ ہی رہی تھی کہ اسماء آئی نہیں ہے۔" وہ مما کے قریب بیٹھ گئی۔

"بس گھر سے نکلنا ہی کہاں ہوتا ہے۔ پھر محمد علی اتنا تنگ کرتا ہے۔ ابھی بھی ابا اسے لے کر نکلا تھا تو میں نے سوچا مل آؤں۔"

"یہ کون ہے؟" زارا نے اسماء کے قریب بیٹھی بجھے ہوئے چہرے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ جو بس نظریں جھکائے قالین کو گھور رہی تھی۔

"ابے کی بھانجی ہے۔ شہر سے آئی ہے۔"

"پڑھتی ہو۔" زارا نے پوچھا تو اسماء نے گم صم نین تارہ کو ٹھوکا دیا اس نے چونک کر سر اٹھایا پھر آہستگی سے بولی۔

"ایف اے کیا ہے۔"

"آگے کیوں نہیں پڑھا؟"

اس نے بڑی اذیت سے نچلا لب دانتوں تلے دبایا تھا۔ زارا نے بے حد غور سے اس کے چہرے کے چھپے تاثرات کو دیکھا۔

"پڑھتی کیسے؟" اسماء جو بولنے پر آئی تو کچھ بھی نہ چھپایا۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر یونہی ساکت و صامت نظریں قالین پر گاڑے بیٹھی رہی۔ گود میں دھرے ہاتھوں میں لرزش اتر آئی۔ زارا اور مما نے بے حد ہمدردی سے اسے دیکھا۔

"اب پڑھو گی؟" زارا نے پوچھا تو وہ زیرلب بڑبڑائی۔

"اب کیا کروں گی پڑھ کر۔"

"اوں ہوں۔" زارا نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"نین تارہ! یہ زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے دوسروں کے لیے ضائع کر دیا جائے۔ زندگی خدا کی امانت ہے اور ہر انسان کو اسے سنوارنے کا حق حاصل ہے۔ اپنے لیے اور ان لوگوں کے لیے جنہیں تمہاری ضرورت ہے۔"

"زارا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ یہ مصیبتیں، یہ تکلیفیں تو انسان کو کندن بنانے آتی ہیں۔ آزمائش ہے تمہاری صلاحیتوں کی اور ان لوگوں کی جن کے ہاتھ میں خدا نے

تمہارا معاملہ دیا تھا۔ ان کی آزمائش تو ہو گئی۔ اب تمہیں اپنی صلاحیتیں آزمانا ہیں۔ ثابت کرو کہ تم معمولی لڑکی نہیں ہو۔ کمزور ہو تو خود کو مضبوط کرو۔ تعلیم پہلی سیڑھی ہوگی اور مجھے یقین ہے ان بہت سی آزمائشوں کے بعد خدا تمہیں کسی بڑے انعام سے نوازے گا۔"

نین تارہ کی آنکھیں لبالب بھر آئیں۔ دل اک آبلہ تھا، کوئی ہمدردی کا پھایا بھی رکھتا تو پھوٹ جاتا۔ وہ اس مہربان خاتون کے گلے لگ کر بہت سا رونا چاہتی تھی مگر سارے آنسو آنکھوں کے اندر منجمد ہو گئے تھے۔ بہت رو چکی تھی وہ۔

"میں تمہیں کتابیں منگوا دوں گی۔" زارا نے کہا تھا مگر اسماء تیزی سے بول اٹھی۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ قاسم شہر آتا جاتا رہتا ہے۔ وہ لا دے گا۔" وہ اک خود دار شخص کی بیوی تھی۔ زارا نے اصرار نہیں کیا مگر تاکید ضرور کی تھی۔ اسماء اجازت لے کر کھڑی ہو گئی۔

"تم نے دیکھا، کیسی شاندار حویلی ہے۔"

بڑے بڑے کمروں، راہداریوں والان عبور کر کے باہر نکلیں تو اسماء نے پوچھا۔ پاؤں کے انگوٹھے پر نظریں جما کر چلتی نین تارہ نے چونک کر سر اٹھایا تو اس جنتو کے تندور کے پاس زین کو کھڑا دیکھ کر ساکت سی ہو گئی۔ لاشعوری طور پر وہ اسماء کے عقب میں ہو گئی تھی۔ اسماء بھی سوال بھول کر دوپٹے کی اوٹ سے زین کو دیکھنے لگی جو رخ بدل کر تندور پر رکھی کڑاہی کی طرف متوجہ تھا۔

"زن کے سوہنا ہے۔"

"پر دوسروں کے نصیبوں میں سیاہی گھول دیتا ہے۔"

اس کے قریب سے گزرتا چند سیکنڈ کا فاصلہ صدیوں پر محیط ہو گیا، ہاتھ پاؤں بے جان سے ہو کر ٹھنڈا پسینہ چھوڑ رہے تھے۔ وہ گویا اک لق و دق صحرا میں کھڑی چیخ چیخ کر اس سے التجا کر رہی تھی۔

"چلے جاؤ یہاں سے، تم تو مرہم بھی لگاؤ گے تو لوگ زخم بنا دیں گے۔"

"تارہ...! تارہ! کیا ہو گیا تمہیں۔" اس کا پیلا پڑتا چہرہ پسینہ پسینہ تھا، گھسٹتے قدم...... اسماء بیچ رستے میں بوکھلا گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" وہ اسماء کا ہاتھ دبوچ کر بمشکل مسکرائی۔ "یونہی چکر آ گیا تھا۔"

اس رات اس نے سجدے میں گر کر اپنے رب سے بہت دعائیں کی تھیں۔ اس ایک شخص کے لوٹ آنے کی جس نے کہا تھا۔ "اپنی ذات کی ساری کھڑکیاں بھی بند کر دو گی، میں تب بھی تم تک پہنچ جاؤں گا۔"

♥ ♡ ♡ ♥

"تم بات مت کرو مجھ سے۔" زارا کی آواز سنتے ہی انعم چیخ اٹھی تھی۔

"کیا ہوا اتنا غصہ۔" زارا مسکرا دی۔ کتنے دنوں کے بعد وہ اسے کال کر رہی تھی۔ سو اس کی خفگی بجا تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے تم سے بات نہ کروں۔" وہ دانت پیس کر کہہ رہی تھی۔

"تو فون بند کر دو۔"

"تم ہمیشہ سے اتنی ہی بے مروت ہو۔ کوئی خفا ہو تو اسے منا لیا کرتے ہیں۔" اس نے بے حد چڑ کر کہا تو زارا ہنس دی۔

"سوری انعم ڈیر! میں واقعی کچھ مصروف تھی اس لیے۔"

"رائے رضوان نے کھیتوں میں ہل تم سے چلوانا شروع کر دیا ہے یا۔"

"شٹ اپ۔"

"اوکے۔ یہ بتاؤ تم کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔ ابھی میں نے عظمیٰ کو کال کی تھی۔ وہ مارکیٹ گئی ہے اور حیرت ہے کہ تمہارے بغیر گئی ہے۔"

"ہاں، اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی چیزیں خریدنی تھیں اور میں اس لیے نہیں گئی کہ میرے پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ میں باتھ روم میں پھسل گئی

تھی۔" اس نے افسردگی سے بتایا۔ تبھی ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا گیا تھا۔

"باتھ روم میں نہیں پھسلی۔ اماں نے بیلن پاؤں پر دے مارا تھا۔"

"ہوگئی شاپنگ۔" زارا نے پوچھا۔

"ہاں ابھی۔ ابھی لوٹی ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو گاؤں میں ایسا کیا ہے جو تمہیں واپس ہی نہیں آنے دیتا۔"

"مما کی وجہ سے رک جاتی ہوں۔ ورنہ یہاں ایسا کچھ نہیں جو مجھے روک سکے۔" زارا نے کہا۔ کچھ دیر وہ دونوں سنجیدگی سے اسٹڈیز کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں۔ تب ہی زارا دوبارہ موضوع بدل کر بیلن کی طرف آئی تو عظمیٰ بتانے لگی۔

"یہ محترمہ شادی کی شاپنگ کر رہی ہیں۔ جو چیز بھی پسند کرتی ہیں اس کی قیمت اتنی ہوتی ہے کہ اس کے ابو کا بلڈ پریشر لو اور امی کا ہائی ہو جاتا ہے۔ تنگ آکر انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا۔ اب یہ گھر میں ہوتی ہیں اور وہ لوگ شاپنگ کرتے ہیں۔"

"ایگزامز میں شادی کہاں سے آگئی۔" زارا نے تحیر سے پوچھا۔

"یہ ہماری مائیں اور اگر بیٹی انعم جیسی ہو تو یہی ہوتا ہے۔ اسے تو لگتا ہے صرف شادی ہی زندگی کا سب سے اہم اور بڑا مقصد ہے۔"

"بالکل۔ بالکل۔" انعم نے فوراً تائید کی تھی۔

"اس کو دفع کرو۔ تم واپس کب آ رہی ہو؟۔ ہم کمبائن اسٹڈی کریں گے۔" عظمیٰ نے پوچھا۔

"میں سنڈے کو واپس آ رہی ہوں۔ عظمیٰ! تمہارے پاس افتخار کا نمبر ہے۔" زارا کو اچانک خیال آیا تو یونہی پوچھ لیا۔

"ہاں ہے۔" اس نے سادگی سے نمبر دہرا دیا۔ ایک دم خیال آیا تو وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اس نے شاید ابا کو بتایا تھا اور وہ سارے نمبر مجھ سے ہی لکھواتے ہیں۔"

"زبانی یاد بھی کروا دیتے ہیں۔" انعم کی سرگوشی ابھری۔ جواباً عظمیٰ نے زور سے چٹکی کاٹی تھی۔

"دل میں چور نہیں ہے تو وضاحت کیوں کر رہی تھیں۔ اور زارا سنو' یہ محترمہ آج کل بشریٰ اعجاز کی "پیاں پار" پڑھ رہی ہیں۔ کچھ سمجھ میں آیا؟" انعم متبسم و شریر لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں دال میں کچھ کالا ہے۔"

"کچھ کیا پوری کی پوری دال کالی ہے۔ بس یہ کہتی ہے۔"

"کیا فضول بکواس ہے۔ کیا پنجابی شاعری صرف افتخار پڑھ سکتا ہے۔" عظمیٰ چڑ گئی۔

"تو ہم نے کچھ کہا۔ یا افتخار کا نام ہمارے لبوں پر آیا۔ اس کے باوجود تم کہتی ہو دل میں چور نہیں۔"

"زارا! اللہ حافظ' سنڈے کو واپس آؤ گی تو ملیں گے۔" عظمیٰ کی آواز کے ساتھ ہی لائن ڈسکنکٹ گئی۔ زارا جانتی تھی اب انعم کی دھنائی ہونا تھی۔ اس نے افتخار کا نمبر ڈائل کیا مگر دوسری طرف بزی ٹون سنائی دے رہی تھی۔

"زارا بی بی! آپ کو بڑی بی بی بلا رہی ہیں۔" پھاتاں نے آکر کہا۔

"آتی ہوں۔" اس نے کہا تو وہ واپس چلی گئی۔ زارا نے بھی فون کا ارادہ فی الحال ترک کیا اور تائی اماں کے کمرے میں چلی گئی۔

♥ ♡ ♡ ♥

میں اوہ موتی جھڑا رلیا پیراں تھلے
میں اوہ پھل آں جیڑا سجیا قبراں اتے
میں اوہ ہونی جیدے اگے چپ نے سارے
میں اوہ نعمت جس دا بھار نہ کوئی جھلے

مٹھائی کا ڈبہ چارپائی پر پڑا تھا۔ محمد علی ہاتھ مار مار کر اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نین تارہ کی ساکت نظریں ڈبے پر جمی تھیں۔ کون لایا تھا۔ اسے خبر نہ تھی۔ مگر یہ ڈبہ کیوں بھیجا گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ ان کی فتح مندی اور اس کی شکست کا اعلان تھا۔

"قاسم تو کہتا تھا کہ۔" مامے مقبول کی آواز بہت دور کسی خلا سے ابھر رہی تھی اور گونج گونج کر واپس جا رہی تھی۔

"اس ڈبے میں کیا ہے؟"

بتول کی استہزائیہ مسکراہٹ۔

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس کا اندازہ تجھے اچھی طرح ہے۔"

کوثر کی آنکھوں کی چمک' فتح کا نشان۔

"میں اجمل کو اتنی آسانی سے تمہارا نہیں ہونے دوں گی۔"

اور وہ سارے دعوے' محبت' اعتبار' وفا اور یقین کے دعوے' سب کے سب اس ڈبے میں بند کر کے اسے روانہ کر دیے گئے تھے۔

"میں نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کیا تھا اور یہ خدا کا انصاف ہے؟"

اس نے آہستگی سے اپنی بند مٹھی کھولی۔ پانچ سو کا نوٹ مڑا تڑا' پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

اک آس' اک امید کی طرح سنبھالا تھا اسے۔

"خدا میری ساری دعائیں کہاں سنبھال کر رکھ رہا ہے۔"

اس کی سانس کا پنچھی تھک کر سینے کی دیواروں میں پھنس کر پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ بہت زور سے اندر کہیں اٹک جانے والی سانس کو کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ محمد علی ڈبے کی طرف سے مایوس ہو کر پلٹا۔ اس کی ہتھیلی سے پانچ سو کا نوٹ جھپٹ کر منہ میں لے کر چوسنے لگا۔

ماما مقبول تھک کر اس کے قریب آبیٹھا۔ یہ دنیا اس کے ساتھ کچھ بھی کرتی' وہ شاید پہلا اور آخری شخص تھا۔ جس کے کندھے پر سر رکھ کر وہ رو سکتی تھی۔ مامے مقبول نے بازو پھیلایا۔

"تارو!"

وہ اک جھرجھری لے کر جاگی۔ دوسرے پل اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ اس نے گردن گھما کر مامے مقبول کو دیکھا اور لپکتے آنسوؤں کو۔

"رو کیوں رہے ہو ماما؟" وہ خشک آنکھوں سے پوچھ رہی تھی۔ مامے کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔ اس نے سر اٹھا کر بے حد سنجیدہ کھڑے قاسم اور رنجیدہ سی اسماء کو دیکھا۔

"کیا یہ متوقع نہیں تھا۔" وہ پھر مامے مقبول سے مخاطب تھی۔ مامے مقبول کا بازو پھر پھیلا' وہ چاہتا تھا۔ نین تارہ رو لے۔ نین تارہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر ایک جھٹکے سے چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم کیوں چاہتے ہو کہ نین تارہ روئے۔ کیا یہی نین تارہ کی قسمت ہے کہ وہ ہر بار زخم کھائے اور تمہارے کندھے پر سر رکھ کر روئے۔ کیا سمجھتے ہو تم لوگ مجھے۔ جس کا دل چاہا عزت دی۔ جس کا دل چاہا بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ جس کا دل چاہا ہاتھوں میں وعدہ تھما دیا اور جس کا دل چاہا۔ زندہ درگور کر دیا' میں جانتی ہوں میرا باپ نہیں ہے۔ جو سر کی چھاؤں بن سکے۔ بھائی نہیں ہے۔ جو میری طرف اٹھنے والی انگلی توڑ دے۔" اس کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی۔ "اور تم لوگ۔" اس نے انگلی اٹھا کر مامے مقبول اور قاسم کی طرف اشارا کیا۔ جو ہکا بکا اس نین تارہ کو دیکھ رہے تھے۔ جس کی کبھی اونچی آواز نہ سنی تھی۔

"تمہارا خون سفید ہو گیا ہے۔" اس نے مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں لیا۔ "بے غیرت ہو گئے ہو تم دونوں' ورنہ یہ ڈبہ لانے والے کے منہ پر دے مارتے۔ یوں میرے سامنے رکھ کر میرا تماشا نہ دیکھتے۔" اس نے ڈبہ صحن میں دے مارا۔ مٹھائی زین کے قدموں میں بکھری تھی۔ جو تولیہ ہاتھ میں لیے ششدر سا اس بپھری ہوئی لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں میں اس نے صرف سہم اور اداسی دیکھی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا زندگی میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے' جب بے بسی دم توڑ دیتی ہے اور بغاوت جنم لیتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جو زین کو گاؤں آنے پر اور نین تارہ کو چیخنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے اندر بھی سر جھکا کر ہر ظلم سہہ جانے والی نین تارہ مر گئی تھی اور اب وہ ایک ایک کا گریبان پکڑ کر حساب مانگ رہی تھی۔!

"بولو قاسم! تمہاری بہن پر کوئی یوں الزام دھرتا تو تم یونہی تماشائی بنے دیکھتے رہتے کہ روتی ہے، چیختی ہے یا مرجاتی ہے۔۔۔ اور ماما! تمہاری بیٹی کے ساتھ یہ سب ہوتا تو تم یونہی اس شخص سے جاکر بھیک مانگتے کہ نین تارہ سے شادی کرلو۔۔۔ بے غیرت وہ نہیں جنہوں نے ظلم کیا۔ بے حس تم تھے۔۔۔ جنہوں نے ظلم کرنے دیا۔ ایک بار تو ان کا ہاتھ روکا ہوتا۔۔۔ ایک بار تو ان کی زبان پکڑی ہوتی تو ان کی جرات نہ ہوتی کہ وہ ہر بار میرے ساتھ یہی سب کرتے۔۔۔۔ اور اب۔۔۔ اب ماما تم اس شخص کی ہاتھ جوڑ کر منتیں کرتے ہو کہ یہ یہاں سے چلا جائے۔۔۔ یہ چلا جائے گا تو کوئی اور آجائے گا۔۔۔ تم کس کس کے سامنے ہاتھ جوڑو گے۔۔۔ تم لوگوں کے پاس مجھے دینے کے لیے بس ایک کندھا ہے۔ جس پر سر رکھ کر میں روسکوں۔"

"تارہ! چپ ہو جاؤ۔" اس کی بلند آواز سے خائف ہو کر قاسم نے کہا تھا۔ نین تارہ نے تڑپ کر اسے دیکھا۔۔۔ اس کی نگاہوں میں چبھن تھی اور شدید غصے کی لپک۔

"میں تو اس وقت بھی چپ تھی، جب پانچ سال کی بچی کے چہرے پر پہلا تھپڑ پڑا تھا۔ میں تو اس وقت بھی خاموش تھی جب میرے پاکیزہ کردار پر جھوٹے الزام لگا کر مجھے زندہ درگور کیا گیا۔ میں تو تب بھی کچھ نہیں بولی جب مجھے میرے حق سے محروم کر دیا گیا۔۔۔ میں تو اٹھارہ سال سے چپ تھی اس انتظار میں کہ کوئی تو میرا بھی ہو گا جو میرے لیے بولے گا۔۔۔ لیکن کوئی نہیں ہے۔" اس کے حلق میں کچھ اٹک سا گیا۔ "مجھ سے اپنے رشتے پر اعتبار نہ تھا تو یتیم سمجھ کر ہی ترس کھایا ہوتا۔"

اس نے اپنی کپکپا جانے والی آواز کو بمشکل سنبھالا اور ایک نظر ان سب پر ڈالی۔ اس پر بھی، جو عقب میں دم بخود کھڑا تھا۔

"لیکن اب نین تارہ نہیں روئے گی۔ کسی سے نہیں ڈرے گی۔ جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو میں کیوں ڈروں۔ کیوں سب سے منہ چھپا چھپا کر پھروں۔۔۔ یہ زندگی میری ہے اور مجھے ہی گزارنی ہے۔ میں اسے تم لوگوں کو جینے نہیں دوں گی۔ مجھے اب تم لوگوں سے اپنی پاکیزگی کی گواہی بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ یہ گواہی میرا دل خود دے رہا ہے۔"

وہ پلٹی اور کمرے میں چلی گئی۔ اک طلسم تھا جو ٹوٹ گیا تھا۔ زین ایک بے نام سی کیفیت کا بوجھ دل پر لیے خاموشی سے بیٹھک میں چلا گیا۔ ماما مقبول، قاسم اور اسماء ساکت سے کھڑے تھے۔ بس محمد علی تھا جو پاؤں پاؤں چلتا مٹھائی اکٹھی کر رہا تھا۔ اس کے گرد پانچ سو کا نوٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"ہوا میں تیر چلانے کا فائدہ ہی کیا؟ محض مفروضے قائم کرنے سے کوئی قاتل ثابت نہیں ہو جاتا۔ آخرہ کون شخص ہے جس نے رائے جمشید کو قتل کرتے دیکھا۔"

ایک دم ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس کے گرد بیٹھا ہر شخص ایک دم خاموش ہو گیا۔ چاچے خوشیے کی چارپائی پر اندھیرے کونے میں بیٹھے شخص نے بے حد غور سے زین کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ ایک معنی خیز سی کیفیت اس کی آنکھوں میں ابھری تھی مگر زین اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

"چھوڑو یار! ہمیں کیا، جن کا معاملہ وہ نمٹیں۔" عباس بیزار سا ہو گیا اور زین اس سے زیادہ بیزار ہو کر اٹھا تھا۔ چلتے چلتے وہ چھوٹی نہر کی طرف نکل گیا تھا۔ جس کے دونوں اطراف میں شہتوت اور ٹاہلی کے درخت لگے تھے۔ نہر کے عقب میں وہ شاندار حویلی تھی۔ اس کی اپنی حویلی۔۔۔ اس کے بابا کا گھر، زین کے لیے اس حویلی اور جاگیر پر اپنی ملکیت ثابت کرنا ممکن نہ تھا مگر وہ اپنے بابا کا نام صاف کرنا چاہتا تھا۔ ان کی اور اپنی زندگی پر لگا بدنما داغ دھونا چاہتا تھا۔ مگر ہر سو تاریکی تھی۔

آخر وہ کون شخص تھا جس نے بابا کو قتل کرتے دیکھا۔

نہر کے پانیوں میں جھانکتے ہوئے اس نے ایک بار

پھر سوچا تھا۔ اسے یہاں آئے کتنے دن ہو گئے تھے مگر وہ آج بھی خالی ہاتھ تھا۔ اپنی ہی زمین پر بے یار و مددگار اور بے نشاں، اپنی ہی حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر گھنٹوں سوچتا کہ وہ اندر جائے یا نہ جائے۔ جائے تو کس حیثیت سے۔ کس قدر اذیت ناک تھا یہ بیس بائیس سال پہلے کے واقعات آپس میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے تھے کہ وہ جس سے بات کرتا ایک نیا نام سامنے آتا تھا۔

"مجھے واپس چلے جانا چاہیے۔"

وہ ہر رات یہی مایوس سوچ تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا اور ہر صبح وہیں بھول جاتا تھا۔

نجانے اسے کس نے باندھ دیا تھا؟

اپنی مٹی کی خوشبو نے۔

حویلی کی روشنیوں نے۔

یا پھر ان سیاہ آنکھوں نے جنہیں وہ ایک بار سوچتا تو گھنٹوں بے چین رہتا تھا۔

"وقت ہمیں ایک بار پھر ایک دوسرے کے مقابل کیوں لے آیا ہے۔؟"

وہ اپنے قدموں میں پڑی نادیدہ زنجیروں کی جھنکار سنتا تو جھنجلا جاتا۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

"تمہیں رائے نواز کے قتل اور رائے جمشید کے فرار میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

وہ بری طرح چونک کر پلٹا اس کے سامنے منشی بشیر علی کھڑا تھا۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔ تو کیا لوگ اس کے بارے میں مشکوک ہونے لگے ہیں؟۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو یونہی۔"

"نہیں اگر کوئی دلچسپی ہے اور تم واقعی کچھ جاننا بھی چاہتے ہو تو رائے سلیمان تمہاری بہتر مدد کر سکتا ہے۔ وہ کل شہر سے واپس آرہا ہے۔" منشی بشیر علی کا لہجہ عجیب سا تھا اور وہ بغور اس کے چہرے کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ زین کے لیے اپنے تاثرات چھپانا ممکن نہ رہے تو رخ بدل کر نہر کے پانیوں میں ٹپ ٹپ کرتے کالے شہتوتوں کو دیکھنے لگا۔ پھر زیر لب بڑبڑایا۔

"وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

منشی بشیر علی کچھ لمحے اس کی پشت کو گھورتا رہا۔ پھر سرسری انداز میں پوچھنے لگا۔

"تمہارا کام مکمل ہو گیا۔"

"کون سا کام؟" وہ ایک بار پھر گڑبڑا گیا تھا۔ منشی بشیر علی کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"تم کون سے کام کے لیے آئے ہو؟"

زین کچھ لمحے بشیر علی کو دیکھتا رہا۔ اسے اس شخص کی بوڑھی نگاہوں کی چمک، معنی خیز لہجے نے خائف سا کر دیا تھا۔

"نہیں۔" وہ مختصر سا جواب دے کر پلٹ گیا۔

"ابھی مکمل نہیں ہوا۔"

♥ ♡ ♡ ♥

جیپ کے بریک عین اس کے قریب آکر لگے تھے۔ وہ اچھل کر ایک سمت نہ ہو جاتا تو شاید کچلا جاتا، یا آنے والے کا مقصد ہی اسے ڈرانا تھا۔ وہ غصے سے جھنجلا کر پلٹا اور ایک لمحے کو ساکت سا رہ گیا۔ رائے سلیمان نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ زین کی یہاں آمد انتہائی غیر متوقع تھی۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

زین مبہم سا مسکرایا۔

"یہاں آنے کے لیے آپ سے اجازت لینا پڑتی ہے؟"

"یہ... میرا علاقہ ہے۔ یہاں پرندہ بھی میری مرضی کے خلاف پر نہیں مار سکتا۔" رائے سلیمان کو اس کا لہجہ خاصا ناگوار گزرا تھا۔

زین نے دو قدم آگے ہو کر جیپ کے دروازے پر دونوں ہاتھ ٹکائے۔

"پرندوں پر لاگو ہوتا ہوگا یہ اصول، خوش قسمتی سے میں اک جیتا جاگتا انسان ہوں۔"

"آ تو گئے ہو۔ دعا کرنا ... جا بھی سکو۔" رائے سلیمان نے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ساتھ ہی ڈرائیور کو جیپ بڑھانے کے لیے کہا۔ زین دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جیپ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ سلیمان نے حویلی جاتے ہی منشی بشیر علی کو طلب کیا۔

"گاؤں میں شہر سے کون آیا ہے؟"

منشی بشیر علی ان کے سوال کا مقصد نہیں سمجھ سکا تھا۔ پھر کان کھجاتے ہوئے بتانے لگا۔

"ایک تو ماسٹر عنایت کا جوائی آیا ہے۔"

"میں اس کی بات نہیں کر رہا۔" سلیمان نے تیزی سے بات قطع کی۔ "گاؤں میں ایک بندہ دندناتا پھر رہا ہے کون ہے وہ؟"

"اچھا وہ... قاسم کا دوست ہے، شہر سے آیا ہے۔"

"کتنے دن ہوئے؟"

"ہفتہ بھر تو ہو گیا ہے۔"

"ہفتہ۔" دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے وہ رائے اکبر کی تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے لب بھینچ لیے۔ ہفتہ بھر پہلے ہی زارا گاؤں آئی تھی۔

"حویلی آیا تھا؟"

"نہ بیٹا جی! حویلی کے تو قریب بھی نہیں پھٹکا بس۔" اس نے متذبذب سا ہو کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بس کیا؟"

"بس ادھر ادھر معلومات اکٹھی کرتا رہتا ہے۔"

"کیسی معلومات؟"

"بڑے رائے صاحب اور رائے جمشید کے بارے میں۔"

"کیا مطلب؟" وہ ایڑیوں کے بل اس کی طرف گھومے۔

"پتا نہیں کوئی اخبار وخبار میں کہانیاں لکھتا ہے۔ شاید اس لیے۔" ٹھیک طرح سے تو منشی بشیر علی بھی کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ وہ حویلی کبھی نہیں آیا۔"

"حویلی آتا تو بھلا مجھے خبر نہ ہوتی۔"

"ہوں!" وہ کچھ لمحے سوچتا رہا۔ "ٹھیک ہے نظر رکھو اس پر کہاں کہاں جاتا ہے اور کیا کیا کرتا ہے۔"

♥ ♡ ♡ ♥

مغرب کی اذان کے بعد نیم تاریکی گاؤں کی گلیوں میں چھانے لگی تھی۔ وہ مسجد سے نکلا تو پاؤں اک اور سمت چل دیے اک موہوم سی امید تھی جو کشاں کشاں اسے گاؤں سے باہر کی سمت لے جا رہی تھی۔ نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ دائیں طرف پلٹ گیا۔ دھول اس کے قدموں سے لپٹ رہی تھی۔ پرائمری اسکول کی عمارت پیچھے رہ گئی۔ تھوڑی دیر میں اسے قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری اور گورکن کا کچا کوٹھا نظر آنے لگا۔

بے تحاشا درختوں کی گھنی چھایا میں تاریکی کا احساس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے دادا اور پردادا کی قبروں پر فاتحہ پڑھی پھر گردن گھما کر اس درخت کی سمت دیکھا۔ جہاں وہ بوڑھا گورکن ملا تھا۔ کچے گھر کی چوکھٹ پر لٹکتی لالٹین روشن ہو گئی تھی۔ اندر سے باتیں کرنے اور برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قبروں کے گرد خودرو گھاس اگی تھی۔ کہیں کہیں گھاس اتنی لمبی تھی کہ قبریں اس میں چھپ گئی تھیں، جس میں آوارہ بلیاں اور کتے اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے۔

زین کے عقب میں ایک دم کچھ سرسراہٹیں ابھری تھیں۔

زین تیزی سے پلٹا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ شاید کوئی جانور جو ساتھ کی جھاڑیوں میں گھس گیا تھا۔ اس نے ذرا آگے ہو کر آواز دی تھی۔ کچی کوٹھڑی سے ابھرتی آوازیں ایک دم خاموش ہو گئیں۔

"کیا بھائی آیا۔"

ذرا سی دیر میں ایک نوجوان دھوتی بنیان میں ملبوس چوکھٹ میں آ گیا۔ لالٹین کی روشنی ان دونوں کے بیچ حائل تھی۔ زین نے پہچان لیا۔ وہ بوڑھے گورکن کا بیٹا تھا۔

"کیا ہوا بابو؟ خیر سے تو آئے۔" شاید وہ بھی اسے پہچان گیا تھا۔

"ہاں مجھے تمہارے ابا سے ملنا ہے؟"

"ابا سے۔" اس نے حیرانی سے دہرایا۔ "ابا سے

کیا کام ہے؟"

"یونہی کچھ پوچھنا تھا۔ وہ اس دن مجھے یہاں ملے تھے نا۔"

"ہاں۔ ہاں مجھے یاد ہے۔ پر ابا سے کیا پوچھنا ہے؟"

وہ بہت زیادہ سوال کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا' یا شاید اس کے ابا سے کبھی کوئی ملنے ہی نہیں آیا تھا۔

زین کے چہرے پر چھائی سنجیدگی گہری ہو گئی۔

"یہ تو میں ان ہی کو بتاؤں گا۔"

لڑکے نے بے حد الجھ کر زین کو دیکھا۔ اس کی خاموشی سے تنگ آکر زین نے دوبارہ پوچھا۔

"وہ کہاں ہوں گے؟"

"ادھر۔" لڑکے نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ زین نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں جا بجا قبروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ زین کی استفہامیہ نگاہیں دوبارہ سے اس کے چہرے پر جم گئیں۔

"دس دن ہو گئے ابا کے انتقال کو۔"

"کیا؟" وہ ششدر سا رہ گیا۔ تقدیر ہر راستہ کھول کر دوبارہ بند کر دیتی تھی۔ امید کا آخری سہارا تھا۔ جو ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ کچھ لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔

"باؤ جی! مجھے بتاؤ' کیا پوچھنا ہے۔"

"تم میری کیا مدد کر سکو گے۔" وہ مایوس سا ہو کر پلٹ گیا۔ اس نے عقب سے پکار کر کچھ کہا بھی تھا۔ جسے زین کی سماعت سننے سے قاصر ہی رہی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ ان گھنے درختوں کی اوٹ میں کوئی تھا جو مسلسل اس کے تعاقب میں تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

ماما مقبول دونوں بازوؤں کا تکیہ بنائے لیٹا تھا۔ محمد علی اس کے سینے پر سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ تارہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے قریب آ رکی۔ مامے نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

"ماما! تم مجھ سے ناراض ہو؟"

محمد علی سر اٹھا کر نین تارہ کو دیکھنے لگا۔ مامے کا ہاتھ دھیرے دھیرے اسے تھپکنے لگا۔

"ماما!۔"

"میں کیوں ناراض ہوں گا۔"

"میں نے اس دن۔"

"غلط نہیں کہا تھا۔ کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا تم نے۔ بزدل لوگوں کا جینا بھی کوئی جینا ہے۔ لوگوں کی باتوں سے ڈر کر تمہیں جہنم میں دھکیل دیا۔" مامے مقبول کی آواز بے حد مدھم تھی۔

"لوگوں کی باتیں؟" نین تارہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ کہتے تھے 'مامے کو مکان کا لالچ ہے۔" ماما مقبول اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گیا اور آنکھیں موندے محمد علی کو تھپکتا رہا۔

"کتنی عجیب سی زندگی ہو گئی ہے؟"

صحن کے بیچوں بیچ کھڑی نین تارہ نے خود کو بے حد تنہا محسوس کیا۔ جب سے اس کی زبان کھلی تھی۔ سب اس سے کترائے کترائے سے پھرتے تھے۔ اسماء بھی پہلے کی طرح باتیں نہیں کرتی تھی۔ وہ کیا کرے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرکے لیٹے مامے مقبول کو دیکھا' اور بیزار سی ہو کر خاموشی سے باہر نکل آئی۔

منزل کوئی نہ تھی۔ بس اک خالی الذہنی کی کیفیت کے ساتھ چلتی رہی۔

"اور یہ کہنا کتنا آسان ہے کہ یہ زندگی میری ہے۔ اسے میں خود جیوں گی۔ مگر یہ زندگی اس کے نخرے ہزار۔ اسے جینے کی کوشش میں ہزار بار مرنا پڑتا ہے۔

ہائے انسان دعوا بھی کرے تو کس بل بوتے پر۔"

اس کے قدم تھک ہار کر سوکھے کھوہ (کنویں) کے کنارے جا رکے اس نے ذرا سا جھک کر اس کے اندر جھانکا۔ اس کی اتھاہ گہرائی کی دہشت نے تیزی سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ "اعتبار کے بنا زندگی جینا کس قدر دشوار ہے۔"

دونوں ہاتھ منڈیر پر ٹکا کر اس نے پھر اندر جھانکا۔

"میں نے بارہا سوچا' مرجانا زیادہ آسان ہے۔ مگر یہ کون ہے جو مجھے مرنے بھی نہیں دیتا۔ مگر یہ جھوٹی اور فریبی دنیا جینے کے قابل ہی کہاں ہے۔ یہاں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے میری ضرورت ہو اور جب کسی کو میری زندگی کی ضرورت ہی نہیں تو پھر اس کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔" وہ پھر سے اپنا اعتماد کھو بیٹھی تھی۔

پچ دے گھر کچ دیاں خوشیاں
کچ دے سجن بیلی
کچ دے کارے بنے ساڈے
کچ دی ہولی کھیڈی
کچ دے گھر وچ بہہ کے سوچاں
مان کراں میں کس تے
جنہاں جنہیں پتھر و کھیے
اوہ ہی اپنے دس دے

وہ استہزائیہ سی ہنسی ہنس دی۔

"کون اپنا ہوتا ہے کوئی بھی نہیں۔ سارے رشتے جھوٹے' سارے وعدے فریب' ڈھکوسلے۔" ذرا سا آگے جھکتے ہوئے اس نے پھر سے تصور کیا۔ وہ مر جائے تو کون ایسا ہے جو اس کے لیے روئے گا۔ "ماما! ہاں ماما۔ بھلا آدمی ہے۔ اور کچھ کرے نہ کرے میرے لیے روئے گا ضرور۔ کیا کروں؟ یہاں سے اپنی زندگی۔ اک نئی زندگی کا آغاز یا۔"

"پاگل ہو گئی ہو۔" کسی نے اسے ایکدم کندھوں سے پکڑ کر کھینچا تھا۔ وہ پشت کے بل پیچھے گری۔

"کیوں اپنی زندگی داؤ پر لگا رہی ہو احمق لڑکی! یہ جاہل لوگ تمہاری موت کو بھی الزام بنا لیں گے۔"

وہ ڈر گیا تھا۔ اپنے سامنے کسی کو مرتے دیکھنا آسان بھی تو نہیں۔ نین تارہ نے اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔ جس کی معمولی سی ہمدردی اس کی پوری زندگی کے لیے الزام بن گئی تھی۔

"اور تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم کسی سے نہیں ڈرو گی۔ یہ زندگی تمہاری ہے' اسے تم خود جیو گی۔ تم نے خود کہا تھا کہ تمہیں کسی گواہی کی ضرورت نہیں اور یہ حرکت۔ یوں ڈرو گی تو سب تمہیں ڈرائیں گے کیونکہ یہ خود ڈرے ہوئے لوگ ہیں۔ ایک بار ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو دیکھو ان کے قدم اکھڑ جائیں گے۔ اور وہ ہمت جس نے کل ان بزدل لوگوں کے منہ پر طمانچہ دے مارا' آج کہاں گئی۔ مت کرو اپنی زندگی کو ضائع۔ یہ زندگی خدا کی امانت ہے۔ تمہاری زندگی۔"

"زندگی۔" نین تارہ کے لبوں پر گہرا طنز ابھر آیا۔ وہ جو کسی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتی' اب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہی تھی۔ "یہ زندگی ہے۔ یہ جو میں جی رہی ہوں اسے زندگی کہتے ہیں۔ کیا اس سے زیادہ خوب صورت لمحے موت کے نہیں۔"

زین ششدر سا رہ گیا۔

یہی الفاظ۔ کم و بیش یہی الفاظ کچھ عرصہ پہلے اس نے زارا سے کہے تھے اور اب وہ کہہ رہی تھی۔

"میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور معتوب ٹھہری۔ اک عمر خود کو بچا بچا کر رکھنے کی سزا یہ ملی کہ سب کے لیے قابل نفرت ہوئی۔ میرے اپنے مجھ سے منہ موڑ گئے۔ میں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گئی۔ لوگوں نے' میرے اپنے لوگوں نے مجھ پر وہ وہ الزام لگائے کہ میں نے ہر پل مرنے کی دعا کی۔" وہ اس شخص کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر آنسو ساون کی جھڑی ہو گئے تھے۔ وہ پھر سے کمزور پڑ گئی تھی۔

وہ اسے یہ سب بتانا نہیں چاہتی۔ وہ اب کسی کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بتا رہی تھی۔ حالانکہ وہ اس کا تھا ہی کون۔ اسے اپنی اس کمزوری اور بزدلی سے نفرت ہونے لگی تھی۔ زین تھکے تھکے انداز میں پگڈنڈی پر بیٹھ کر گھاس کی پتیاں نوچنے لگا۔ وہ روتے روتے خود ہی خاموش ہو گئی' تب وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"کاش میں جب تمہاری مدد نہ کرتا۔"

"تم نہ کرتے' کوئی اور کرتا۔ یہ سب تو ایسے ہی ہونا تھا۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک نظر اس کی پشت پر ڈالی۔ وہ زرد نارنجی سورج کی شعاعوں میں نہایا' ڈوبتے سورج پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے نین تارہ! میں اور تم بالکل ایک سی زندگی جی رہے ہیں۔"

اس کا بے حد مدھم لہجہ نین تارہ کے اٹھتے قدموں کو زنجیر کر گیا۔ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا جو کہہ رہا تھا۔

"واقعات و حادثات مختلف ہو سکتے ہیں مگر کیفیات ایک ہیں۔ دکھ و تکالیف مختلف ہو سکتی ہیں۔ مگر درد ایک ہے۔ شاید جس پل تم نے خود کو اکیلا محسوس کیا اسی پل تنہائی کا عذاب مجھ پر بھی اترا تھا۔ جب تمہارے اندر مرنے کی خواہش نے جنم لیا' زندگی مجھے بھی بوجھ لگی تھی۔ بے عزتی کے احساس نے تمہیں گھر سے نکلنے پر مجبور کیا اسی پل میں بھی توہین کے احساس سے دوچار ہو کر نکل کھڑا ہوا تھا۔ جو زندگی تمہارے لیے طعنہ بنی' اسی زندگی کو میں نے بھی بے جرم سزا کی طرح کاٹا ہے۔ کیا یہ درد مشترک نہیں؟"

وہ کھڑا ہو کر پلٹا تو نین اس کے مقابل تھا۔ نارنجی شعاعیں اس کے اطراف سے نکل کر نین تارہ کی آنکھوں میں ڈوبنے لگیں۔ وہ اس کے وجود کے سائے میں ششدر سی کھڑی تھی۔ نارنجی روشنی میں بھیگا یہ انمول لمحہ ان دونوں کو ایک نئے سفر کا اذن دے رہا تھا۔

"کچھ تو ایسا ہے۔ جو ہمیں دوبارہ ایک دوسرے کے مقابل لے آیا۔ تم جانتی ہو' وقت یہ سازش کیوں کر رہا ہے؟"

وہ یک دم دو قدم پیچھے ہٹی۔

اسے وقت اور تقدیر سے کسی مہربانی کی امید نہ تھی۔

اس کے بے اختیار قدم پگڈنڈی پر مڑ گئے۔

"سی۔" وہ ایک دم رکی۔ ایڑی میں کھبا کانٹا بے دردی سے کھینچ کر زیر لب بڑبڑائی۔

"میں نے خدا سے جب بھی کچھ مانگا۔ بدلے میں بس زخم ہی ملا۔"

زین پلٹ کر اس کے لڑکھڑاتے قدموں کو دیکھنے لگا اور ہر اٹھتا قدم اس کے فیصلے کو مضبوط کر رہا تھا۔ وہ چلتا ہوا اس کے برابر آگیا۔ نین تارہ پگڈنڈی سے اتر گئی۔ زین نے بھی اس کی تقلید کی۔ نین تارہ نے ناگواری سے اسے دیکھا اور قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ زین کے قدم بھی نہیں رکے۔

گاؤں کی حد شروع ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ تھا' کھیتوں سے واپس آتے لوگوں نے انہیں دیکھا۔ اونچی نیچی گلیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ تب بھی ساتھ تھا نہ ایک قدم آگے نہ ایک قدم پیچھے۔ کچھ آشنا چہروں پر حیرت سی ابھری۔ وہ اس کے ہم قدم تھا' دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں ڈالے' پُرسکون اور بااعتماد' نگاہ صرف راستے پر تھی۔

وہ بھاگ کر کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

ماے مقبول نے کچھ کہنے کو لب کھولے' عقب میں آتے زین کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ نین تارہ بھاگ کر کمرے میں گھس گئی۔ زین ماے مقبول کے قریب آکر رک گیا۔ ماے مقبول نے کچھ الجھ کر اپنے سامنے کھڑے متذبذب سے نوجوان کو دیکھا۔ وہ کچھ لمحے انگلیاں چٹخاتا رہا پھر بولا۔ تو لہجہ سادہ' ٹھوس اور مضبوط تھا۔

"ایک دن آپ میرے پاس آئے تھے۔ آج میں اپنے دل و دماغ کی پوری آمادگی کے ساتھ آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ میں نین تارہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

ماما مقبول پلکیں جھپکنا بھول گیا۔

♥ ♡ ♥

"کہاں رہ گئیں یہ محترمہ؟" رضوان نے دوسری بار گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

"اپنا پرس لینے گئی ہے۔" مما نے آہستگی سے بتایا۔ رضوان رات ہی آیا تھا اور صبح جانے کے لیے تیار۔ تائی اماں اسی بات پر خفا سی تھیں۔

"میری زندگی میں تو بس اولاد کی دوری ہی لکھی ہے۔ پہلے بورڈنگ' پھر پردیس اور اب شہر نے جکڑ لیا ہے۔ پورا پورا ہفتہ گزر جاتا ہے تمہاری شکل دیکھے۔ تھوڑا ترس ہی کھا لیا کرو ماں پر۔"

"امی!" رضوان بازو ان کے کندھے پر پھیلا کر ہنس دیا۔ "مصروفیت تھوڑی زیادہ ہو گئی ہے۔ لیکن جب بھی موقع ملتا ہے سیدھا گاؤں بھاگتا ہوں۔"

"ہاں' رات بھر رکتے ہو صبح پھر جانے کو تیار۔ ماں تو بات کرنے کو ترس جاتی ہے۔"

"رضوان! ایک فیکٹری بیچ کیوں نہیں دیتے۔" آئمہ جانتی تھیں اس پر دہرا بوجھ ہے۔

"مم آن آنٹی لوگ تو چار چار فیکٹریاں سنبھال لیتے ہیں۔ میں دو نہیں سنبھال سکوں گا۔ انکل کی فیکٹری تو یوں بھی اسٹیبلش ہے۔ سارا کام جوں کا توں ہو رہا ہے۔ بس ذرا نگرانی کرنا پڑتی ہے اور وہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں۔"

وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ آئمہ نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ وہ واقعی عمیر ہی کی طرح تھا۔ کسی بھی بات کو جتانا اس کی عادت نہ تھی۔ تب ہی زارا شولڈر بیگ سنبھالے آگئی۔

"ایک اس کے آنے سے ذرا رونق ہو جاتی ہے مگر یہ بھی ہمیشہ بھاگنے کو تیار رہتی ہے۔" تائی اماں نے شکوہ کیا۔

"میں کئی بار کہہ چکا ہوں۔ چھوڑیں حویلی' شہر چلتے ہیں۔" جواب رضوان نے دیا تھا۔

تائی اماں نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"تم نئی نسل کا بس چلے تو اپنے آباؤ اجداد کی ہر چیز سے جان چھڑا لو۔"

"میں مذاق کر رہا تھا۔" رضوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ تائی اماں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ زارا کو پیار دیا۔ مما نے جلد آنے کی تاکید کی۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔" زارا کو زیادہ فکر مما کی ہی ہوتی تھی۔

"آپ واقعی بہت مصروف ہو گئے ہیں رضوان۔" گاڑی حویلی سے نکلی تو زارا نے کہا۔ ڈرائیونگ ہمیشہ کی طرح رضوان خود ہی کر رہا تھا۔

"ہاں' اب تو تمہیں فون کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔" وہ مسکرا دیا۔

"میں اس لیے نہیں کہہ رہی۔ تائی اماں کو بہت فکر رہتی ہے آپ کی۔"

"اور تمہیں۔" اس کی نگاہیں متبسم و شریر ہوئیں۔

"ظاہر ہے مجھے بھی ہوگی۔" اپنی مسکراہٹ دبا کر اس نے سرسری سا لہجہ اختیار کیا۔ "لیکن مصروفیت کیسی بھی ہو' اپنے لیے وقت تو نکالنا چاہیے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن کیا کریں زارا ڈیر! یہ مقابلے کا دور ہے۔" وہ بے بسی سے کندھے اچکا کر بولا۔ "لیکن آج ایسا کرتے ہیں تھوڑا وقت نکالتے ہیں اپنے اور تمہارے لیے۔ تمہیں گھر چھوڑ کر میں آفس جاؤں گا لیکن لنچ ٹائم تک تیار رہنا۔ لنچ باہر کریں گے اور پھر آؤٹنگ کے لیے کہیں بھی نکل چلیں گے۔" اس نے فوراً ہی پروگرام بنا لیا۔

"اوکے۔ لیکن۔" اس کے باقی الفاظ لبوں میں ہی دم توڑ گئے۔ گاڑی تیزی سے اس شخص کے پاس سے گزر گئی تھی۔ جسے وہ ہزاروں' لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر پھر گردن گھما کر بیک مرر سے اسے دیکھا۔

"مائی گاڈ۔! زین یہاں۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

۹
نویں قسط

زارا سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ زین جیسا بزدل شخص یہ انتہائی قدم اٹھا لے گا۔ وہ بھی بنا کسی سے پوچھے اور مشورہ کیے بغیر۔ جس پل زارا نے آخری بار زین سے بات کی تھی۔ اس کے کسی جملے، کسی انداز سے اس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور اسے زین سے اس بے وقوفی کی توقع بھی نہ تھی کہ وہ منہ اٹھا کر گاؤں پہنچ جائے گا۔ موڑ کاٹ کر سڑک پر آتے ہوئے رضوان نے اس کی سمت دیکھا۔ وہ بات کرتے کرتے ایک دم خاموش ہوئی تھی۔

"کیا ہوا۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔!" وہ چونک گئی۔ نظریں بیک مرر کی طرف اٹھیں، مگر موڑ کاٹنے کی وجہ سے وہ اب غائب ہو چکا تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"کہاں کھو گئیں محترمہ۔۔۔؟" رضوان نے پوچھا تو وہ قصداً ذرا سا مسکرائی۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"کہیں نہیں۔۔۔؟"

(یہ یقیناً "افتخار" کا مشورہ ہو گا۔ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کے سبق وہی دیا کرتا ہے)

"ہم کیا بات کر رہے تھے؟"

"پتا نہیں۔۔۔" ساری باتیں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ ذہن تو پورے کا پورا زین میں جا اٹکا تھا۔ وہ کچھ بیزار سی ہو کر باہر جھانکنے لگی۔ بھاگتے دوڑتے منظروں کی رفتار اس کی سوچوں سے زیادہ تیز نہ تھی۔

رضوان نے رخ موڑ کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ کچھ الجھ گئی تھی۔ ایک ہلکا سا اضطراب دھند کی طرح اس کے چہرے پر بکھر گیا تھا۔

(ابھی تو میں خود میں اتنا حوصلہ پاؤں گا ہی کہ ان کے سامنے جا کھڑا ہوں کہ دیکھو! میں اس شخص کا بیٹا ہوں جس نے کچھ نہیں کیا مگر ساری زندگی بے جرم سزا کی طرح کاٹ دی۔) زین نے ایک بار اس سے کہا تھا۔

"تو گویا تم نے اپنے اندر وہ حوصلہ پا لیا۔" زارا نے سوچا۔ "اور شاید یہ اچھا ہی ہوا۔ تم کب تک ڈبل مائنڈڈ ہو کر سوچتے رہتے۔"

سڑک پر بھیڑوں بکریوں کا ریوڑ گزر رہا تھا۔ رضوان نے گاڑی آہستہ کر لی۔ چرواہا ادھر ادھر بھاگ جانے والی بکریوں کو ہانک رہا تھا۔ گاڑی میں بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔ شاید رضوان نے اس کی بے توجہی محسوس کر لی تھی۔ زارا نے نظروں کا زاویہ بدل کر رضوان کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمائے باہر دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے ہمیشہ اپنی محبت، وفا اور اعتماد کا یقین دلایا تھا۔ صرف لفظوں سے نہیں اپنے عمل اور رویے سے۔ وہ دعوے ہی نہیں کرتا تھا۔ وقت آنے پر ثابت بھی کر دیتا کہ دنیا میں وہی ایک شخص ہے جو وقت آنے پر ڈھال بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے۔

رضوان کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تو کیا یہ شخص قابلِ اعتبار نہیں؟" زارا کا دل چاہا۔ وہ اسے اس راز میں شریک کر لے۔ اسے زین العابدین کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ وہ یقیناً اس کی مدد کرتا۔

"رضوان!" اس نے بے اختیار پکارا تھا۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔۔۔" اس کا لہجہ و انداز متبسم و شریر تھا۔ زارا رک سی گئی۔ پھر کچھ سوچ کر قدرے بیزاری سے بولی تھی۔

"کچھ نہیں۔"

رضوان کی آنکھوں میں ہلکی سی حیرت در آئی۔ زارا کا ہر ہر انداز وہ پہچانتا تھا۔ وہ ٹوک لہجے میں بغیر لگی لپٹی رکھے بات کرنے والی لڑکی تھی۔ ٹھوس، مستحکم مگر رشتوں کا احساس کرتا لہجہ ہوتا۔ مگر کبھی کبھی وہ یونہی اسے پکار لیتی۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ مگر ہمیشہ ہنا کے بات بدل دیتی۔ اس لمحے جو الجھن اس کے چہرے پر نظر آئی وہ رضوان کو بھی الجھا دیتی تھی۔ سڑک خالی ہو چکی تھی۔ اس نے اسپیڈ بڑھا دی۔

"تمہیں معلوم ہے زارا! میرے اور تمہارے رشتے کا سب سے خوبصورت پہلو کیا ہے؟"

رضوان نے پوچھا تو زارا کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ وہ اس رشتے کے کئی خوبصورت پہلو گنوا سکتی تھی، مگر وہ جاننا چاہتی تھی۔ رضوان کے نزدیک سب سے خوبصورت پہلو کون سا ہے۔ رضوان کچھ لمحے منتظر رہا مگر خود ہی بول اٹھا۔

"اعتماد۔۔۔"

"میں جانتی ہوں۔۔۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"پھر بھی لگتا ہے، کہیں کوئی کمی ہے۔۔۔ کوئی کسر رہ گئی ہے میری طرف سے۔۔۔"

"ایسی کوئی بات نہیں رضوان! میں ہمیشہ کہتی ہوں، مجھے آپ پر خود سے زیادہ اعتبار ہے۔"

رضوان کے لہجے میں در آنے والی ہلکی سی مایوسی اس سے برداشت نہ ہوئی تھی۔ رضوان نے رخ بدل کر براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تو پھر تم مجھ سے وہ کیوں نہیں کہہ دیتیں جو کہنا چاہتی ہو۔"

زارا چاہتے ہوئے بھی نظروں کا زاویہ نہیں بدل سکی۔ البتہ رضوان نے اپنی توجہ سامنے مرکوز کر لی تھی۔

"رضوان! اگر میں آپ کو کچھ نہیں بتا پا رہی تو اس میں کچھ بھی مصلحت ہو سکتی ہے۔ مگر وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔" زارا کے لہجے میں سنجیدگی در آئی تھی۔

"کبھی کبھی ہم مصلحت کے ہاتھوں مناسب وقت بھی کھو دیتے ہیں زارا!"

زارا نے چونک کر رضوان دیکھا۔ نجانے کیوں اسے پاپا کی آخری بات یاد آگئی تھی۔ انہوں نے جب کہا تھا۔

"مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ تم لوگوں نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔۔۔" کس قدر افسردگی و مایوسی تھی ان کے اس ایک جملے میں۔

زارا کے اندر اضطراب سا اتر گیا۔

"کیا واقعی ہم اپنی بے جواز مصلحتوں کے ہاتھوں مناسب وقت کھو دیتے ہیں۔۔۔"

ایک فیصلہ سا اس کے اندر اترا۔ وہ کب تک یہ سب چھپا سکتی تھی۔ آج یا کل سب کچھ عیاں ہونا ہی تھا۔ تب رضوان یہ شکوہ کرنے میں حق بجانب ہی ہوتا کہ زارا نے اس پر اعتبار نہیں کیا۔

"اور اب یہ کھیل ختم ہو ہی جانا چاہیے۔"

"رضوان۔۔۔!" اس کے لہجے میں مخصوص الجھن غائب ہو چکی تھی۔ رضوان اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہیں زین العابدین یاد ہے۔۔۔؟" اس نے محتاط سے لہجے میں آغاز کیا۔

"کون زین العابدین۔۔۔؟" وہ ڈیڑھ برس کا بچہ، جس کے لیے وہ ہاسٹل سے کھلونے لایا کرتا تھا کہیں لاشعور میں ہو تو ہو۔ فوری طور پر شعور نے نفی کا سگنل ہی دیا تھا۔

"نورین آنٹی کا بیٹا۔۔۔؟" زارا نے دانستہ یہ حوالہ استعمال کیا تھا۔

"اوہ۔۔۔" وہ چونکا پھر پوچھنے لگا۔ "اس کا یہاں کیا ذکر۔۔۔؟"

"اسی کا ذکر تو کرنے جا رہی ہوں۔۔۔" زارا نے آہستگی سے کہا۔ رضوان نے الجھ کر اسے دیکھا "میں اور مما زین العابدین سے ملتے ہیں۔۔۔"

رضوان کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ دوسرے پل اس کا پاؤں بریک پر دباؤ ڈال گیا۔ جیپ کے پہیے چرچرائے اور وہ عین سڑک کے درمیان رکی تھی۔ کچی پکی سڑک پر دھول کا بادل اٹھا اور بند شیشوں سے سر ٹکرانے لگا۔

رضوان پورے کا پورا اس کی طرف پلٹ گیا۔

"تم اور آنٹی، زین العابدین سے ملتے ہو گویا زین۔۔۔؟"

زارا خاموش بیٹھی شیشوں پر جمی گرد دیکھتی رہی۔ یہی گرد ہے جو ہمارے ذہنوں پر چھا کر سارے منظر دھندلا دیتی ہے۔ واقعات کا اصل رخ ہی چھپا دیتی ہے۔

"کب سے زارا۔۔۔؟"

"ایک سال سے۔۔۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔

رضوان کی آنکھوں میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔ وہ

جو سمجھتا تھا زارا اس سے بھی کوئی بات نہیں چھپا سکتی اور وہ گزشتہ ایک سال سے اس بات کو چھپائے ہوئے تھی۔

"وہ میرا یونیورسٹی فیلو ہے۔۔۔" زارا نے مزید بتایا۔ رضوان کا دماغ ماؤف سا ہو گیا تھا۔ حیرت تھی غصہ اور دکھ بھی۔

"سلیمان بھائی جانتے ہیں۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔" زارا نے مختصراً جواب دیا۔

"تم جانتی ہو۔ سلیمان بھائی کو جب یہ اطلاع ملے گی۔ تو ان کا ردِ عمل کیا ہو گا۔"

زارا نے ایک نظر اسے دیکھا' پھر سامنے دیکھتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں بولی تھی۔ "جانتی ہوں۔۔۔"

"تم ایک ایسے شخص سے ملتی رہی ہو۔ جو میرے باپ کے قاتل کا بیٹا ہے۔۔۔" رضوان کے لہجے سے دبا دبا غصہ اور شدید خفگی مترشح تھی۔

"وہ نورین آنٹی کا بھی بیٹا ہے اور ویسے بھی باپ کے جرم کی سزا کیا بیٹے کو ملے گی؟"

اس نے رسانیت سے سوال کیا۔ رضوان بنا جواب دیے اسے دیکھتا رہا۔ پھر لب بھینچ کر اگنیشن میں چابی گھمائی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کس ردِ عمل کا اظہار کرے۔ زارا اسے یہ نہیں بتا سکی کہ اس نے زین کو گاؤں میں دیکھا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ خبر رضوان کے ذریعے سلیمان تک پہنچے۔ بہرحال زین کی زندگی اور سلامتی اسے سب سے زیادہ عزیز تھی۔

گھر پہنچنے تک رضوان بالکل خاموش رہا تھا۔ عالیہ بھابھی لان ہی میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی خوش دلی سے بولیں۔

"شکر ہے زارا! تم آ گئیں۔ ورنہ سعد تو یہ کہہ کر گیا تھا کہ آج باجی نہیں آئیں تو میں خود گاؤں پہنچ جاؤں گا۔"

"اسکول گیا ہے۔۔۔؟" زارا نے ان سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ سب ٹھیک تو تھے۔۔۔"

"بالکل۔۔۔"

"ناشتہ لگاؤں تم لوگوں کے لیے۔۔۔؟" انہوں نے رضوان سے پوچھا۔

"ناشتہ کر چکے ہیں۔ میں ابھی واپس جا رہا ہوں بس زارا کو چھوڑنے آیا تھا۔" رضوان نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ پھر ملازم کو پکار کر بریف کیس گاڑی میں رکھنے کو کہا۔

"تمہارے بھیا کب واپس آئیں گے۔۔۔؟"

"کچھ بتایا نہیں انہوں نے۔۔۔" وہ سابقہ انداز میں کہہ کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

عالیہ بھابھی رازداری کے ساتھ اس کی طرف جھکیں۔

"میرے دیور کے منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔ کیا راستے میں لڑائی ہو گئی تھی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ بتائیں۔ اس وقت اتنی فارغ کیسے نظر آ رہی ہیں۔"

اس نے آرام سے بات بدلی۔ حالانکہ رضوان کے اس بے حد سنجیدہ انداز کو وہ پوری حسیات کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن ایک بات کا یقین تھا اس کو۔ رضوان کسی اور خاص طور پر سلیمان سے یہ بات نہیں کرے گا۔

"وہ تمہارے سلیمان بھائی تو کہہ دیتے ہیں صاف صاف کہ اگر موٹی ہوئیں تو دوسری لے آؤں گا۔ کل ویٹ کیا تو پورے پانچ کے جی ویٹ بڑھ گیا تھا۔ صبح شام واک کرتی ہوں۔"

"یہ آپ کی صبح ہے۔۔۔؟" زارا نے رضوان کی گاڑی کو گیٹ سے نکلتے دیکھا تو اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

♥ ♡ ♡ ♥

دونوں ہاتھ سر کے نیچے تکیہ کیے وہ پلنگ پر نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں روشن دان سے چھن چھن کر آتی دھوپ کی کرنوں سے الجھ رہی تھیں۔ مگر ذہن میں ایک کھچڑی سی پک رہی تھی۔ ایک فیصلہ تھا۔ جو ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ وہ متذبذب تھا۔

"مجھے انہیں سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا۔"

وہ کب سے ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔ تب ہی ہلکی آواز سے اندرونی دروازہ کھلا۔ اس کی ادھر ادھر بکھری سوچیں بھاگ کر ذہن کے کسی نیم تاریک کونے میں جا چھپیں۔ کمرے کی نیم تاریکی میں روشنی نے راستہ سا بنا لیا تھا۔

مامے مقبول نے اسے دیکھا۔ پھر سوتا سمجھ کر اماری کی طرف پلٹ گیا۔ وہ اس کے خیال سے بہت آہستگی سے الماری کھول رہا تھا۔ شاید اسے کچھ لینا تھا۔ مگر اس کے پیچھے محمد علی کلکاریاں مارتا آیا تھا۔

"بابا۔۔۔ بابا۔۔۔!" وہ مامے مقبول کو نجانے کیا دکھانا چاہتا تھا۔

"اوئے گڈو! چل اپنی ماں کے پاس۔۔۔" مامے مقبول نے دبی آواز میں اسے ڈانٹا۔ مگر وہ سنی ان سنی کر کے میز کے نیچے گھس گیا۔ کچھ لمحے وہاں پڑی چپل کو چھیڑتا رہا۔

"چھپانا دھوکا دینے کے مترادف ہو گا۔" زین نے آخری بار سوچا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پلنگ چرچرایا تھا۔ مامے مقبول نے پلٹ کر دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"میں سمجھا۔ تم سو رہے ہو۔۔۔"

"نہیں۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔۔۔" زین نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"گڈو۔۔۔ چل! نکل پلنگ کے نیچے سے۔ ورنہ چاچا مارے گا۔"

مامے مقبول نے محمد علی کو ڈرایا۔ وہ پلنگ کے نیچے سے نکل زین کی طرف دیکھنے لگا۔ زین نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔ اسے گویا حوصلہ ہو گیا تھا۔ ایک ایک قدم اٹھاتا وہ میز تک آیا۔ میز کا کونا دونوں ہاتھوں سے تھام کر ننھی منی ایڑیاں اٹھائے اوپر رکھی کتابیں دیکھنے لگا۔

"بابا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔"

ماما مقبول دہل سا گیا۔

"نہیں! اس کا ارادہ تو نہیں بدل گیا۔" اس نے بغور زین کا چہرہ دیکھا۔ وہ مقبول کو کچھ الجھا ہوا لگا۔

"کیسی بات۔۔۔؟"

"آپ بیٹھیں۔۔۔؟" زین نے کہا تو وہ میز کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ محمد علی اچک اچک کر کسی چیز کو کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ تا میں کیسے کہوں۔۔۔ اگر معاملہ شادی کا نہ ہوتا تو شاید میں فی الحال یہ بات کسی سے نہ کرتا۔" وہ متذبذب سا انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ مامے مقبول کی دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ذہن قیاس کر رہا تھا۔ وہ کیا کہنے والا تھا۔

ابھی رات اس کی آنکھوں نے ایک طویل عرصے کے بعد سکھ کی نیند دیکھی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ زین کی کوئی بات پھر سے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین چھین لے۔

"تم کہو۔۔۔؟" اس کی آواز بے حد دھیمی تھی۔

"میں نے نین تارہ سے شادی کا فیصلہ پوری ایمان داری اور سچائی سے کیا ہے اور اسی ایمان داری اور سچائی کا تقاضا ہے کہ میں آپ کو سب کچھ سچ بتا دوں۔"

"یا اللہ۔۔۔ یا اللہ۔ اس بچی پر رحم کر۔۔۔" اس کا دل دونوں ہاتھ باندھے دہائی دے رہا تھا۔

"آپ جانتے ہیں' میں درحقیقت یہاں کس کام سے آیا ہوں۔۔۔؟" زین نے آہستگی سے پوچھا تو مامے مقبول کی گردن میکانکی انداز میں نفی میں ہلی۔ تب ہی محمد علی نے کسی چیز کو ہاتھ مارا۔ زین کا والٹ میز سے پھسل کر مامے مقبول کے پیروں میں آ گرا۔

"اوئے۔۔۔!" ماما مقبول نے اسے اٹھانا چاہا۔ مگر وہیں ساکت ہو گیا۔ اسے لگا والٹ نہیں' مکان کی چھت گر گئی ہے۔ کھلے والٹ میں۔۔۔ وہ ششدر سا اسے دیکھتا رہا۔ زین کی توجہ اس سمت نہیں تھی۔ وہ مناسب لفظ ڈھونڈ رہا تھا' مگر جو بات اس کے ہونٹوں پر رک رہی تھی۔ کھلی سچائی کی طرح سامنے آ پڑی تھی۔ مامے مقبول نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں' کھڑی ناک' کشادہ پیشانی' اس کے ہونٹ۔

"پہلے آپ کو وعدہ کرنا ہو گا کہ فی الحال آپ اس حقیقت کو کچھ عرصہ چھپا کر رکھیں گے۔"

مامے مقبول نے پھر سے والٹ میں لگی تصویر کو دیکھا۔ پھر زین کو۔

"دراصل میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ......"

"کہ تم رائے جمشید حیات کے بیٹے ہو۔ رائے حیات اکبر کے پوتے......"

زین ششدر سا رہ گیا۔

مامے مقبول نے جھک کر والٹ اٹھایا اور اس میں لگی تصویر کو بغور دیکھنے لگا۔ زین ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ حقیقت خود بخود سامنے آ گئی تھی۔ مامے مقبول نے والٹ اس کی سمت بڑھا دیا۔

"جی! میں یہی بتانا چاہتا تھا......" اس نے والٹ تھام لیا۔

"تم یہاں کیوں آئے تھے......؟"

"سچائی کی تلاش میں۔" اس نے والٹ میں رکھی بابا کی تصویر کو دیکھا۔

"واپس چلے جاؤ......" مامے مقبول نے بے اختیار کہا تھا۔ زین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"خالی ہاتھ......؟"

"تم نے یہاں آ کر اچھا نہیں کیا۔"

"کاش کوئی ایک تو یہ کہے۔ تم نے یہاں آ کر بہت اچھا کیا زین العابدین......" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

"یہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا......؟"

"مایوسی، تاریکی، دھند، راستے، اجنبیت۔ تو کیا میں ساری زندگی منزل کی تلاش میں یونہی بھٹکتا ہوا واپس چلا جاؤں تو اس دل کو کیسے سمجھاؤں۔ جو کہتا ہے بابا بے قصور ہیں، جو کہتا ہے یہ بزدلی کی زندگی مت جینا زین العابدین۔ میں کب تک لوگوں سے چھپتا رہوں گا بابا! اپنی زمین، اپنی مٹی پر کھڑے ہو کر کب تک اپنی شناخت چھپاتا رہوں گا۔ کب تک حویلی کے درودیوار کو دور سے تکتا رہوں گا۔" اس کا چہرہ شکست خوردگی کی علامت تھا۔ پھر یک دم گویا اس کے اندر سے ابال اٹھا تھا۔ چہرہ ایک دم دہکنے لگا تھا۔

"نہیں...... اب ایسی زندگی نہیں جینا۔ میں کچھ بھی نہ کھوج پایا تب بھی ان لوگوں کے سامنے جا کر اپنی حویلی میں کھڑے ہو کر یہ ضرور کہوں گا کہ میں رائے جمشید حیات کا بیٹا ہوں اور مجھے اس شناخت پر کوئی شرمندگی نہیں۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ زین العابدین بھی اپنے باپ کی طرح بزدل تھا۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے......" مامے مقبول نے تیزی سے کہا۔ اس کا لہجہ درشت تھا۔ درحقیقت وہ ڈر گیا تھا۔ زین کے لبوں پر در آنے والی مسکراہٹ بتاتی تھی۔ وہ ایسا ہی کچھ کرے گا۔

"تم رائے سلیمان کو نہیں جانتے ہو۔ وہ بھون کر رکھ دے گا تمہیں۔"

"مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے خوفی تھی۔ مامے مقبول نے بہت غور سے اس کے تاثرات دیکھے۔ اس کے ہر انداز میں جرات تھی۔

"کیوں گڑے مردے اکھیڑتے ہو۔ پڑھے لکھے ہو، شہر میں اپنا گھر ہے کہیں نوکری کر کے سکون کی زندگی گزارو...... پتر! تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ طاقت کے نشے میں چور ہیں۔ پاگل تو نہیں ہیں کہ زمین کے ایک اور وارث کو اپنے مقابل کھڑا ہونے دیں۔ یہ تو چھوٹا سا بہانا بنا کر تمہیں راستے سے ہٹا دیں گے۔ سکون سے زندگی جی رہے ہو۔ مت پڑو ان بکھیڑوں میں۔"

"سکون سے ہی تو نہیں جی رہا......" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

"ہو سکے تو فوراً واپس چلے جاؤ۔ یہ منشی بشیر علی، جو سارے گاؤں میں دندناتا پھر رہا ہے اس کا خاص بندہ ہے اسے تو بھنک بھی پڑ گئی تو......"

"آپ میری مدد نہیں کر سکتے تو پلیز مجھے روکیے بھی مت......" وہ بیزاری سے گویا ہوا۔

محمد علی اس کے ہاتھ سے والٹ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ زین نے اسے میز کی دراز میں رکھ دیا۔ تو مایوس سا ہو کر دراز کھولنے لگا۔

ماما مقبول خاموش سا ہو گیا تھا۔

"میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ میں پہلے بھی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا اور

اب بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کے دل میں کوئی ڈر، کوئی خوف ہے تو۔۔۔"

زین نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ ماما مقبول نجانے کیا کیا سوچتا رہا۔ بہت سے لمحے خاموشی کی گود میں سر رکھ کر اونگھنے لگے۔ تب ایک طویل سانس لے کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"اس نمانی کی زندگی میں کوئی اور دکھ لکھا ہوا تو میں کیا کر سکوں گا۔۔۔ اس کی تقدیر۔۔۔ میں تو دعا ہی کر سکتا ہوں۔ پہلے بھی کرتا تھا، اب بھی کرتا رہوں گا۔" اس کے بوڑھے ہاتھ زین کے سر پر ٹک گئے۔

"میری تو ساری امیدیں تم ہی سے وابستہ تھیں۔ کل بھی اور آج بھی۔۔۔" زین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کا بوڑھا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر مسکرا دیا۔

"تھینک یو بابا۔ تھینک یو سو مچ۔۔۔ میرے بس میں جہاں تک ہوا۔ میں اس کے لیے کروں گا۔ مجھے یقین ہے۔ آپ کی دعائیں ہماری خوشیوں کے گرد حصار باندھ دیں گی۔"

"اللہ تمہاری حفاظت کرے۔" ماما مقبول نے جھک کر اس کا سر چوم لیا۔ آج اس پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا۔ اپنی آنکھوں میں در آئی نمی کو چھپاتے ہوئے اس نے جھک کر محمد علی کو اٹھا لیا۔

"چل گڈو۔ تجھے ٹافی لے دوں۔"

زین نے ایک سکون بھری سانس کھینچی۔ اس کے سر سے گویا ایک بوجھ اتر گیا تھا۔

منشی بشیر علی ماما مقبول کو دکان پر ہی مل گیا تھا۔ پہلی بار ماما مقبول کو اس کی شکل بے حد بری لگی تھی۔

"سنو چوہدری مقبول! کیا حال چال ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔۔۔" ماما مقبول کے لہجے میں لاشعوری طور پر رکھائی در آئی تھی۔

"یہ پوتے کو لیے کدھر گھوم رہے ہو۔۔۔؟"

"ٹافی دلانے لایا تھا۔" اس نے صوفی کو میٹھی گولیاں دینے کا اشارہ کیا۔

"اور سناؤ! تمہارا شہری مہمان چلا گیا یا یہیں ہے؟"

"اسے بہت زیادہ سوال کرنے کی عادت ہے۔" ماما مقبول نے پہلی بار سوچا تھا۔

"یہیں ہے۔۔۔" اس نے کرتے کی جیب سے پیسے نکالے۔ محمد علی نے ٹافیاں دونوں مٹھیوں میں بھری تھیں۔ "جاتا تو تمہیں خبر ہو ہی جاتی۔"

"ٹھیک ٹھاک تو ہے نا۔۔۔"

"ٹھیک ٹھاک ہے، اسے کیا ہونا ہے۔۔۔" ماما مقبول چڑ سا گیا۔

"یار یونہی پوچھ رہا ہوں۔ اتنے دنوں سے تجھ پر بار بنا ہوا ہے۔" منشی بشیر علی نے ہمدردی دکھائی۔

"ہم پر مہمان بار نہیں ہوتے۔ اللہ کی رحمت سمجھتے ہیں۔" وہ تنک کر بولا پھر زیر لب بڑبڑایا۔

"تیرے گھر سے روٹی کھاتا ہے۔"

"لگتا ہے، آج مقبول کا مزاج ٹھیک نہیں۔" منشی بشیر علی نے قہقہہ لگایا۔ ماما مقبول کا دل چاہا، وہ منشی بشیر کو کھڑے کھڑے چھینٹی لگا دے۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔ بس آج اسے منشی بشیر علی زہر لگ رہا تھا۔ اس نے باقی پیسے لیے اور اس سے قبل کہ منشی کوئی اور سوال کرتا وہ واپسی کے لیے مڑ گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

قاسم ششدر سا رہ گیا تھا۔ خود نین تارہ اپنی جگہ ساکت و صامت بیٹھی ٹکر ٹکر ماما مقبول کا چہرہ تک رہی تھی۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔" ماما مقبول کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔

"پر ابا! ہم اسے جانتے تک نہیں یوں۔۔۔"

"تم نہیں جانتے۔ میں جانتا ہوں۔۔۔" اس نے آرام سے قاسم کی بات کاٹ کر ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"مگر وہ نیاز اور ظہور۔ ان سے تو پوچھنا ہوگا آخر انہوں نے۔۔۔"

"مجھے کسی سے نہیں پوچھنا اور تم سے بھی میں مشورہ نہیں کر رہا۔ صرف بتا رہا ہوں۔ میں نے نین

تارہ کا رشتہ اس لڑکے سے طے کر دیا ہے۔ بہت جلد بے حد سادگی سے نکاح ہو گا۔"

ماما کا لہجہ ٹھوس اور اٹل تھا۔ قاسم جھنجلا کر باہر نکل گیا۔ ماما مقبول نے ایک نظر ساکت بیٹھی نین تارہ پر ڈالی اور مسکرا دیا۔

"میں نے کہا تھا نا۔ تیری قسمت بہت اچھی ہو گی۔ اتنی کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔"

نین تارہ کی نگاہوں میں شکوہ سا ابھرا۔

"کچھ مت سوچو پتر! خوشیاں ہاتھ بھر کے فاصلے پر تمہاری منتظر ہیں۔"

"ماما! لوگوں کی باتوں پر تصدیق کی مہر لگا رہے ہو۔۔۔" عجیب بھیگا بھیگا سا لہجہ تھا۔ ماما بے ساختہ ہنس دیا۔ پھر پیار سے اس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بولا تھا۔

"پگلی! لوگ کچھ کہنے کے قابل ہی کہاں رہے گا۔"

"ماما! ایسا مت کرو۔۔۔" نین تارہ نے سر اٹھا کر التجا کی۔

"یہ شخص تو میری دعا ہے تارو پتر۔ وہ دعا جو میں نے رات رات بھر تیرے لیے کی تھی۔ وہ خوشی ہے جو تقدیر نے بہت سنبھال سنبھال کر تیرے لیے رکھی ہے اور تو ہی تو ہتی تھی۔ ماما تیرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔ ماما کیا کرتا۔ کرنا تو اوپر والے نے تھا اور رب سوہنے نے کر دکھایا۔" وہ بڑا خوش، بہت مگن سا لگ رہا تھا۔ نین تارہ جھنجلا گئی۔

"ماما! تم میری بات نہیں سمجھ رہے یہ سب۔۔۔"

"بس۔۔۔" ماما مقبول نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "ناشکری نہیں کرتے۔ چل اٹھ نماز پڑھ اور اپنے رب کا شکر ادا کر۔"

مغرب کی اذان ہونے لگی تھی۔ ماما اسے نماز کی تاکید کر کے اٹھ گیا۔ کندھے پر صافہ رکھا اور باہر چلا گیا۔ وہ وہیں بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نہ اس شخص کا فیصلہ، نہ ماما کی خوشی اور نہ اپنی کیفیت۔ جو کچھ ہو چکا تھا۔ وہ اسے خوش گمان بھی نہ ہونے دیتا تھا اور دل تو پہلے ہی بے یقین تھا۔ وہ کیسے مان لیتی کہ ریت کا سفر اختتام پذیر ہے۔ سامنے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ ہے، سراب نہیں۔

وہ مرے مرے قدموں سے چلتی نلکے تک آئی۔ تب ہی زین بھی وضو کے ارادے سے اندر آیا۔ نین تارہ کو دیکھ کر ایک بے اختیار اور بے ساختہ سی مسکراہٹ لبوں پر ابھری تھی۔

ایک فیصلہ تھا۔ جو ہو گیا تو اندر تک پر سکون کرتا چلا گیا تھا۔ یہ کیا تھا؟

ہمدردی، محبت یا محض تقدیر کا فیصلہ، جو بھی تھا، زین نے یہ فیصلہ اپنے دل و دماغ کی تمام تر گہرائیوں اور جذبوں کی شدت سے کیا تھا۔

"کھڑے کھڑے کہاں کھو جاتی ہو۔۔۔"

زین نے اس کی نظروں کے سامنے چٹکی بجائی۔ وہ بری طرح چونکی۔

"خودکشی کے نئے طریقوں پر غور کیا جا رہا ہے۔" متبسم و شریر لہجہ، وہ تڑخ کر بولی۔

"تمہیں کوئی ضرورت نہیں مجھ پر ترس کھانے کی۔۔۔"

"ضرورت تو ہم دونوں کو ہے ایک دوسرے پر ترس کھانے کی۔ میں نے کہا تھا نا، حالات مختلف سہی۔ مگر درد تو مشترک ہے۔" زین نے ذرا سا جھک کر دونوں ہاتھ نلکے کے نیچے کیے۔ گویا وہ نلکا چلا ہی دے گی۔ وہ سیاہ بالوں پر نظریں جمائے لب کاٹتی رہی۔ پھر زیر لب بڑبڑائی۔

"تم سب ایک جیسے ہو۔۔۔ بند کھڑکیاں کھولتے ہو اور جب دروازے کھل جائیں تو وہاں بس دستک چھوڑ جاتے ہو۔ پہلے دل کو یقین کی ڈور سے باندھتے ہو۔ پھر۔۔۔ تمہیں میرے بارے میں کچھ نہیں پتا اور جب پتا چلے گا تو تم بھی لوٹ جاؤ گے۔"

زین نے ذرا سا سر اٹھا کر اس کے ہلتے لبوں کو دیکھا۔ ایک خود کلامی تھی جو اس کی سماعتوں سے دور ہی دم توڑ گئی تھی۔ مگر وہ ان کہے لفظوں کا مفہوم بخوبی

سمجھتا تھا۔ تب ہی اس کے دل کو زنجیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ یقین تو خود اس کے اندر اترنا چاہیے تھا۔

"کیا یونہی کھڑا رہوں۔۔۔؟" اس نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔ وہ ہاتھ چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ پھر اس کے لبوں پر طنز میں بجھی مدھم سی مسکان اتری۔

"کوئی کسی کے لیے کھڑا نہیں رہتا۔۔۔"

وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ زین نے تکیے پر ہاتھ ٹکاتے ہوئے اسے اندر جاتے دیکھا۔ پھر مسکرا دیا۔

"میں جانا چاہتا تو مجھے کون روک سکتا تھا۔ مگر شاہراہِ حیات پر کوئی ایک شخص ایسا ضرور ملتا ہے۔ جو پاؤں سے سفر چھین کر وہیں ایستادہ ہونے کی خواہش باندھ دیتا ہے اور زین العابدین! تم زنجیر ہو چکے ہو۔"

♥ ♥ ♥

منشی بشیر علی افتاں و خیزاں لپکا آیا تھا۔ رائے سلیمان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ رائے سلیمان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آؤ منشی چاچا! کوئی کام تھا کیا۔۔۔؟" ظاہر ہے، وہ بے وقت آیا تھا اور سلیمان کے پاس شہر سے کچھ مہمان آئے بیٹھے تھے۔

"کچھ نہیں، میں پھر آجاؤں گا۔" وہ کچھ بددل سا ہو کر واپس پلٹ گیا۔ مردان خانے کے سامنے آم کے بے شمار درختوں کی چھاؤں میں کرسیاں اور چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک کرسی پر فیروز بیٹھا بندوق صاف کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔

"آؤ چاچا! چوہدری صاحب نے بلوایا ہے۔"

"ہاں۔۔۔" منشی بشیر علی اس سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سو مختصراً جواب دے کر ایک طرف ہو بیٹھا۔ دو گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد رائے سلیمان مہمانوں سمیت باہر نکلے تھے۔ فیروز اٹھ کر ان کے قریب چلا گیا۔ منشی بشیر علی خاموشی مگر بے تابی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ رائے سلیمان نے فیروز کو مہمانوں کے ساتھ کہیں بھیجا تھا۔ پھر پلٹ کر وہیں آگئے۔ منشی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کہو چاچا! کیا خاص بات ہے۔۔۔؟" ایک کرسی سنبھال کر رائے سلیمان نے سنجیدہ سے لہجے میں پوچھا تھا۔ منشی بشیر علی کا بے وقت آنا کسی خاص بات کی نشاندہی کر رہا تھا۔

"خاص نہیں۔ بہت خاص بات ہے۔" اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔ رائے سلیمان نے بغیر کچھ کہے بس استفہامیہ نگاہوں سے منشی بشیر علی کو دیکھا۔

"یہ جو چھوکرا گاؤں میں آیا ہے۔۔۔"

"کوئی گڑبڑ کی ہے اس نے۔۔۔؟" سلیمان کی پیشانی پر سلوٹ ابھری۔

"کی تو نہیں۔ اور بے چارہ کرے گا بھی کیا! اسے تو قضا کھینچ لائی ہے اس گاؤں میں۔" اس کا لہجہ غیر معمولی تھا۔

"کام کی بات کرو منشی۔" رائے سلیمان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"آپ کو پتا ہے، وہ کون ہے۔۔۔" اس کا لہجہ پراسراریت میں ڈھل گیا۔

"کون ہے۔۔۔؟"

"وہ۔۔۔" اس نے ایک لمحے کو رک کر، خود کو اس انکشاف کے لیے تیار کیا۔ "وہ رائے جمشید حیات کا بیٹا ہے۔۔۔"

اس نے گویا دھماکا کیا تھا۔ رائے سلیمان کے ماتھے پر شکن ابھری۔ مگر انہوں نے سابقہ لہجے میں پوچھا تھا۔

"تمہیں کس نے بتایا۔۔۔؟"

منشی بشیر علی کے لیے رائے سلیمان کا ردعمل غیر متوقع تھا۔ اس کا خیال تھا وہ بھڑک اٹھے گا۔ اس نے تیزی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تصویر نکالی۔

"یہ تصویر اس لڑکے کے بٹوے میں تھی۔ میں نے خود نکالی ہے۔"

رائے سلیمان نے تصویر کو دو انگلیوں میں تھام کر سرسری سی نگاہ دوڑائی۔ پھر نظریں منشی بشیر علی کے چہرے پر جما دیں۔ اس کا اپنا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"گویا یہ وہی زین العابدین ہے۔ رائے جمشید حیات کا بیٹا۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں بالکل۔۔۔ اب تو شک کی گنجائش ہی نہیں رہی۔" منشی تیزی سے بولا۔

"تو اب کیا کیا جائے۔۔۔؟" رائے سلیمان سابقہ لہجے میں اس سے رائے مانگ رہے تھے۔ منشی بشیر علی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"سلیمان پتر! تمہاری قسم پوری ہونے کا وقت آگیا ہے۔ مجھے تو اب بھی وہ وقت نہیں بھولتا، جب بڑے چوہدری صاحب کی لاش میرے سامنے خون میں لت پت پڑی تھی اور تم نے اسی خون کی قسم کھا کر کہا تھا کہ رائے جمشید کیا اس کی نسل مٹا کر رکھ دو گے۔۔۔" وہ جذباتی سے لہجے میں کہہ رہا تھا اور رائے سلیمان کی نظریں تصویر پر جمی تھیں۔ وہ دیکھ سکتے تھے اس سولہ سال کے نوجوان کو دیکھ کر جو باپ کی لاش کو دیکھ کر پاگل ہو رہا تھا۔ وہ رونا چاہتا تھا مگر رونا اس کا منصب نہ تھا۔ وہ اب اس جاگیر کا وارث تھا۔ انتقام کے شعلوں نے اس کے آنسو بھاپ کی طرح اڑا دیے تھے۔

"وہ آج کل میں شہر واپس جا رہا ہے۔۔۔" منشی بشیر علی بتا رہا تھا۔ رائے سلیمان نے طویل سانس لے کر اسے دیکھا پھر تصویر سامنے چھوٹی ٹیبل پر اچھال دی تھی۔

"اسے جانے دو۔۔۔"

"جی۔۔۔" منشی بشیر علی نے ٹھٹھک کر انہیں دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا۔ مگر رائے سلیمان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارا کیا تھا۔

"میں نے کہا۔ اسے شہر جانے دو۔۔۔"

رائے سلیمان کا غیر جذباتی اور سپاٹ انداز۔۔۔ منشی بشیر علی اگلا جملہ کہنا ہی بھول گیا۔ وہ حیران تھا بے حد حیران۔۔۔ رائے سلیمان نے اٹھتے ہوئے اچٹتی سی نظر اس کے ہکا بکا چہرے پر ڈالی اور مزید کچھ بھی کہے یا سنے بغیر اندر چلے گئے۔ منشی بشیر ساکت سا بیٹھا تھا۔

♥ ♥ ♥

وہ حقیقتاً ان دونوں کا ممنون تھا۔ جنہوں نے ایک اجنبی کو اتنے دنوں اپنے گھر میں ٹھہرائے رکھا۔ قاسم سے مل کر اس نے ننھے محمد علی کو ہلکے سے گدگدایا۔

"اگلی بار آؤں گا۔ تو تمہارے لیے کھلونے لاؤں گا ماسٹر۔۔۔"

وہ بنا کچھ سمجھے کھلکھلایا تھا۔ زین نے اسماء کے کندھے کے اوپر سے چولہے کی لپائی کرتی نین تارہ کو دیکھا۔ جو بے ارادہ ہی ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"میں جلد ہی افتخار اور بے بے کو لے کر آؤں گا۔" یہ جملہ بطورِ خاص اس کے لیے تھا۔ نین تارہ کے لبوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ طنز سے بھری تھی۔ پھر وہ سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی۔

"آؤ! میں تمہیں بڑی سڑک تک چھوڑ آؤں۔۔۔" ماما مقبول نے کہا تھا۔

"نہیں بابا! تکلیف مت کریں۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"میں چھوڑ آتا ہوں ابا۔۔۔" قاسم جلدی سے بولا۔ مگر ماما مقبول نے نفی میں سر ہلا کر اس کا بیگ اٹھا لیا۔ زین شرمندہ سا ہو گیا۔

"بابا! میں اٹھا لیتا ہوں۔" اس نے تیزی سے بیگ ہاتھ میں لیا۔

"چلو۔ ویگن نکل جائے گی۔" ماما مقبول کو نجانے کس بات کی جلدی تھی۔ وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر پلٹا۔ مگر دروازے میں ہی رک گیا۔

"میرا انتظار کیجیے گا۔"

قاسم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ اسماء دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی یہ جملہ کس کے لیے بولا گیا تھا۔ نین تارہ کا وجود سلگ اٹھا۔ قاسم اور وہ لوگ باہر نکلے تو وہ ہنستے ہوئے نین تارہ کی طرف پلٹی۔

"سنا! تم سے کیا کہہ گیا ہے وہ۔۔۔؟"

"میں نے اعتبار اور انتظار دونوں ہی کرنا چھوڑ دیے ہیں۔" وہ زہرخند لہجے میں گویا ہوئی۔

"تو تو پاگل ہے، وہ کوئی اجنبی تھوڑا ہی ہے۔" اسماء نے کہا تھا۔ مگر اس کے اندر امید کی کوئی کرن پھوٹتی ہی نہ تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور وہ

ہوا کی شرارت سمجھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا، جو چلا گیا، وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ زندگی کے لبوں پر ایک مہربان سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ وقت نے شرارت سے زندگی کو آنکھ ماری، کچھ اور نامہربان لمحوں کو اپنی زنبیل میں ڈالا اور بے حد خاموشی سے کھسک گیا۔

ماما مقبول چلتے چلتے اس کچی سڑک کے کنارے رک گیا جس کے گرد آموں کے باغات کا سلسلہ بہت دور تک جاتا تھا۔ جس کے عقب میں دو حویلی کے خدوخال نمایاں ہونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ فضا میں خاموشی، سبز کھیتوں اور پھولی سرسوں کے پیلے پھولوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ نہر کے پانیوں کو چھو کر آتی ہوا میں خوشگوار سی ٹھنڈک تھی۔

ماما مقبول کے قدم وہیں تھم گئے تھے۔ وہ بے حد خاموشی سے سامنے سڑک پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔ زین نے متعجب انداز میں اسے دیکھا۔

"چلیں بابا۔ ویگن نکل جائے گی۔"

ماما مقبول زیر لب نجانے کیا بڑبڑایا تھا۔

"بابا۔۔۔" زین نے دوبارہ پکارا۔ تو وہ نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھنے لگا۔

"چلیں۔۔۔" زین نے پوچھا تھا۔

"خالی ہاتھ۔۔۔؟" ماے مقبول نے پوچھا۔ زین ٹھٹھک کر اور پھر الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے سوچا تھا۔ میں یہ سب تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گا۔ مگر تم۔۔۔ تم باز نہیں آؤ گے۔"

"آپ۔۔۔ کہنا کیا چاہتے ہیں۔۔۔؟"

"جانتے ہو تم کہاں کھڑے ہو۔۔۔" ماے مقبول نے سوال کیا اور شہتوت کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑے زین العابدین کے اعصاب تن گئے۔ اضطراب کی لہر اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں رائے نواز قتل ہوا تھا۔

"تم جانتے ہو۔ میں نے۔۔۔ میں نے اسے اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔"

ماے مقبول کا لہجہ سپاٹ تھا۔ زین ششدر سا رہ گیا۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا اس نے کسی ایسے شخص کو جس نے اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا ہو۔ امید کا دامن تھام کر وہ یہاں تک آیا تھا اور کس ناامیدی سے لوٹ رہا تھا کہ شاید کوئی ایسا نہیں۔ جو سچ پر پڑا نقاب کھینچ سکے۔۔۔ اور یہ شخص۔۔۔ یہ شخص کہہ رہا تھا اس نے۔۔۔

ماما مقبول دو قدم چل کر اس کے سامنے آیا۔ اس کی پشت زین کی طرف تھی۔ زین دم بخود تھا۔ ماما مقبول کچھ لمحے کچے راستے پر اڑتی دھول دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسی راستے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"وہ دونوں وہاں سے آ رہے تھے۔۔۔ گھوڑوں پر سوار۔۔۔"

ماے مقبول کی آواز خود کلامی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ یوں گم صم سا بول رہا تھا۔ جیسے ایک بھولا بسرا منظر پھر سے اس کی آنکھوں میں جاگنے لگا ہو۔ زین کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

"کون۔۔۔ کون آ رہے تھے۔" اسے خود اپنی ہی آواز اجنبی سی لگی۔

"رائے جمشید اور رائے نواز۔۔۔ وہ دونوں ست روی سے گھوڑوں پر سوار آ رہے تھے۔ میں وہاں تھا۔۔۔ اپنے کھیت کے کنارے۔۔۔ قاسم کی ماں ابھی تک روٹی لے کر نہیں آئی تھی۔ مجھے بھوک لگنے کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا۔

"آج اسے نہیں چھوڑنا۔ روز بروز ہڈ حرام ہوتی جا رہی ہے۔" میں سخت غصے میں اٹھ کر کھڑا ہوا تب ہی میری نگاہ ان پر پڑی۔" وہ ایک پل کو خاموش ہوا گویا پوری کائنات چپ کی گود میں جا گری تھی۔ زین کے اعصاب تن سے گئے۔ اسے لگا ایک اہم انکشاف ہونے جا رہا ہے۔ اس کا پورا وجود سماعت بن گیا۔ ماے مقبول کی خود کلامی سرگوشی سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اس گھنی خاموشی میں وہ ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔

"کمال ہے۔ یہ دونوں آج اکٹھے کیسے نظر آ رہے ہیں۔" میں نے بے حد حیرت سے سوچا۔ سارا گاؤں جانتا تھا۔ ان دونوں میں زمین کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ دونوں تو ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار بھی نہیں۔ میں روٹی اور بیوی دونوں بھول کر انہیں دیکھنے لگا۔ ان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر اتنی نہیں کہ کچھ سمجھ سکتا۔ مگر میں دیکھ سکتا تھا۔ رائے جمشید سخت غصے میں تھا اور رائے نواز بے حد پرسکون۔

"تو تم فیصلہ چاہتے ہو۔۔۔؟" وہ ذرا قریب ہوئے تو ان کی آوازیں بھی واضح ہو گئیں۔ رائے نواز رائے جمشید سے پوچھ رہا تھا۔ جواباً وہ تنک کر بولا۔

"میں یہ بات کئی بار دہرا چکا ہوں۔۔۔"

"میں تو تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ۔۔۔"

"مجھے کوئی بات نہیں سننا۔ بس فیصلہ کرو۔ آج ابھی اور اسی وقت۔۔۔"

"اگر فیصلہ تمہاری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو۔۔۔" رائے نواز کے لبوں کی مسکراہٹ معنی خیز اور استہزائیہ تھی۔

"تو تم نے مجھے یہاں بلایا کیوں تھا۔۔۔؟" رائے جمشید بپھر کر بولا۔

"فیصلہ کرنے۔۔۔" رائے نواز کا لہجہ پرسکون تھا۔ "اور فیصلہ یہ ہے کہ تمہارا اس زمین پر کوئی حق نہیں۔"

"میرا اس زمین پر کوئی حق نہیں۔۔۔؟" رائے جمشید نے چیختے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ زمین اسی کی ہے، جس نے اسے کاشت کیا اور سنبھالا۔۔۔ یہ زمین نہ پہلے تقسیم ہوئی تھی اور نہ آج ہو گی۔" رائے نواز کا لہجہ حتمی ہو گیا تھا۔

"پھر تمہیں یہ فیصلہ مہنگا پڑے گا۔"

"تم کچھ بھی کہو فیصلہ تو ہو گا۔۔۔" رائے نواز نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی، چابک ماری اور اسی پل۔۔۔" ماے مقبول کی آواز ٹوٹ کر چپ ہو گئی۔ سانس زین کے سینے میں اٹک کر رہ گئی۔

"اس پل۔۔۔ اسی پل کیا ہوا تھا بابا۔۔۔؟" شدید ہیجانی کیفیت میں اس نے سوال کیا۔ ماے مقبول نے جھرجھری لی۔ زین تیزی سے گھوم کر اس کے سامنے آیا۔

"اسی پل کیا ہوا تھا بابا۔۔۔" اس کے مضبوط ہاتھوں نے اس کے بوڑھے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ ماے مقبول نے اس کی سرخ انگارہ آنکھوں کو دیکھا۔

"میں جب بھی تمہیں دیکھتا تھا۔ عجیب سا احساس ہوتا تھا۔" اس کی نگاہیں زین کے ہر ہر نقش میں ایک اور چہرہ کھوج رہی تھیں۔ "اور یہ احساس ہر اس شخص کو ہو سکتا ہے۔ جس نے رائے جمشید کو قریب سے دیکھا ہو۔"

"میں پوچھ رہا ہوں، اس پل کیا ہوا تھا۔۔۔" وہ ضبط کھو بیٹھا۔

"اس پل۔۔۔" ماما مقبول ڈوب سا گیا۔ "گولی چلی اور رائے جمشید کا گھوڑا بدک گیا۔۔۔ نہیں۔۔۔ گولی بعد میں چلی تھی۔۔۔ پہلے گھوڑا بدکا تھا۔ یا سب کچھ ایک ساتھ ہی ہو گیا۔ گھوڑے نے شاید کوئی سانپ دیکھا تھا۔ وہ ہنہنایا اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ گولی اس کی ٹانگوں سے نکل کر رائے نواز کو جا لگی اور اگر رائے جمشید کا گھوڑا نہ بدکتا تو گولی کا نشانہ اسے ہی بننا تھا۔"

"کیا۔۔۔؟" ایک چونکا دینے والا انکشاف تھا۔

میں آگے بڑھنے کو تھا کہ عقب سے کسی نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"نہ بھرا۔۔۔" میں چونک کر پلٹا۔ وہ زیتون تھی میری بہن اور زمین تارہ کی ماں۔"

"مگر وہ۔۔۔" میں پھر بھی آگے بڑھنے کو تھا۔ اس نے میرا بازو نہیں چھوڑا۔

"کیا آپ نے اسے دیکھا۔ جس نے گولی چلائی تھی۔" زین نے بے تابانہ پوچھا۔

"ہاں۔ وہ وہاں ان درختوں کے پیچھے۔۔۔" ماے مقبول نے ایک سمت اشارہ کیا۔ "لیکن میں اسے پہچان نہیں سکا۔ اس کا چہرہ صافے میں چھپا تھا اور وہ یہاں سے دور بھی تھا۔"

"اور بابا جان۔۔۔؟"

"اس نے بمشکل گھوڑے کو سنبھالا اور گھوڑے سے کود کر بھاگتا ہوا رائے نواز تک آیا۔ مگر گولی اس

کے سر میں لگی تھی۔ وہ تو شاید ہچکی بھی نہ لے سکا۔ پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہو گیا یا شاید وہ جانتا تھا کہ نواز کے قتل کا الزام اسی پر آئے گا۔"

زین کو پہلی بار بابا جان کی بزدلی پر شدید غصہ آیا۔ وہ فرار نہ ہوتے تو آج حالات مختلف ہوتے اور یہ۔۔۔ اس نے سر اٹھا کر ماما مقبول کو دیکھا۔ پھر تند و تلخ لہجے میں گویا ہوا۔

"اور آپ یہیں چھپے رہے۔۔۔ آپ نے کسی سے کچھ بھی نہ کہا۔ آپ نے سوچا، حویلی والوں کے لیے گولی اور خون کا کھیل نیا نہیں۔ آپ کو پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی اپنی جان سے جائے یا زندہ درگور ہو جائے۔۔۔ آپ آنکھیں بند کیے سچ کو چھپائے بیٹھے رہیں گے، کیونکہ اس معاملے سے آپ کا کیا تعلق تھا۔"

شدید غصے اور اشتعال میں وہ اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ ماما مقبول نے کچھ کہنا چاہا مگر زین نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔

"نہیں۔ ٹھیک ہے آپ کو خاموش ہی رہنا چاہیے تھا کہ یہ تو عمومی رویہ بن گیا ہے۔ ہمارے سامنے کوئی کسی کا گلا بھی گھونٹ رہا ہو تو ہم اس کا ہاتھ نہیں روک سکتے کہ اس معاملے سے ہمارا کیا تعلق۔۔۔ بزدل ہیں ہم۔۔۔ سب کے سب بزدل ہیں۔ خاموش ہو جاتے ہیں۔۔۔ کبھی اپنی جان کے خوف سے تو کبھی خود سے وابستہ رشتوں کی بنا پر۔۔۔ سچائی چھپانے کی عادت ہو چکی ہے ہمیں۔۔۔ کسی کی جان پر کیسے بھی عذاب ٹوٹیں۔ ہم سچ سے نظریں چراتے رہیں گے۔ یہ تو ساری کہانی ہی بزدلی کی ہے۔ بابا جان اور میں۔۔۔ بزدل۔۔۔ سبھی بزدل۔۔۔"

شدید طیش میں وہ بار بار مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

"میں کہاں کہاں خوار نہیں ہوا اور آپ مجھے اب یہ بتا رہے ہیں۔"

اس نے پلٹ کر ماما مقبول سے پوچھا۔ ماما مقبول بس ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اب بھی یہ سب نہ بتاتا مگر زین کے اندر جو کھوج لگ گئی تھی۔ وہ بار بار اسے یہیں بھٹکاتی۔

"لیکن سوری۔ مجھے آپ سے یہ سب نہیں کہنا چاہیے۔۔۔ جب وہ شخص خود اپنے دفاع کے قابل نہ تھا تو آپ کو کیا ضرورت تھی اس کے پیچھے اس کی بے گناہی ثابت کرنے کو بھاگے پھرتے۔۔۔ آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔۔۔ آپ کو خاموش ہی رہنا چاہیے تھا۔ لیکن آپ نے یہ سب مجھے اب کیوں بتایا ہے۔۔۔؟"

ماما مقبول خاموش ہی رہا۔ زین اضطراری انداز میں ادھر سے ادھر چکراتا رہا۔

"تم اب کیا کرو گے۔۔۔؟" ماما مقبول نے اچانک سوال کیا تو وہ رک گیا۔ کچھ لمحے خالی رستے پر نظریں جمائے سوچتا رہا اسے اب کیا کرنا ہے۔ پھر اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر ماما مقبول کو دیکھا۔ وہ اسی کی سمت متوجہ تھا۔ زین نے پلٹ کر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر ٹکا دیے۔ ماما مقبول نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"اتنے برسوں تک آپ خاموش رہے۔۔۔ اب۔۔۔ اب اگر ضرورت پڑی تو آپ سچ بولیں گے میری خاطر۔۔۔"

ماما مقبول کا سر اثبات میں ہل گیا۔ دور سے ویگن آ رہی تھی۔ وہ اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹا۔

"تم اب کیا کرو گے زین پتر۔۔۔؟" ماما مقبول نے پھر پوچھا۔

"اس شخص کو تلاش کروں گا، جس نے گولی چلائی۔" اس نے ویگن کو رکتے دیکھا تو جھک کر بیگ اٹھا لیا۔ "میں چلتا ہوں۔۔۔"

"زین پتر۔۔۔" ماما مقبول نے پکارا تو وہ پلٹا پھر اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"بے فکر رہیں بابا۔۔۔! میں وعدہ خلاف نہیں۔ میں جلد ہی آؤں گا۔" اس کا لہجہ سنجیدہ اور ٹھوس تھا۔ ماما مقبول نے دھندلائی آنکھوں سے اسے ویگن میں سوار ہوتے دیکھا اور پلٹ گیا۔ زین نے سیٹ سنبھال کر بیگ اپنے قریب خالی سیٹ پر رکھا اور کنپٹی مسلنے لگا۔

"تو یہ تھی سچائی۔" جس سچائی کی تلاش میں وہ مسلسل بھٹک رہا تھا۔ وہ ایک دم سامنے آئی تھی۔

"باؤ جی۔ پیسے۔۔۔" کنڈیکٹر نے کہا تھا۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر والٹ نکال کر کھولا اور یو ہی بس ٹھٹک گیا۔ اس کے والٹ میں ہمیشہ موجود رہنے والی بابا جان کی تصویر غائب تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

سلیم اس سے یوں ملا تھا۔ جیسے مہینوں کے بعد گھر لوٹا ہو۔

"سچ بھائی جان! آپ کے بغیر تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔"

"یار! ہفتہ ہی تو ہوا ہے۔" زین نے مسکراتے ہوئے بیگ اسے تھمایا۔

"مجھے تو مہینہ لگ رہا ہے بھائی جان۔۔۔" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ زین سیدھا بیڈ روم میں آ گیا۔ کمرہ ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا تھا۔

"ناشتہ لاؤں۔۔۔" سلیم نے بیگ کھول کر کپڑے نکالے۔

"نہیں ایک کپ چائے۔۔۔" اس نے جوگر اتارے۔

"دودھ تو ختم ہے۔ میں ابھی لے آتا ہوں۔"

"لے آؤ لیکن پہلے یہ بتاؤ۔ کوئی آیا گیا۔۔۔"

"افتخار بھائی آئے تھے ایک دن۔ بہت خفا ہو کر گئے۔ زارا باجی اور پھپھو کے بھی فون آئے تھے۔ کل شام بھی آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں جیسے ہی آپ واپس آئیں ان سے فون پر بات کر لیں۔"

سلیم نے پیغام دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم دودھ کا پیکٹ لے آؤ۔"

زین نے کہا تو وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا۔ زین نے فون سیٹ اپنی طرف کھسکایا۔ پہلے افتخار کا نمبر ملایا تو فون باسط نے ریسیو کیا۔ افتخار گھر پر نہیں تھا۔ اس نے باسط کو پیغام دیا۔ کریڈل دبایا۔ پھر کچھ سوچ کر زارا کے موبائل کا نمبر ملایا تھا۔

"ہیلو۔۔۔" دوسری طرف سے زارا کی آواز ابھری۔

"السلام علیکم۔۔۔!" وہ مسکرا دیا۔

"زین العابدین۔ تھینک گاڈ تم واپس آ گئے۔۔۔" زارا بے ساختہ ہی بولی تھی۔ وہ اس کے لیے کتنی پریشان اور فکر مند تھی۔

"کیا بہت یاد آ رہا تھا میں۔۔۔؟" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"کیا نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ بتاؤ بغیر بتائے کیوں غائب ہو گئے تھے۔۔۔" اس نے شکوہ کیا۔

"یونہی دل چاہ رہا تھا۔۔۔" وہ لاپروائی سے گویا ہوا۔

"تمہارے دل کا علاج بھی کرنا پڑے گا۔۔۔" اسے غصہ سا آ گیا۔

"وہ میں نے خود ہی کر لیا ہے۔۔۔" زین زیرِ لب مسکرایا۔

"تم سا ہیوال گئے تھے۔۔۔؟" زارا نے سرسری انداز میں سوال کیا۔ وہ چاہتی تھی زین اسے خود بتائے۔

"کہاں گیا تھا؟ کیوں گیا تھا؟ یہ سب آپ کو بتانا ہے۔ ابھی گھر آ سکتی ہیں۔۔۔"

"ابھی تو مشکل ہے۔۔۔ ہاں شام میں ضرور آؤں گی۔"

"میں انتظار کروں گا لیکن دیکھیں، آنا ضرور ہے۔۔۔" اس نے دوبارہ تاکید کی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"چھیما۔۔۔ چھیما۔۔۔" تائی اماں کی آواز برآمدے والان میں گونجی تو چھیما بھاگی آئی۔ وہ پندرہ سولہ سال کی دبلی پتلی الھڑ سی لڑکی تھی۔

"جی بی بی!" دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتی وہ ان کے قریب آ گئی۔ تسبیح پھیرتی تائی جان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ تو آنکھوں میں ناگواری سی اتر آئی۔

"چھیما! کتنی بار کہا ہے تجھے نہا کر کپڑے بدل لیا کر۔۔۔" ان کی نفاست پسند طبیعت ان کے گندے

سندے چلیے دیکھ کر اوب جاتی تھی۔ چھیما کو انہوں نے اسی لیے صفائی کے کاموں پر لگا رکھا تھا۔ کچن کے تو قریب بھی پھٹکنے نہ دیتی تھیں۔

"ہوں بی بی! ابھی جمعہ کو تو نہا کر بدلے تھے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"کل اگلا جمعہ آ رہا ہے۔"

"اچھا بی بی! بدل لوں گی۔" وہ مرے مرے لہجے میں بولی۔ گویا گند ا رہنا اس کا شوق تھا۔

"تیری ماں نہیں آئی۔ بلوایا تھا میں نے اسے۔"

"اماں کو تو سخت بخار ہے بڑی بی بی! وہ تو سارا دن کانپتی ہی رہتی ہے۔"

"اچھا۔ چل پھر اپنی چاچی کو بھیج دینا شام کو گندم صاف کرنا ہے۔ دیکھ بھولنا مت۔" انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔

"نہیں بھولتا کس لیے۔ میں جاتے ہی بول دوں گی۔"

انہوں نے تخت کے کنارے پڑے اپنے بٹوے کو کھول کر کچھ روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"ماں سے کہنا دوائی لے لے۔"

"شکریہ بی بی!" اس نے جھٹ سے روپے پکڑے۔

"میں نے تمہیں بلوایا تھا۔ دینو سے کہو۔ باہر دوپہر میں چارپائیاں دھوپ میں پڑی خراب ہوتی رہتی ہیں۔ دوپہر میں انہیں چھاؤں میں کھینچ دیا کرے۔ مجال ہے جو ذرا سی بھی پروا کرتے ہوں۔"

"ابھی بول دیتی ہوں بی بی۔" وہ پیسے مٹھی میں دبائے باہر بھاگ گئی۔ تائی جان نے تسبیح پوری کر کے جائے نماز تہہ کی۔ تب ہی آئمہ آ گئیں۔ ان کا سوٹ ملگجا سا ہو رہا تھا۔ ایک دم ستا ہوا پژمردہ چہرہ، تائی اماں تاسف سے سر ہلا کر رہ گئیں۔

یہ وہ عورت تھی، جو اپنے لباس پر ایک شکن بھی برداشت نہ کرتی تھی۔

"آؤ آئمہ! بیٹھو۔" انہوں نے اپنے قریب جگہ بنائی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

"کل تمہاری عدت بھی ختم ہو جائے گی۔"

"ہاں۔" ایک سرد سی آہ ان کے لبوں پر ٹوٹی۔ "اتنے دن گزر گئے۔ پر دل کو صبر نہیں آتا۔ لگتا ہے، کل کی بات ہے۔"

"دل چاہے تو شہر چلی جانا۔" انہوں نے ہمدردی سے کہا۔

"کیا فرق پڑتا ہے آپا۔ یہاں رہوں یا وہاں۔" ان کے ہر ہر انداز میں دل گرفتی و بیزاری تھی۔ تائی جان نے بغور اسے دیکھا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

"یہ حادثہ صرف تمہارے ساتھ ہی تو نہیں ہوا آئمہ! مجھے دیکھو۔ میں نے بھی تو ایک عمر بیوگی میں گزار دی۔ شروع میں یونہی لگتا تھا بس زندگی ہی ختم ہو گئی۔ مگر زندگی کہاں ختم ہوتی ہے۔ جینا ہی پڑتا ہے جتنی سانسیں، جتنے دن رب سوہنے نے لکھ دیے ہیں وہ تو پورے کرنے ہی ہیں۔ بھلے رو کر یا صبر کے ساتھ۔ تم بھی صبر کرو۔"

"آپ کے پاس تو شیر جیسا بیٹا تھا۔ آنسو پونچھنے والا، حوصلہ بڑھانے والا۔ میرے پاس کیا ہے ایک بیٹا۔ وہ بھی دور جا بیٹھا ہے۔ ماں کو دو حرف تسلی کے کہنے کا بھی وقت نہیں اس کے پاس کتنے دن ہو گئے اس نے فون نہیں کیا۔ اور ذارا۔ اسے تو پہلے ہی آپ کو سونپ چکی ہوں۔ میں تو خالی ہاتھ ہوں آپا۔ نہ گھر رہا۔ نہ گھر والا۔"

وہ رو دیں۔ آج دل بہت اداس تھا۔ کتنے بہت سے دن شیراز کے فون کا انتظار کرتے گزر گئے تھے۔ تائی جان انہیں ساتھ لگا کر دھیرے دھیرے تھپکنے لگیں۔

"رضوان بھی تو تمہارا ہی بیٹا ہے۔"

آئمہ بتا نہیں سکتی تھیں۔ وہ خود کو کس قدر تنہا محسوس کر رہی تھیں۔ بچھڑے ہوئے، کھوئے ہوئے سارے سارے رات انہیں تڑپاتے تھے۔ رات بھر نیند پلکوں سے روٹھی رہتی۔

"مجھے لگتا ہے۔ اس حویلی کو کسی کی بددعا لگ گئی ہے۔" انہوں نے سر اٹھا کر حویلی کے در و دیوار سے لپٹے

سناٹے کو دیکھا۔ اس پر چھائی خاموشی کو پوری شدت سے محسوس کیا۔ "دیکھیں نا آپا! کتنی ویرانی سی چھا گئی ہے۔ لوگ یہاں سے جاتے ہیں تو واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ یہ۔ یہ کس کی بددعا کا سایہ ہے، جو حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔" ان کے لہجے میں خوف سا سمٹ آیا۔ "ہر پل کچھ اجنبی سی آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ کچھ عجیب سی سرگوشیاں۔ کہیں۔ کہیں کوئی اور حادثہ تو نہیں ہونے والا۔"

ان کے لہجے نے تائی جان کا دل دہلا دیا۔

"آئمہ۔" انہوں نے ایک دم انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔ "اٹھو۔ اندر کمرے میں چلتے ہیں۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئیں۔ کچھ لمحے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہیں۔ پھر آہستگی سے گویا ہوئیں۔

"آپ جائیں آپا! میں کچھ دیر اکیلے بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

انہوں نے کچھ کہنا چاہا، مگر چپ ہو کر تسبیح اٹھا کر کمرے میں چلی گئیں۔ آئمہ نے سر اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ بہت گہری خاموشی تھی جس کے منحوس پنجے حویلی کے در و دیوار میں کھب گئے تھے۔

"ہاں۔ یہ آہٹیں۔ یہ سرگوشیاں، کیا ہونے والا ہے؟ یہ دل کو دھڑکا سا کیوں لگا رہتا ہے؟ اور وہ۔ وہ کیوں آنے لگا ہے، بار بار میرے خواب میں۔ چپ اور گم صم۔ کچھ بھی نہیں بولتا۔ پھر بھی محسوس ہوتا ہے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ "مجھے لگتا ہے، میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"چھوٹی بی بی۔! بڑی بی بی کدھر ہیں۔؟" چھیما ہاتھ میں ایک تصویر پکڑے پوچھ رہی تھی۔ آئمہ نے چونک کر سر اٹھایا پھر درشتی سے بولیں۔

"کیا تکلیف ہے۔؟"

"بڑی بی بی۔!"

"اپنے کمرے میں ہوں گی۔" انہوں نے غصے سے جواب دیا۔ تب ہی نظر اس کے ہاتھ پر گئی۔

"یہ کیا ہے۔؟"

"ادھر چارپائیاں اٹھانے لگی تو یہ تصویر وہاں گری پڑی تھی۔"

"دکھاؤ۔"

چھیما تصویر انہیں تھما کر خود بھاگ لی۔ اسے ابھی بہت کام کرنے تھے۔ آئمہ نے تصویر سیدھی کی۔ دوسرے پل وہ ششدر سی رہ گئیں۔ گویا کائنات کی گردش رک گئی تھی۔ جس شخص کا نام اس گھر کے در و دیوار کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔ جس کی صورت یہاں کے مکین بھول چکے تھے۔ اس کی تصویر اور یہاں۔

"جمشید۔ میرے بھائی!" ان کے لبوں نے اس تصویر کو بار بار چوما۔ "تم ہی تو ہو۔ کیوں آتے ہو میرے خواب میں۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔ اتنے گم صم، اتنے چپ کیوں ہوتے ہو۔ کیا تمہارے پاس مجھے دینے کے لیے دو حرف تسلی کے بھی نہیں۔" وہ تصویر کو سینے سے لگائے زیر لب بڑبڑا رہی تھیں۔ "جمشید۔ دیکھو میں کتنی تنہا ہو گئی ہوں۔ کوئی ایسا نہیں، جو میرے آنسو پونچھ سکے۔"

اندر آتے رائے سلیمان ایک دم رک گئے۔ ان کی آنکھوں میں ہلکی سی الجھن اور بے تحاشا سنجیدگی در آئی تھی۔ وہ آگے بڑھنے کو تھے کہ ان کی سماعتوں نے لرزتے لبوں کی سرگوشی سن لی۔ وہ کچھ لمحے لب بھینچے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر جس خاموشی سے آئے۔ اسی خاموشی سے دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔

"میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں جمشید۔ کیوں اتنی دور چلے گئے کہ میں تمہیں آواز بھی نہیں دے سکتی۔" مانوس ہاتھوں کا لمس ان کے چہرے پر جاگا۔ کسی نے نرمی سے ان کے آنسو صاف کر کے سر پر بوسہ دیا تھا۔

"اتنا کیوں رو رہی ہو پگلی۔ میں کہیں بھی چلا جاؤں۔ تمہارا دھیان، تمہارا خیال ہمیشہ میرے پاس رہتا ہے۔"

انہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور بے اختیار

اردگرد دیکھا تھا۔ پھر بے اختیار چہرے پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔

یہی الفاظ تھے جب وہ ہر چیز سے بیزار ہو کر مصر جا رہا تھا۔ تو اس نے روتی ہوئی بہن کے آنسو سمیٹتے ہوئے کہے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ مگر اب کوئی آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔ تصویر کو چومتے ہوئے وہ ایک دم ٹھٹک گئیں۔

"یہ تصویر۔۔۔ یہ تصویر یہاں کیا کر رہی ہے؟" انہوں نے دیکھا۔ یہ تصویر پیرس میں کھینچی گئی تھی۔ "مگر اسے یہاں کون لایا۔۔۔" وہ اضطراری انداز میں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں "کہاں سے گری۔ یہ تصویر؟ کون آیا تھا؟"

"رائے سلیمان کے سامنے جا کر کہوں گا۔ میں رائے جمشید کا وارث ہوں۔"

بہت پہلے زین کا کہا ایک جملہ ان کی یادداشت میں گونجا۔ کسی نے ان کا دل گویا مٹھی میں لے کر مسلا تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ یہاں تو نہیں آ گیا۔۔۔ یا اللہ! اسے اپنی حفاظت میں رکھنا۔" ان کا دل سجدے میں گر کر دعائیں کر رہا تھا۔

"کس سے پوچھوں۔۔۔ کس سے پوچھوں وہ یہاں آیا تھا یا نہیں۔۔۔؟" وہ اضطراری انداز میں کھڑی ہوئیں۔ ذرا سا آگے بڑھیں اور ایک دم آگے بڑھ کر دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہا۔ سلیمان فوری طور پر پلٹ نہ سکے۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی تھیں۔ ان کی نگاہیں کچھ لمحے سلیمان پر گڑی رہیں اور زندگی میں پہلی بار رائے سلیمان کو اپنے تاثرات چھپانا مشکل لگا۔ تو انہوں نے رخ بدلنا چاہا مگر ان کا بازو آئمہ کی گرفت میں تھا۔ وہ ان کے سامنے آ گئیں۔

"وہ یہاں آیا تھا۔۔۔؟"

"کون۔۔۔؟"

"وہ یہاں آیا تھا نا سلیمان۔۔۔؟" ان کے لہجے میں خوف آمیز یقین تھا۔

"کس کی بات کر رہی ہیں آپ۔۔۔؟"

"زین العابدین۔۔۔ وہ یہاں تمہارے پاس آیا تھا، ہے نا سلیمان۔"

"وہ یہاں نہیں آیا تھا۔۔۔" سلیمان نے آہستگی سے اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"جھوٹ مت بولو سلیمان! وہ نہیں آیا تو یہ تصویر کہاں سے آئی۔" انہوں نے درشتی سے کہتے ہوئے تصویر ان کے سامنے کی۔ رائے سلیمان نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور لب بھینچ کر رہ گئے۔

"بولو! وہ یہاں آیا تھا۔۔۔ کیا کیا تم نے اس کے ساتھ۔۔۔" وہ بپھر کر بولیں۔ دوسرے پل ان کا گریبان آئمہ کے ہاتھ میں تھا۔ "بولو سلیمان! کیا کیا تم نے اس کے ساتھ۔۔۔ یہ تصویر وہاں کیوں اور کس سے گری تھی۔ کیا پلان کر رہے تھے تم لوگ۔۔۔؟"

سلیمان ششدر سے رہ گئے۔ لیکن انہوں نے گریبان چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس خود پر قابو پاتے ہوئے دونوں ہاتھ ان کے بازو پر رکھ کر تحمل انداز میں بولے تھے۔

"آپ یقین کریں۔۔۔ وہ یہاں نہیں آیا۔۔۔"

اور آئمہ جانتی تھیں۔ سلیمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ پھر وہ ان کے بازو پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"وہ یہاں آئے گا سلیمان۔۔۔ وہ یہاں ضرور آئے گا۔۔۔ وہ آئے گا اور کہے گا کہ میں زین العابدین ہوں۔۔۔ وہ سر اٹھا کر تم سب کو بتائے گا کہ وہ رائے جمشید حیات کا وارث ہے۔ اس حویلی کا ایک اور سپوت۔۔۔"

انہوں نے چہرہ اونچا کر کے سلیمان کو دیکھا۔ آنسو بھل بھل ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ سلیمان لب بھینچے انہیں دیکھتے رہے۔

"میں جانتی ہوں سلیمان۔۔۔ وہ ایک دن یہاں تمہارے سامنے کھڑا ہو گا۔ مگر تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔۔۔ تم سن رہے ہو سلیمان۔۔۔" انہوں نے ساکت کھڑے سلیمان کو جھنجھوڑ ڈالا۔ "وہ بے گناہ ہے، بے قصور ہے۔۔۔ اسے کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

نہ جائیداد نہ وراثت۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ بس اپنا نام، اپنی شناخت چاہتا ہے۔ سر اٹھا کر جینا چاہتا ہے۔ اگر جرم اس کے باپ نے کیا ہے تو سزا اسے مت دینا۔ تم نہیں جانتے وہ میرے لیے کیا ہے۔ تم نے کبھی اسے غور سے نہیں دیکھا۔ کبھی اسے غور سے دیکھنا سلیمان۔۔۔ اس کی آنکھیں جمشید کی آنکھیں ہیں۔ اس کی آواز جمشید کی آواز ہے۔ وہ بولتا ہے تو اس کے لہجے میں مجھے جمشید سنائی دیتا ہے۔ اس کا وجود جمشید کی خوشبو سے مہکتا ہے۔۔۔ اگر اسے کچھ ہوا سلیمان تو جمشید دوبارہ مر جائے گا۔۔۔ اسے نہیں مرنا چاہیے۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ میں جمشید کو دوبارہ مرتے نہیں دیکھ سکتی۔۔۔"

نہ معلوم کون کون سے خدشات ان کے دل میں چھپے بیٹھے تھے جو موقع ملتے ہی زبان کی نوک تک آ گئے۔ ایک خود کلامی تھی۔

"لیکن میں یہ سب تم سے کیوں کہہ رہی ہوں۔۔۔ تمہیں تو جمشید سے نفرت ہے نا۔۔۔ لیکن وہ صرف جمشید کا ہی تو نہیں تمہاری پھپھو کا بھی بیٹا ہے۔۔۔ وعدہ کرو سلیمان۔۔۔ میرے ساتھ وعدہ کرو۔۔۔ وہ تمہارے سامنے آیا تو تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔۔۔ وہ تم سے کچھ بھی کہے۔۔۔ میری خاطر وعدہ کرو۔۔۔" وہ ہسٹریائی انداز میں ان کا ہاتھ دبوچے کہہ رہی تھیں۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں آئمہ آنٹی! آپ اندر چلیں۔۔۔" ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتے سلیمان بمشکل گویا ہوئے۔

"نہیں۔۔۔ تم پہلے مجھ سے وعدہ کرو۔۔۔"

"زینب! چھیما۔۔۔" رائے سلیمان کی گرج دار آواز پر جہاں وہ دونوں بھاگتی آئیں وہیں آئمہ ایک دم خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگیں۔

"بی بی کو اندر لے جاؤ۔۔۔" انہوں نے آہستگی سے کہا اور خود رخ بدل لیا۔ دونوں ملازماؤں نے ذرا حیرت سے دیکھا۔ پھر آئمہ کی طرف بڑھیں۔

"چلیں بی بی۔۔۔"

"تو تم وعدہ نہیں کرو گے۔۔۔" انہوں نے بے حد بے یقینی سے سلیمان کو دیکھا۔

"آپ اندر جائیں۔۔۔" ان کا لہجہ سپاٹ سا ہو گیا۔ آئمہ گھوم کر ان کے سامنے آئیں۔

"سلیمان! ایک بات یاد رکھنا۔۔۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

کہتی وہ پلٹیں اور تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں گھس گئیں۔ رائے سلیمان لب بھینچے نجانے کیا سوچتے رہے۔ پہلی بار ایک ہلکا سا اضطراب ان کے چہرے پر نظر آیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"باجی زارا۔۔۔!" سلیم اسے دیکھتے ہی چہکا۔

"کہاں ہیں تمہارے بھائی جان۔۔۔؟" زارا نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ کے لیے خود کیک بیک کیا ہے انہوں نے۔ ابھی ابھی ٹیرس پر گئے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔"

"لگتا ہے بھائی جان بہت خوش ہیں۔ صبح سے خواہ مخواہ گنگنائے جا رہے ہیں۔ مجھے یونہی سو روپیہ پکڑا دیا کہ جاؤ عیش کرو۔"

"ابھی پتا چل جائے گا کہ موصوف خوش کیوں ہیں۔"

زارا ٹیرس پر آئی تو وہ دونوں ہاتھ ریلنگ پر جمائے دریا کی ساکت لہروں پر ہوا کے بھنور بنتے دیکھ کر گنگنا رہا تھا۔ زارا نے حیرت و دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کے اس موڈ کو دیکھا۔ کم از کم زارا نے اسے آج سے پہلے کبھی گنگناتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"اگر ساہیوال کا موسم تمہیں اتنا ہی خوش اور فریش کر دیتا ہے تو تم اکثر ایک چکر وہاں کا لگا آیا کرو۔"

زین چونک کر پلٹا۔ پھر ہنس دیا۔

"السلام علیکم۔۔۔!"

"وعلیکم السلام! جیتے رہو۔۔۔"

"آپ سے کس نے کہہ دیا۔ میں خوش ہوں۔۔۔؟" وہ دونوں ہاتھ عقب میں ریلنگ پر ٹکاتے

ہوئے پوچھ رہا تھا۔ زارا نے اس کا جگمگاتا چہرہ اور روشن آنکھیں دیکھیں۔

"کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں۔"

زین نے ملکے سے سیٹی بجائی۔ پھر زیرِ لب بڑبڑایا۔

"زین العابدین! تم کچھ نہیں چھپا سکتے۔"

"مجھ سے تو واقعی کچھ نہیں چھپا سکتے۔" زارا کا لہجہ جتاتا ہوا تھا۔

"اچھا چھوڑیں۔ آپ اتنی دیر سے کیوں آئی ہیں؟۔ میں نے آپ کے لیے ایسا زبردست کیک بنایا ہے کہ آپ نے ساری زندگی نہیں کھایا ہو گا۔" وہ زینے کے دروازے پر چارکا۔

"سلیم! ابی شہزادہ سلیم صاحب! میں نے کہا اگر زحمت نہ ہو تو وہ کیک نکال کر اوپر تشریف لے آئیں۔"

"ہم فارغ نہیں ہیں۔ آپ خود ہی زحمت فرمائیں۔" وہ نیچے سے پکارا۔

"آپ خاصے گستاخ واقع ہوئے ہیں شہزادہ سلیم۔ ہم ٹانگیں توڑ دیں گے۔" وہ غصے سے گویا ہوا۔

"شہزادہ بھی کہتے ہیں اور بے عزتی بھی کرتے ہیں۔" کچھ لمحوں میں خفا خفا سا سلیم سیڑھیوں پر نمودار ہوا تھا۔ ٹرے اس نے دونوں کے درمیان رکھی۔

"تم کیا سچ مچ خود کو شہزادہ سمجھنے لگتے ہو۔؟" زین نے مذاق اڑایا۔ وہ منہ بنا کر نیچے اتر گیا۔ زین نے چھری اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

"کاٹیے۔"

"کس خوشی میں۔؟"

"خوشی۔" زین نے لمحہ بھر کو سوچا پھر مسکرا دیا۔ "آج کے دن میں نے آپ کو پہلی بار یونیورسٹی میں دیکھا تھا اور جب گھر آ کر بابا کو بتایا تو انہوں نے ایسا ہی ایک کیک بنا کر کہا تھا۔ "زین العابدین! اسی خوشی میں کیک کاٹو۔""

زارا نے چھری پکڑ لی۔

"پتا ہے زارا! آپ اور پھپھو میرا سب سے خوبصورت رشتہ ہیں۔ سب سے خوبصورت حوالہ۔"

"تم مجھے زارا کیوں کہتے ہو جبکہ میں تم سے بڑی ہوں۔" زارا نے پوچھا۔

"تو پھر کیا کہوں۔؟"

"کچھ بھی۔ آپی۔ باجی۔"

"آپی۔!" وہ ہنسنے لگا۔ "شکل دیکھیں آئینے میں جا کر۔ آپی لگتی ہیں آپ میری؟" وہ ہنسنے اور مذاق اڑانے لگا۔

"میں چھری کھینچ ماروں گی۔" زارا نے دھمکی دی۔

"اچھا۔ اچھا کہہ دوں گا آپ کو آپی۔ باجی۔ خاص طور پر آپ کے رضوان صاحب کے سامنے تو ضرور کہہ دوں گا۔ خوامخواہ غلط فہمی کا شکار ہی نہ ہو جائیں۔ آخر اتنی ڈیشنگ پرسنالٹی ہے میری۔" وہ اترا کر بولا تھا۔

"اب آئینے میں منہ دیکھنے کی باری تمہاری ہے اور تم رضوان کے پیچھے مت پڑے رہا کرو۔ وہ ایسی ذہنیت کا مالک نہیں ہے۔"

"میری جرات کہ ان کو کچھ کہہ سکوں۔" اس نے فوراً پینترا بدلا۔ "ویسے میں آپ کا چھوٹا بھائی بننے کو تیار ہوں۔ لیکن بڑے نخرے ہوتے ہیں چھوٹے بھائیوں کے۔ اٹھا سکیں گی آپ۔"

وہ ذرا جھک کر متبسم و شریر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میں تمہارے سارے نخرے اٹھانے کو تیار ہوں زین العابدین۔"

زارا نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ زین کی آنکھوں میں جلتی روشنیاں تین گنا بڑھ گئی تھیں۔ جیسے اماوس کی رات میں ہزاروں جگنو جگمگا اٹھے ہوں۔

"تھینک یو زارا۔" پھر ذرا رک کر بولا تھا۔ "آپی۔"

"لیکن زین! تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔" زارا نے چھری واپس رکھ دی۔

"آپ سے جھوٹ بولوں گا۔؟ مرنا ہے مجھے۔"

"میں نے تمہیں گاؤں میں دیکھا تھا۔"

زین ٹھٹھک گیا۔ پھر سر پر ہاتھ مار کر بڑبڑایا۔

"اور میں سمجھتا رہا کہ کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی۔ ایک دم گھامڑ ہو تم زین العابدین۔"

"زین! کچھ ملا۔؟" زارا مسکرائی پھر قدرے سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں واپس آنے کو کہوں۔ پھر خیال آیا مجھے تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ تمہیں وہی کرنا چاہیے جو تم چاہتے ہو۔"

"میں نے بھی کئی بار سوچا کہ آپ کو بتا کر جاؤں۔ پھر خیال آیا کہیں آپ مجھے روک نہ لیں۔ حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر بار بار سوچا کسی بہانے جا کر پھپھو سے ملوں لیکن دل و دماغ کا فیصلہ ایک ہی تھا کہ اس حویلی میں قدم رکھوں گا تو اپنی اصل شناخت کے ساتھ۔"

"پھر ملا زین۔؟"

"بہت کچھ۔" وہ ایک دم پر جوش ہو گیا۔ "میں نے کہا تھا نا کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور مل جائے گا۔ جو بابا کی بے گناہی کو ثابت کر سکے اور مجھے وہ مل گیا ہے زارا۔ مجھے یقین تھا۔ بابا نے قتل نہیں کیا۔ وہ کر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو بس ایک سازش کا شکار ہو گئے تھے۔ گولی بابا نے نہیں چلائی اور میں یہ بات ثابت کر سکتا ہوں۔"

اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ زارا چونک گئی۔

"کیسے۔؟"

"میں بہت مایوس ہو کر پلٹ رہا تھا زارا۔! مجھے لگا میں کبھی سچ نہیں کھوج سکوں گا۔ لیکن وہ میرا اللہ۔ وہ مجھے مایوس نہیں ہونے دیتا اور اب مجھے خبر ہوئی اللہ اسے میرے راستے میں کیوں لے آیا تھا۔"

"کس کی بات کر رہے ہو۔؟"

"وہ جس نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"یعنی گواہ۔ مگر کون۔؟" زارا بری طرح چونکی۔

زین مبہم سا مسکرایا۔

"یہ نہیں بتا سکتا۔"

"لیکن زین! جو شخص اتنے برسوں تک نہیں بولا۔ وہ اب گواہی دے گا۔"

زین کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"دے گا۔ ہر صورت میں دے گا۔ بلکہ اب تو دینا پڑے گی۔" زین نے اسے سب ہی کچھ بتایا تھا۔ سوائے گواہ کے نام کے۔ شام آہستہ آہستہ دریا کے پانیوں میں گھلنے لگی اور ریستوران کی روشنیاں جلنے لگیں اور وہ کہہ رہا تھا۔

"اب کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ مجھے یقین ہے۔ رائے سلیمان جان چکا ہے کہ میں کون ہوں میرے والٹ سے تصویر کا غائب ہونا۔ کسی کو اس تصویر سے کیا لینا دینا۔؟ کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ ماسوائے اس کے کہ رائے سلیمان کو بتایا جائے کہ میں کون ہوں۔ پھر رائے سلیمان کا رویہ۔ اسے مجھ سے کیا پرخاش ہے۔ وہ جب بھی مجھ سے بات کرتا ہے۔ اس کا لب و لہجہ بے حد ناگوار اور درشت ہوتا ہے۔ بالکل وہی لہجہ جو کسی دشمن کے ساتھ روا رکھا جائے۔"

"تم سلیمان بھائی سے دوبارہ ملے تھے۔؟" زارا چونکی۔

"ان کے گاؤں گیا تھا۔ ایک آدھ دفعہ تو ٹکراؤ ہونا ہی تھا۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ قاتل کا نشانہ کون تھا۔؟" زارا نے پرسوچ انداز میں پوچھا۔

"غالب گمان تو یہی ہے کہ نشانہ بابا جان ہی تھے۔ گھوڑا بدک جانے کی وجہ سے نشانہ چوک گیا۔"

"اور ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قاتل دونوں کا مشترکہ دشمن ہو۔" زارا اس معاملے کو نئے انداز میں دیکھنے لگی تھی۔ "ایک تیر سے دو شکار۔ رائے نواز قتل اور رائے جمشید ہمیشہ کے لیے مفرور۔ اس سچویشن سے فائدہ کس کو حاصل ہوا؟"

زین بری طرح اچھلا۔

"رائے سلیمان۔؟"

"کم آن زین! باؤ از اٹ پاسبل ؟" زارا ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔ سارے اختیارات اور جاگیر ان ہی کے ہاتھ تو آئی ہے۔ فائدہ صرف اور صرف اسی شخص کو حاصل ہوا۔" وہ پُرجوش ہو گیا۔ ذہن ایک نئی سمت چل دیا تھا۔

"تمہارا کہنے کا مطلب ہے، محض اختیارات اور جاگیر کے لیے رائے سلیمان اپنے باپ کو قتل کروا دیتا ہے۔۔۔ نو۔۔۔ نیور۔۔۔"

"قتل اور کس لیے ہوا کرتے ہیں، ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے زارا ڈیر۔۔۔"

"نہیں زین۔ میرا دل نہیں مانتا۔۔۔"

"دل کی نہیں۔ حقائق کی بات کریں۔ چلیں ٹھیک ہے ایک کام کریں۔۔۔ رائے سلیمان سے اتنا تو معلوم کریں۔ وہ کون تھا جس نے رائے جمشید کو گولی چلاتے دیکھا۔۔ کوئی تھا؟ یا محض ان دونوں کے درمیان جھگڑے کی بنا پر سمجھ لیا گیا کہ قاتل رائے جمشید ہے۔ حویلی تک یہ خبر کس نے پہنچائی اور کن الفاظ میں؟ جھوٹ کہاں سے شروع ہوا؟ پھپھو اور انکل عمیر امریکہ میں تھے۔ رضوان کا تو سمجھیں اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ انہوں نے اپنی آدھی زندگی بورڈنگ اور پھر امریکہ میں گزار دی۔ گاؤں میں یہ خبر بعد میں پہنچی وہاں تو ایک ہزار ایک باتیں ہیں۔ فقط رائے سلیمان ایسا شخص ہے جو اس بارے میں کوئی مستند بات بتا سکتا ہے۔"

زارا کچھ لمحے سوچتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر تاسف سے کہنے لگی۔

"ماموں کے فرار نے ان پر لگے ہر الزام کو درست ثابت کر دیا۔"

"کاش بابا نے اس بزدلی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا۔۔ وہ گھبرا کر فرار ہوئے اور جب سنبھلے تو کہانی کچھ کی کچھ ہو چکی تھی۔ لیکن بزدلی سب سے پہلے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کرتی ہے۔ بس بھاگ جانے پر مجبور کرتی ہے۔ کاش بابا! ایک بار ڈٹ کر سامنے آجاتے تو آج یہ سب نہ ہوا ہوتا۔" زین کے لہجے میں تاسف سا چھلکنے لگا تھا۔

"زین!" زارا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "اب جو کچھ بھی کرنا ہے جلد کرنا ہے۔ ہمارے پاس خاموش رہنے کا وقت نہیں۔ اس سے قبل کہ سلیمان بھائی کوئی غلط قدم اٹھالیں۔ وہ کل واپس آئیں گے اور میں کل ہی ان سے بات کروں گی۔"

"دو ٹوک بات کیجیے گا۔ مجھے اب کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ بس بابا کا نام کلیئر ہونا چاہیے۔" وہ سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا۔ زارا مسکرا دی۔

"ڈونٹ وری۔ وہ اب مجھے ٹال نہیں سکیں گے۔ لیکن کیا یہ کیک یونہی رکھا رہے گا۔" اس نے بات بدلی۔

"بالکل نہیں۔ یہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"

زارا کو اب خواہش نہیں رہی تھی۔ کچھ گہری ہوتی شام بھی اسے جلدی میں ڈال گئی تھی۔ اس نے یونہی ذرا سا ٹکڑا لے لیا۔ زین نے پیپسی کے ٹن پیک کھولے اور اپنا گلاس لے کر پھر سے ریلنگ کی طرف آگیا۔ ہوا پتوں کو چھو کر گزرتی تو وہ تالیاں سی پیٹنے لگتے۔ کوئی پتا شاخ سے ہاتھ چھڑاتا تو پانی میں دور تک دائرے بنتے چلے جاتے۔

"مجھے لگتا ہے۔ میں ایسی ہی کسی خوبصورت شام میں آپ سے ملنے رائے ہاؤس آؤں گا۔ اپنے اصل نام اور تعارف کے ساتھ۔۔۔" وہ ذرا سا سر اٹھائے آسمان پر تیرتے بادل کے اس زرد ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا جو سورج کے آخری کنارے کو چھو کر آیا تھا۔

"ان شاء اللہ۔" زارا کے دل نے بے اختیار کہا۔

یہ شام اور تیرا نام
دونوں کتنے ملتے جلتے ہیں
تیرا نام نہیں لوں گا
بس تم کو شام کہوں گا

کہیں ٹی وی فل آواز میں چل رہا تھا۔ زین کو گندم کے سنہری کھیتوں پر چھائی شام جیسی لڑکی یاد آگئی۔

"نین تارے۔۔۔" وہ زیر لب مسکرایا۔ اس کا دل چاہا وہ زارا کو اس کے متعلق بتائے اور پوچھے "کیا یہ محبت

ہے۔۔۔؟"

وہ متذبذب ہی تھا جب زارا اٹھ گئی۔ وہ اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا اور آج سے پہلے وہ کبھی اسے گاڑی تک چھوڑنے نہیں آیا تھا۔ زارا نے دروازہ کھولا تو دونوں ہاتھ اس پر ٹکاتے ہوئے متبسم چہچہتے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"آپ کو ایک اور بات بھی بتانا تھی۔"

"۔۔۔؟"

"یہ سوچتا ہوں رہنے دوں۔۔۔" اس نے کان کھجاتے ہوئے کہا تو زارا مسکرا دی۔

"کیا یہ ممکن ہے زین العابدین۔۔۔؟"

"جانے کیسا رشتہ ہے میرا آپ سے۔ میں اپنا ہر غم۔۔۔ ہر خوشی آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔"

"اب کہہ بھی دو زین۔۔۔" زارا کو جلدی تھی۔ "دیکھو شام کتنی گہری ہو گئی ہے۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے سر اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھا۔ "چلیں، ٹھیک ہے آپ جائیں۔ یہ بات پھر کبھی تفصیل سے بتاؤں گا۔ جب آپ کے پاس بہت سا وقت ہوگا۔"

زارا نے اصرار نہیں کیا۔ زین نے اس کے بیٹھنے پر دروازہ بند کیا۔ پھر جھک کر کہنے لگا۔

"پھپھو سے کہیے گا۔ زین انہیں بے حد یاد کرتا ہے۔"

"اور بھی۔۔۔؟"

"ان سے کہیے گا۔ میرے لیے دعا کریں۔"

"اوکے۔۔۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ زین نے اس کی گاڑی کو بہت دور تک جاتے دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ دائیں طرف مڑ گئی۔

♥ ♥

کئی رجسٹر تھے جنہیں منشی بشیر علی کھول کھول کر رائے سلیمان کے سامنے رکھ رہا تھا۔ رائے سلیمان کے انداز میں ہلکی سی بے توجہی تھی۔ جیسے ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہو۔ تب ہی ایک جگہ غلط اندراج پر نشان لگاتے ہوئے سلیمان نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"وہ چلا گیا ہے۔۔۔؟"

"کون۔۔۔؟"

"وہی لڑکا۔۔۔ کیا نام تھا اس کا۔۔ ہاں زین العابدین۔۔۔ چلا گیا یا یہیں ہے۔" ان کا انداز اب بھی سرسری ہی تھا۔

"وہ تو کل دوپہر ہی چلا گیا تھا۔" منشی بشیر علی کے لہجے میں مایوسی سی تھی۔

"ہوں۔۔۔" رائے سلیمان دوبارہ رجسٹر پر جھک گئے۔

"پر وہ دوبارہ ضرور آئے گا۔" کچھ دیر کے بعد منشی بشیر علی بولا تھا۔ سلیمان نے چونک کر سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں ناگواری کی ہلکی سی لکیر ابھری تھی۔

"تمہیں الہام ہونے لگا ہے چاچا۔۔۔"

"الہام کیسا پتر۔ حوصلہ بڑھ گیا ہے اس کا۔۔ ایک بار صحیح سلامت لوٹ گیا ہے۔ دوبارہ ضرور آئے گا۔ ایک بار حویلی اور زمینیں دیکھ گیا ہے اب وہ رکے گا۔ آخر وارث ہے وہ بھی۔ حصہ ہے اس کا بھی اس ساری جائیداد میں۔۔۔"

"اتنی جرات نہیں اس میں کہ وراثت کا دعویٰ کرے۔" رائے سلیمان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"جرات تو اپنے آپ ہی پیدا ہو گی۔ یہاں ہمدرد جو پیدا ہو گئے ہیں اس کے۔۔۔"

وہ مقبول ہے نا اپنی بھانجی کا نکاح کر رہا ہے اس کے ساتھ۔۔۔" منشی نے اگلی اطلاع دی۔

رائے سلیمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تو کرنے دو نکاح۔ تمہیں کیا اعتراض ہے۔۔۔؟"

منشی بشیر علی ششدر سا رہ گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

"مجھے کیا اعتراض ہو گا، جب کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ پر کیا کروں پتر۔۔۔ میری آنکھوں سے تو بڑے رائے صاحب کا چہرہ اوجھل نہیں ہوتا۔ کیا گزرتی ہوگی ان کی روح پر۔ جب ان کے قاتل کی اولاد ان کی

قبر پہ دندناتی پھر رہی ہوگی۔"

"منشی بشیر علی۔" رائے سلیمان کے لہجے میں عجیب سی گرج تھی۔ منشی بشیر ایک دم چپ ہو گیا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"آپ اسے پکڑ لیتے تو وہ خود بخود ہی بول دیتا کہ جمشید کہاں چھپا ہے۔"

رائے سلیمان کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ پھر ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔ گاؤں والے کب جانتے تھے کہ جمشید مر چکا ہے۔

"ٹھیک ہے چاچا۔ اٹھاؤ یہ سب کچھ۔"

منشی بشیر نے رجسٹر اکٹھے کر کے بغل میں داب۔ سلیمان نے اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دروازے تک جا کر رک گیا۔

"ویسے پتر سلیمان! اب تم اپنی قسم کا کفارہ ادا کر ہی دو۔"

رائے سلیمان نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ منشی بشیر علی تیزی سے باہر نکل گیا۔ رائے سلیمان کے اعصاب تن گئے اور وجود میں چنگاریاں سی چٹخنے لگی تھیں۔

♥ ♥

"بھابھی! سلیمان بھائی کہاں ہیں۔۔۔؟" زارا نے لاؤنج میں میگزین کے صفحے پلٹتی عالیہ سے پوچھا۔ سلیمان بھائی کل ہی گاؤں سے آئے تھے۔

"کیا معلوم۔۔۔؟" وہ قدرے چڑ کر بے نیازی سے گویا ہوئیں۔ "وہ تو گھر میں بھی ہوں تو بھی علم نہیں ہوتا کہ کہاں ہیں۔"

"لڑائی ہو گئی کیا۔۔۔؟" زارا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"لڑے تو انسان اس سے، جو دو گھڑی دستیاب ہو۔ یہاں تو ہفتہ ہفتہ بھر ان کی شکل نظر نہیں آتی۔ شہر میں ہوں تو بھی خبر نہیں ہوتی کہ موصوف کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ بیوی تو گویا ایک فالتو پرزہ ہے۔ جسے گھر کے کسی کونے میں ڈال کر بھول چکے ہیں تمہارے سلیمان بھائی۔" وہ نجانے کس بات پر بھری بیٹھی تھیں۔

"بیویوں کو اگر ناشکری قوم کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔" سلیمان اندر داخل ہوئے۔

"اور شوہروں کو تو طعنے دینے کا موقعہ چاہیے۔ ایسی کون سی ناشکری دکھا دی میں نے۔" وہ تنک کر پوچھنے لگیں۔ انہوں نے زارا کو دیکھا اور متبسم لہجے میں کہنے لگے۔

"تمہاری بھابھی کا آج لڑائی کا موڈ ہے۔"

"مجھے کیا لڑنا ہے۔ بس یاد دہانی کروا رہی تھی۔ اماں کا فون آیا تھا کہ ہم پنڈی کب آ رہے ہیں۔ عاصم کی منگنی ہے اور سب کچھ میری وجہ سے رکا ہوا ہے۔" انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کا نام لیا۔

"تو تم جاؤ نا۔ ہم نے کب روکا ہے۔ سعد کے اسکول سے دو چار چھٹیاں لے لو۔" انہوں نے آرام سے پلان کیا۔ وہ سسرال کم کم ہی جاتے تھے۔ "یہ تو تم عورتوں کے معاملات ہیں۔ میں فون پر عاصم کو مبارک باد دے دوں گا۔"

"گویا آپ نہیں چل رہے۔"

"تھوڑا مشکل ہو جائے گا۔ ایک دو کام اٹکے ہیں۔ پھر فصل کی کٹائی بھی شروع ہونے والی ہے۔" انہوں نے گویا صاف انکار کیا تھا۔

"ٹھیک ہے اماں، بابا سے کہوں گی۔ خود بات کر لیں اپنے لاڈلے داماد سے۔ میری نہیں سنتے۔" وہ گویا خفا ہو کر اٹھی تھیں۔ سلیمان مسکراتے ہوئے زارا کی طرف پلٹے پھر پوچھنے لگے۔

"تم کیا سوچ رہی ہو۔۔۔؟"

وہ جو اس پورے عرصے میں یہی سوچتی رہی تھی کہ سلیمان بھائی سے کس طرح بات کرے۔ سر جھٹک کر بولی۔

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں۔۔۔؟"

"ٹھیک ہیں۔"

"اچھا مجھے کہیں جانا ہے۔۔۔" انہوں نے گھڑی پہ نگاہ دوڑا کر اٹھنے کا ارادہ کیا۔ تو وہ بول اٹھی۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"کہو۔۔۔؟" وہ اٹھتے اٹھتے پھر سے بیٹھ گئے۔ زارا متذبذب سی ہو گئی۔ رائے سلیمان سے بات کرنا آسان کام نہ تھا۔

"کہو نا بیٹا! پیسوں کی ضرورت ہے۔۔۔؟" ان کے لہجے میں مخصوص سی شفقت در آئی۔

"نہیں۔۔۔" وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

"تو۔۔۔" رائے سلیمان نے اس کے متذبذب چہرہ و انداز کو بغور دیکھا۔ تب ہی اس نے گویا دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"مجھے ماموں کے بارے میں بات کرنا ہے۔۔۔" وہ ان کی سمت دیکھ رہی ہوتی تو ان کے چہرے پر در آنے والی سنگین سنجیدگی کو جانچ لیتی۔۔۔ پھر بھی انہوں نے پوچھا تھا۔

"رائے جمشید کے بارے میں۔۔۔؟"

"میرے ایک ہی ماموں تھے۔۔۔" اسے اپنا اعتماد بحال کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ رائے سلیمان نے اسے دیکھا۔ پھر بولے تو لہجہ پُرسکون اور اطمینان بھرا تھا۔

"کیا بات کرنی ہے۔۔۔؟"

زارا نے سر اٹھا کر براہِ راست ان کی سمت دیکھا۔

"سننے والے نے تو یہ کہا کہ قتل رائے جمشید نے کیا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کون شخص تھا جس کی بات پر آپ نے بنا تصدیق کیے اعتبار کر لیا۔ کسی نے انہیں گولی چلاتے دیکھا۔ آپ نے یا اس شخص نے کوئی تو ایسا واضح ثبوت ہو گا جو ماموں کو قاتل ثابت کرے یا میں سمجھوں کہ آپ نے دانستہ یا وقتی جذباتیت سے واقعات کا رخ بدل دیا۔"

زارا نے اپنے آخری جملے کا ردِعمل ان کے چہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ مگر مقابل رائے سلیمان تھے، وہی سنجیدہ نگاہیں اور سپاٹ چہرہ۔

"اپنی بات پوری کرو۔۔۔؟" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"تفتیش اگر برابر طریقے سے ہوتی تو حقائق خود بخود سامنے آ جاتے۔۔۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ ثابت کر دیتی کہ گولی کتنی دور سے ماری گئی تھی اور رائے جمشید کتنے فاصلے پر موجود تھے یہ بات آپ کے عینی گواہ نے ضرور بتائی ہو گی۔ اس کے علاوہ بہت سی دوسری باتیں، دوسرے حقائق۔ جنہیں جاننا اس وقت آپ کے لیے بہت ضروری تھا۔ محض یہ کہنا کہ دونوں میں پیدا ہونے والی نفرت اور دشمنی کی بنا پر یہ قتل ہوا۔ واقعہ کا ایک رخ ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے اس کی آڑ لے کر کسی اور نے اپنا مقصد پورا کیا ہو۔"

زارا نے پہلی بار رائے سلیمان کی آنکھوں میں ہلکی سی الجھن تیرتی دیکھی۔

"تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔؟"

"کیونکہ مجھے کچھ ایسے شواہد ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل کوئی اور تھا۔" زارا نے آہستگی سے بتایا۔

"کیسے شواہد۔۔۔؟" وہ ذرا سا چونکے۔

"سوری! یہ میں ابھی نہیں بتا سکتی۔" وہ نظروں کا زاویہ بدل کر دیوار پر لگی پینٹنگ دیکھنے لگی۔ "مجھے صرف اس شخص کا نام دیں سلیمان بھائی۔ جس نے سب سے پہلے آپ تک یہ خبر پہنچائی۔ مجھے یقین ہے اس نے آپ سے جھوٹ بولا تھا اور یوں بھی ہمیں لگتا ہے نشانہ تایا جان نہیں ماموں تھے۔"

"ہمیں۔۔۔؟" رائے سلیمان نے زیرِ لب دہرایا۔ زارا ایک پل کو گڑبڑائی۔ رائے سلیمان نے ایک طویل سانس لے کر ذرا سا آگے جھکے اور براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"زارا! تم اب یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو جبکہ رائے جمشید زندہ بھی نہیں۔"

زارا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"آئی تھنک! آپ یہ بات جانتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہوں۔"

"میں تم سے سننا چاہتا ہوں۔۔۔" ان کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ فوری طور پر زارا فیصلہ نہیں کر پائی کہ زین العابدین کے بارے میں بتائے یا نہیں۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے سلیمان بھائی اب تک لاعلم ہی ہوں۔" ایک خیال سا ابھرا تھا۔

"زارا! تمہیں اب یہ سب جاننے کا خیال کیوں آیا ہے......" سلیمان بھائی نے اپنا سوال دہرایا۔

"سلیمان بھائی! اہمیت اس بات کی نہیں ہے کہ یہ خیال اب کیوں آیا دس سال پہلے کیوں نہیں آیا۔ میں دس سال کے بعد پوچھتی۔ آپ تب بھی یہی سوال کرتے۔ میں صحافت پڑھ رہی ہوں اور محض شوق نہیں ایک عزم کے ساتھ پڑھ رہی ہوں۔ کسی بھی غیر واضح سچائی کو واضح کرنا میری فطرت ثانیہ بن چکا ہے اور یہ تو ہمارے خاندان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔"

سلیمان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ در آئی۔

"اہمیت تو اس سوال کی ہے جو میں نے آپ سے کیا۔" زارا ان کی مسکراہٹ یکسر نظرانداز کر گئی۔

"اہمیت تو ان شواہد کی ہے جو بائیس برس کے بعد سامنے آئیں گے۔ اس سے پہلے کہ ہم پھر کسی بڑے نقصان سے دوچار ہو جائیں۔"

سلیمان بھائی نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر تھپتھپایا۔

"تم واقعی بڑی ہو گئی ہو اور لگ رہا ہے کہ صحافت پڑھ رہی ہو۔"

زارا کو ان کا انداز انسلٹنگ سا لگا۔ دوسرے معنوں میں وہ باور کروا رہے تھے کہ وہ کتنی بھی بڑی ہو جائے۔ ان کے مقابل نہیں آ سکتی۔

"تو آپ میرے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔"

زارا نے سر اٹھا کر بے حد سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔ رائے سلیمان نے کلائی موڑ کر گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

"تم نے مجھے خاصا لیٹ کروا دیا ہے۔"

"تو کیا میں سمجھوں کہ آپ دانستہ اس سچائی کو چھپانا چاہتے ہیں......" زارا ان کی طرف سے بدگمان ہو گئی تھی۔ اس کا لہجہ چبھتا ہوا اور تلخ تھا۔ رائے سلیمان نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے گہری نظروں سے اس کے تاثرات جانچے۔ زارا نے بھی نظروں کا زاویہ بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

"جس شخص نے تم تک یہ شواہد پہنچائے ہیں۔ اس سے کہنا اس سوال کا جواب بھی ڈھونڈ دے۔" ان کا لہجہ بالکل سپاٹ اور ٹھنڈا تھا۔ "میں چلتا ہوں ڈنر پر ملاقات ہو گی۔"

زارا نے لب بھینچ کر انہیں جاتے دیکھا۔

"یہ کام تو اب میں کروں گی سلیمان بھائی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

سائیں سائیں کوک نعیبا
سائیں سائیں کوک
دل میں عجب اندھیرا پھیلا
بینائی بے چین
ایک جھلک دکھلا کے سانول
اوڑھ گیو رے رین
جنگل جنگل، صحرا صحرا
گونجیں دل کے بین
گھائل ہو گئے نین مسافر
گھائل ہو گئے نین
سائیں سائیں کوک نعیبا
گھائل ہو گئے نین

اس نے پلٹ کر زین کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"تو کیا جانے یہ عشق کیا بلا ہے۔ بچہ ہے یار......"

"میں نے کب عشق کا دعوا کیا ہے افتخار بھائی۔"

زین ہنسا۔ گلابی شام دھرتی پر دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ ان کے اردگرد لوگ تھے ٹریفک کا شور تھا۔ اشیاء کے انبار تھے، سجے سنورے چہرے اور وہ بازو میں بازو ڈالے اسی شام میں چلتے جا رہے تھے۔

"سات سمندر تیر آئی ہے
ایک اکیلی جان......"

افتخار نے پھر سے نعرہ لگایا۔ آج وہ بڑی موج میں تھا۔ بن پیے بہک رہا تھا۔ زین نے اسے پہلے کبھی اس موڈ میں نہیں دیکھا تھا وہ دونوں چلتے جاتے تھے۔ کہیں رکتے...... کبھی ملک شیک، کبھی جوس پیتے اور پھر چل دیتے۔ کبھی کبھی وہ دونوں ہاتھ باندھ کر جھومنے لگتا۔

کبھی بادل وار برس سائیں
میرا سینہ گیا ترس سائیں
میں توبہ تائب دیوانہ
آباد کروں کیا ویرانہ
میری بس سائیں، میری بس سائیں
کبھی بادل وار برس سائیں
اس عشق نے عجب اسیر کیا
خود دل سینے میں تیر کیا
کیا چلے گی پیش و پس سائیں
کبھی بادل وار برس سائیں

وہ دھپ سے وہیں فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھا۔ پھر سر اٹھا کر سنجیدہ نظروں سے زین کو دیکھا، اس کا سانس پھولا ہوا اور چہرہ سرخ تھا۔

"جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے نہیں معلوم تھا اس کی آنکھوں کا رنگ کیسا ہے۔ مگر مجھے لگا میں ڈوب جاؤں گا۔ بس ایک بار ان آنکھوں میں جھانک لیا تو ہمیشہ کے لیے ڈوب جاؤں گا۔"

"میں نے اسے پہلی بار تب دیکھا تھا جب اس کے پاؤں میں کانچ لگ گیا تھا۔ لیکن مجھے تو ایسا کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔" زین افتخار کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ان کے پاس سے پھول بیچنے والے آوازیں لگاتے جا رہے تھے۔ تازہ پھولوں اور کلیوں کی مہک فضا میں گھل مل گئی تھی۔

"اس دن جب وہ......"

زین نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آج آپ صرف میری بات سنیں گے۔"

افتخار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہنسنے لگا۔

"تم بھی کہتے ہو گے، افتخار پاگل ہو گیا ہے... بس یار بہت دنوں سے اسے دیکھا نہیں نا... حالانکہ میں خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا مگر یہ کمبخت عشق یونہی خوار کرتا ہے۔"

"تو آپ دیر کیوں کر رہے ہیں افتخار بھائی......"

"اب نہیں کروں گا......" اس نے گویا خود سے تہیہ کیا۔ پھر چونک کر پوچھنے لگا "تم کیا کہہ رہے تھے......؟"

"میں شادی کر رہا ہوں۔۔۔" اس نے ایکدم کہا۔
"کیا۔۔۔؟" وہ اچھل پڑا۔ "اس سارے قصے میں شادی کہاں سے آگئی۔"
"پتا نہیں بس آگئی۔۔۔" وہ ہنس دیا۔
"کس سے کر رہے ہو۔۔۔؟"
"وہی لڑکی جس کے پاؤں میں کانچ لگ گیا تھا۔"
"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ اور جس کے بھائی۔۔۔ بتایا تھا تم نے مجھے ایک دفعہ۔ لیکن تم تو کہتے تھے ہم اس لڑکی کو بالکل نہیں جانتے۔"
"خیر۔ پہلے نہیں جانتا تھا' اب تو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اتفاق سے میں گاؤں میں ان ہی کے گھر ٹھہرا تھا۔"
"اتفاق سے۔۔۔؟" افتخار کی آنکھیں شرارت سے مسکرائیں۔
"بائے گاڈ افتخار بھائی میں سچ کہہ رہا ہوں۔"
"اوئے۔۔۔ تو افتخار کو اتنا بے وقوف سمجھتا ہے۔" اس نے دھپ لگائی۔
"تو آپ یقین نہیں کریں گے۔۔۔ مت کریں۔۔۔ لیکن بے بے سے بات تو کریں۔ وہ میرے ساتھ چلیں۔۔۔" اس نے افتخار کو پوری بات بتا کر کہا تھا۔
"بے بے سے تم خود بات کرلو۔۔۔" افتخار نے بے نیازی دکھائی۔
"افتخار بھائی۔۔۔" زین نے خفگی سے اسے دیکھا تو اس نے ہنستے ہوئے بازو اس کے کندھے پر پھیلایا۔
"تجھے تو بھائی کہا ہے میں نے۔۔۔ تم دیکھنا' ٹھیک ٹھاک برات لے کر جائیں گے۔"
"ٹھیک ٹھاک بارات کی ضرورت نہیں۔ بس میں آپ اور بے بے چلیں۔ باقی انتظامات ماما مقبول خود کر لیں گے۔"
"یار! تو تھوڑا انتظار کرلے تو ولیمہ ہم حویلی میں کھاتے۔"
"مجھے حویلی سے کیا لینا دینا۔ بس بابا کے نام پر لگے بے بنیاد اور گھٹیا الزام کو دھونا ہے۔ اور وہ انشااللہ اب ہو کر رہے گا۔ بس آپ میرا یہ کام کردیں کیونکہ اس معاملے میں آپ کے سوا کوئی میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"
"سمجھو ہو گیا اور بھلا بے بے کیوں نہیں مانیں گی۔ بہت پیار کرتی ہیں تم سے۔۔۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"چلو چلتے ہیں۔"
"آپ چلیں افتخار بھائی۔۔۔ میں آپ کے ساتھ گیا تو لمبا چکر ہو جائے گا اور آج سلیم سے میں جلدی آنے کو کہہ گیا تھا کیونکہ اسے چھٹی لے کر گھر جانا ہے۔"
"چلو ٹھیک ہے۔۔۔ میں جا کر بے بے سے بات کرتا ہوں۔۔۔" اس نے قریب سے گزرتی اپنے روٹ کی ویگن کو ہاتھ دے کر روکا۔
"آج ہی بات کیجئے گا افتخار بھائی! کیونکہ وقت بہت کم ہے اور ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔" اس نے پھر سے تاکید کی۔
"اتنی جلدی کس بات کی۔ کون سی گاڑی چھوٹ رہی ہے تم نے۔۔۔" افتخار نے ویگن میں سوار ہوتے ہوئے پوچھا۔
"وقت کا کیا پتا' کہاں کا ٹکٹ تھما دے۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔ جواباً افتخار نے ہاتھ ہلایا۔ ویگن کا دروازہ بند ہوا اور وہ زن سے نکل گئی۔ زین مسکرا کر پلٹا ایک مطمئن سی سانس بھر کر اس نے پھولوں کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا اور پاس سے گزرتے لڑکے کے ہاتھ میں کلیوں کے گجرے دیکھ کر اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔
(تمہارے لبوں کی وہ طنزیہ مسکراہٹ۔ اے محبت بھری مسکان میں نہ بدلا تو میرا نام بھی زین العابدین نہیں۔)
اس کا دل چاہا' وہ گجرے خریدے۔ پھر ہنس دیا۔
"کیا اپنی کلائی میں پہنے گا احمق۔۔۔"
عجیب سرخوشی کا احساس تھا۔ جو اس کے دل کو گھیر رہا تھا۔ ایک سکون' ایک طمانیت کا احساس۔ اس کے آگے ایک گول مٹول سا بچہ تقریباً لڑھکتا جا رہا تھا۔
"یہ شام اور تیرا نام" کی دھن سیٹی پر بجاتے ہوئے وہ مگن سا چلا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا اب زیادہ دن نہیں لگیں گے جب وہ اپنے لوگوں کے درمیان ہو گا۔ اپنے اصل نام اور شناخت کے ساتھ۔
"مجھے لگتا ہے' زندگی بالکل بدل جائے گی۔ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ آزاد۔۔۔"
اس نے راستے میں آئے ننھے سے کنکر کو ٹھوکر سے اڑاتے ہوئے مطمئن سے انداز میں سوچا تھا۔ اسی پل فضا گولی کی آواز سے گونج اٹھی۔ ایک پل کے لیے اسے لگا ایک گرم نوکیلی سلاخ ہے جو سینے میں دھنستی چلی گئی۔ اس کے وجود کو جھٹکا لگا اور گویا ہفت آسمان گھوم گئے اس کا ایک ہاتھ بے اختیار سینے کی طرف اٹھا جہاں سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا تھا۔ اس نے سہارے کے لیے دوسرا ہاتھ بڑھایا۔ مگر وہ خلا میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ زمین اس کے قدموں تلے کھسکتی چلی گئی۔ اس نے خود کو پاتال میں گرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کے اردگرد شور تھا' چیخ و پکار' دوڑتے قدموں کی آوازیں' بہت سے چہرے۔ اس کا سر بہت زور سے زمین سے ٹکرایا۔ اس نے آنکھوں کے سامنے چھاتی دھند کی اوٹ سے کسی بہت اپنے اور آشنا چہرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی' مگر ہر چہرہ اجنبی تھا۔ ہر آواز ناآشنا۔
"وقت اپنی چال چل گیا۔ تو کیا میں ہار گیا۔۔۔؟"
ایک زخمی سی سوچ اس کے شعور و لاشعور میں چکرا رہی تھی۔
دھند گہری۔۔۔ کچھ اور گہری ہو گئی۔
اسی دھند کے درمیان کچھ چہرے ابھرے تھے۔
کچھ آشنا اور بہت ہی اپنے چہرے۔
وہ انہیں پہچان سکتا تھا اور پکارنا چاہتا تھا مگر وہ سارے چہرے ایک نیلی دھند کی اوٹ میں غائب ہوتے گئے۔ بس کچھ آوازیں تھیں جو اس کے زخمی وجود کو اپنے حصار میں لے رہی تھیں۔ ہاں۔۔۔ وہ بابا کی آواز تھی جو دونوں بانہیں پھیلائے اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔
"زین العابدین! میرے پاس آؤ۔۔۔" وہ جانا چاہتا تھا۔
تب ہی ایک سسکتی ہوئی آواز نے پہلی آواز کا گلا گھونٹ دیا۔
"تمہیں نہیں پتا زین! تم میرے لیے کیا ہو۔ جمشید کا دوسرا جنم' تمہیں اگر خراش بھی آئی تو میں مر جاؤں گی۔"
ایک کراہ اس کے لبوں سے ٹوٹی۔ تو ایک اور آواز نے اسے سنبھال لیا۔
"میں تمہارے سارے نخرے اٹھانے کو تیار ہوں زین العابدین۔۔۔"
اس کی انگلیوں نے جلتے زخم سے ابل ابل نکلتے لہو کو روکنے کی کوشش کی۔
"تجھے تو بھائی کہا ہے میں نے۔۔۔ تم دیکھنا ٹھیک ٹھاک برات لے کر جائیں گے۔"
اس نے سر کو دائیں بائیں پٹخ کر گہری ہوتی دھند کو ہٹانے کی کوشش کی۔ مگر اس کے گرد اجنبی آوازوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر دور سے کسی اتھاہ گہرائی سے ایک شکوہ کرتی آواز کو اس نے مدھم سا سنا۔
"تم سب ایک جیسے ہو۔۔۔ بند کھڑکیاں کھولتے ہو اور جب دروازے کھل جائیں تو وہاں بس دستک چھوڑ جاتے ہو۔"
اس نے آخری بار چیخنا چاہا۔ مگر ایک سرد خاموشی اس کے لبوں پر آ گری۔ ایک عجیب سی بے بسی اور بند ہوتی حیرت آنکھوں میں منجمد ہو گئی۔ جو سوال کرتی تھی۔
"کیا یہ وقت کا انصاف ہے۔۔۔"
اندھیرے میں گم ہوتی شام۔۔۔ اس خوبرو نوجوان کو اپنی دھن میں مگن گنگناتے اور پھر گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ پاس سے گزرتے' دوڑتے بھاگتے لوگوں کی بے حسی پر کڑھی' اس کی بند ہوتی آنکھوں کا سوال بے حد افسردگی اور بے چارگی سے پڑھا اور پھر ان ہی آنکھوں میں بجھ گئی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

وہی شام نین تارہ کے آنگن میں بھی اتری تھی۔
اس شام کا رنگ بہت مختلف اور عجیب تھا۔
ہوا رکی رکی، فضا ساکت، ساری کائنات چپ گم صم.....
کیا پرندے واپسی کا رستہ بھول گئے ہیں۔
شام کی گود پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے خالی کیوں ہے؟
اور شام کا رنگ۔۔۔ بے حد زرد۔۔۔ یہ زرد رو شام گھر کے آنگن، دیواروں، چھتوں، گاؤں کے کھیتوں اور درختوں سے لپٹی بے حد افسردہ اور خاموش لگ رہی تھی۔
نین تارہ کے آگ جلاتے ہاتھ رک سے گئے۔
اس نے جلتی ہوئی تیلی کو چولہے میں جھونکا اور پلٹ کر اسماء کو دیکھنے لگی۔ وہ نلکے پر محمد علی کو نہلا رہی تھی۔ گرمی بے حد تھی۔ وہ پانی کی دھار میں ہاتھ مار مار کر خوش ہو رہا تھا۔ نین تارہ نے ہنڈیا میں ڈوئی گھمائی۔ پھر ڈھکن سے ڈھانپ کر اسماء کے پاس آ گئی۔
"آپا! حویلی چلیں۔" بس اچانک ہی اس کا دل چاہا تھا۔ اسماء نے حیرت سے اسے دیکھا۔
زارا تو وہاں نہیں ہے۔"
"مجھے تو ان کی امی سے ملنا ہے۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ اور ماے مقبول کو دیکھنے لگی۔ وہ کندھے پر چادر ڈالے اندر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اب وہ یونہی خوش اور مگن سا دکھائی دیا کرتا تھا پھر چارہ بکریوں کو ڈالنے لگا۔
"ان سے کیوں ملنا ہے؟" اسماء کو پھر حیرت ہوئی تھی۔
"میرا دل چاہ رہا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔
"مگر اس وقت تو شام ہو رہی ہے۔ ابھی تو ہانڈی روٹی بھی کرنی ہے۔ پھر کسی دن بلکہ صبح چلیں گے۔"
"اچھا۔" نین تارہ خاموش ہو گئی۔
"کہاں چلنے کے ارادے ہیں؟" ماما مقبول ہاتھ جھاڑتا نلکے کی طرف آیا۔ اسماء نے محمد علی کو پیچھے کیا اور نلکا چلانے لگی۔

"تارہ کا دل حویلی جانے کو چاہ رہا تھا۔"
ماے مقبول نے ہاتھ دھوتے ہوئے سر اٹھا کر نین تارہ کو دیکھا اور ہنس دیا۔
"ہاں ہاں۔۔۔ تو چلی جاؤ نا۔"
"ابا! مجھے تو ابھی روٹی پکانی ہے۔" اسماء نے عذر پیش کیا۔
"اچھا۔" ماے مقبول نے کندھے پر رکھے صافے سے ہاتھ صاف کیے۔ "چل پھر میں چھوڑ آتا ہوں۔"
"یہ ٹھیک ہے۔ تم ابے کے ساتھ چلی جاؤ۔" اسماء نے کہا تو نین تارہ نے اثبات میں سر ہلا کر دوپٹہ ٹھیک طرح سے اوڑھ لیا۔ اور ماے مقبول کے ساتھ باہر نکل آئی۔
"ماما! یہ شام کتنی عجیب سی ہے۔ ہر چیز زرد رنگ میں نہا گئی ہے جیسے آسمان سے پیلا زرد رنگ برس رہا ہو۔" گلی میں اپنے ہی قدموں کی چاپ سے گھبرا کر وہ بول اٹھی۔
"گرمی میں ایسا ہو جاتا ہے۔"
"خاموشی کتنی زیادہ ہے۔" نین تارہ نے چاچے خوشیے کی خالی چارپائی کو دیکھا۔
"ہاں۔ شاید آندھی آئے گی۔ اس سے پہلے ہوا رک جائے تو ایسی ہی خاموشی محسوس ہوتی ہے۔" ماے مقبول نے پچھم کی طرف گرد گرد آسمان کو دیکھا۔
"ہاں شاید میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ وہ زارا ہے نا، اس کی امی بہت اچھی خاتون ہیں۔ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں بس ان ہی سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ان کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ اب تو وہ شہر چلی جائیں گی۔ میں ان سے ملنا چاہتی تھی۔"
"ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔ چلی آیا کر تو حویلی۔۔۔ ان سے اچھی اچھی باتیں کیا کر۔ ذرا ان کے طور طریقے اچھی طرح دیکھا اور سمجھا کر۔" وہ نجانے کیوں ہنس رہا تھا۔ نین تارہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر کہنے لگی۔
"میں نے کیا کرنا ہے ان کے طریقے سمجھ کے۔

بھلا ہمارے جیسے گھروں میں چل سکیں گے اور باتیں تو وہ خود اتنی اچھی کر لیتی ہیں۔ میں تو بس سنتی رہی تھی۔"
"کیا پتا رب سوہنے نے تیری قسمت کسی حویلی والے سے جوڑنی ہو۔" ماے مقبول نے بے حد پیار سے اس کا سنجیدہ سا چہرہ دیکھا۔
"بچوں جیسے خواب دیکھتے ہو ماما تم بھی۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔
"خواب کیوں؟" ماے نے خفگی سے اسے دیکھا۔
"تیری ماں تجھے اپنی رانی بیٹی کہتی تھی۔"
"ساری مائیں کہتی ہیں ماما! پر اس کے کہنے سے میں رانی تو نہیں بن گئی۔"
"بن تو سکتی ہے۔ اللہ چاہے تو تو بھی کسی حویلی میں رانی بن کر راج کر سکتی ہے۔"
وہ جو کچھ ماے مقبول کے دل و دماغ میں تھا، نین تارہ کیسے جان سکتی تھی تب ہی چڑ گئی۔
"ہاں ماما! وہ شہر والے کے آنے کی امید ٹوٹ گئی تو اب حویلی کے خواب دیکھنے لگے ہو۔" اس کا لہجہ تلخ تھا۔ ماما مقبول ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔
"میں پہلے ہی کہتی تھی۔ مت دیکھو ایسے خواب وہ اب نہیں آنے والا۔"
"آئے گا نین تارہ! ضرور آئے گا۔" ماما مقبول یقین لہجے میں بولا۔ ایک تلخ سی مسکراہٹ نے نین تارہ کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ وہ زیر لب نجانے کیا کہنے والی تھی۔ جب کہ مقبول خاموش ہو کر کچھ سوچ رہا تھا۔
... حویلی آ گئی۔
"... میں یہیں بیٹھتا ہوں پھر اکیلی واپس کیسے آؤ گی۔" ماے مقبول نے کہا۔
"... زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گی۔"
"... کوئی جلدی نہیں۔ تو اطمینان سے بیٹھنا۔" ماے مقبول نے کہا۔ نین تارہ نے اندر کی طرف قدم بڑھائے جب کہ مقبول درختوں کی چھایا میں بیٹھنے والوں میں آ بیٹھا۔

"کیسے ہو تایا؟" وہ لیٹا ہوا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"اللہ کا کرم ہے۔ تو سنا۔"
"میں بھی ٹھیک ہوں۔"
"یہ منشی بشیر علی نہیں نظر آیا صبح سے۔ کہیں گیا ہے؟" ماے مقبول نے پوچھا۔
"ہاں۔ اس کی بیٹی ہے نا، جس کا بیاہ چک جھمرہ میں ہوا ہے۔"
"ہاں۔۔۔ ہاں کیا ہوا اس کو؟" مقبول چونک گیا۔
"اس کے ہاں پانچ سال کے بعد بچہ پیدا ہوا پر مر گیا۔"
"پر اس بات کو تو بڑے دن ہو گئے۔ منشی ہو آیا تھا وہاں سے۔"
"طبیعت ٹھیک نہیں اس کی، پتا کرنے گیا ہے۔ سنا ہے اس کا خاوند دوسری شادی کرنے لگا ہے۔ جا کر سمجھائے بجھائے گا۔ پر بتایا تو خود ہی تھا۔ مرد شادی کیوں کرتا ہے۔ اولاد کے لیے نا۔"
وہ دونوں اپنی ہی باتوں میں لگ گئے تھے۔ نین تارہ اندر آئی تو سب سے پہلے چھیما ہی ملی تھی۔
"جی۔۔۔ تارہ باجی! آج یہاں کیسے؟"
"ہاں۔۔۔ میں چھوٹی بی بی سے ملنے آئی تھی۔"
"وہ تو کمرے سے ہی نہیں نکلتیں حالانکہ ان کی عدت بھی ختم ہو گئی ہے، تم اندر چلی جاؤ۔ کیا پتا اسی طرح ان کا دل بہل جائے۔"
چھیما اسے دروازے پر چھوڑ کر چلی گئی۔ نین تارہ نے دستک دی۔
"اندر آ جاؤ۔" بیزار سی آواز ابھری تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، پیروں تلے دبیز قالین آ گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر نیچے دیکھا پھر جوتے اتار دیے باہر شام ہونے کی بنا پر کمرے میں تاریکی ہو رہی تھی۔
"کون ہے۔۔۔؟"
"میں۔۔۔ میں نین تارہ۔" وہ ایک پل کو گڑبڑا سی گئی۔ آئمہ نے کروٹ بدلی پھر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
"تم۔۔۔ آؤ نین تارہ۔" وہ ننھے ننھے قدم

"ابے۔۔۔ بابا کہہ رہا تھا شاید آندھی آئے۔"

"آندھی کی ۔۔۔" انہوں نے زیر لب دہرایا۔ پھر پلٹیں۔ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں پھر آہستگی سے اس کا گال چھوا اور بولیں۔

"بہت پیاری بچی ہو نین تارہ! میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔" انہوں نے ایک دم سینے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی آواز بہت دور سے نکلی تھی۔

"کیا ہوا! آپ ٹھیک تو ہیں۔" نین تارہ نے پریشانی سے پوچھا۔ وہ واقعی انہیں ٹھیک نہیں لگی تھیں۔ آئمہ مضمحل سا مسکرائیں۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹی! یونہی دل ڈوب سا آیا تھا۔ آندھی آنے والی ہے اور کبھی کبھی یہ اپنے ساتھ بہت کچھ اڑا لے جاتی ہے تم اب گھر جاؤ آندھی آنے سے پہلے تمہیں گھر پہنچ جانا چاہیے پھر کسی دن آنا تفصیل سے بات کریں گے۔ آج دل کچھ قابو میں نہیں ہے۔"

نین تارہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنے چپل پہنے۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔"

جانے کیوں اب وہ قصداً بھی مسکرا نہ سکی۔

اسے دیکھ کر بابا مقبول اٹھ کر قریب آیا۔

"اتنی جلدی آگئیں۔"

"ہاں۔ ان کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

♥ ♡ ♡ ♥

وہی شام رائے ہاؤس کے وسیع لان میں کھلے دھنک رنگ پھولوں، سرسبز بیلوں، فوارے کے موتی نما پانیوں میں بھی اتری تھی۔ جب رضوان نے زارا کو لان میں بیٹھے دیکھا۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا اور چہرے پر سوچ کی پرچھائیں۔

رضوان اس کے قریب آرکا۔

وہ تب بھی بے دھیان رہی۔

رضوان کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے ذرا سا جھک کر کی چین سے ٹیبل بجائی۔ زارا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس دن گاؤں سے آتے ہوئے لنچ کا پروگرام بنانے کے بعد وہ دوپہر میں گھر نہیں آیا تھا۔ زارا منتظر رہی تھی، بلکہ اگلے دو دن بھی اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ اس سلسلے میں زارا سے کوئی معذرت ہی کر لیتا۔ یا شاید وہ شعوری طور پر اسے نظر انداز کر رہا تھا۔

"کیا سوچا جا رہا ہے۔" وہی مخصوص اپنائیت بھرا دوستانہ لہجہ، وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"کچھ خاص نہیں۔"

"میں نہیں مانتا۔" وہ پُر یقین لہجے میں بولا۔ زارا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آپ کو کہیں جانا ہے؟۔"

"ابھی تو آیا ہوں یار۔۔۔ ہاں اگر تمہارا موڈ ہو تو۔۔۔" وہ دونوں ہاتھ کرسی کی پشت پر جماتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"نہیں رضوان! اگر تھوڑا وقت ہے تو مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں ڈسکس کرنا ہے۔" اس کا لہجہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

رضوان کے چہرے پر بھی سنجیدگی چھا گئی۔ شاید اسے اندازہ تھا۔ زارا اس سے کیا بات ڈسکس کرنا چاہتی ہے۔ اس نے موبائل اور کی چین ٹیبل پر رکھی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کہو۔"

زارا کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی گویا موزوں الفاظ منتخب کر رہی ہو۔ رضوان کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"رضوان! میں آپ کی فیلنگز سمجھتی ہوں۔"

"یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے۔" وہ مسکرایا۔

"لیکن آپ میری اور مما کی فیلنگز نہیں سمجھ پا رہے۔" رضوان نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"فرض کریں، اگر سلیمان بھائی۔ جنہوں نے آپ کو باپ بن کر پالا ہے۔ اگر سلیمان بھائی سے کوئی بھیانک غلطی ہو جائے تو آپ ان سے نفرت کر پائیں گے۔ یا شیراز کچھ ایسا کرے تو کیا میں اس سے نفرت کر پاؤں گی؟"

اٹھاتی بیڈ کے قریب آئی۔

"السلام علیکم۔"

"خوش رہو۔" انہوں نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ دعا دی۔

"آپ اتنے اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہیں۔"

نین تارہ کو پہلی بار میں ہی اس عورت سے اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔

آئمہ خاموش ہی رہیں۔

"کھڑکی کھول دوں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کھول دو۔۔۔" آئمہ نے آہستگی سے کہا تو اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ روشنی کے ساتھ ساتھ تازہ ہوا بھی اندر آئی تھی۔ وہ پلٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"بیٹھو۔" انہوں نے بیڈ کی ہی سمت اشارا کیا۔ وہ کنارے پر ٹک گئی۔

"تم اس دن کے بعد آئی ہی نہیں۔"

"میں سوچتی تو تھی مگر۔۔۔" وہ اپنا جملہ بھول کر ان کا متورم چہرہ اور سرخ آنکھیں دیکھنے لگی۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔" پھر وہ ایکدم خاموش ہوئی۔ بھلا وہ کون ہوتی تھی پوچھنے والی۔

آئمہ مضمحل سا مسکرائیں۔

"آج کوئی یاد آ رہا ہے۔"

"کون؟" اس نے بے ساختہ پوچھا" زارا یاد آ رہی تھیں۔"

"نہیں، میرا بھتیجا ہے زین، میرے مرحوم بھائی کی اکلوتی نشانی۔"

"زین۔۔۔" نین تارہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ذہن بھٹک کر اس کی سمت چلا گیا تھا پھر وہ مسکرا دی۔

"کہاں حویلی کا سپوت اور کہاں وہ۔"

"بہت دنوں سے دل مچل رہا ہے اسے دیکھنے اور پیار کرنے کو اور آج تو۔۔۔" انہوں نے سینہ مسلتے ہوئے اک لمبی سانس کھینچی۔ پھر جھنجلا کر بولیں۔

"ایک تو یہ فون بھی خراب پڑا ہے۔"

نین تارہ خاموشی سے ان کی بے چینی دیکھتی رہی۔

"اچھا چھوڑو۔ تم سناؤ کیا کرتی ہو اب۔"

"اس دن جو آپ نے باتیں کی تھیں۔" اس نے اپنے ہاتھوں پر نظریں جما کر کہنا شروع کیا۔ "بہت سوچا ہے میں نے ان کو۔ آپ نے سچ کہا تھا۔ شاید یہ سب ہم سب کی آزمائش ہی تھا۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ مجھے اپنی صلاحیتوں کو آزمانا چاہیے۔

خدا نے مجھے صرف دکھ دینے کے لیے تو پیدا نہیں کیا ہوگا۔ زندگی کی خوشیوں میں تھوڑا سا حصہ میرا بھی تو ہوگا۔ اور میں کب تک دوسروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہوں گی کہ کوئی بچی کچی خوشی میری جھولی میں بھی ترس کھا کر ڈال دی جائے۔"

"نہیں تارہ! تم کیوں دوسروں سے آس لگاؤ۔ تمہارا تو اپنا وجود دوسروں کے لیے خوشی بن جائے گا۔ بس ذرا سی ہمت کرو۔ اپنے خدا پر بھروسا رکھ کر قدم آگے بڑھاؤ۔ لوگوں سے مت ڈرو تم دیکھنا خدا تمہیں کس عظیم انعام سے نوازے گا۔" وہ آہستگی سے اس کا گال تھپتھپا کر بولیں۔

"مجھے بڑا انعام نہیں چاہیے۔ میں تو بس سر اٹھا کر عزت کے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔"

"ایسا ضرور ہوگا۔" وہ ایک دم بے چین سی ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ یہ سر اٹھا کر جینے کی خواہش کا اظہار کسی اور نے بھی کئی بار کیا تھا۔

وہ اٹھ کر دروازے تک گئیں۔ نین تارہ یونہی دونوں ہاتھ گود میں دھرے انہیں دیکھنے لگی۔ انہوں نے ایکدم دروازہ کھول کر پکارا۔

"بی بی جی۔۔۔" وہ بھاگی آئی۔

"سلیمان نہیں آیا گھر سے۔" ان کے لہجے میں عجیب سا اضطراب در آیا تھا۔

"نہیں بی بی۔"

"دفع ہو جاؤ۔" وہ بری طرح جھنجلا گئیں۔ "فون بھی ٹھیک نہیں ہے۔" انہوں نے پلٹنا چاہا پھر ٹھٹک کر رک گئیں۔ ان کی نگاہیں آسمان پر جم کر رہ گئی تھیں۔

"نین تارہ! آج شام کا رنگ کیسا ہے؟" وہ اٹھ کر ان کے عقب میں آگئی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" اس نے جواباً سوال کیا۔

زارا نے ایک طویل سانس لے کر پشت بیک سے ٹکائی اور نظروں کا زاویہ بدل کر کھلے پھولوں کو دیکھنے لگی۔

"آنٹی عمیر جمشید سے نفرت نہیں کر سکتیں۔ اور نہ ہی زارا زین العابدین سے۔" اس کا لہجہ مدھم سا تھا۔

"اور مرنے والے سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں تھا؟" رضوان کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"کیوں نہیں تھا۔۔۔ بالکل تھا بلکہ ہے۔ اور آپ کے حوالے سے یہ رشتہ کچھ اور مضبوط ہو گیا ہے لیکن جو کچھ بھی ہوا اس میں زین العابدین کا کیا قصور؟ وہ تو سال بھر کا بچہ تھا رضوان۔"

"زارا! کیا ہم اس ٹاپک کو چھوڑ نہیں سکتے۔" وہ بے زار سا ہو گیا۔

"نہیں۔۔۔" زارا کا لہجہ قطعی تھا۔ "یہ ٹاپک تو شروع ہی اب ہوا ہے۔ اب جب کہ جمشید ماموں بھی نہیں رہے۔"

رضوان نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ خبر یقیناً اس کے لیے نئی تھی۔ زارا ایک پل کو خاموش ہوئی تھی۔

"رضوان! آپ نے کہا تھا، ہمارے رشتے کا سب سے خوبصورت پہلو اعتبار ہے۔ اسی کو سامنے رکھ کر آج آپ کو سب کچھ بتاؤں گی۔ کچھ ایسے حقائق جو آپ کو نہیں معلوم کچھ ایسی باتیں جن سے آپ کو لاعلم رکھا گیا۔ کیونکہ آج زارا کو آپ کی پوری سپورٹ کی ضرورت ہے کیونکہ مقابل رائے سلیمان ہیں جن کے ساتھ میرے کئی رشتے نکلتے ہیں۔ اور میں ان رشتوں میں دراڑیں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" رضوان الجھ گیا۔

"میں جو کہنا چاہتی ہوں اس امید پر کہہ رہی ہوں کہ آپ سچ کا ساتھ دیں گے۔" اس نے شوقی نظروں سے رضوان کو دیکھا۔

"کیسا سچ۔۔۔؟"

اور زارا نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ وہ سب کچھ بتایا تھا جو اسے معلوم تھا۔ اور رضوان رائے سلیمان نہیں تھا کہ اپنے تاثرات چھپا سکتا۔ جو کچھ وہ سوچ رہا تھا یا محسوس کر رہا تھا۔ زارا اس کے چہرے پر حرف حرف پڑھ رہی تھی۔

"میرے لیے کچھ بھی معلوم کرنا ناممکن نہیں ہے۔ حویلی کا کوئی بھی پرانا ملازم یا نگی جان ہی مگر سلیمان بھائی۔۔۔ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟"

رضوان لب بھینچے خاموش ہی رہا۔

"اگر یہ میری کوئی اسائنمنٹ ہوتی تو شاید میں آپ کو اس میں شامل نہ کرتی۔ مگر اب یہ یوں بھی ضروری ہے کہ یہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے۔ اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ ہمارا ساتھ کس حد تک دے سکتے ہیں۔"

"ہمارا۔۔۔؟" رضوان کا انداز استفسار یہ تھا۔

"آف کورس۔ میرا اور زین العابدین کا۔"

تب ہی اس کا موبائل جاگ اٹھا۔ زارا نے ایک نظر رضوان کے سنجیدہ چہرے پر ڈالی۔

"لیس۔۔۔"

"ہاں۔ میں بس نکل ہی رہی تھی۔ نہیں پورا ہو گیا ہے۔ میں بس آ رہی ہوں۔" اس نے موبائل آف کر کے رضوان کو دیکھا پھر اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی تھی۔

"مجھے عالیہ کے میگزین کے لیے ایک آرٹیکل دینے جانا ہے۔ آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں رضوان! پھر بتائیں کہ آپ ہماری کہاں تک مدد کر سکتے ہیں۔"

وہ شاید پہلے ہی جانے کو تیار تھی۔ رضوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس یونہی بے خیالی میں اثبات میں سر ہلایا تھا۔ جب تک زارا نے گاڑی نکالی۔ وہ اسی زاویے پر بیٹھا رہا تھا۔

زارا کا ذہن گاڑی کی رفتار کے ساتھ اپنے اگلے لائحہ عمل کو سوچ رہا تھا۔ سلیمان کے رویے نے اسے خاصا مایوس کیا تھا اور کبھی کبھی تو اس کا ذہن نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار وہ بات دہرانے لگتا۔

"سارے اختیارات اور جاگیر ان ہی کے ہاتھ تو آئی ہے۔ فائدہ صرف اور صرف اسی شخص کو حاصل ہوا۔"

اس نے رضوان سے اس امکان پر بات نہیں کی۔ وہ جانتی تھی رضوان بھڑک اٹھے گا۔ سلیمان اور رضوان کی محبت باپ بیٹے جیسی تھی۔ اور جب تک کوئی ٹھوس بات اور ٹھوس حقائق اس کے ہاتھ نہ لگتے۔ وہ خود بھی سلیمان کے خلاف کوئی فیصلہ صادر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تو رائے سلیمان! یہ زارا عمیر کے لیے ایک چیلنج ہے۔" اسے گاڑی کی رفتار آہستہ رکھنا پڑی۔ سڑک کے کنارے بے حد ہجوم تھا۔

"کیا ہوا بھائی؟" اس نے گاڑی روک کر شیشہ نیچے کرتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ شاید کوئی حادثہ ہوا ہے۔" وہ ابھی ابھی آیا تھا۔

"ہر روز کوئی نہ کوئی ہنگامہ کوئی نہ کوئی حادثہ یہ تو معمول بن چکا ہے۔"

اس نے کوفت و دل گرفتی سے سوچتے ہوئے گاڑی بیک کی اور دوسری سڑک سے نکل گئی۔

اسے کیا معلوم تھا، آج اس سے چند قدموں کے فاصلے پر حادثے کا شکار ہونے والا شخص کون تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

رضوان ڈاکٹر شمسی سے ملنے ہسپتال آیا تھا۔ زارا سے بات کرنے کے بعد وہ بے حد ڈسٹرب ہو کر گھر سے نکلا تھا۔ یونہی سڑکوں پر گاڑی بھگاتے ہوئے وہ ہسپتال کے سامنے سے گزرا تھا۔ تو خیال آیا ڈاکٹر شمسی سے مل لے۔ اسے اس ورکر کے بارے میں بات کرنا تھی جس کا بازو مشین میں آکری طرح کچلا گیا تھا۔ اپنے ورکرز کا اپنے خاندان کی طرح خیال رکھنا اس نے انکل عمیر سے سیکھا تھا۔

کاریڈور میں اس نے ٹھٹک کر اس نوجوان کو دیکھا جو ایک ڈاکٹر کا بازو پکڑے چیخ رہا تھا۔

"اسے کچھ ہو گیا تو ہم اس اسپتال کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

اس کے قریب ہی اسٹریچر پر ایک زخمی نوجوان خون میں لت پت پڑا تھا۔ رضوان سرسری نگاہ ڈال کر گزر جاتا اگر اس نے غصے میں آگ بگولہ ہوتے اس نوجوان کو پہچان نہ لیا ہوتا۔

وہ اشعر تھا۔ بے حد ذہین اور متحمل مزاج لڑکا۔ رائے عمیر کی فیکٹری میں پیکنگ کے شعبے کا سپروائزر۔ یوں تو فیکٹری میں کئی سپروائزر ہوں گے مگر اشعر کو یوں خصوصیت حاصل تھی کہ اس نے اپنی تعلیم ملازمت کے دوران مکمل کی تھی۔ اور اب وہ یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا اور سیکنڈ شفٹ میں کام کرتا تھا۔ رائے عمیر نے اسے بہت سی مراعات دے رکھی تھیں۔ خاص طور پر امتحانوں کے دنوں میں وہ بغیر تنخواہ کاٹے چھٹیاں دے دیا کرتے تھے۔ اسے اجازت تھی کہ وہ براہ راست اپنے کسی بھی مسئلے کے لیے ان سے مل سکتا تھا۔

"ایسے ہی نوجوان اس ملک و قوم کا سرمایہ ہیں۔" ایک بار رضوان کے سامنے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد جب رضوان نے فیکٹری سنبھالی تو اس نے افسردگی و مایوسی میں گھرے اس نوجوان کو رائے عمیر ہی کی طرح ٹریٹ کیا تھا۔

"اشعر!" رضوان نے قریب جا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ فوراً پلٹا پھر اضطراری انداز میں اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔

"سر۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ میرا یونیورسٹی فیلو ہے۔ یہ مر رہا ہے اور یہ لوگ اسے دیکھ ہی نہیں رہے۔ کہتے ہیں پہلے پولیس میں رپورٹ درج کرو۔ سر! یہ مر جائے گا تب تک۔ اتنی بے حسی۔۔۔ اتنی۔۔۔"

"اشعر۔۔۔!" رضوان نے اس کا ہاتھ تسلی آمیز انداز میں دبایا پھر ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیا مسئلہ ہے ڈاکٹر۔۔۔؟"

"کیا مسئلہ ہونا ہے۔ مسئلہ تو یہ سسٹم ہے ہمارا۔ بعد میں پولیس آ جائے گی ہمیں تنگ کرنے کو۔" ڈاکٹر جھنجھلا کر بولا۔

…کیا اب حارث بھی پولیس کی مرضی سے ہوا کرے گا۔" اشعر چیخ اٹھا "اس کی حالت بگڑ رہی ہے۔"

رضوان نے نظروں کا زاویہ بدل کر خون میں ڈوبے نوجوان کو دیکھا۔ کھڑی ناک، کشادہ پیشانی، اس کے نقوش میں بڑی جاذبیت اور معصومیت تھی۔ وہ پلٹ کر ڈاکٹر شمسی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر شمسی اس کے ساتھ ہی باہر آئے تھے۔ وہ نوجوان پر جھک گئے نجانے اس کی سانس بھی چل رہی تھی یا نہیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔

"اسے آپریشن تھیٹر میں منتقل کریں۔" ڈاکٹر شمسی نے پلٹ کر جونیئر ڈاکٹر سے کہا۔ دوسرے پل وہاں بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔

"ڈونٹ وری اشعر! انشاء اللہ اسے کچھ نہیں ہو گا۔" رضوان نے اسے تسلی دی تو اس نے بے حد مایوسی سے سر اٹھا کر رضوان کو دیکھا۔

"پتا نہیں سر۔ میں جب وہاں پہنچا تو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ خون بہت بہہ رہا تھا اور لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔" اشعر کی پلکیں نم تھیں۔

"وہ تمہارا دوست ہے؟"

"نہیں۔ میں اسے افتخار بھائی کے حوالے سے جانتا تھا۔" اشعر ایک دم چونک گیا پھر تیزی سے بولا۔

"سر! آپ کچھ دیر یہاں رکیں گے۔ میں افتخار بھائی کو فون کر دوں۔"

رضوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اشعر چلا گیا۔ وہ پلٹ کر آپریشن تھیٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ نرس تیزی سے باہر نکلی۔

"آپ ان مریض کے ساتھ ہیں؟" رضوان نے اثبات میں سر ہلایا۔

"خون کی اشد ضرورت ہے۔ اے پوزیٹو۔"

رضوان کا اپنا گروپ بھی یہی تھا۔ اسے سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ بوتل خون دے کر نکلا تو وہاں خون دینے والے کئی لڑکے جمع ہو چکے تھے۔

"تھینک یو سر! تھینک یو سو مچ۔" اشعر نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"اس کی ضرورت نہیں اشعر!" رضوان نے آہستگی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ پھر جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"اس پر میرا گھر اور موبائل کا نمبر ہے۔ کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے کال کر لینا۔" کارڈ اشعر کے ساتھ کھڑے شخص نے پکڑا۔ ایک سرسری سی نگاہ دوڑائی اور چونک کر سر اٹھایا۔ اس نے بغور رضوان کو دیکھا اور گھنی مونچھیں سنوارتے ہوئے بھرپور انداز میں مسکرایا۔

"آج تو کمال ہو گیا۔"

اس نے جاتے ہوئے رضوان کو دیکھا اور زیر لب بڑبڑایا۔

"افتخار بھائی! وہ بچ جائے گا نا۔"

اشعر کا لہجہ ڈرا ہوا تھا۔ افتخار کے چہرے پر سنگین سنجیدگی بکھر گئی۔ اس نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر ڈالی۔

"اگر اسے بچانا ہوتا تو آج رائے رضوان یہاں نہ آتے۔ تم دعا کرو۔ میرا دل کہتا ہے اسے کچھ نہیں ہو گا۔"

"لیکن اسے گولی کس نے ماری؟ وہ تو بے حد بے ضرر نوجوان تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔" اشعر الجھ کر پوچھنے لگا۔ افتخار نے خاموشی سے کارڈ جیب میں ڈالا۔

"ذرا خیال رکھنا۔ میں زارا کو فون کر دوں۔"

"زارا!" اشعر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"جرنلزم کی زارا عمر اس کی کزن ہے۔" افتخار نے بتایا۔

"اچھا۔" اشعر کے لیے یہ انکشاف ہی تھا۔

♥ ♥

وہ سب ہی لاؤنج میں موجود تھے۔ اور ایسا بہت عرصے کے بعد ہوا تھا۔

"السلام علیکم۔" زارا اندر آئی تو سب ہی نے اکٹھے جواب دیا تھا۔

"ارے! زارا! تم بھی آ گئیں۔ میں کہہ رہی تھی … ہے تو دونوں بھائی اکٹھے گھر پر نظر آ رہے ہیں۔" عالیہ رضوان اور سلیمان کو دیکھ کر … زارا نے وہیں بیٹھتے ہوئے رضوان کو دیکھا … نظر آیا۔ جب کہ سلیمان خاصے خوشگوار … تھے۔

"… تھک گئی زارا؟" عالیہ نے پوچھا تو اس نے … سر ہلا دیا۔

"… پریشان ہو رضوان۔" رائے سلیمان … سے پوچھ رہے تھے۔ ان کے لہجے میں پیار … تھا۔

رضوان نے ایک نظر زارا کو دیکھا اور قصداً … دیا۔

"بس یونہی فیکٹری میں کچھ پرابلمز چل رہی ہیں۔"

"کتنی بار کہا ہے مجھے بتایا کرو مگر تم تو…" انہوں نے رضوان کے کندھے پر بازو پھیلایا۔

"ہاں۔ سلیمان بھائی کے پاس ہر پرابلمز کا حل ہے … کسی کی پرابلم حل کرنا چاہتے ہیں۔" زارا کا لہجہ … کوشش کے باوجود نارمل نہ تھا۔

سلیمان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"میں دوسروں کو بھی موقع دیتا ہوں۔ تاکہ انہیں بھی اپنی صلاحیتوں کا علم ہو۔ اس کے بعد میری مدد کی … آتی ہے۔"

"آپ کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے دوسروں کو آپ کی مدد کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔"

"زارا!" رضوان نے بے اختیار اسے ٹوکا تھا۔

"بولنے دو یار۔" سلیمان نے محظوظ ہوتے ہوئے رضوان کا کندھا تھپتھپایا۔ "خفا ہے مجھ سے۔ غبار نکل جائے گا۔"

زارا لب بھینچ کر رہ گئی۔ جب کہ عالیہ نے بے حد حیرت سے دونوں کو دیکھا۔

"آپ دونوں میں کیا ناراضی ہو گئی۔"

اس سے قبل کہ دونوں میں سے کوئی جواب دیتا۔ فون کی بیل گونج اٹھی۔ رضوان نے ریسیور اٹھایا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"تمہارا فون ہے زارا۔"

زارا اٹھ کر قریب آئی اور اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

"یس زارا اسپیکنگ۔"

"افتخار خیریت۔" دوسری طرف افتخار کی آواز سن کر اسے خاصی حیرت ہوئی تھی۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے زارا بی بی۔"

"کیا ہوا افتخار؟" اس کا دل دھڑک سا گیا۔ نظریں بے اختیار رائے سلیمان کی طرف اٹھیں جو عالیہ کی کسی بات کا جواب دے رہے تھے۔

"زین کو گولی لگی ہے۔"

"کیا۔؟" زارا کا دل ایک پل کو بالکل خاموش ہو کر دھڑکا تھا۔ سب ہی پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔

"وہ ٹھیک تو ہے افتخار؟" اس نے بے تابانہ پوچھا۔

"آپریشن تھیٹر میں ہے حالت خاصی نازک ہے۔ ڈاکٹرز زیادہ پرامید نہیں ہیں۔" افتخار نے کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔ ہسپتال آ کر اسے یہی سب معلوم ہوا تھا۔

"میں آ رہی ہوں افتخار۔" اس نے فون پٹخا اور تیزی سے پلٹی نظریں رائے سلیمان پر جم گئی تھیں۔ اور اس کی آنکھوں میں اتنی بیگانگی اور نفرت تھی کہ ایک پل کو رائے سلیمان بھی ٹھٹک گئے۔

"تو آپ نے وہی کیا۔" وہ ان کے سامنے کھڑی سلگتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "اور میں ہمیشہ مما کو جھٹلاتی رہی کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔"

سلیمان نے الجھ کر اسے دیکھا۔ رضوان کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا زارا۔؟"

اس نے زارا کا کندھا تھام کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ کوئی سنگین حادثہ پیش آیا تھا اس کا ادراک سب ہی کو ہو رہا تھا۔

زارا نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور رائے سلیمان کی

طرف تھی۔

"میں زارا عمیر ہوں۔ آمنہ عمیر سمجھنے کی غلطی مت کیجئے گا مجھے۔ جو اپنے بھائی کو کھو کر خاموش رہی تھی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا نا رائے سلیمان! تو میں کسی کو معاف نہیں کروں گی۔" اس کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی۔ ایک جھٹکے سے پلٹی اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

ہکا بکا رضوان نے رائے سلیمان کو دیکھا۔ ان کا چہرہ بے حد سپاٹ تھا۔

"سلیمان بھائی۔۔۔" اس نے کچھ پوچھنا چاہا۔ پھر تیزی سے زارا کے پیچھے لپکا، وہ گاڑی کا لاک کھول رہی تھی۔

"زارا! کیا ہوا ہے؟"

"رائے سلیمان سے پوچھیں۔" اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ رضوان نے جھنجلا کر دروازہ بند کیا۔ کندھوں سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں کیا ہوا ہے؟" اس کی گرفت اور لہجہ دونوں ہی سخت تھے۔

"زین العابدین پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" رضوان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"اب یہ بھی بتاؤں کہ کس نے کیا ہے؟" وہ چبا چبا کر بولی۔ رضوان ششدر سا رہ گیا۔ اس نے آہستگی سے اپنے ہاتھ اس کے کندھوں سے ہٹا لیے۔

زارا نے اک چبھتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ ہکا بکا کھڑے چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ اس کی گاڑی نکلنے تک رضوان فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

♥ ♡ ♡ ♥

آپریشن تھیٹر کے سامنے وقت گویا منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک ایک سیکنڈ رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ خوف اور واہموں میں ڈوبے لمحے وہ سب ایک دوسرے سے اپنے اپنے خوف چھپائے دست بہ دعا تھے۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے تھے۔

آصف حیدر، سلیم افتخار اور نجانے کون کون؟

زارا ایک ہی جگہ مانند بت ایستادہ تھی۔

"بیٹھ جائیں زارا۔" افتخار نے اس کے سامنے آکر آہستگی سے کہا۔

زارا نے اس کی سمت دیکھا۔ افتخار کو ان آنکھوں میں بس خوف ہی خوف نظر آیا تھا۔

"افتخار! وہ بچ جائے گا نا۔"

"دعا کریں۔" وہ بس یہی کہہ سکتا تھا۔ اور سال تو رواں رواں محو دعا تھا۔

کوئی بے حد خاموشی سے اس کے قریب آکھڑا ہوا تھا۔ زارا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اسے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی رضوان آئے گا۔

رضوان، زارا کے ساتھ کھڑے افتخار کو دیکھ کر چونک گیا۔

"تم۔" اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

"جی میں۔"

"شعر تمہارے ساتھ ہی تھا نا۔؟" وہ اب بھی کچھ سمجھ نہ پایا تھا۔

"جی۔ اب وہ گھر چلا گیا ہے۔" افتخار نے جواب دیا۔

"تو وہ۔" رضوان نے بے اختیار پلٹ کر آپریشن تھیٹر کے بند دروازے کو دیکھا "تو وہ زین العابدین تھا؟"

"جی ہاں وہی زین العابدین تھا۔" افتخار نے آہستگی سے جواب دیا۔ اور آصف کی طرف مڑ گیا۔ زارا نے سوالیہ نظروں سے ہکا بکا رضوان کو دیکھا۔ اس نے انگلیوں سے پیشانی مسلتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابھی ابھی جس شخص کو خون دے کر وہ گھر گیا ہے، وہ کوئی اور نہیں زین العابدین تھا۔

تب ہی آپریشن تھیٹر پر جلتی سرخ بتی بجھ گئی۔ ان سب کے دل دھڑکنا بھول گئے۔

ڈاکٹر شمسی باہر آئے تھے۔

وہ سب اپنی اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئے۔ خوف ان کے قدموں کو زنجیر کیے بیٹھا تھا۔ افتخار آہستگی سے آگے ہوا۔ اس کی بے تاب استفہامیہ نگاہیں۔ ڈاکٹر

۔۔۔ پر نمی تھیں۔

۔۔۔ ہے مگر۔ اس کی حالت خطرے ۔۔۔ نہیں ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں ہوش آ گیا تو ۔۔۔

۔۔۔ آگے سب کی سانسیں رک جاتی ۔۔۔ زارا نے خوف زدہ ہو کر رضوان کو دیکھا۔ اس ۔۔۔ اس کا کندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ ۔۔۔

"۔۔۔ ابھی تک یہیں ہو رضوان۔" ڈاکٹر شمسی نے ۔۔۔ پوچھا۔

"۔۔۔ آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" رضوان نے ۔۔۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

♥ ♡ ♡ ♥

۔۔۔ گھنٹے۔

۔۔۔ چوبیس سال، بلکہ چوبیس صدیاں بن گئی تھیں۔

۔۔۔ تاریک رات بنتی تھی۔

"۔۔۔ اس رات کی صبح ہو گی؟" کبھی کبھی اس کے ۔۔۔ بول اٹھتا۔

"ضرور ہو گی۔"

شیشے کے اس طرف بے حس و حرکت پڑے وجود کو ۔۔۔ بار دیکھ چکی تھی۔

اس کی شوخیاں۔

ادائیں

۔۔۔ یاں

۔۔۔ سب کچھ نہیں یاد آ رہا تھا۔

"آپ کے بغیر تو زین العابدین کچھ بھی نہیں ہے ۔۔۔" اس نے ایک بار مما سے کہا تھا۔

"میں جب تک آپ سے ملا نہیں تھا، مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ یہ رشتے اتنے اہم ہوتے ہیں۔۔۔ اب مجھے افسوس ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلے کیوں نہیں ملے۔"

"میرا دل چاہتا ہے، میں کھلے عام اپنی پھپھو کے گھر آؤں۔ ان سے لاڈ اٹھواؤں، ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتاؤں کہ میں تنہا نہیں ہوں، یہ مسز آمنہ عمیر میری پھپھو ہیں۔"

اس کے لبوں سے اک کراہ سی نکلی۔

ڈاکٹر شمسی باہر نکلے تھے۔ وہ ان کے سامنے آ گئی۔

"انکل پلیز!"

"بیٹا! ضد کیوں کر رہی ہیں۔۔۔؟"

"میں صرف ایک نظر اسے قریب سے دیکھنا چاہ رہی ہوں۔"

انہوں نے رضوان کی سمت دیکھا۔ وہ بس کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے لیکن زیادہ دیر نہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر شمسی نے دروازہ کھولا۔ وہ بڑے ضبط سے اندر گئی تھی۔ وہ بالکل چپ تھا۔ ایک دم خاموش، مگر اس کی شوخ آواز زارا کی سماعتوں میں اودھم سا مچا رہی تھی۔

"میں نے سوچا، آپ کو اپنے ہاتھوں سے مچھلی فرائی کر کے کھلاؤں گا۔"

"اور جو میں نہ آتی۔"

"یہی مچھلی لے کر آپ کے گھر پہنچ جاتا۔"

"پتا ہے زارا! آپ اور پھپھو میرا سب سے خوبصورت رشتہ ہیں۔ سب سے خوبصورت حوالہ۔"

زارا کا دل چاہا، وہ اس کی کشادہ پیشانی پر بکھرے بالوں کو سمیٹے۔

"نجانے کیسا رشتہ ہے میرا آپ سے۔ میں اپنی ہر خوشی، ہر غم آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔"

باوجود ضبط کے آنسو اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ وہ بند لبوں سے التجا کر رہی تھی۔

"آنکھیں کھولو زین۔"

ڈاکٹر شمسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

"پھپھو سے کہیے گا، زین انہیں بے حد یاد کرتا ہے۔"

وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

"زارا۔۔۔! ریلیکس۔۔۔" رضوان آگے بڑھا۔ افتخار نے بے بس سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"رضوان! انسان اتنا سنگدل بھی ہوتا ہے۔" اس نے بھیگا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا چاہا تھا اس نے بس یہی کہ وہ اپنی اصل شناخت کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ کیا یہ زین العابدین کا قصور ہے کہ وہ جمشید حیات کا بیٹا ہے۔ غلطی رائے سلیمان کرے تو کیا سزا تمہیں ملنی چاہیے۔"

"زارا! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔"

"تو کن باتوں کا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو مما زندہ نہیں رہیں گی۔ آپ نہیں جانتے زین ان کے لیے کیا ہے۔" اس نے تھک کر دیوار سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

"اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو آپ کیا کریں گی۔ یونہی ایک آرٹیکل لکھ کر خاموش ہو جائیں گی۔"

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔

"افتخار۔۔۔" اس نے بے اختیار پکارا۔ خاموش بیٹھے افتخار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم نے رپورٹ درج کروائی تھی۔"

اس سے قبل کہ افتخار کچھ بولتا، رضوان بول اٹھا تھا۔

"ڈاکٹر شمسی سے بات کر لی ہے میں نے۔۔۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔ تمہیں تو پتا ہے وہ یہاں۔۔۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔" زارا کی نم آنکھوں میں تحیر اتر آیا۔ دوسرے پل وہ بپھر کر بولی تھی۔ "کیا کچھ نہیں ہوگا رضوان! رپورٹ درج ہوگی اور رائے سلیمان کے خلاف ہوگی۔"

افتخار نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا۔ اور رخ بدل لیا۔ وہ یکسوئی سے دعا کرنا چاہتا تھا۔

"یہ ضروری تو نہیں زارا کہ۔۔۔"

"یہ ضروری ہے۔ اس وقت اس شہر میں رائے سلیمان واحد شخص تھا جو اسے زندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔" وہ زہرخند لہجے میں گویا ہوئی۔

رضوان لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا وہ اس وقت کچھ نہیں سنے گی۔ مگر جو کچھ وہ سوچ رہی تھی۔ وہ ہونا بھی تو ناممکن تھا۔ نرس لپکتی ہوئی ڈاکٹر شمسی کے کمرے میں گئی تھی۔ دوسرے پل ڈاکٹر شمسی اور ڈاکٹر فرحان آئے تھے۔

بہت دور مؤذن نے اذان دی تھی۔ اندھیرے سے پھوٹتی صبح، رات کو شکست دیتی دن کی روشنی، سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ان بند پلکوں میں جنبش ہوئی تھی۔ اک ہلکی سی کراہ۔ زندگی کی علامت بن گئی۔

زارا کی سینے میں کب سے اٹکی اک سانس باہر نکلی تھی۔

افتخار نے وہیں سجدہ شکر ادا کیا تھا۔

رضوان کے سر سے اک بوجھ اتر گیا اگر زین العابدین کو کچھ ہو جاتا تو نجانے رائے فیملی پر مزید کیا قیامتیں ٹوٹ پڑتیں۔

"میں نے کہا تھا ناں اسے کچھ نہیں ہوگا۔ آج تو معجزوں کا دن تھا۔" افتخار آصف سے کہہ رہا تھا۔

"اسے نیند کا انجکشن دیا ہے۔ جلد ہی روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔"

"کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔" رضوان کہہ رہا تھا۔

"ڈونٹ وری سن۔۔۔" انکل شمسی نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔

♥ ▽ ▽ ♥

"کپڑے استری کر دیے پتر میرے۔" ماما مقبول نے اندر آ کر پوچھا۔ اسماء ابھی ابھی محمد علی کو سلا کر لیٹی تھی۔ جو رات بارہ بجے اٹھ بیٹھا تھا۔ سو صبح صبح دوبارہ سو گیا۔

"ابھی کر دیتی ہوں ابا! بس ذہن ہی سے نکل گیا۔" وہ جلدی سے اٹھ کر دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے بولی۔

"میں کر دیتی ہوں آپا۔۔۔" نین تارہ ابھی ابھی برتن دھو کر آئی تھی۔ اسماء کے جواب کا انتظار کیے بغیر دھلے ہوئے کپڑوں میں سے ماما مقبول کے کپڑے نکالنے لگی۔

"نین تارہ! پتر شہر چلو گی میرے ساتھ۔" ماما مقبول کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔ نین تارہ نے بے یقینی سے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"میں۔۔۔" پھر سر جھٹک کر بولی۔ "میں کیا کروں گی جا کر۔"

"اپنی پسند سے چیزیں خرید لینا۔"

"چیزیں۔۔۔" استری کا پلگ لگاتے ہوئے نین تارہ نے ایک بار پھر بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ پھر پوچھنے لگی۔ "ماما! کیسی چیزیں؟"

"یہ بھی بس پگلی ہے۔" ماما مقبول نے ہنس کر اسماء کو دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

"پگلی جاؤ نین تارہ! سب کچھ اپنی پسند کا خرید لینا۔ آخر پہننا اوڑھنا تو تم ہی کو ہے۔" اسماء نے بھی کہا تو اس کے ہاتھ رک گئے۔

"آخر آپ لوگ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔" استری جلتی چھوڑ کر وہ پوری کی پوری ان کی طرف مڑ گئی۔

"اب کیا خالی ہاتھ رخصت کریں گے تمہیں۔ کوئی زیور، گہنا، کپڑا لتا کچھ تو خریدنا ہے۔ جہیز پورا تو اس وقت اتنی جلدی میں بن نہیں سکتا، پر جو کچھ بن سکتا ہے وہ تو کریں گے۔" ماما مقبول نے کہا۔

وہ کچھ لمحے خالی الذہنی کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ اسماء نے چپل پہنی اور باہر نکل گئی۔

"ماما! تمہیں واقعی یقین ہے کہ وہ آ جائے گا۔" وہ ایک بار پھر بے حد حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"تو تو بالکل ہی پاگل ہو گئی ہے۔" ماما مقبول جھنجلا کر باہر نکل گیا۔ اسے ابھی نہانا تھا۔

"پھر مجھے یقین کیوں نہیں آتا۔" وہ نچلا لب کاٹتے ہوئے زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

♥ ▽ ▽ ♥

"مجھے ایس پی شاہ میر سے بات کرنا ہے۔ میرا نام۔۔۔" موبائل اس کے ہاتھ سے ایکدم جھپٹ لیا گیا تھا۔ وہ ایکدم گھومی۔

"تم بے وقوفی کر رہی ہو؟" رضوان سخت غصے میں تھا۔

"مجھے یہ بے وقوفی کر لینے دیں رضوان۔۔۔" زارا نے موبائل لینے کو ہاتھ پھیلایا۔ اس کا لہجہ سنجیدہ و پرسکون تھا۔

"یہ پاگل پن ہے۔ رائے سلیمان پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ بیٹھی ہو۔" رضوان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زارا کو اس اقدام سے کس طرح باز رکھے۔

"آسان ہے یا مشکل مگر مجھے یہ کام کرنا ضروری ہے۔ اور رضوان آپ کہہ رہے ہیں یہ پاگل پن ہے۔ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا پاگل پن ہے۔ ظالم کا ہاتھ روکنا پاگل پن ہے اور وہ پاگل پن نہیں ہے جو رائے سلیمان نے کیا۔ اک معصوم شخص کو موت کے گھاٹ اتار دینے کی کوشش کو کس طرح جسٹی فائی کریں گے آپ۔ کیا جواز دیں گے؟" وہ بھڑک اٹھی۔ رضوان کا یوں اپنے سامنے رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جانا اس کے لیے شاک تھا۔

"زارا! میں مانتا ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر صلح جو لہجے میں گویا ہوا۔

"سلیمان بھائی سے غلطی ہوئی ہے۔ انہیں یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ مگر تم جو کر رہی ہو۔ وہ بھی ٹھیک نہیں۔ سراسر جذباتی پن۔"

"جذباتی پن۔۔۔" زارا نے تحیر سے اسے دیکھا۔ پھر تلخ لہجے میں گویا ہوئی۔ "یہ نوجوان اب بھی خطرے سے خالی نہیں ہے رضوان صاحب!" اس نے بے سدھ پڑے زین العابدین کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ زندہ بچ گیا ہے اور رائے سلیمان اسے دوبارہ مروانے کی کوشش ضرور کرے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا زارا۔ بلیو می۔" زارا کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"تو آپ میرا ساتھ نہیں دیں گے۔ ٹھیک ہے۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔" اس نے جھک کر اپنا بیگ اٹھا کر قدم بڑھائے ہی تھے کہ رضوان نے ایک جھٹکے سے اسے کھینچ کر واپس لا کھڑا کیا۔

"تم حد سے بڑھ رہی ہو زارا رضوان۔"

زارا کا چہرہ غصے سے دہک اٹھا۔

"آپ اور میرے رشتے کو درمیان میں نہ ہی لائیں تو اچھا ہے۔" اس نے جانا چاہا۔

رضوان نے دیوار پر ہاتھ ٹکا کر راستہ بلاک کر دیا۔

"کیا کرو گی تم یہ رشتہ ختم کر دو گی۔" اس کا لہجہ استہزائیہ سا تھا۔ پہلی بار زارا کو اس کے لہجے میں رائے خاندان کی مخصوص نخوت نظر آئی۔

"بات کو غلط رنگ دینے کی کوشش مت کریں۔"

"میں دے رہا ہوں یا تم دے رہی ہو بات کو غلط رنگ۔ کیسے ثابت کرو گی کہ مجرم رائے سلیمان ہے۔ تمہاری اس حرکت سے ہمارے خاندان پر کیا گزرے گی۔ یہ سوچا ہے تم نے اخبارات اور ہمارے مخالفین کیا بکواس لکھیں گے۔ یہ خبر ہے تمہیں۔ ہمارا خاندان کسی اور حادثے کا متحمل نہیں ہو سکتا زارا رضوان۔ اور رائے سلیمان! بہت ہی غلط اندازہ ہے تمہارا اس شخص کے بارے میں۔ رائے سلیمان کے سامنے کھڑی ہوئی تو خود چھوٹی پڑ جاؤ گی۔ وہ بتا دے گا کہ رائے خاندان سے کٹ کر تم کیا ہو۔"

وہ اسے حقیقت سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا۔ کچھ اتنا غلط بھی نہ تھا۔ یہ بات زارا خود بھی اچھی طرح سمجھتی تھی۔

"کیا یہ ہمارے خاندان کا حصہ نہیں؟۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔

"مجھے اس سے انکار نہیں۔"

"پھر بھی آپ اس کی مدد نہیں کریں گے۔ صرف اس لیے کہ ظلم کرنے والا آپ کا بھائی ہے۔ میں آپ کو بہت مختلف انسان سمجھتی تھی۔ رضوان۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز گھل گیا۔

رضوان کچھ لمحے اسے یونہی دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ ہٹا کر رخ بدل گیا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے اس نے زین کے چہرے پر نظریں جمائیں۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"میں اس کی مدد کروں گا زارا! جو یہ چاہتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ مگر جو تم چاہتی ہو وہ ہونا ممکن نہیں۔"

اس کی بات واضح اور لہجہ ٹھوس تھا۔

"عجیب منطق ہے رضوان صاحب آپ کی یعنی کہ۔"

افتخار کی آمد پر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ شاپنگ بیگ تھے۔ اس نے اچٹتی سی نظر ان دونوں پر ڈالی۔ کمرے میں ایک دم خاموشی سی چھا گئی تھی۔ جسے موبائل کی بیپ نے توڑ ڈالا۔

رضوان نے نمبر دیکھا اور موبائل زارا کی طرف بڑھا دیا۔ مما کی کال تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں مما! آپ کیسی ہیں۔" اس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل کرنے کی سعی کی۔ رضوان دانستہ باہر نکل گیا۔ افتخار بیگ سے چیزیں نکال کر ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔

"رات سے طبیعت گھبرا رہی تھی۔ اوپر سے فون بھی خراب تھا۔ ابھی ٹھیک ہوا ہے۔" مما نے بتایا۔

"طبیعت کیوں گھبرا رہی تھی مما؟"

"پتا نہیں۔ تم لوگ بھی تو مجھے بھول گئے ہو۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"مما! ایسا ممکن ہے؟۔"

"زین کو دیکھو۔ اس کے پاس اب اتنا بھی وقت نہیں کہ ایک منٹ کی کال مجھے کر سکے۔"

"مصروف ہے مما! ایگزام کی ڈیٹ ایک دو دن میں آنے والی ہے۔" اس کا لہجہ مدھم ہو گیا۔

"ٹھیک تو ہے نا وہ؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے سوئے ہوئے زین پر نگاہ ڈالی اس کے سینے کا زخم سفید چادر میں چھپا تھا۔

"اسے میری بہت سی دعائیں دینا۔"

"آپ کی دعائیں ہی تو۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اک طویل سانس لے کر گویا ہوئی۔ "بہت تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ پھر میں، آپ اور زین بہت سا وقت ایک ساتھ گزاریں گے۔"

"ان شاء اللہ۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ میں شہر آجاؤں۔ لیکن اب سوچتی ہوں تم بھی مصروف ہو گی

...زین کی۔ میں تو انجواؤ وسٹرب کروں گی۔ اس لیے ایگزامز ختم ہونے تک میں رک جاؤں گی۔"

زارا دانستہ خاموش رہی۔

"پھر بھی زین سے کہنا کبھی کبھار مجھے کال کر لیا کرے۔ خود تو جب بھی فون کرو وہ گھر پر نہیں ملتا۔"

"افتخار کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کرتا ہے۔ میں کہہ دوں گی۔" زارا آہستگی سے گویا ہوئی۔ تو انہوں نے دعائیں دے کر فون بند کر دیا۔ زارا موبائل ہاتھ میں لیے نجانے کیا سوچتی رہی۔

"بے بے نے اپنے ہاتھ سے آپ کے لیے کھانا بنا کر بھیجا ہے اور زین کے لیے یخنی۔"

"ہوں۔" افتخار کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا گویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"آپ گھر ہو آئیں۔ میں ہوں زین کے پاس۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" زارا نے پیشانی مسلی۔ اس کی نگاہیں ہاتھ میں پکڑے موبائل پر ہی تھیں۔ افتخار نے بغور اسے دیکھا۔

"ایک بات کہوں زارا بی بی۔"

زارا نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"رائے سلیمان کے مقابل مت آئیں۔"

"تمہیں اپنے دوست کی زندگی عزیز نہیں افتخار؟" زارا کی نگاہوں میں تحیر ہی تحیر تھا۔

"افتخار دوستی پر جان دینے والا بندہ ہے زارا بی بی! جو کچھ ہوا لاعلمی میں ہو گیا مگر اب کس ملک کے لال کی جرات ہے کہ افتخار کھوکھر کے ہوتے زین کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔" اس کا بے خوف اور نڈر لہجہ۔ زارا ہلکا سا مسکرا دی۔

"میں جانتی ہوں، مگر افتخار اتبی تو کہا کرتے تھے۔ جیتنے کے لیے لڑنا ضروری ہے مگر لڑائی حکمت عملی سے بھی تو جیتی جا سکتی ہے۔" مونچھیں سنوارتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"حکمت عملی۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔" زارا الجھ کر پوچھنے لگی۔

رضوان اندر آیا تو زارا نے بات بدل دی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ملا مقبول گھر سے چلا تو اس نے کتابوں کی ایک لسٹ اس کے ہاتھ میں تھمادی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" ملا مقبول نے بے حد حیرت سے دریافت کیا تھا۔

"کتابیں ہیں بی اے کی۔ یاد سے لیتے آنا ملا۔" نین تارہ نے تاکید کی تھی۔

"پر یہ تو۔" اس نے کچھ کہنا چاہا مگر نین تارہ نے اس کی بات قطع کر دی۔

"تم اپنا کام کرو ملا! مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

اس نے مجبوراً لسٹ جیب میں ڈال لی تھی۔ گھر سے نکلا تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ ظہور کی طرف نہیں جائے گا۔ مگر بازار میں اس کا ہمسایہ مل گیا۔ اس نے بتایا تھا۔ ظہور سارا دن گھر پر پڑا رہتا ہے۔ کاروبار بالکل ٹھپ پڑا ہے۔ تمام دن بیوی کے ساتھ چخ چخ ہوتی رہتی ہے۔

"مجھے تو لگتا ہے اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔" آخر میں اس نے رائے دی۔

ملا مقبول نہ چاہتے ہوئے بھی چلا آیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ ملا مقبول اندر داخل ہو گیا۔ کھلے صحن میں عجیب سی ویرانی تھی۔ ہر طرف دھول، تنکے، خشک پتے لگتا تھا۔ یہاں کوئی صفائی کرنے والا ہی نہیں۔ نین تارہ کے ہوتے ہوئے یہ آنگن کتنا صاف ستھرا اور روشن ہوا کرتا تھا۔ چولہے کے گرد برتن بکھرے تھے۔ اور چولہے میں راکھ اڑ رہی تھی۔ کونے میں بچھی چارپائی پر ظہور لیٹا تھا۔ اس کا ایک بازو آنکھوں اور دوسرا سینے پر پڑا تھا۔ ملا مقبول اس کے قریب آ کر رک گیا۔

"ظہور۔" اس نے آہستگی سے پکارا۔ ظہور نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا پھر تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

"ملا۔ اتم۔؟" اور زندگی میں پہلی بار وہ اس کے گلے لگا تھا۔ ملا مقبول نے بس رسم نبھائی تھی۔

"نین تارہ نہیں آئی؟" اس نے پیچھے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ واپس آنے کے لیے تو نہیں گئی تھی۔" ملا نے

تلخی سے ہنستے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ ظہور خاموش سا ہو گیا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ واپس کیوں آئے گی۔ وہ نفیسہ۔"

"نہیں۔ بس یونہی گھر سے آیا تھا۔" ملا مقبول نے ادھر ادھر دیکھا۔ "یہ گھر کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ بتول کہاں ہے؟"

"ہو گی کہیں۔" اس نے زیر لب گالی دی۔ "کیسی عورت ہے۔ سارے کرتوت کھل گئے گیا کھیل کھیلتی رہی ہے میرے ساتھ۔"

"ہو گی اپنی عقل کام کرے تو کون کھیل کھیل سکتا ہے اس کے ساتھ۔ اس کو گالیاں دینے کا فائدہ۔ مت تو تمہاری اپنی ماری گئی تھی اسی کی آنکھوں سے دیکھتے اور اسی کے کانوں سے سنتے تھے۔" ملا مقبول نے لہجے میں آئینہ دکھایا۔

"ٹھیک کہا ملا تم نے؟" اس نے یاسیت سے اک ٹھنڈی آہ بھری۔ "یہ بربادی تو خود مول لی ہے میں نے کسی کا کیا دوش 'اب تو سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔" اس نے تاسف سے دونوں ہاتھ ملے۔

"یوں لگتا ہے 'سب کچھ نین تارہ کے دم سے تھا۔ وہ گیا تو گئی۔ چھت ہی سر پر آ گری۔ سارا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔"

اس نے اعتراف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ شاید ترس گیا تھا کہ کوئی تو ہو جس کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ وہ بول رہا تھا اور ملا مقبول اس اکھڑ مرد کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی آنکھوں کی سرخی بتاتی تھی کہ اس کے ضمیر کی چبھن اسے ساری رات سونے نہیں دیتی۔ اس کا لہجہ اس کے پچھتاووں کا غماز تھا۔

وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"انسان اپنے عمل سے پہلے ایک بار بھی سوچ لے کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے تو پچھتاوے یوں اس کا مقدر نہ بنیں۔"

"نین تارہ سے کہیے گا' اپنے بھائی کو معاف کر دے۔"

ملا مقبول کہنا چاہتا تھا کہ اس کے وجود کے زخم تو کب کے بھر چکے مگر جو زخم تمہاری زبان نے دیے ہیں۔ وہ تو ساری عمر نہیں بھریں گے۔" مگر وہ خاموش رہا۔

"میں نے تو بڑے خلوص دل سے چاہا تھا کہ اس کی شادی اجمل سے ہو جائے۔ وہ سکھی ہو گی تو کچھ تو میرے گناہوں کا کفارہ ادا ہو گا۔ مگر وہ زہریلی عورت یہاں بھی ڈنک مارنے سے باز نہ آئی۔"

"اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ منزل کوئی اور ہو تو چھوٹے چھوٹے راستے سامنے آتے ہیں۔ خود انسان کو منزل کا شعور نہ بھی ہو تو تقدیر خود صحیح راستہ نکال دیتی ہے۔"

ظہور سمجھ نہ سکا۔ ملا مقبول کیا کہہ رہا ہے۔ بس خاموشی سے ہاتھ مسلتا رہا۔ اس نے ہلکی سی تھپکی اس کے کندھے پر دی۔

"میں پھر آؤں گا۔"

"ملا! بیٹھو میں تمہارے لیے۔"

"نہیں پھر سہی۔ کسی چیز کی خواہش نہیں۔"

"شکر کیوں آئے تھے ملا؟" وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔

"کام تھا۔" اس نے مختصراً کہا۔ کام کی وضاحت نہیں کی تھی۔

وہ جیولر کے پاس سے آیا تھا۔ نین تارہ کے لیے بہت خوبصورت سونے کا سیٹ بننے کو دیا تھا اور سونے کے کنگن بھی۔

موڑ مڑ کر وہ کچھ لمحے متذبذب سا کھڑا رہا۔ نگاہ اس رستے پر تھی۔ جو زین کے گھر کی سمت جاتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا بنگلے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بنگلے کے دوسری طرف بس خاموشی تھی۔ وہ زین سے ملنا چاہتا تھا مگر ڈر رہا تھا۔

"کہیں وہ بدگمان نہ ہو جائے کہ مجھے اس پر اعتبار نہیں۔" وہ متذبذب تھا۔

"نہیں۔ وہ واقعی یہی سمجھے گا۔" اس نے قدم آگے بڑھا دیے تب تک سلیم اس کے قریب آ چکا

تھا۔

"جی بابا جی۔" وہ پہچان چکا تھا۔ یہ بابا پہلے بھی ایک بار زین بھائی سے ملنے آیا تھا۔

"تمہارا صاحب گھر پر ہے؟"

"نہیں۔ وہ تو۔" سلیم کچھ کہتے کہتے رک سا گیا۔

"خیریت سے تو ہے نا۔؟" ملا مقبول مسکرایا۔

"اسے لگا وہ اپنے بیٹے کی خیریت دریافت کر رہا ہے۔"

"بس اللہ نے بچالیا۔" سلیم متفکر لہجے میں بولا تھا۔

"کسے کیا ہوا۔؟" ملا مقبول کا چہرہ ایک دم فق ہو گیا۔

"کیا کوئی نیا امتحان؟"

"گولی لگ گئی تھی بھائی جان کو۔" سلیم کا مدھم لہجہ مقبول کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لے گیا۔ اسے لگا گولی زین کو نہیں خود اسے لگی ہے۔ کچھ تو تھا جو دل کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر گیا تھا۔

"وہ۔ وہ بچ گیا ہے نا؟"

"اللہ کا بے حد کرم ہوا۔ بھائی جان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔" ملا مقبول کے سینے میں اٹکی سانس باہر آئی۔

"گولی کس نے ماری؟"

"کچھ پتا نہیں کون دشمن نکل آیا۔ حالانکہ انہوں نے تو کبھی بھی کسی کو تکلیف نہیں دی۔ اور ایسی دشمنی کہ بات گولی تک پہنچ جائے۔"

سلیم کیا کہہ رہا تھا۔ ملا مقبول کی سماعتیں اسے سننے سے قاصر تھیں مگر اس کا ذہن یکسو ہو کر ایک ہی نکتے پر غور کر رہا تھا۔ پھر اس نے سلیم سے ہسپتال کا پتا پوچھا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

اونوں کہندے کہندے تھک گیا

مینوں یاد نہ آیا کر

او ہسدی ہسدی رو پئی، بی اے

عظمیٰ کے قدم دروازے کے باہر ہی ٹھٹھک گئے۔ پھر اس نے مڑ کر بے بسی سے انعم کو دیکھا۔

"کیا ضروری ہے یہ شخص ہمیشہ میرے راستے میں آئے۔"

"وہ کیا کرے جب راستے ہی ایک ہیں۔" انعم نے ترت جواب دیا۔

"میں نہیں جا رہی۔" وہ پلٹنا چاہا۔

"یار! اتنی سنگدل کیوں ہو جاتی ہو تم؟" انعم نے اس کا بازو اپنی گرفت میں لیا۔ ظاہر ہے وہ بازو چھوڑ کر تو جا نہیں سکتی تھی۔ انعم نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"آہا۔ یہاں تو سب موجود ہیں۔" اس کی پرجوش آواز پر سب ہی نے پلٹ کر دیکھا۔ مجبوراً عظمیٰ کو اندر آنا پڑا بلکہ وہ گھسیٹ کر لے آئی تھی۔

افتخار کے لبوں پر اک بھرپور مسکراہٹ بکھری اور ساتھ ہی اس کی نظم نے رنگ بدلا۔

ساڈی یاری بجنی او کی

او اتھری تے میں منہ زور

میں اپنی مرضی دا مالک

تے او نے لوڑی اپنی ٹور

دو گھڑیاں وی نال کے کدھرے

کٹھیاں بہہ نہیں سکدے

اے گل وکھری

وکھریاں ہو کے اک دوجے توں

زندہ رہ نہیں سکدے

(ہماری دوستی بھی مشکل ہے۔ وہ اڑیل ہے اور میں منہ زور۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں اور اس نے اپنی کرنی ہے۔ دو گھڑی بھی ہم ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتے) عظمیٰ کے پسینے ہی چھوٹ گئے۔

"یہ حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔"

وہ اسے یکسر نظرانداز کر کے زین کی طرف بھی نہیں بڑھ سکتی تھی کیونکہ وہ زین کے سرہانے ہی بیٹھا تھا۔ اس کا ایک بازو بیڈ کی بیک پر پھیلا تھا۔ وہ زارا کی طرف مڑ گئی۔

"کیسی ہو عظمیٰ۔!" زارا اس سے گلے ملی۔

"میں ٹھیک ہوں مگر یہ زین۔" جب کہ انعم یہ والی بات براہ راست زین سے پوچھ رہی تھی۔

"اب ٹھیک ہے۔"

"تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔" اس نے زرا جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"یہ۔ رضوان! یہ عظمیٰ اور انعم ہیں اور یہ رضوان۔" اس نے تعارف کروایا۔ انعم تیزی سے بولی۔

"ارے آپ ہیں رضوان۔ بہت اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔" اس نے سر تاپا رضوان کا جائزہ لیا۔

"لگتا ہے میرا غائبانہ تعارف پہلے ہی ہو چکا ہے۔" رضوان اخلاقاً مسکرایا۔

"ایسا ویسا۔" انعم نے شرارت سے زارا کو دیکھا۔ وہ قصداً مسکرائی۔ یہ ساتھ کھڑا شخص گزرے چند دنوں میں اسے بے حد اجنبی سا لگنے لگا تھا۔

"آپ غالباً زین کی عیادت کو آئی ہیں؟" افتخار عظمیٰ سے مخاطب تھا۔

(تم یہاں سے دفع ہو گے تو میں کچھ کروں گی۔) وہ تلملائی۔ افتخار مسکراتا ہوا اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ تب اس نے زین کی خیریت پوچھی تھی۔

"پہلے افتخار نے گولی کھائی۔ اب تم بھی اسی کے نقش قدم پر چلنے لگے ہو۔" انعم ہنسی۔

زین ہلکا سا مسکرایا۔ وہ پہلے سے بہتر تھا مگر اس کا چہرہ اب بھی زرد سا تھا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔ افتخار نے تو کسی کو متاثر کرنے کے لیے گولی کھائی تھی۔ تم کس کو متاثر کرنا چاہتے ہو؟" انعم کی زبان کون پکڑ سکا تھا۔

"آپ کی تو غالباً منگنی ہو چکی ہے۔" زین کا جملہ بے ساختہ تھا۔ انعم کا منہ کھل گیا۔ سب ہی مسکرائے تھے وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"تم پر واقعی افتخار کا اثر ہو گیا ہے۔"

"گویا لاعلاج قرار دے دیا آپ نے مجھے۔ ویسے مجھے نہیں پتا افتخار بھائی نے کس کو متاثر کرنے کے لیے گولی کھائی تھی۔"

"ارے وہ۔" جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ عظمیٰ نے گھبرا کر اس کا بازو پکڑا۔

"انعم!"

افتخار کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ جز بز ہو گئی جب کہ ہنسنے کی کوشش میں زین محض کراہ کر رہ گیا تھا۔ زارا تیزی سے آگے بڑھی۔

"زین۔! ڈاکٹر نے تمہیں زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا ہے۔"

"جانے دیں زارا آپی! دوبارہ زندگی کو چھونے کا احساس اتنا جاں فزا ہے کہ خاموش ہونے کو دل ہی نہیں چاہتا۔"

"سچ بتاؤ زین! موت کے فرشتے سے ملاقات کیسی رہی۔" انعم اور اس کے سوال۔ عظمیٰ نے سر پیٹ لیا۔

"چلو انعم۔" عظمیٰ نے کہا پھر زین کی طرف پلٹی۔ "خدا تمہیں صحت یاب کرے اور دشمن سے محفوظ رکھے۔ میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں زین۔" اس کے لہجے میں خلوص ہی خلوص تھا۔

"ساری۔" افتخار نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔ "تھوڑی بچا رکھیں عظمیٰ بی بی! کسی اور کو بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"کیوں افتخار بھائی! تمہارا دوبارہ گولی کھانے کا ارادہ ہے۔" انعم کی زبان پھسلی۔ عظمیٰ نے بے اختیار ہاتھ ماتھے پر مارا۔ جب کہ وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی تھی۔

"ہم اب چلتے ہیں زارا۔؟" اب کے اس نے کھسکنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

"میں انہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔" افتخار بھی ان کے ساتھ ہی نکل آیا۔

"جب ہم لوگ آ رہے تھے تو آصف اور حیدر ملے تھے۔ سخت پریشان تھے کہ ایگزام کی ڈیٹ آنے والی ہے اور تیاری خاک نہیں۔"

"تمہاری تیاری کیسی ہے؟" افتخار نے پوچھا۔ عظمیٰ کو یقین تھا کہ وہ روانی میں اپنی شادی کی تیاریوں

کی تفصیل سنانے لگی۔ مگر انعم بڑی شرافت سے ایگزام کی تیاری ڈسکس کرنے لگی۔
عظمٰی نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اونچا لمبا نوجوان دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اس کے ہم قدم تھا۔ اس کے چلنے کے انداز میں بھی بے خوفی اور بے فکری تھی۔ اس کی باتوں میں برجستگی، روانی اور درویشانہ پن تھا۔ جس کا ساتھ ہی تحفظ کا احساس بن کر اس کے پورے وجود کو گھیر لیتا۔ جو محبت ہی نہیں عزت کرنا بھی جانتا تھا۔
ایک لڑکی کو چاہیے بھی کیا؟
محبت، عزت اور تحفظ
وہ یہی سب تو دے رہا تھا۔
"یہ جینا، ترسنا، چلنا میری مجبوری ہیں۔ تم ساتھ ہوتے ہو تو اک خوشی کا بے پایاں احساس میرے وجود کو گھیر لیتا ہے۔ میرے من میں محبت خوشبو بن کر پھیل جاتی ہے۔ تمہیں کھو دینے کا سوچتی ہوں تو میرے اندر میرا اپنا آپ مر جاتا ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ میں اپنی ہتھیلیوں پر چراغ جلائے گھر سے نکلی ہوں۔ میرے پیچھے آنے والوں کو ان ہی کی روشنی میں اپنا راستہ ڈھونڈنا ہے۔ جو میں لڑکھڑائی تو یہ چراغ بجھ جائیں گے اور گھپ تاریکی پھر سے ان کا مقدر بن جائے گی۔ میں انہیں تاریکیوں میں بھٹکا کر خود روشنی کا سفر کیسے شروع کر دوں۔۔۔ یہ تو خود غرضی ہوگی۔ اور عظمٰی خود غرض نہیں بس مجبور ہے۔ وہ تمہیں چاہے گی مگر تمہاری محبت کی خوشبو کو قید نہیں کرے گی۔ یہی اس کا فیصلہ ہے اور یہی اس کا عزم ہے۔"
اس نے آنکھ کنارے ٹھہر جانے والے آنسو کو بے حد خاموشی سے دل میں اتار لیا تھا۔ اور افتخار نجانے کیوں اپنی بات بھول کر ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"یہ۔۔۔ زین العابدین اسی کمرے میں ہے۔" وہ ادھیڑ عمر شخص کچھ پریشان اور گھبرایا ہوا سا تھا۔ افتخار نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔
"آپ کون ہیں؟"
"میں مقبول، گاؤں سے آیا ہوں۔۔۔ وہ زین وہاں گاؤں میں میرے پاس ہی رہتا رہا ہے۔"
"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ زین یہیں ہے۔"
"پر وہ ٹھیک تو ہے نا۔"
"بالکل ٹھیک ہے بلکہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔" افتخار نے تسلی دیتے ہوئے دروازہ کھولا۔
"دیکھو! زین العابدین تم سے ملنے کون آیا ہے؟"
کمرے میں اگر رضوان موجود نہ ہوتا تو یقیناً افتخار کا جملہ کچھ اور ہوتا۔ ایک وہی تو جانتا تھا۔ زین کی شادی اس شخص کی بھانجی سے ہونے والی تھی۔
"بابا! آپ۔۔۔" بے اختیار ہی زین نے اٹھنا چاہا۔ مگر درد کی ٹیسیں سینے میں اٹھنے لگی تھیں۔ رضوان نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔
"تمہیں احتیاط کی ضرورت ہے زین۔۔۔"
ماما مقبول اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر سر پر بوسہ دیتے ہوئے رو پڑا۔
"میں نے کہا تھا نا تم سے۔ مت کریدو ماضی کی راکھ۔۔۔"
"بابا! ٹیک اٹ ایزی۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ میں آپ کے سامنے ہوں، زندہ سلامت۔" وہ بمشکل مسکرایا۔ آج وہ تھک گیا تھا۔
"افتخار! تم یہیں ہو۔۔۔" رضوان نے اچانک پوچھا۔ افتخار نے چونک کر سر اٹھایا پھر اثبات میں سر ہلایا۔
"ٹھیک ہے۔ ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔" اس نے زارا کا ہاتھ تھاما اور اسے کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر باہر لے آیا۔
"یہ۔۔۔ رائے رضوان یہاں کیا کر رہا ہے؟" مامے مقبول نے چونک کر پوچھا۔
"مسیحا بن کر آیا تھا۔ خون دیا ہے اس نے مجھے، جان بچائی ہے میری۔ قدرت کا فیصلہ ہے، ایک بھائی جان لینے کے درپے ہے اور دوسرا۔۔۔" اس نے تھک کر تکیے پر سر رکھا۔

"زین! تم تھوڑی دیر سو جاؤ۔ مگر پہلے یہ ٹیبلٹ لے لو۔۔۔" افتخار نے سہارے سے اسے اونچا کیا اور گولیاں کھلا دیں۔ ایک درد کی تھی اور دوسری نیند کی۔ وہ ہوش میں آتا تو یونہی بے احتیاطی کرتا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر نے اسے ہلنے جلنے اور زیادہ بات کرنے سے منع کیا تھا۔
"میں نے سوچا تھا۔ میں افتخار بھائی سے کہوں گا کہ وہ آپ سے مل لیں۔ کہیں آپ بھی یہ نہ سمجھیں کہ زین العابدین بھی دوسروں کی طرح۔۔۔"
"میں ایسا کبھی نہیں سوچ سکتا۔۔۔" مامے مقبول نے آہستگی سے کہتے ہوئے صافے سے آنکھیں صاف کیں۔
"وہ تو سوچ سکتی ہے۔" زین ذرا سا مسکرایا۔ "بہت بدگمان ہے۔ لیکن اسے کہیے گا۔ زین العابدین وعدہ خلاف نہیں۔"
اس پر غنودگی سی چھانے لگی۔
"یہ افتخار ہے۔ اسی کی بے بے سے بات کرنے آیا تھا میں۔"
ماما مقبول نے ایک نظر افتخار کو دیکھا اور خاموش ہی رہا۔
"لیکن آپ کو کس نے بتایا میرے بارے میں۔۔۔؟"
"وہ لڑکا تمہارے ہاں کام کرتا ہے۔" مامے مقبول نے آہستگی سے جواب دیا۔
"سلیم! ہاں اچھا لڑکا ہے۔۔۔ بے چارہ بہت پریشان ہو رہا تھا۔" اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔
"تم سو جاؤ پتر۔۔۔" مامے مقبول نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔
"ہاں۔۔۔ مگر آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ نین تارہ کیسی ہے۔۔۔؟" وہ نیم غنودہ سی کیفیت میں سوال کر رہا تھا۔
"اچھی ہے۔۔۔"
"ہاں۔۔۔ مگر بدگمان بہت ہے۔۔۔"
افتخار نے مامے مقبول کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

رضوان نے اس کے احتجاج کی پروا کیے بغیر گاڑی کے پاس آکر ہی اس کا ہاتھ چھوڑا تھا۔
"بیٹھو۔۔۔"
"کہاں جانا ہے۔۔۔"
"بیٹھ جاؤ۔ تماشا مت بنو۔۔۔" وہ ڈپٹ کر گویا ہوا۔ زارا گویا مجبوراً بیٹھی تھی۔ وہ گھوم کر دوسری طرف آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ گاڑی اسپتال سے نکل کر سڑک پر آئی تو وہ پھر سے بول اٹھی۔
"رضوان! مجھے کہیں نہیں جانا۔۔۔"
وہ سنجیدگی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔
سارا راستہ گاڑی میں خاموشی ہی چھائی رہی، یہاں تک کہ گاڑی رائے ہاؤس کے پورچ میں جا رکی تھی۔ سلیمان بھائی کی گاڑی موجود نہ تھی۔ گویا وہ گھر پر نہیں اور یہ اچھا ہی تھا۔ وہ اس شخص کی شکل بھی نہ دیکھنا چاہتی تھی۔
رضوان نے رخ بدل کر اس کے ناراض چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور مسکرا دیا۔
"تھینک یو۔۔۔"
"فار واٹ؟" زارا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
"تمہاری سمجھ میں میری بات آگئی۔" وہ مسکرایا۔ زارا کچھ لمحے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر نظریں سامنے جماتے ہوئے گویا ہوئی۔
"زین العابدین ایسا نہیں چاہتا۔"
"گویا تمہاری سمجھ میں میری بات نہیں آئی۔۔۔" رضوان ہنس دیا۔
زارا خاموش ہی رہی۔
"ہم سے تو زین العابدین ہی اچھا نکلا۔"
"تو کیا صلہ ملا اس کو اس کی اچھائی کا۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔
"زارا! بات کا رخ کیوں بدل دیتی ہو۔ اتنا غصہ آتی

نفرت۔"

"زندگی کا ہی رخ بدل گیا ہے رضوان صاحب۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ عالیہ لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں۔

"السلام علیکم۔!" اس نے آہستگی سے کہا۔ آج اپنے ہی گھر میں اپنا ہی وجود اجنبی لگ رہا تھا۔

"زارا۔" عالیہ تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آئیں۔ اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہنے لگیں۔

"کہاں گم ہو اتنے دنوں سے۔؟"

"اسپتال میں ہی تھی۔" وہ قدرے بے زاری سے گویا ہوئی۔

"زین کیسا ہے۔؟"

"ٹھیک ہے۔"

"میں نے تو کئی بار رضوان سے کہا۔ میں بھی اسپتال جاتی ہوں مگر یہ ہمیشہ ہی روک دیتا تھا۔"

"یہ تو وہاں ہمارا وجود ہی برداشت نہیں کرتیں۔ زبردستی اٹکے ہوئے ہیں وہاں۔" رضوان نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ فریش ہو جاؤ تو میں کھانا لگا دوں۔"

"بالکل۔" رضوان نے کہا۔ پھر اس کا کاندھا چھو کر بولا۔ "جاؤ زارا! چینج کرو اور فریش ہو آؤ۔"

"سعد کہاں ہے بھابھی۔؟"

"اسکول۔" وہ کچن میں گھس گئیں۔ تو زارا اپنے کمرے میں آئی۔ سامنے دیوار پر گروپ فوٹو لگا تھا۔ وہ، پاپا، شیراز اور مما۔

وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کی نظریں رائے عمیر پر ہی تھیں۔

"پاپا! کیا آپ بھی یہی سب کرتے جو رضوان کر رہے ہیں۔ اس نے زین العابدین کو خون دیا۔ اس کی جان بچائی۔ وہ اس کے لیے سب ہی کچھ کرنے کو تیار ہے۔ مگر سلیمان کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا۔ حالانکہ وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ زین پر حملہ اسی نے کروایا ہے۔"

نجانے وہ کس سے سوال کر رہی تھی کہ جواب تو محض خاموشی تھا۔

"اور مما! آپ۔" اس نے نظروں کا زاویہ بدلا۔ "اتنے برس ان لوگوں کے درمیان کس طرح گزار دیے آپ نے۔ بہت حوصلہ تھا آپ میں۔ اور میں۔ میں اتنا بیزار ہو گئی ہوں ان چند دنوں میں کہ رائے ہاؤس کے کسی فرد کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

اس نے سر جھٹکا اور وارڈ روب سے وہ سوٹ نکال کر واش روم میں چلی گئی۔ نہا کر آئی تو قدرے خود کو تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔

"زارا! کھانا لگ گیا ہے۔" عالیہ نے اندر آ کر کہا۔

"میں آتی ہوں۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر برش اٹھایا اور گیلے بالوں کو انگلیوں سے سلجھانے لگی۔

"اور یہ میں ہوں زارا رضوان۔" اس کی نگاہیں ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں منعکس ہوتے اپنے ہی عکس پر جم گئی تھیں۔ "جسے چند ہی دنوں میں باور کروا دیا گیا کہ وہ رائے خاندان سے کٹ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ شاید میں یہ ثابت کر ہی دیتی کہ زارا اتنی بھی کمزور نہیں۔ سچ نہ سہی احتجاج تو کر سکتی ہے۔ ایک ہلکا سا دھچکا بھی رائے سلیمان کو لگ جاتا تو اس کا زعم پاش پاش ہو جاتا مگر یہ افتخار اور زین العابدین۔"

وہ جھنجلائی۔ تب ہی نگاہ عقب میں کھڑی عالیہ پر پڑی۔ وہ متذبذب سی لب تک وہیں کھڑی تھیں۔ زارا جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔

ایک تلخ سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا۔

"زارا۔" انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔ زارا برش واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے پلٹی۔

"چلیں بھابھی! کھانا کھاتے ہیں۔"

وہ اس موضوع پر ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

رضوان خود بھی نہا کر آ گیا تھا اور اب ٹیبل پر اس کا

انتظار تھا۔ زارا عالیہ کے برابر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"آپ کے بھائی کی منگنی کب ہے عالیہ بھابھی۔؟"

رضوان نے دیکھا، نکھرے نکھرے دھلے چہرے پر [illegible] اضطراب اور اضمحلال بکھرا تھا۔ آنکھوں میں بے اعتنائی اور خفگی کی جھلک۔ مگر وہ خود کو نارمل پوز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

(میں اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ باپ جیسے بھائی کے خلاف کیسے اٹھ کھڑا ہوتا۔ تم نے مجھ سے میرے حوصلے سے زیادہ مانگ لیا تھا زارا۔)

"اگلے جمعہ ہے۔" عالیہ بھابھی نے مختصراً بتایا۔ زارا نے اپنے چہرے پر اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کی تو پلیٹ پر جھک گئی۔ رضوان نے بھی اپنی توجہ کھانے کی طرف مبذول کر لی تھی۔ عالیہ ایک ایک ڈش ان دونوں کے سامنے رکھ رہی تھیں۔

"سلیمان بھائی کہاں ہیں۔؟" رضوان نے اچانک پوچھا۔

"پتا نہیں۔ صبح ہی نکل گئے تھے۔" عالیہ نے آہستگی سے بتایا۔

زارا برائے نام کھا کر اٹھ گئی۔

"چلیں۔" اس نے رضوان سے کہا۔

"ہاں۔ میں یہ ختم کر لوں۔" رضوان نے کہا پھر عالیہ سے مخاطب ہوا۔ "ایک کپ کافی مل جائے گی۔؟"

"ہاں۔ میں بناتی ہوں۔"

زارا جزبز ہو گئی۔ وہ جان بوجھ کر دیر کر رہا تھا۔

"تم لو گی زارا؟" عالیہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ ذرا جلدی فارغ ہو جائیے گا۔" وہ رضوان سے کہہ کر کمرے میں آ گئی۔ تنہا بھی جا سکتی تھی۔ مگر جانتی تھی۔ وہ جانے نہیں دے گا۔ وہ یونہی کتابیں کھول کر دیکھنے لگی۔ بہت دیر تک بیٹھنے کے بعد بھی وہ نہ آیا تو وہ جھنجلا کر اٹھی۔

اسی پل رضوان اندر آیا۔

"فارغ ہو گئے آپ۔؟" اس نے طنزاً پوچھا۔

"جی ہو گئے۔" اس کا لہجہ متبسم تھا۔

"تو چلیں پھر۔" وہ چڑ سی گئی تھی۔

"اتنی جلدی کیا ہے۔" اس کی متبسم نگاہیں زارا کے چہرے پر جمی تھیں۔ اپنے عقب میں دروازہ آہستگی سے بند کرتے ہوئے اس نے بند دروازے سے ٹیک لگا لی۔

"زین وہاں اکیلا ہے رضوان۔" زارا کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

"اکیلا نہیں ہے۔ بہت لوگ ہیں اس کے پاس۔ جو تم سے بہتر اس کی دیکھ بھال بھی کر سکتے ہیں اور حفاظت بھی۔" لہجہ ہنوز وہی تھا۔

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔" وہ جھنجلا گئی۔

"بہت دنوں سے تمہیں ڈھنگ سے دیکھا نہیں اور نہ بات کی ہے۔" وہی پرشوق نگاہیں، وہی متبسم لہجہ۔

زارا ایک پل کو پزل سی ہوئی۔ پھر تلملا کر بولی تھی۔

"میرے پاس نہ وقت ہے اور نہ ایسی کوئی خواہش۔"

"میرے پاس وقت بھی ہے اور خواہش بھی۔" لہجہ و انداز ہنوز وہی تھے۔

"رضوان! فار گاڈ سیک۔"

رضوان نے اسے کندھوں سے تھام کر اس کا رخ دوسری طرف کیا۔

"ذرا آئینے میں اپنا چہرہ دیکھو۔ کیا حال کر لیا ہے ان چند دنوں میں۔"

وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔ پھر اس کی طرف پلٹی۔

"آپ چل رہے ہیں یا نہیں۔"

"نہیں۔" دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے وہ کچھ اور پھیل گیا۔ زارا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اپنے سامنے ایستادہ اس دیوار چین کو کس طرح ہٹائے اس کا چہرہ سرخ اور نفس تیز تھا۔ یقیناً" اس کی قربت کا اعجاز نہیں۔ غصے کا اثر تھا۔ تپتا ہوا چہرہ اس کی اندرونی کیفیات کا غماز تھا۔ رضوان مسکرا دیا۔

"آپ ٹھیک ہے۔ خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔ چلتے ہیں۔" شاید زین آگیا تھا۔ اس نے دروازے کی ناب گھمائی۔ پھر سوچ کر پلٹا۔ ایک لمحے اس کی سرخ آنکھوں کو بغور دیکھا۔ پھر باہر نکلنے لگا۔ پھر رک گیا۔ زارا ہوا اپنی دھن میں آگے بڑھی تھی۔ اس سے ٹکرا گئی۔

"رضوان۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"فرمائیے۔" وہ وہیں ایستادہ تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟"

"ارادہ تو یہی تھا کہ ہم واپس جائیں گے مگر اب بدل گیا ہے۔ بہتر ہے۔ تم کچھ دیر آرام کر لو۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" وہ تلملا کر بولی۔

"تمہیں ضرورت ہے۔ بہت دنوں سے ڈھنگ سے سو نہیں پائی ہو۔ بہتر ہے کچھ گھنٹوں کی پرسکون نیند لے لو۔ میں بھی ایک چکر آفس کا لگاؤں گا۔ شام کو اکٹھے اسپتال جائیں گے۔ آوازیں دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ عالیہ سعد کو لینے اسکول جارہی ہیں اور ملازم یہ کام کریں گے نہیں۔" اس نے بے حد آرام سے پلان کیا اور دوسرے پل باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

"رضوان! دروازہ کھولیں۔ مجھے نہیں سونا۔" ایک پل کو وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائی تھی۔ بس ششدر سی رہ گئی۔ پھر ہوش آیا۔ تب چیخی تھی۔

"زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں۔" وہ ڈپٹ کر بولا۔ "میں چند گھنٹوں میں آجاؤں گا۔ گڈ بائے۔"

"گڈ بائے" کے ساتھ ہی دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ شدید غصے کے باوجود وہ جانتی تھی۔ اب کسی کو پکارنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بہت دیر کمرے میں ادھر ادھر چکرانے کے بعد وہ بیڈ پر بیٹھی کھولنے لگی۔ اسی کھولنے تلملانے کے درمیان کب اس کی آنکھ لگی۔ اسے خود بھی خبر نہ تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"آپ بے حد اطمینان سے واپس جائیں بابا! اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

جب تک زین سویا رہا تھا۔ ماما مقبول اس کے پاس بیٹھا نجانے کیا کیا پڑھ کر پھونکتا رہا تھا۔

"اور ہاں۔ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں جلدی ہی آؤں گا۔"

ماما مقبول اب بھی جانے کو تیار نہ تھا۔ زین نے بہت اصرار کے ساتھ بھیجا۔

"چھوٹے! اس کا خیال رکھنا۔" اس کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے ماما مقبول نے افتخار سے التجا کی۔

"آپ فکر ہی نہ کریں۔"

"اور بابا۔ بہت خیال رکھیے گا۔ کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ بس ایک مناسب وقت پر گواہی دینی ہے۔"

ماما مقبول نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حالانکہ وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

"ولو بھئی واہ۔ بڑا محبت کرنے والا سسر ڈھونڈا ہے تو نے۔" ماما مقبول کے جاتے ہی افتخار نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

"بات تو اس کی ہے جو شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" زین مسکرایا۔

"تیری اور میری قسمت ایک جیسی ہے۔" افتخار نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور پھر سے "وہ اتھری نے میں منہ زور" گنگنانے لگا۔ تب ہی رضوان اور زارا آگئے۔

"ہیلو! اوری باڈی۔" رضوان کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ سارا رستہ وہ زارا کا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر حظ اٹھاتا رہا تھا۔

"آپ لوگ کہاں غائب ہوگئے تھے؟" زین نے پوچھا۔

"تھوڑی دیر کے لیے گھر گئے تھے۔ محترمہ کو نیند آرہی تھی۔ کمرے میں گھس کر سوئیں تو بس ابھی جاگی ہیں۔" رضوان کا لہجہ مبتسم اور شریر تھا۔

"رضوان! جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" وہ تلملا کر گویا ہوئی۔

رضوان ہنستے ہوئے زین پر جھکا۔

"ٹھیک ہو نا۔ کوئی تکلیف وغیرہ تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ اب میں بہت بہتر ہوں۔"

"اچھا۔ مجھے ایک میٹنگ کے لیے جانا ہے۔ رات میں آؤں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" زارا نے خفگی سے کہا۔ رضوان ہنس دیا۔

"آپ سے مشورہ کس نے مانگا ہے محترمہ۔"

"میں بھی ایک چکر گھر کا لگا آتا ہوں۔ زین کے لیے کچھ بنوا لاؤں گا۔" افتخار نے کہا۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی باہر نکل گئے۔

"آپ کا موڈ کیوں خراب ہے؟" زین نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔

"یہ رضوان! اس نے بھی آج حد کر دی۔" زارا نے جھنجھلاتے ہوئے بتایا تو زین مسکرا دیا۔

"بہت اچھا کیا۔ اب خاصی فریش لگ رہی ہیں۔"

زارا خاموش ہی رہی۔

"ویسے زارا آپی! آپ واقعی لکی ہیں۔"

"وہ کس طرح۔۔۔؟"

"رضوان واقعی بہت اچھے اور شاندار انسان ہیں۔"

"شاندار اور اچھے انسان کی تعریف میرے نزدیک تھوڑی مختلف ہے۔ جو حق کا ساتھ دے سکے۔ خواہ سامنے اس کا کوئی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔" زارا کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"کہاں ہوتا ہے ایسا۔ اب اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ بابا نے واقعی قتل کیا تھا۔ تو آپ کا کیا خیال ہے۔ میں ان سے نفرت کرسکوں گا۔ میں ان کے اس فعل سے تو نفرت کروں گا۔ مگر ان سے نہیں۔ رضوان بھائی بھی رائے سلیمان کی اس حرکت سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر وہ ان سے نفرت نہیں کرسکتے۔"

"اب تم نے کیا سوچا ہے؟۔ ہماری یہ خاموشی ہماری کمزوری بن جائے گی۔ رائے سلیمان کو تو شہہ مل جائے گی۔"

"ہمیں اس خاندان کو اکٹھا کرنا ہے زارا! ہمارا شدید ردعمل تو دلوں میں مزید کدورتیں اور نفرتیں پیدا کرے گا۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے، بے حد احتیاط اور سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔"

اس کی بات سن کر زارا مسکرا دی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں کو انگلیوں سے سمیٹا۔

"زین! تم سے اب زارا کو مشورے لینے پڑتے ہیں۔ مگر مجھے اچھا لگا۔ تمہارے اندر اب وہ جذباتی پن نہیں رہا۔"

"وقت سب سے بڑا استاد ہے، سارے کس بل نکال دیتا ہے۔" وہ آہستگی سے ہنسا۔

"مگر اب ہمیں کرنا کیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی، میں خود گاؤں جاؤں۔"

"میرا نہیں خیال اس کی ضرورت ہے۔"

"تو اس شخص کا پتا کیسے چلے گا۔ کبھی کبھی تو مجھے بھی شک ہونے لگتا ہے۔ رائے سلیمان اس میں انوالو ہے۔"

"اتنی بڑی باتیں منہ سے نہیں نکالتے زارا! جن پر بعد میں پچھتانا پڑے۔" ان دونوں نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا اور ساکت رہ گئے۔

رائے سلیمان اپنے مخصوص انداز میں اندر داخل ہوئے تھے۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

"آپ ۔۔۔؟" زارا کھڑی ہوگئی۔

"ہاں میں ۔۔۔" انہوں نے پرسکون انداز میں جواب دیا اور زین کی طرف بڑھے مگر زارا یوں ان کے سامنے تن گئی تھی۔ جیسے انہیں زین تک جانے سے روکنا چاہتی ہو۔ ان کی پیشانی پر ایک شکن ابھری۔

"آپ یہاں کس لیے آئے ہیں؟"

"زین کی خیریت معلوم کرنے ۔۔۔"

"آپ کو اس کی خیریت سے کیا سروکار۔" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"زارا! ہٹ جاؤ سامنے سے۔" وہ متحمل انداز میں گویا ہوئے۔

"آئی ایم ساری رائے سلیمان صاحب! لیکن اب میں آپ کا سایہ بھی زین پر پڑنے نہیں دوں گی۔"

"ڈونٹ بی سلی زارا ۔۔۔" زارا کے رویے پر غصہ آنے کے بجائے ان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"زارا! آنے دیں ۔۔۔" زین کے کہنے پر زارا گویا مجبوراً آگے سے ہٹی تھی۔

وہ زین کے قریب آگئے' ایک ہاتھ بیڈ کی بیک پر ٹکاتے ہوئے اس پر جھکے۔

"کیسے ہو زین العابدین ۔۔۔؟"

زین نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ جواب زارا کی طرف سے ملا تھا۔ گہرے طنز میں لپٹا ہوا۔

"زندہ ہے ۔۔۔"

"اچھی بات ہے ۔۔۔" وہ زیرلب مسکرائے اور سیدھے ہو کر دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے زارا کو دیکھنے لگے۔ جس کے بے حد سنجیدہ انداز میں بیزاری ہی بیزاری تھی۔

زین کچھ کے سہارے ذرا سا اونچا ہوا۔

"فرمائیے کیسے زحمت کی؟" زارا کا ہر انداز اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

"تو تمہارے خیال میں' میں اپنے باپ کے قتل میں الوالو ہوں۔" وہ زارا سے مخاطب تھے۔

"بہت خوب۔ یہ تم اخبار والے اور تمہاری کہانیاں ۔۔۔"

"حقیقت سامنے نہیں آئے گی تو ہم مفروضات پر ہی بات کریں گے۔" زین نے طنز سے کہا۔

"حقیقت! جانتے ہو حقیقت کیا ہے؟" وہ اس کی طرف پلٹے۔

"جاننا چاہتا ہوں۔" زین نے جواب دیا پھر سوالیہ انداز میں پوچھنے لگا۔ "کیا آپ نہیں جاننا چاہیں گے اگر آپ واقعی اس میں انوالو نہیں ہیں۔"

"حقیقت جان کر کیا کرو گے؟" رائے سلیمان نے اس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

"بے فکر رہیں کوئی دعوا نہیں کروں گا۔" وہ مسکرا دیا۔ رائے سلیمان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ رائے سلیمان تمہارے دعووں سے ڈرتا ہے۔"

زین خاموش ہی رہا۔ زارا بھی خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

"جانتا ہوں۔ بہت نفرت بھری ہے تم دونوں کے دلوں میں۔" انہوں نے خاموش کھڑی زارا پر نگاہ ڈالی۔

"نفرت تو آپ کے دل میں تھی زین کے خلاف' جو باہر بھی آگئی۔" زارا نے چبھتے ہوئے لہجے میں ان کی بات قطع کی۔

"ریلیکس زارا ۔۔۔" انہوں نے پرسکون انداز میں اسے بچوں کی طرح پچکارا۔

زارا تلملا اٹھی مگر خاموش رہی۔ رائے سلیمان کا انداز زہر لگ رہا تھا اسے۔

"چلو ان سب باتوں کو ایک طرف رکھ کر ایک ڈیل کرتے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرتے ہیں۔" ان کا لہجہ دوستانہ تھا۔ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کیسی ڈیل ۔۔۔؟" زین نے پوچھا تھا۔

"تم جاننا چاہتے ہو' وہ شخص کون تھا جس نے مجھے میرے باپ کے قتل کی اطلاع دی۔" ان کا لہجہ

دوستانہ تھا۔ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"یقیناً ۔۔۔" زین نے مختصراً کہا۔ رائے سلیمان کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھتے رہے پھر بیک پر ہاتھ ٹکا کر جھکے۔

"وہ شخص کون تھا زین! جس نے تمہیں سب کچھ بتایا ہے۔"

زین نے گڑبڑا کر زارا کو دیکھا۔ اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"سوری۔ یہ میں نہیں بتا سکتا۔"

"کاؤں میں ہی ہے نا ۔۔۔"

سلیمان نے پوچھا۔ زین نے لب بھینچ لیے۔ اسے سلیمان کی زیرک اور گہری نگاہوں سے الجھن ہو رہی تھی۔

"تو تم نہیں بتاؤ گے ۔۔۔" وہ کچھ لمحے منتظر رہنے کے بعد گویا ہوئے پھر سیدھے ہو گئے۔

"ٹھیک ہے ایز یو وش ۔۔۔ چلتا ہوں میں ۔۔۔ اس کا خیال رکھنا زارا ۔۔۔ ویسے میں ڈاکٹر کسی سے مل لوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ۔" زارا کا لہجہ گہرے طنز کا غماز ہی تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائے اور جس طرح اچانک آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ رضوان ان کو پارکنگ میں ملا تھا۔ انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"آپ یہاں ۔۔۔؟" ظاہر ہے سلیمان کا یہاں آنا اچنبھے کی بات ہی تھی۔

"ہاں ۔۔۔ تم گھر جا رہے ہو؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں آفس ۔۔۔" رضوان کا انداز کترایا ہوا تھا۔ سلیمان نے بغور اسے دیکھا پھر اس کا کندھا تھپتھپا کر اپنی جیپ کی طرف بڑھ گئے۔ رضوان کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

بلب کی زرد روشنی میں وہ کب سے کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے شروع کرے۔ اس دن ملا مقبول خالی ہاتھ ہی گھر آیا تھا۔ کچھ اداس اور بہت بے چین' نین تارہ کے بار بار پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ کتابیں اسے قاسم نے لا کر دی تھیں اور اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

"صبح حویلی جاؤں گی شاید وہی میری کچھ مدد کر سکیں۔"

انگلش کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس نے سوچا۔

ماسے مقبول کی چارپائی چرچرائی۔

نین تارہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ کب سے کروٹ پر کروٹ بدل رہا تھا۔ اسے لگا روشنی ماسے مقبول کو بے چین کر رہی ہے۔ وہ کتابیں رکھ کر اس کے قریب آگئی۔

"کیا ہوا ملا! نیند نہیں آرہی؟"

ماسے مقبول نے چونک کر سر اٹھایا۔

"نہیں۔ بس ایسے ہی ۔۔۔"

"بتی بجھا دوں۔"

"رہنے دو۔ پڑھو تم ۔۔۔"

"پڑھنا تو نہیں۔ ابھی تو کتابیں دیکھ رہی تھی۔" نین تارہ نے آہستگی سے کہا اور پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگی۔ ملا مقبول سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ اس کی کھلی آنکھوں کے سامنے سیاہ رات کے سینے پر لاکھوں ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ تب ہی ایک ستارہ ٹوٹ کر زمین کی طرف بکھرا۔

"خدا اسے اپنی امان میں رکھے ۔۔۔"

بے ساختہ ایک دعا اس کے لبوں پر مچلی۔

"کسے ملا ۔۔۔؟" نین تارہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ خاموش ہی رہا۔ نین تارہ بھی خاموشی سے پاؤں دباتی رہی۔ آج خلاف معمول ماسے مقبول نے اسے منع نہیں کیا تھا۔ بہت دیر کے بعد نین تارہ نے خود ہی پوچھا تھا۔

"ملا! ایک بات پوچھوں؟"

ماسے نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"جب سے شہر سے آئے ہو۔ یونہی بے چین ہو۔ شہر میں کوئی بات ہوگئی کیا۔۔۔؟"

اس کے ہاتھ رک گئے تھے۔ ماسٹر مقبول نے پاؤں کھینچ لیے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے۔

"ماما! مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟"

ماما بے حد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر زیرلب بڑبڑایا۔

"تمہارے لیے۔۔۔ تمہارے لیے یہ سب کرنا پڑے گا ورنہ تو سب ختم ہو جائے گا۔"

"کیا کہہ رہے ہو ماما۔۔۔؟" نین تارہ کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔

"کچھ نہیں' جاؤ تم سو جاؤ۔"

اس نے دوبارہ سے لیٹ کر کروٹ بدل لی۔ وہ کچھ لمحے حیرت سے اسے دیکھتی رہی کہ ماسٹر مقبول کا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ پھر پلٹ کر چارپائی پر آکر بیٹھی تو ذہن میں صرف اور صرف کتابیں تھیں جبکہ ماسٹر مقبول کا ذہن ہر قسم کے سود و زیاں سے نکل کر ایک خاص فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

"تم بالکل پاگل ہو چکی ہو۔۔۔" وہ سخت غصے میں تھی۔ عظمٰی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

"تمہیں یہ گمان کیوں ہوا؟"

"کیونکہ ایسا فیصلہ ہوش میں رہ کر نہیں کیا جاسکتا۔"

انعم نے غصے سے کہا تو وہ ہنس دی۔

"مت ہنسو اس طرح۔ زہر لگتی ہے مجھے تمہاری یہ ہنسی' کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ بہت خوش ہو تم۔ تم خوش نہیں ہو عظمٰی بی بی! تو خوش ہونے کا ناٹک بھی مت کرو۔ بی پاؤ گی ایک ایسے شخص کے ساتھ جس کے نزدیک یونیورسٹی جانے والی ہر لڑکی کا کردار مشکوک ہے جسے نوکری کرنے والی عورت نہیں چاہیے۔ کیا فائدہ ہوا اتنا پڑھ لکھ کر۔۔۔ اب کیا ساری عمر اس جاہل کے ساتھ گزار دو گی تم کیا مل جائے گا تمہیں اس کی چاکری کر کے۔ الٹا اکڑ جائے گا' خاندان کی باغی لڑکی کو نکیل ڈال کر گھر میں جو بند کر دیا اس نے۔ وہ ایک دم جاہل ہے عظمٰی۔ کیسے نبھاؤ گی اس کے ساتھ۔"

عظمٰی نے سر اٹھا کر دروازے میں کھڑی آگ بگولا ہوتی انعم کو دیکھا۔ وہ اس کی سہیلی تھی اس کی ہمدرد اور غمگسار سہیلی۔ اس کے لیے اسی سے لڑ رہی تھی۔ بے وقوف تھی اس سے لڑنے کو کہہ رہی تھی جو سارے ہتھیار پھینک چکی تھی۔ لب خاموش تھے۔ آنکھیں خشک مگر جو دکھ اس کے چہرے پر لکھا گیا تھا' صرف انعم پڑھ سکتی تھی۔

اس نے ماچس اٹھا کر بلاوجہ تیلی جلائی۔ کچھ لمحے اس کے شعلے کو دیکھتی رہی پھر پھونک مار کر تیلی بجھا دی۔

"جاہل تو نہیں خاندان کا واحد گریجویٹ ہے۔"

اس کی آواز میں کچھ بھی نہ تھا۔ ایک دم سپاٹ۔

"ہاں ایسا گریجویٹ' جس کے ذہن کے جالے اس کی ڈگری بھی نہ اتار پائی۔ جو آج بھی عورت کو دبا کر' جلا کر خوش ہوتا ہے۔" وہ تڑخ کر بولی۔ "پاؤں کی جوتی بنا کر رکھے گا' طعنے دے دے کر مارے گا اور جو سر رلو کوئی کلاس فیلو مل گیا۔ تو شک کے کوڑے رسید کرے گا تمہارا وہ گریجویٹ کزن۔"

"اب اتنا ہولناک نقشہ تو مت کھینچو۔" عظمٰی جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"کچھ ایسا ہی ہو گا۔ تم سے زیادہ تو میں جانتی ہوں تمہارے خاندان کو۔ اپنی بہنوں کو تو پرائمری کے بعد ہی گھر بٹھا چکا ہے۔۔۔ اور تم۔"

انعم نے بے حد دکھ سے اس بے حس لڑکی کو دیکھا۔ جو بے حس نہیں تھی' بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ انعم کے لہجے میں چھلکتا غصہ دکھ میں بدل گیا۔

"تمہیں تو فیملی میں آنا تھا عظمٰی! کام کرنا تھا' خود کو منوانا تھا کیا ہوئے تمہارے وہ خواب' وہ آرزوئیں' وہ خواہشیں۔"

عظمٰی نے ماچس چھوڑ کر دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے۔

"زندگی کوئی ہماری خواہشوں کے مطابق تھوڑی گزرتی ہے' تقدیر کے اپنے ہی چکر ہیں۔ اسے ہمارے خوابوں اور آرزوؤں سے کیا غرض اور میں نے تو خواب دیکھنا چھوڑ ہی دیا ہے۔"

"جب کوئی خود ہی ڈوبنے کو تیار ہو تو تقدیر بے چاری کیا کرے۔"

"میں کچھ نہیں کر سکتی انعم!"

"روشنی کی سفیر بن کر نکلی تھیں۔ خود کو اندھیروں کے سپرد کر دیا۔ وہ روشنی کا دیا کیا ہوا جسے بادِ مخالف بھی بجھا نہ پائی تھی؟"

انعم کے سوال پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری۔

"وہ دیا اب بھی نہیں بجھا۔ میرے پیچھے آنے والے روشنی کے رستے پر قدم رکھیں گے۔"

"یہی آنے والے سوال کریں گے۔ کیا تعلیم تمہیں اتنا شعور بھی نہ بخش سکی کہ صحیح اور غلط کا فیصلہ کر سکو۔ تمہارا عمل انہیں خوفزدہ کرے گا۔ جو اپنے لیے رستہ نہ ڈھونڈ سکی وہ دوسرے کے لیے کیا رستہ نکالے گی۔ بھٹکے ہوئے لوگ دوسروں کو رستہ دکھا سکتے ہیں عظمٰی بی بی!"

"بھٹکے ہوئے لوگ۔۔۔" عظمٰی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"اپنے ابا کی آنکھوں میں غور سے دیکھنا عظمٰی! وہاں بکھرے خوابوں کی دھول اڑتی ہے۔ انہوں نے تو بڑے مان کے ساتھ اپنے خواب سونپے تھے' تم نے کیا کیا ان کے ساتھ۔ انہوں نے کیا کچھ تمہیں سوچ رکھا تھا تمہارے لیے۔ ایک خوبصورت زندگی' ان تنگ ذہنوں اور گھٹے ہوئے ماحول سے دور۔ اسی لیے تمہیں اتنا پڑھایا لکھایا' سب سے لڑ کر۔ آج بھی وہ تمہاری دعائیں بن جائیں گے عظمٰی۔"

عظمٰی کیا کہتی۔ دیکھ رہی تھی' ابا کتنے خاموش ہو گئے تھے اور اماں سارا دن بڑبڑاتی رہتی۔ انہیں ان باپ بیٹی کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ ابا سے لڑتیں "اتنا اچھا رشتہ خاندان کا سب سے امیر گھرانہ' پیسے اور زمینوں والا۔ بیٹی کے بوجھ کو تو اتارنا ہی ہے' پھر انتظار کس بات کا۔ ابا دم سادھے بیٹھے تھے۔ نجانے انہیں کس کا انتظار تھا۔ اماں اندر سے ڈرتی تھیں۔ ان کی نفاست پسند پڑھی لکھی بچی اس ماحول میں گھٹ کر رہ جاتی۔ مگر مجبوری تھی۔ عظمٰی کی ہم عمر سب بیاہی گئی تھیں اور وہ پڑھائی کے چکروں میں عمر نکال رہی تھی۔ (اماں کے حساب میں) لوگ باتیں بناتے تھے۔

عظمٰی سب دیکھتی اور سمجھتی تھی مگر گونگی بہری بنی رہتی۔

"خاموش کیوں ہو گئی ہو۔" انعم نے چونکا دیا۔ وہ شاکی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اچھی سہیلی ہو۔ حوصلہ بڑھانے کے بجائے کم کر رہی ہو۔"

"میرا نہیں خیال' قسطوں میں خودکشی اتنا اچھا فعل ہے۔" "وہ طنزاً" مسکرائی عظمٰی خفا ہو کر اٹھی باہر نکلنے لگی تو انعم نے اس کا بازو پکڑ کر روکا۔

"اسے بھول سکو گی۔" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ نچلا لب کاٹتے ہوئے نظریں چرا گئی پھر بازو چھڑا کر باہر نکل گئی۔ انعم ایک طویل سانس لے کر رہ گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"رضوان! جاتے جاتے تو چائے پیتے جاؤ۔" عالیہ نے اسے نکلتے دیکھا تو پکار کر کہا۔ اس نے کلائی موڑ کر گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

"ابھی وقت نہیں ہے۔" بہ عجلت کاغذات بریف کیس میں رکھنے لگا۔

"کیا بنے گا؟" عالیہ مایوسی سے سر ہلا کر کچن میں چلی گئیں۔ گھر میں ہمہ وقت سناٹا سا چھایا رہتا۔ زارا تو گھر میں ہی نہ تھی۔ رضوان بھی یونہی گھڑی بھر کے لیے آتا۔ سلیمان گھر میں ہوتے مگر ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اتنے دنوں میں مجال ہے جو دونوں بھائیوں میں کوئی بات ہوئی ہو۔

سلیمان نے اخبار سے نظر اٹھا کر رضوان کو دیکھا۔ وہ ساری دنیا اور ہر رشتے سے' اپنے اسی ٹھنڈے اور

پرسکون انداز میں نمٹتے تھے مگر رضوان ایک ایسا شخص تھا جس کی بے اعتنائی اور خفگی انہیں بے سکون اور بے چین کر سکتی تھی۔

وہ بے سکون اور بے چین تھے کیونکہ رضوان ان سے خفا تھا۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اپنی عادت کے مطابق وہ ان سے کچھ کہے گا نہیں۔

"تم ناشتہ کیوں نہیں کر رہے۔" انہوں نے اخبار سے نظر اٹھا کر اپنے ازلی پرسکون انداز میں دریافت کیا۔

رضوان نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر مختصراً گویا ہوا۔

"وقت نہیں ہے۔"

"اسپتال جا رہے ہو۔" انہوں نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"آفس۔" رضوان نے بریف کیس بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس سے قبل کہ باہر نکل جاتا انہوں نے دوبارہ پکارا۔

"رضوان!" وہ پلٹ کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہ کچھ لمحے انہیں دیکھتے رہے۔ پھر نظروں سے اشارہ کرتے ہوئے بولے تھے۔

"تمہارا والٹ۔۔۔"

رضوان نے چونک کر نگاہ دوڑائی پھر آگے بڑھ کر والٹ اٹھا لیا۔

"تم مجھ سے کترانے کیوں لگے ہو؟"

رائے سلیمان کے اچانک پوچھنے پر وہ ٹھٹک سا گیا۔ پھر والٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ایسی بات ہے۔" رائے سلیمان زور دے کر بولے "میں ٹیبل پر ہوں تو تم ناشتہ نہیں کرتے۔"

"آپ کو پروا ہے؟" رضوان کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے۔" انہوں نے الٹا سوال کیا۔

رضوان خاموش ہی رہا۔

"بتاؤ۔ کیا رائے سلیمان کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اسے تمہاری پروا ہے یا نہیں۔" وہ زور دے کر بولے۔

"آپ کو کسی کی پروا نہیں ہے۔" رائے سلیمان ساکت رہ گئے۔

"اگر ہوتی تو۔۔۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر لب بھینچ کر رہ گیا۔

"تو۔۔۔؟" انہوں نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"میں چلتا ہوں۔"

"جملہ پورا کرو رضوان۔۔۔" ان کی گرج دار آواز نے جہاں رضوان کے قدموں کو زنجیر کیا تھا وہیں عالیہ کچن کے دروازے میں رک گئیں۔

"بولو۔۔۔" وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ گئے۔ رضوان نے لب بھینچ کر انہیں ایک نظر دیکھا پھر بڑبڑایا تھا۔

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کیا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ رخ بدل گیا تھا۔ سلیمان نے اسے کندھے سے جھنجھوڑ کر دوبارہ سے اپنے سامنے کیا۔ ان کی آواز اور آنکھوں میں غصے کی لپک تھی۔

"زین کو قتل کروانے کی کیا ضرورت تھی۔" رضوان جھنجھلا گیا۔

اس کے کندھے پر سلیمان کی آہنی گرفت ہلکی پڑ گئی۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر انہوں نے رضوان کو بغور دیکھا۔ وہ بے حد جھنجھلایا ہوا اور خفا سا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھتے ہوئے ایک طویل سانس بھری۔ بولے تو لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

"تمہیں لگتا ہے زین پر قاتلانہ حملہ میں نے کروایا ہے۔"

"زارا کو یقین ہے۔"

"تم اپنی بات کرو۔" انہوں نے اس کی بات قطع کی۔

"اور کون کر سکتا ہے؟"

وہ رضوان کے منہ سے یہ جملہ سننا نہیں چاہتے تھے اور نہ رضوان نے یہ کہتے ہوئے ان کی سمت دیکھا تھا۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتے رہے پھر پلٹ کر ٹیبل کی دوسری سمت چلے گئے۔ ان کی چائے بالکل ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے پیالی عالیہ کی سمت بڑھا دی۔ عالیہ نے تیزی سے کپ پکڑا اور کچن میں گھس گئیں۔

رائے سلیمان نے بلیک پینٹ اور لائٹ گرین شرٹ میں ملبوس رضوان حیدر کو دیکھا جسے انہوں نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ سست روی کے ساتھ دونوں ہتھیلیوں کا دباؤ میز پر ڈال کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ رضوان کے لیے خاموشی کا یہ لمحہ بہت طویل اور شاق تھا۔

"تو تم سمجھتے ہو میں نے زین کو قتل کروانے کی کوشش کی ہے۔"

انہوں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا تو وہ لب بھینچ کر رہ گیا گویا اب ایک لفظ نہیں بولے گا۔

"میں نے زارا سے بھی کہا تھا' ایسی بات منہ سے مت نکالو جس پر بعد میں پچھتانا پڑے۔"

وہ زیر لب بڑبڑائے پھر سر اٹھا کر رضوان کو دوبارہ دیکھا۔

"سنو رضوان حیدر۔۔۔!" ان کا مخصوص ٹھہرا ہوا لہجہ عود آیا۔ "مجھے وضاحت دینے کی عادت نہیں مگر تمہارے لیے بتا رہا ہوں' مجھے زین العابدین کو قتل کروانا ہوتا تو اسی دن کروا دیتا۔ جب وہ گاؤں آیا تھا۔"

رضوان تیزی سے ان کی طرف پلٹا۔

"یا پھر اس دن۔۔۔ جب وہ زارا کو چھوڑنے رائے ہاؤس تک چلا آیا تھا۔"

"آپ۔۔۔؟" تحیر کے مارے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"میں اپنا انتقام رائے جمشید کے ساتھ اسی کی قبر میں دفن کر چکا تھا۔" انہوں نے مزید کہا۔

"آپ۔۔۔ آپ جانتے تھے؟"

"رائے سلیمان کو بچہ سمجھتے ہو تم لوگ۔۔۔" ان کے لہجے کی گرج بیدار ہوئی۔ "وہ پورا ہفتہ میرے گاؤں میں گزار دے اور رائے سلیمان کو خبر نہ ہو۔ زارا اور آمنہ آنٹی اس کے گھر جا کر ملتی رہیں اور رائے سلیمان کو پتا نہ چلے۔ اتنا بے خبر نہیں ہوں میں۔۔۔ رضوان حیدر! جاؤ پہلے کچھ دیکھو تو کھلی آنکھوں سے ہر واقعہ کو دیکھنا اور دماغ سے سوچنا سیکھو تو تب آنا رائے سلیمان سے جواب طلبی کرنے۔"

"سلیمان بھائی۔۔۔ میں۔۔۔"

"جا سکتے ہو اب تم۔۔۔" انہوں نے بات ہی ختم کر دی۔ رضوان جانتا تھا اب وہ اس کی کوئی بات نہیں سنیں گے۔ وہ بریف کیس اٹھا کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ تب ہی عالیہ چائے لے کر آ گئیں اور خاموشی سے کپ ان کے سامنے رکھ دیا۔

"تم نے دیکھا عالیہ۔۔۔!" سلیمان نے کہا۔

عالیہ نے پہلی بار ان کے لہجے میں ایسا دکھ محسوس کیا تھا۔ انہوں نے تسلی آمیز انداز میں ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ سب دم بخود تھے۔

زین ایک دم ہنس دیا اور اس کی ہنسی کی آواز نے ماحول پر چھائی خاموشی کو بکھیر کر رکھ دیا۔ سب ہی نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔

"اور ہم یہ سوچے بیٹھے تھے کہ رائے سلیمان سب سے زیادہ بے خبر ہیں۔ میں اس وقت خود کو احمق تصور کر رہا ہوں۔"

"میں بھی۔۔۔" زارا نے اک طویل سانس لے کر کہا۔ "ہم کیا کیا جتن نہیں کرتے تھے ہم ان سے یہ سب چھپانے کے لیے۔"

"اور سب کچھ ان پر عیاں تھا۔" رضوان نے آہستگی سے کہا۔

"داد دینی پڑے گی رائے سلیمان کو۔ چوہے بلی کا کھیل کھیلتا رہا تمہارے ساتھ۔۔۔" افتخار نے لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"چچا کے بتا رہے ہیں افتخار بھائی۔۔۔!" زین نے

خفگی سے پوچھا تو وہ ہنس دیا۔
"سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ کیسے یقین کر لیا جائے کہ زین پر حملہ سلیمان بھائی نے نہیں کروایا۔" زارا نے سوچتے ہوئے کہا تھا' رضوان نے بے حد سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔
انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر انہوں نے کہا ہے تو واقعی یہ انہوں نے نہیں کیا ہوگا۔ انہیں ہم سے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ جھوٹ بولیں۔ ان میں اتنی پاور ہے کہ وہ اپنے کسی بھی عمل کو تسلیم کر سکیں۔ خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔" رضوان بھرپور یقین کے ساتھ بولا۔
"سوال یہ ہے کہ اگر رائے سلیمان نہیں تو پھر کون؟"
زارا کے سوال پر سب کی نگاہیں زین کی طرف اٹھیں۔
"آپ سب تو یوں میری طرف دیکھ رہے ہیں جیسے گولی چلانے والے نے گولی چلانے سے پہلے اپنا تعارف کروایا ہو۔" وہ گڑبڑا گیا۔
"زین! انہیں یہ نین تارہ کے بھائیوں کی حرکت نہ ہو۔" افتخار نے اچانک کہا۔ زارا نے چونک کر اسے دیکھا۔
"نین تارہ کون؟"
"نین تارہ!" افتخار نے مسکرا کر زین کو دیکھا۔ "بتاؤ زین۔"
"نین تارہ ہے افتخار بتائے گا۔" زین گڑبڑا گیا۔
"کیا پرابلم ہے' جلدی بتاؤ کون ہے یہ نین تارہ؟" زارا نے اپنے بڑے ہونے کا رعب جمایا۔
"موصوف نین تارہ سے شادی کر رہے ہیں۔ اس کے بھائیوں کے ساتھ ایک دفعہ جھگڑا بھی ہو چکا ہے۔ اس کے گھر آ کر پٹائی کر گئے تھے وہ۔"
"افتخار بھائی!" زین نے دہائی دی۔ جب کہ زارا بری طرح چونکی۔
"یہ وہ لوگ ہیں زین! جو میرے ہوتے ہوئے آئے تھے۔"

زین نے اثبات میں سر ہلایا تو افتخار ہنس دیا۔
"گویا یہ فریضہ آپ کے سامنے انجام دیا تھا انہوں نے۔"
زین نے بے حد خفگی سے اسے دیکھا۔
"مگر تم تو کہہ رہے تھے' تم اس لڑکی کو نہیں جانتے۔ تمہارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔" زارا نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔
"تعلق نہیں تھا اب ہو گیا ہے۔"
"بہت گہرا ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے ساتھ شادی کر رہا ہے۔ اس شام ہم اس کی شادی کی تیاری کر رہے ہوتے اگر یہ گولی نہ کھا بیٹھتا۔" افتخار نے مزید بتایا۔
"زین العابدین۔" زارا نے بے حد سنجیدگی سے اس کی سمت دیکھا۔ "تم مجھے تفصیل بتانا پسند کرو گے؟"
"دراصل میں۔" اب بتائے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا۔
"گاؤں میں کس کے ہاں ٹھہرے تھے تم۔" رضوان اور زارا نے بے حد خاموشی سے اس کی ساری بات سنی تھی۔
"قاسم کے ہاں۔ اس کے والد کا نام مقبول ہے۔" زین نے رضوان کے سوال کا جواب دیا تو زارا اچھل پڑی۔
"ہم اسماء کے ہاں ٹھہرے تھے۔ گویا وہ لڑکی۔" ایک دم اسے اسماء کے ساتھ آنے والی اک زرد رو سہمی سی لڑکی یاد آ گئی۔ "تو وہ نین تارہ تھی۔"
"آپ ملی تھیں اس سے۔" زین نے اشتیاق سے پوچھا۔
"ہاں وہ آئی تھی اسماء کے ساتھ۔"
"کیسی لگی آپ کو؟"
"ہاں۔ اچھی ہے۔" زارا نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ زین ان نگاہوں کا مطلب سمجھتا تھا۔
"سوری میں آپ کو بتانا چاہتا تھا مگر اس وقت آپ جلدی میں تھیں۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں گویا

ہوا۔

"جانے دو۔ لیکن کیا اس کے بھائی اس حد تک جاسکتے ہیں۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مجھے نہیں لگتا" ماما مقبول نے انہیں کچھ بتایا ہو یا پھر ہو سکتا ہے۔"

"آپ سب لوگ بہت اچھے جرنلسٹ ثابت ہوں گے۔" رضوان کی طنزیہ آواز پر سب ہی نے چونک کر اسے دیکھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے انہیں طنزیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"غالب گمان تو یہی تھا کہ ——"

"غالب گمان۔" رضوان نے تیزی سے اس کی بات قطع کی۔ "آج سلیمان بھائی کے سامنے میں نے جو کچھ کہا۔ اس کے بعد انہیں میری شکل نہیں دیکھنا چاہیے اور رہا میں۔ تو میں اب ان کا سامنا ہی نہیں کر سکتا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو انعم سے ٹکر ہو گئی۔

"السلام علیکم رضوان بھائی۔"

"وعلیکم السلام" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور کترا کر نکل گیا۔ وہ اندر آئی تو زین بائیوی سے کہہ رہا تھا۔

"ہم سب احمق ہیں۔"

"السلام علیکم۔" انعم نے کہا تو افتخار گویا ہوا۔

"لیجیے ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔"

"میں اس وقت بے حد سنجیدہ ہوں۔" وہ زارا کے قریب بیٹھ گئی۔

"خیریت تو ہے۔ آج تمہاری سکھی بھی نظر نہیں آرہی۔" افتخار نے پوچھا۔

"وہ خودکشی کر رہی ہے۔"

"اور تم یہاں بیٹھی ہو۔" افتخار نے حیرت کا اظہار کیا۔ "عجیب سہیلی ہے روکنے کے بجائے ہمیں اطلاع دینے آگئی۔"

"یہ وقت مذاق کا نہیں ہے افتخار۔" انعم واقعی سنجیدہ تھی۔ "تم سے دوٹوک بات کرنے آئی ہوں۔"

"مجھ سے۔" اس نے سینے پر انگلی رکھے حیرت سے پوچھا۔

"عظمیٰ کو کیا سمجھتے ہو تم؟" اس نے ایکدم سوال کیا۔

"اپنی منگیتر۔" افتخار برجستہ گویا ہوا۔

"شادی کرنا چاہتے ہو اس سے؟"

"ظاہر ہے۔ گھر والے بھی۔"

"افتخار! اگر تم اس بات کے انتظار میں ہو کہ عظمیٰ تمہیں کوئی رسپانس دے گی تو یہ ناممکن ہے۔ وہ احمقوں کی سردار ہے اور میرا تو دل چاہتا ہے کہ مار مار کر اس کا بھرکس نکال دوں۔" انعم تپی ہوئی تھی۔

"ارے۔ کیا کر رہی ہیں۔ کچھ ہمارا ہی خیال کریں۔" وہ مونچھیں سنوارتے ہوئے مسکرایا۔

"پرابلم کیا ہے؟" زارا رضوان کی خفگی میں الجھی ہوئی تھی تب ہی سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"موصوفہ کے کزن کا پرپوزل آیا ہے۔ اس کے تایا کا بیٹا ہے۔ خاندان کا واحد گریجویٹ ہے سو بیوی اسے ایسا ہی چاہیے۔ جسے گھر میں بند کرکے زمانے بھر کی داد پائے گا۔ ایکدم جاہل ہے۔ وہی سوچ، وہی انداز۔ تھوڑی سی نشن ہے مگر انداز جاگیرداروں والے۔ اکلوتا سپوت ہے اور حد درجہ بگڑا ہوا۔"

"گویا کوئی خوبی نہیں موصوف میں۔" افتخار نے مایوسی سے سر ہلایا۔ انعم نے تپ کر اسے دیکھا۔

"ہوں گی مگر ایک ہزار ایک خوبیاں بھی ہوں۔ تب بھی عظمیٰ کا ذہن اس سے نہیں ملنے والا۔"

"عظمیٰ راضی ہے؟" افتخار نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو ہر معاملے میں راضی بہ رضا ہے۔" انعم جل کر بولی۔

"تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تم ——" انعم غصے میں کھڑی ہو گئی۔ "تم دونوں اپنی اپنی انا کا پرچم بلند رکھو مگر یاد رکھو تم دونوں ہی سر پکڑ کر روؤ گے میں ہی احمق اور پاگل ہوں جو تم دونوں کی ہمدردی اور محبت میں یہاں تک بھاگی چلی آئی۔ اب جو کچھ بھی ہو میری بلا سے۔"

"اتنا غصہ ——" افتخار ہنس دیا۔ پھر زین کی طرف پلٹتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "کیا کیا جائے یار؟"

"ارے بھئی! بے بے کو لے کر اس کے گھر جاؤ۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔

"ہاں افتخار! اب کوئی قدم اٹھا ہی لو۔" زارا نے بھی تائید کی۔

"اچھا ——" اس نے باری باری دونوں کو دیکھا! پھر پشت پر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے انعم کی طرف پلٹا۔

"ٹھیک ہے انعم! کل میرا اور بے بے کا انتظار کیجیے گا۔"

"جی۔ یہ بھی مجھ ہی پر احسان ہو گا۔" وہ اس کے شاہانہ انداز پر چڑ گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

ماما مقبول نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ تب ہی اس کی آنکھ لگی تھی۔

"ابا ابھی تک سو رہا ہے۔" قاسم ناشتے کے لیے آیا تو حیرت سے پوچھنے لگا۔ پھر جگانے لگا تو نین تارہ بول اٹھی۔

"رہنے دو قاسم بھائی! ابھی ابھی آنکھ لگی ہے۔"

"کیوں طبیعت تو ٹھیک تھی۔" وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

"ہاں۔ بس ساری رات جاگتے رہے ہیں۔" نین تارہ نے بتایا اور پیالیوں میں چائے نکالنے لگی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ ابا ساری رات جاگتا رہا ہے۔"

اسماء نے پراٹھا توے سے اتارتے ہوئے پوچھا تو وہ خاموش ہو رہی۔ کیا بتاتی ایک عرصہ ہوا رات کی بس چند گھڑیاں ہی ایسی ہوتی ہیں جب نیند مہربان ہوتی ہے ورنہ ساری رات خود پر جھکے آسمان کو تکتے گزر جاتی ہے۔

قاسم ناشتہ کرکے باہر نکل گیا۔ اسماء نے برتن اکٹھے کرکے دھونا شروع کر دیے۔ نین تارہ صحن میں جھاڑو دینے لگی۔ محمد علی اسماء کے پاس بیٹھ کر برتن چھیڑنے لگا۔ اسی کے ہاتھ سے کوئی برتن چھوٹا تھا۔ ماما مقبول ہڑبڑا کر جاگا۔

سورج سر پر چمک رہا تھا۔

دھوپ دیواروں پر اتر آئی تھی۔

"اُف ——" وہ سر پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔ پھر جلدی سے پاؤں میں چپل اڑستے ہوئے پکارا۔

"نین تارہ! میرے کپڑے استری کر دے۔"

"کہاں جانا ہے ماما؟" وہ جھاڑو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"شہر۔" وہ مختصراً کہہ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

"شہر کیا کرنے جانا ہے؟" وہ اسماء سے پوچھنے لگی۔

"پتا نہیں ذکر تو نہیں کیا اس نے۔"

نین تارہ اندر جاکر کپڑے استری کرنے لگی۔ ماما مقبول نہا کر نکلا تو بہ عجلت بولا۔

"اسماء مجھے ایک پیالی دہی کی دے۔"

اسماء اثبات میں سر ہلا کر اٹھ گئی۔ محمد علی باقاعدہ کھرے میں بیٹھ کر برتن دھونے لگا تھا۔

"شہر کیا کرنے جانا ہے ابا۔؟" اسماء نے دہی کا پیالہ اس کے سامنے رکھا۔

"ایک کام ہے۔ بہت ضروری۔" ماما مقبول نے مختصراً کہا۔ کام کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"بس کر نارہ پتر! لے آ کپڑے۔ مجھے جلدی ہے۔" اس نے پکار کر کہا۔ پھر دہی کھا کر خود ہی اندر چلا گیا۔ نین تارہ اسے کپڑے تھما کر باہر نکل گئی۔

"ابا کی تو لگتا ہے ٹرین چھوٹی جارہی ہے۔" اسماء نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں پتا نہیں ایسا کیا کام سوجھ گیا؟" نین تارہ نے دوبارہ سے جھاڑو اٹھالی۔ ماما مقبول کپڑے بدل کر باہر نکل گیا۔

"قاسم کو بتا دینا۔ میں شہر جارہا ہوں کسی کام سے۔"

"شام تک تو آجاؤ گے نا ابا!" اسماء نے پوچھا۔

"ہاں ——ہاں —— شام تک آجاؤں گا۔ کام ہو گیا تو شاید جلدی ہی آجاؤں۔"

وہ باہر نکل گیا۔ ویگن کا انتظار اس نے سڑک کے کنارے بنے بابا دین محمد کے کھوکھے پر چائے پیتے

ہوئے گیا تھا۔

ویگن آئی۔ اس میں بیٹھتے ہوئے اس نے ایک پل کو سوچا تھا۔

"کہیں زین ناراض ہی نہ ہو جائے۔"

"اللہ مالک ہے۔۔۔۔" اس نے خود کو تسلی دی اور بیٹھ کر کرایہ نکالنے لگا۔ شہر پہنچنے تک اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آما جگاہ بنا رہا۔

ویگن رکی تو اس نے اتر کر رکشے کو آواز دی۔ رکشے والے کو آواز دیتے ہوئے اس نے پھر سوچا تھا۔

"کیا میں جو کچھ کرنے جا رہا ہوں وہ ٹھیک ہے۔"

اور جب رکشہ پھنپھناتا ہوا "رائے ہاؤس" کے سامنے رکا تو ایک پل کو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا دل چاہا وہ اسی رکشے میں بیٹھ کر واپس چلا جائے۔

"جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

وہ سر جھٹک کر آگے بڑھا تب ہی گیٹ کھلا۔ رائے رضوان کی گاڑی باہر آئی اور اس کے قریب سے گزر گئی۔ چوکیدار گیٹ بند کرنے لگا۔ تو وہ آگے بڑھ آیا۔

"رائے سلیمان ہے؟"

چوکیدار نے سر تا پا اسے دیکھا۔ پھر رکھائی سے پوچھنے لگا۔

"کیا کام ہے۔۔۔؟"

"بہت ضروری کام ہے۔ اس سے کہو۔ گاؤں سے مقبول آیا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"او بابا! وہ ایک دن میں یوں بھی صاحب کو گاؤں ہی جانا تھا۔"

"تم سے مشورہ نہیں مانگا میں نے۔" ملا مقبول نے چڑ کر کہا۔ "ضروری کام ہے اسی لیے صبح صبح بھاگا ہوا آیا ہوں۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا اندر آگیا۔ ملازم کو پیغام دیا۔ ملازم نے پیغام رائے سلیمان تک پہنچایا۔ رائے سلیمان نے چونک کر سر اٹھایا۔

"گاؤں سے مقبول۔۔۔ اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے اسے لان میں بٹھاؤ۔" ان کی آنکھوں میں گہری سوچ کے رنگ ابھرے۔ انہوں نے عالیہ کو دیکھا تو وہ قدرے چڑ کر کہنے لگیں۔

"گاؤں کے دھندے گاؤں میں ہی چھوڑ آیا کریں سلیمان۔۔۔!"

وہ ہلکا سا مسکرائے اور کھڑے ہو گئے۔ باہر آئے تو ملا مقبول بے چینی سے کرسی پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"خیریت مقبول چاچا۔ ایسے آنا ہوا۔۔۔؟" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ متذبذب سا بیٹھ گیا۔

"مجھے بہت ضروری بات کرنا تھی سلیمان پتر!"

رائے سلیمان نے گہری نگاہوں سے اس کے تذبذب بھرے انداز کو دیکھا۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا۔ زین اسی کے گھر ٹھہرا تھا۔

"کیسی بات؟ کوئی کام ہے۔۔۔" انہوں نے نارمل سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں کام تو نہیں ہے۔۔۔" وہ بہت سوچ سمجھ کر یہاں تک آیا تھا۔ مگر اب کوئی لفظ بھی گرفت میں نہ تھا۔ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ رائے سلیمان بڑے صبر سے منتظر تھے حالانکہ ایک ہلکی سی بے چینی ان کے اندر جاگ گئی تھی۔

تب ہی ملا مقبول نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"مجھے رائے نواز کے بارے میں بات کرنا ہے۔"

رائے سلیمان ایک پل کو ساکت رہ گئے تھے پھر زیر لب بڑبڑائے۔

"مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔۔۔ کہو چاچا مقبول کیا کہنا چاہتے ہو۔"

♥ ♡ ♡ ♥

وہ کب سے سیڑھیوں پر خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ کئی کام پڑے تھے۔ اماں کئی بار بڑبڑا چکی تھیں۔ صحن میں امرود کے پتے بکھرے تھے اور ابھی تک جھاڑو نہیں لگی تھی۔ برآمدے میں میز پر جہاں بیٹھ کر وہ اپنی اسٹڈی کیا کرتی تھی۔ یونہی کتابیں اور کاغذ بکھرے تھے

کشنوں پر تھوڑی ٹکائے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ کہ انعم نے دیوار پر سے جھانکا اور مسکرا دی۔

"خیریت تو ہے۔۔۔ کس کا سوگ منایا جا رہا ہے؟" عظمیٰ نے چونک کر سر اٹھایا اور قصداً مسکرائی۔

"یونہی۔۔۔ کچھ کرنے کو دل نہیں چاہا تو سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گئی۔"

(ہائے یہ بھرم رکھنے کی بے چاری سی کوشش۔ وہ بھی ان کے سامنے جو آپ کی رگ رگ سے واقف ہوں)

"چلو اچھا ہوا۔ تم نے بھی اپنے دل کی سنی۔" اس نے دیوار پر پاؤں رکھا اور اس کے پاس اتر آئی۔ کچھ لمحے کمر پر ہاتھ ٹکائے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔

"تم نے صفائی بھی نہیں کی۔"

"بس موڈ نہیں بنا۔" اس نے بیزاری سے کہہ کر کھلے بالوں کو ہاتھوں سے سلجھا کر جوڑا سا بنا لیا۔

"تھوڑی بہت صفائی تو ہونی چاہیے۔ آخر تمہاری سسرال والے جواب لینے آ رہے ہیں۔"

انعم نے مسکراتے ہوئے امرود کے پیچھے پڑی جھاڑو اٹھالی۔ عظمیٰ نے بیزاری و اکتاہٹ سے اسے دیکھا۔ پھر اسے جھاڑو اٹھاتے دیکھ کر کہنے لگی۔

"رہنے دو۔ میں کر لوں گی۔"

"ارے تم کیا خاک کرو گی۔ صبح سے ان ہی سیڑھیوں پر بیٹھی وظیفہ پڑھ رہی ہو۔ انعم بی بی! تم ہی ہمت کرو ورنہ یہ لڑکی تو ناک کٹوائے گی۔ اسی لیے کہتی ہوں یہ پڑھائیاں تو لڑکیوں کو نکما کر دیتی ہیں۔" انعم نے مسکرا کر رخ بدل لیا۔ اماں اسے دو چار صلواتیں سنا کر بیٹھک میں گھس گئیں۔ آج ان کے پاؤں میں بڑے چکر لگے تھے۔ عظمیٰ سست روی سے اٹھ کر میز تک آئی اور اپنے نوٹس سمیٹنے لگی تب ہی ابا چلے آئے۔ حسب معمول ڈیوڑھی میں رک کر کھنکھار رہے تھے۔ عظمیٰ نے دوپٹہ اوڑھ لیا۔ ابا کے ہاتھ میں بڑا سا شاپر تھا۔

"لو بیٹا! سنبھالو یہ سامان۔۔۔" انہوں نے آکر سامان کا شاپر عظمیٰ کے ہاتھ میں دیا پھر انعم کو دیکھ کر مسکرائے۔

"آج سارا کام انعم بیٹا سے ہی کروانا ہے۔"

"نہیں۔ میں تو ابھی آئی ہوں۔"

عظمیٰ نے بے حد حیرت سے بڑے سے شاپر میں جھانکتے بیکری کے لیٹر پیک، پھل اور سموسوں کے لفافے کو دیکھا۔

"یہ اتنا کچھ۔۔۔" ابا کے جانے کے بعد عظمیٰ نے انعم سے پوچھا تھا۔

"تمہارے سسرال والوں کی خاطر مدارات نہیں کرنی۔" اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ عظمیٰ کچھ لمحے ہونٹ کاٹتی رہی۔ پھر آہستگی سے پوچھنے لگی۔

"کیا واقعی آج تایا وغیرہ آ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ جواب لینے آ رہے ہیں۔" اس نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کر کے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ خاموشی سے کچن میں گھس گئی اور بہت دیر تک باہر نہیں نکلی تھی۔

انعم کی پھرتیاں عروج پر تھیں۔ لمحوں میں اس نے سارا گھر چمکا دیا تھا۔

"عظمیٰ کہاں ہے؟" امی نے آکر پوچھا تھا۔

"کچن میں۔۔۔" انعم کیاری سے خشک پتے اکٹھے کر رہی تھی۔

"اسے کہو منہ ہاتھ دھو کر ڈھنگ کے کپڑے پہن لے۔"

"خیر ہے خالہ! انہوں نے کیا پہلے عظمیٰ کو دیکھا نہیں۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"لیں۔ لگتا ہے آگئے وہ لوگ۔"

اماں دروازے کی طرف چلی گئیں۔ عظمیٰ کچن سے نکل کر کمرے میں گھس گئی۔

وہ آج سب سے چھپ جانا چاہتی تھی۔ مہمان کب آئے کہاں بیٹھے گئے کچھ خبر نہ تھی۔ شاید اماں نے انہیں بیٹھک میں ہی بٹھایا تھا۔ تھی تو حیرت کی بات کہ تایا اور تائی بیٹھک میں بٹھانے والے مہمان نہ

تھے مگر ذہن اتنا خالی ہو رہا تھا کہ اس مسئلے پر زیادہ غور ہی نہ کر سکی۔ پھر خیال آیا انعم اکیلی لگی ہوئی ہے۔

"مونق ہو عظمٰی! جب فیصلہ اپنا ہے تو فرار کیسا؟"

اس نے چہرے پر دونوں ہاتھ رگڑے اور اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ انعم کولڈ ڈرنکس سرو کر چکی تھی۔ اب چائے کے ساتھ لوازمات رکھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر عظمٰی کو دیکھا وہ خاموشی سے برتن نکالنے لگی۔

"چائے لے کر تم جاؤ گی۔" انعم نے پوچھا۔

"نہیں۔ تم ہی دے آؤ۔" اس نے آہستگی سے کہا پھر پوچھنے لگی۔ "کون کون آیا ہے؟"

"زیادہ لوگ نہیں ہیں۔" انعم نے مختصراً کہا اور ٹرے اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ عظمٰی نے اس کے جانے کے بعد چیزیں سمیٹیں پھر مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔

نجانے کتنا وقت گزرا۔

بیٹھک سے نکل کر آوازیں باہر آنے لگیں۔

پھر وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

خوش و خرم اماں، مطمئن ابا اور ہنستی مسکراتی انعم کے ساتھ افتخار کی بے بے ہی تھیں۔ اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔

بے بے نے آپ آ کر اسے ڈھیروں پیار کیا۔

"یہ تو میرے گھر کی خوشی تھی۔" نجانے وہ کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے ہکا بکا کھڑی عظمٰی کے ہاتھ میں ہزار روپے کا نوٹ ٹھونس دیا۔

اماں منع کرنے لگیں۔

انعم فقرے چست کر رہی تھی۔ وہ ہونق بنی کھڑی تھی۔

پھر اماں انہیں رخصت کرنے دروازے تک چلی گئیں۔ انعم بھی ساتھ تھی۔ واپس آئی تو ہاتھ میں مٹھائی کی بڑی سی ٹوکری تھی۔

"خانساماں والا ہے۔" اس نے ٹوکری صحن میں پڑی چارپائی پر رکھی۔ پھر ہونق بنی عظمٰی کو دیکھا تو ہنستے ہوئے آگے بڑھی۔ اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھما ڈالا۔

"اللہ! عظمٰی میں کتنی خوش ہوں۔ اتنی خوشی تو مجھے اپنی دفعہ بھی نہ ہوئی تھی۔ کتنے نفل اور کتنی منتیں مانی تھیں میں نے۔"

اس نے چھوڑا تو وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی اور خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا۔ خوشی کے مارے کوما میں تو نہیں چلی گئیں۔" انعم نے چھیڑا۔

"یہ کیا ہے۔۔۔؟" عظمٰی نے بے یقینی سے مٹھی کھولی۔ ہزار روپیہ مٹھی سے نکل کر چارپائی پر گرا۔ انعم نے آرام سے اٹھا کر ہاتھ سے اس کی سلوٹیں نکالیں۔ پھر اسے ہوا دیتے ہوئے بولی۔

"تقدیر کی خوبصورت سازش، خوابوں کی تعبیر، آرزوؤں کی تکمیل۔"

"تم افتخار کے پاس گئی تھیں۔" عظمٰی نے اچانک سوال کیا۔ ایک پل کو وہ گڑبڑائی۔ پھر ڈھیٹ بن کر بولی۔

"تو کیا کرتی۔ تمہیں اس گھونچو کے ساتھ رخصت کر دیتی۔"

"بہت برا کیا تم نے انعم۔!" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ پتا نہیں کیوں۔ پہلے دل ڈوبا جا رہا تھا اور اب شدید غصہ آ رہا تھا۔ اسے خود اپنی فیلنگز سمجھ میں نہ آ رہی تھیں۔

"بالکل برا نہیں کیا بلکہ بہت عقل مندی سے کام لیا ہے۔" وہ اپنے کارنامے پر اترا رہی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ میں اس سے شادی کر لوں گی؟"

"تو اور کیا کرو گی؟" انعم جھنجلا گئی۔

"انکار۔۔۔" وہ سنجیدہ و غمگین لہجے میں گویا ہوئی۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔۔۔" انعم غصے میں آ گئی۔

"ہاں میں انکار کر دوں گی۔ مجھے افتخار سے شادی نہیں کرنی۔"

"تو پھر کس سے کرنی ہے؟" اماں کے کان میں اس کا آخری جملہ پڑا تھا۔ تیور اگر اس کے سامنے آ گئیں۔

"تیرا دماغ تو نہیں الٹ گیا۔ کیسے منہ پھاڑ کر انکار کر رہی ہے۔ ارے یہیں قبر کھود کر دفنا دوں گی۔ اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دوں گی تمہارا۔۔۔ اس سے نہیں اس سے نہیں۔ تو پھر کس سے کرنی ہے یہ بھی بتاؤ۔ ایسا کون سا پسند آ گیا ہے میری حور پری کو۔"

"اماں۔۔۔! میں۔۔۔" اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ یہی الزام تھا۔ یہی وہ جملے تھے جس سے بچنے کے لیے وہ اپنے خواب رہن رکھ رہی تھی۔ اسی سے بچنے کے لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

"بیٹیا تمہارے باپ کے مزاج نہیں ملتے تھے۔۔۔ اب یہ کھڑی ہو گئی ہے۔ یہی سکھاتی ہیں تمہاری ہمسائیاں۔۔۔ اسی لیے کہتی تھی مت بھیجو ٹیوشن پڑھنے۔۔۔ کوئی نہ کوئی گل کھل کر رہے گا۔ اب دیکھ لو۔ پر ایک بات کان کھول کر سن لو۔ لڑکا مجھے اور تمہارے باپ کو پسند ہے تم رخصت ہو گی تو اسی کے ساتھ۔ ورنہ میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔" اماں آپے سے باہر ہو رہی تھیں۔ اس میں مزید سننے کی تاب نہ رہی تو بھاگتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔ انعم انہیں خاموش کروانے لگی۔

"سمجھا دینا اس کو اچھی طرح۔۔۔" ان کا سانس پھول گیا تھا۔

"نہیں سمجھاؤں گی۔۔۔" انعم نے انہیں پانی کا گلاس دیا۔ وہ کچھ ریلیکس ہوئیں تو اٹھ کر اندر آ گئی۔ وہ اوندھے منہ پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ انعم دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا کہے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا تمہاری اس بے وقوفی کو کن الفاظ میں خراج تحسین پیش کروں۔"

انعم نے کہا۔ جواب میں سسکیاں ابھرتی رہیں۔

تب ہی اسے لگا عظمٰی ہنسی ہے۔

اس نے بہت غور سے دیکھا اور سنا۔

وہ رو رہی تھی۔

نہیں شاید ہنس رہی تھی۔

نہیں سسکیوں کی آواز ہے۔

مگر نہیں۔۔۔ کہیں ہلکی سی ہنسی بھی گونج رہی ہے۔

وہ کچھ حیران سی ہو کر آگے بڑھی۔ اسے کندھوں سے تھام کر سیدھا کیا اور ٹھٹک گئی۔

وہ عجیب دھوپ ساون کا منظر تھا۔

وہ روتی جاتی تھی اور ہنستی جاتی تھی۔

انعم نے گھور کر اسے دیکھا تو عظمٰی اس سے لپٹ گئی۔ انعم کے بازو ڈھیلے ہی رہے اسے عظمٰی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ مگر شدید غصے کے باوجود اس کے لبوں پر ہنسی بکھیر گئی۔ اس کے بازو اٹھے اور عظمٰی کو گھیر لیا۔

اب وہ دونوں روتی جاتی تھیں اور ہنستی جاتی تھیں۔

نجانے کیوں؟

♥ ▽ ▽ ♥

جیپ بے حد تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کچی پکی سڑک پر اٹھتے دھول کے بادل راستے گم کر رہے تھے۔ جیپ رائے سلیمان خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات اتنے پتھریلے اور جامد تھے کہ زارا اور رضوان کو کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ پوچھنے کی ہمت تو انہیں تب بھی نہ ہوئی تھی۔ جب رائے سلیمان نے کچھ بھی بتائے بغیر انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ انہیں خبر نہ تھی کہ وہ گاؤں جا رہے ہیں اور اگر جا رہے ہیں تو کیوں؟

جیپ آم کے گھنے درختوں سے نکل کر ایک نیچی چھتوں والے چھوٹے سے مکان کے سامنے جا رکی۔ رضوان تو واقف تھا مگر زارا یہاں پہلے کبھی نہ آئی تھی۔

جیپ کے رکتے ہی اندر سے دو ملازم بھاگتے ہوئے نکلے۔ ان کا ڈیل ڈول، حلیہ اور ہاتھوں میں پکڑی بندوقیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ رائے سلیمان نے انہیں یہاں کیوں رکھا ہے۔ انہوں نے دیکھتے ہی زوردار سلام کیا تھا اور زارا کو دیکھتے ہی جہاں حیرت ان کی آنکھوں میں اتری تھی۔ وہیں وہ احتراماً نظریں جھکا کر ایک طرف ہو گئے۔

رائے سلیمان نے سر کے اشارے سے جواب دیا تھا۔

"ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔۔۔؟" زارا نے رضوان سے پوچھا تھا۔ وہ محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔ رائے سلیمان بر آمدے میں رکے۔

"کہاں ہے۔۔۔؟"

"اندر ہے۔" ایک نے تیزی سے جواب دیا۔

"ہوں۔" انہوں نے دروازہ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا پھر رک کر پلٹے۔

"مجھے اپنے معاملات میں دوسروں اور خاص طور پر عورتوں کی دخل اندازی پسند نہیں۔" انہوں نے ایک نظر زارا کو دیکھا۔ "مگر تمہارا معاملہ کچھ اور ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ حقیقت تم دونوں کے سامنے کھلے۔"

اس سے قبل کہ وہ کوئی سوال کرتے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ سو انہیں بھی تقلید کرنی پڑی پھر وہ ٹھٹک گئے۔ کمرہ دھول مٹی اور پرانے فرنیچر سے اٹا ہوا تھا اور حیرت انگیز چیز منشی بشیر علی تھا۔ جو فرش پر اکڑوں بیٹھا دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے پنڈولم کی طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ اس کے سر پر کھڑا بندوق بردار گویا اس کی روح سلب کر رہا تھا۔

"کیسے ہو منشی بشیر علی۔۔۔؟" رائے سلیمان نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔ اس نے بڑبڑا کر اٹھنا چاہا مگر بندوق بردار نے اپنی بندوق کی نال اس کے کندھے پر چبھو کر دوبارہ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

"سلیمان پتر! یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی۔ کوئی قصور سرزد ہو گیا۔" منشی بشیر دہائی دیتے ہوئے بولا۔

"تم سے قصور۔۔۔ نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ قصور تو ہمارا ہے۔ غلطی تو ہم سے سرزد ہوئی ہے منشی چاچا! اور اسے نیچے کیوں بٹھایا ہے۔" انہوں نے بندوق بردار کو گھورا۔ "تم تو ہمیشہ ہمارے برابر بیٹھتے رہے ہو۔ اٹھو۔۔۔ اوپر کرسی پر بیٹھو۔"

تب تک دوسرے ملازم تین کرسیاں جھاڑ پونچھ کر ان کے قریب رکھ چکے تھے۔ ایک نے دھول میں اٹی کرسی کھینچ کر منشی کے قریب کی اور کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور زبردستی کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کے عین سامنے رائے سلیمان نے کرسی سنبھال لی۔

"سلیمان بھائی۔" رضوان نے کچھ کہنا چاہا مگر سلیمان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹھو اور دیکھو۔" ان کا لہجہ سرد تھا۔ رضوان لب بھینچ کر رہ گیا۔

"ہاں تو منشی بشیر علی۔" رائے سلیمان نے کلائی موڑ کر گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ "میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تقریباً" دس منٹ۔"

"سلیمان پتر میں۔۔۔"

"بیس برس پہلے جس شخص نے حویلی میں رائے سلیمان کے قتل کی اطلاع پہنچائی وہ تم تھے۔" رضوان اور زارا نے چونک کر پہلے منشی بشیر علی کو پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسرے پل انہیں یہاں آنے کا مقصد سمجھ میں آ گیا۔

"تو یہ تھا وہ شخص۔۔۔"

"تم نے آکر بتایا کہ رائے نواز کو قتل کر دیا گیا ہے اور قتل کرنے والا رائے جمشید ہے۔ ہے نا۔۔۔" رائے سلیمان نے ذرا سا جھک کر اپنی سرد نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ منشی بشیر علی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ خوف اس کی آنکھوں میں الڈ آیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔"

"تم نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کیونکہ تم اس وقت اتفاق سے آموں کی فصل کا جائزہ لینے باغ کی طرف نکل گئے تھے۔" سلیمان نے مزید کہا۔ منشی بشیر علی نے تھوک نگلتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا ہوا تھا؟"

"تم جانتے ہو سلیمان پتر۔۔۔!"

"یہ لوگ تفصیل تمہارے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ منشی بشیر علی نے اٹک اٹک کر کہنا شروع کیا۔ مگر دوسرے پل رائے سلیمان کے بھاری ہاتھ کا بھرپور تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا۔ وہ الٹ گیا۔ بندوق بردار نے اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ رضوان نے لب بھینچ کر زارا کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

"سچ بولو منشی بشیر علی۔۔۔! بالکل سچ۔۔۔" سلیمان نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔

"میں بالکل سچ بول رہا ہوں سلیمان پتر۔۔۔!" وہ [illegible] دیتے ہوئے بولا۔

"بکواس بند کرو منشی۔۔۔" رائے سلیمان غرائے۔ "سولہ سال کے سلیمان کو بے وقوف بنانا آسان تھا مگر آج نہیں۔۔۔ آج صرف سچ سنوں گا۔"

"میں نے جھوٹ نہیں بولا۔" وہ دہائی دیتے ہوئے [illegible]۔

"زین العابدین کو گولی تم نے ماری ہے۔" رائے سلیمان نے اچانک سوال کیا۔ وہ ایک پل کو ٹھٹکا پھر [illegible] سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

"نہیں۔۔۔ میں نے نہیں ماری۔"

"تم بہت ضدی ہو۔ ایسے نہیں مانو گے۔"

"چوہدری صاحب! آپ حکم کریں۔" پیچھے کھڑے بندے نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔

رائے سلیمان نے پیچھے ہو کر کرسی کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ کچھ لمحے منشی بشیر کو متوحش نگاہوں سے دیکھتے رہے پھر ان کے لبوں پر پراسرار سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"تم تو جانتے ہو منشی! پھر بھی خود کو مصیبت میں ڈال دیا۔"

"سلیمان پتر! میری بات سنو' خدا گواہ ہے میں نے کچھ بھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"نور محمد۔" رائے سلیمان نے گویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ نور محمد لپک کر ان کے قریب آیا۔

"نور محمد! جاؤ۔ منشی بشیر علی کے گھر کو آگ لگا دو۔" رائے سلیمان کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔ "اور لگانے سے پہلے یہ اطمینان کر لینا کہ اس کے سارے گھر والے گھر کے اندر ہی موجود ہوں۔" رائے سلیمان کے لہجے میں سفاکی ہی سفاکی تھی۔

"نہیں۔۔۔ تم۔۔۔ تم ایسا نہیں کر سکتے ہو۔" منشی بشیر علی کی نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"نور محمد! تم نے سنا نہیں۔۔۔" رائے سلیمان نے گرج کر کہا۔

"سن لیا چوہدری صاحب۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے منشی بشیر علی کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ سلیمان پتر نہیں۔۔۔" وہ خود نور محمد کے پیچھے لپکا۔ پاس کھڑے بندے نے اسے گردن سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ مچل مچل کر خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چیخ چیخ کر نورے کو آوازیں دے رہا تھا۔ رائے سلیمان نے بے حد اطمینان سے یہ منظر دیکھا۔ زارا سے ضبط نہ ہوا۔

"سلیمان بھائی پلیز۔"

"تمہیں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے رکھائی سے جواب دیا اور منشی کو دیکھنے لگے چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔

"چپ۔۔۔ چپ۔۔۔ منشی کی بہو بہت ہی لاپروا عورت ہے سارا گاؤں جانتا ہے۔ ذرا سی لاپروائی سے سارے گھر کو آگ لگا دی۔ سب جل کر راکھ ہو گئے۔ منشی کا بیٹا' بہو' اس کے تین نواسے اور۔۔۔"

"بس کرو سلیمان! بس کرو یہ ظلم ہے۔۔۔" وہ خود کو چھڑا کر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے اس کے چیروں میں گر گیا۔

"تو بتاؤ سچ کیا ہے۔۔۔؟"

"اسے روکو۔۔۔ اسے روکو۔"

"میں اسے روک سکتا ہوں مگر سچ بولنا ہو گا۔ ایک منٹ کے اندر اندر۔۔۔ اگر نورے کے قدم اس باغ سے باہر نکل گئے تو پھر میں اسے نہیں روکوں گا۔" انہوں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا اور منشی کے سامنے اپنا جوان بیٹا' خوبصورت بہو اور ننھے منے بچے آ گئے جو آگ کے شعلوں میں گھرے چیخ چیخ کر اسے مدد کے لیے پکار رہے تھے۔

اور ایک پل نہیں لگا اسے وہ راز اگلتے ہوئے جسے اس نے بیس برس تک چھپائے رکھا۔

"رائے نواز نے مجھے کہا تھا میں جمشید کو گولی مار دوں۔ سارا قصہ ختم ہو جائے گا۔ اس نے خود جمشید کو بلایا کہ فیصلہ کرنا ہے۔ وہ دھوکے سے رائے جمشید کو وہاں تک لے آئے جہاں میں پہلے ہی چھپا ہوا تھا۔ انہوں نے اشارہ کیا تو میں نے گولی چلا دی مگر جمشید کا

تھوڑا بدک گیا۔ گولی رائے نواز کو جا لگی۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر—"

وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ رائے سلیمان ساکت و صامت بیٹھے تھے۔ خود زارا اور رضوان سانس لینا بھول گئے تھے۔

"مجھے لگا زین العابدین سب کچھ جان لے گا۔ میں نے اسے گولی مار دی۔ مگر وہ بچ گیا۔"

آج اعتراف جرم کا دن تھا۔ جس سچ کی تلاش میں زین بھٹکتا پھر رہا تھا۔ عیاں ہو گیا تھا۔

رائے سلیمان کی ٹھوکر اتنی بھرپور تھی کہ وہ پیچھے کو الٹ گیا۔ انہوں نے جھپٹ کر بندوق ہاتھ میں لے لی۔

"نمک حرام، بیس برس تک آستین کے سانپ بن کر پلتے رہے۔"

"نہیں سلیمان بھائی!" رضوان نے تیزی سے آگے بڑھ کر بندوق پکڑ لی۔

"ہٹ جاؤ رضوان—"

"پلیز سلیمان بھائی! قانون ہاتھ میں مت لیں۔" زارا تیزی سے ان کے سامنے آئی اگر وہ دونوں وہاں نہ ہوتے تو اس وقت منشی کی لاش تڑپ رہی ہوتی۔

"میں نے بیس برس تک اس شخص کو بزرگ سمجھ کر اپنے برابر بٹھایا اور یہ—"

رضوان اور زارا نے پہلی بار انہیں اس طرح بپھرتے دیکھا تھا۔ وہ منشی بشیر علی کی بوٹی بوٹی کر دینا چاہتے تھے۔

"نورے— نورے—" ان کی گرج پر دروازے کے باہر کھڑا نور دلپک کر اندر آیا۔ منشی نے ذرا سا سر اٹھا کر اسے دیکھا اور قدرے اطمینان سے زمین پر سر ٹکا دیا۔ اسے اب اس بات کی فکر نہ تھی کہ وہ اعتراف جرم کر چکا ہے۔

"لے جاؤ اسے میرے سامنے سے اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو کسی خارش زدہ کتے سے کیا جاتا ہے۔" انہوں نے بے حد نفرت سے کہا تھا۔ رضوان نے ایس پی شاہ میر کا نمبر ملایا۔ وہ اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے تھے۔

رضوان نے موبائل آف کیا تو سلیمان نے بغیر ان کی طرف دیکھے کہا تھا۔

"زارا کو لے کر حویلی چلے جاؤ۔ چابی جیپ میں ہے۔"

"سلیمان بھائی! آپ—" وہ دو قدم آگے بڑھا۔

"میں اس وقت اکیلے رہنا چاہتا ہوں۔ پلیز—"

"رضوان فار گاڈ سیک! زارا اسے لے جاؤ—" اس وقت ان کی کیفیت ایسی تھی کہ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ زارا نے رضوان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا اور باہر نکلنے کا اشارہ کیا تھا۔

♥ ♡ ♡ ♥

سہ پہر کا وقت تھا اور تھی چپ—

تھکا ہوا ذہن اور بھٹکی ہوئی سوچیں۔

کون ہوں میں؟ یہ سوال کئی بار ان کے ذہن کی دیواروں سے ٹکرایا تھا۔

بس ایک دھند تھی جس میں ان کا وجود گم ہوتا جا رہا تھا۔

ان کا دل چاہتا، وہ بھاگ جائیں، ان در و دیوار سے باہر، ان رشتوں سے دور بہت دور، کسی ایسی جگہ جہاں انہیں کوئی نہ ڈھونڈ پائے۔

نجانے کیوں وہ اپنا اعتماد کھوتی جا رہی تھیں۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور سست روی سے چلتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ آئینے میں منعکس ہوتا چہرہ ان کا اپنا ہے—؟

ایک پل کو انہیں دھچکا سا لگا۔

"آمنہ مراد! کیا یہ تم ہو؟"

جواب ایک تو کی صورت ان کے لبوں پر آ کر ٹوٹ گیا۔

"یہ زرد، پھیکا، اعتماد سے محروم، زندگی سے عاری چہرہ میرا ہے۔"

ان کی انگلیوں نے آئینے میں منعکس ہوتے عکس کو چھونے کی کوشش کی۔ انگلیاں آئینے کی شفاف سطح

[illegible] ٹکرا گئیں۔

ہم لوگ نہ تھے ایسے

ہیں جیسے نظر آتے

اے وقت گواہی دے

ہم لوگ نہ تھے ایسے

[illegible] نہ تھا ایسا

[illegible] لوگ نہ تھے ایسے

دیوار نہ تھے رشتے

زندان نہ تھی بستی

[illegible] نہ تھی بستی

[illegible] نہ تھی سستی

[illegible] صورت ہے

[illegible] نہ تھے ایسے

[illegible] نہ تھے موسم

[illegible] رات نہ تھے ایسے

[illegible] نہ تھی ایسی

[illegible] لوگ نہ تھے ایسے

اے وقت گواہی دے

ہم لوگ نہ تھے ایسے

"اے کاش! یہ سب یوں نہ ہوا ہوتا تو آج—"

[illegible] کا دروازہ آہستگی سے چرچرایا۔ وہ سر جھکا کر آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسو صاف کرنے لگیں۔ کوئی دبے قدموں اندر داخل ہوا اور کسی کے [illegible] سے جوتی مانوس سی خوشبو پھیلی۔ تب ہی کسی کے بازوؤں نے عقب سے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔

انہوں نے چونک کر سر اٹھایا پھر ساکت ہو گئیں۔ انہیں لگا۔ وہ ذرا بھی ہلیں تو آئینے میں منعکس ہوتا عکس بکھر جائے گا۔

[illegible] مسکرایا۔ آمنہ مبہوت سی دیکھتی رہیں۔

"پھپھو—!" اس نے آہستگی سے پکارا۔ وہ بری طرح چونکیں اور تیزی سے پلٹیں۔

وہ ایک قدم پیچھے ہوا اور مسکرا کر پوچھنے لگا۔

"کیا ہوا، یقین نہیں آیا نا—"

ان کے دونوں ہاتھ اٹھے اور اس کے نقش چھونے لگے۔ زین نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا اور سر اٹھا کر پوچھنے لگا۔

"آپ کو خوشی نہیں ہوئی پھپھو—؟"

تو وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ کر رو دیں۔

"کتنا چاہا تھا میں نے کہ تم میرے پاس آؤ یہاں—"

"تو آپ کا خواب سچ ثابت ہو گیا نا—"

اچانک انہوں نے زین کے سینے پر رکھا اپنا سر اٹھایا۔ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں۔

"تم اتنے کمزور کیوں ہو رہے ہو۔"

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ انہوں نے اس کی شرٹ کے بٹن کھولنا شروع کر دیے اور اس کے سینے کا زخم اور زخم پر بندھی پٹی ان کے سامنے تھی۔

"یہ— یہ کیا ہے؟" انہوں نے خوفزدگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ معمولی سی چوٹ لگی تھی۔" زین نے بتایا اور ان کا ہاتھ تھام کر انہیں بیڈ پر بٹھا دیا اور خود ان کے قدموں میں قالین پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

"تم— تم یہاں تک کیسے آئے زین—! چلے جاؤ۔ کوئی دیکھ لے گا۔"

"کوئی کچھ نہیں کہے گا پھپھو—!" وہ اپنی جگہ سے اٹھا نہیں۔

"نہیں۔ تم جاؤ یہاں سے— کہیں کہیں سلیمان—"

"آنے دیں ذرا ان سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں۔" وہ اطمینان سے گویا ہوا۔

"تم سمجھ نہیں رہے—"

"پھپھو! وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ—"

"کیونکہ زین العابدین کو میں خود یہاں لایا ہوں—" سلیمان اندر داخل ہوئے۔ زین اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آمنہ تیزی سے زین کے سامنے آ گئیں۔ جیسے اسے چھپانا چاہتی ہوں۔

"تم۔۔۔ تم کیوں لائے ہو اسے یہاں۔۔۔"

"کیا یہ اس کا گھر نہیں۔۔۔" سلیمان نے جواباً سوال کیا۔ وہ کچھ پریشان ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"اور آپ ہی نے تو کہا تھا۔ زین یہاں آئے تو اسے کچھ مت کہنا کیں۔۔۔ کچھ نہیں کہا۔ بس کالر سے پکڑ کر یہاں تک لے آیا ہوں۔ اب جو چاہیں اس کے ساتھ کریں۔"

وہ خاصے خوشگوار موڈ میں کہہ رہے تھے۔

"سلیمان! تم۔۔۔"

"آپ تو کبھی برے نہیں ہو۔۔۔" زین نے ان کا جملہ پورا کیا۔ سلیمان کھل کر مسکرائے تھے اور آئمہ بے یقینی سے دونوں کو دیکھتی رہیں پھر انہیں یوں لگا جیسے آبلہ پائی کا سفر تمام ہو گیا ہو۔

♥ ♡ ♡ ♥

حویلی میں برسوں کی سوئی ہوئی خوشیاں انگڑائی لے کر جاگ اٹھیں۔

صدیوں کا چھایا سناٹا ایک چھناکے سے ٹوٹ کر بکھرا تھا۔ اب آوازیں تھیں۔ مسکراہٹیں، قہقہے، زندگی سے بھرپور چہرے۔

آئمہ گویا پھر سے جی اٹھیں۔ زین کا اس گھر میں آنا محض ایک فرد کا آنا نہیں تھا۔ یہ دو خاندانوں کا ملاپ تھا۔ وہ ادھر سے ادھر مہمانوں کو اٹینڈ کرتے رابداریوں میں آتے جاتے، لان میں ڈرنک سرو کرواتے ہوئے انہیں لگا ان آوازوں میں ایک آواز اور بھی سنائی دی ہے ان قہقہوں میں ایک قہقہہ سب سے الگ ہے۔ سب سے بلند اور سب سے جاندار۔

"میں جانتی ہوں آج تمہاری بے چین روح کو قرار آگیا ہو گا جمشید!"

انہوں نے ایک طرف کھڑے ہو کر سوچا تھا۔ پلکیں بھیگ گئیں۔

"ممما! یہ آنسو کس لیے؟" زارا انہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آئی تھی۔

"یونہی بیٹا! تمہارے پاپا کا خیال آگیا۔ وہ ہوتے تو خوشیوں کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا۔"

"وہ اب بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ہماری یادوں میں ہمارے دل میں۔۔۔"

انہوں نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔

"آئیں۔ دیکھیں افتخار کتنی زبردست نظمیں سنا رہے ہیں۔" زارا نے ان کا دھیان بٹانا چاہا۔

"میں کیا کروں گی۔ وہ تو تم جوانوں کی محفل ہے۔ تم جاؤ۔ میں ذرا تمہاری تائی جان سے مل لوں۔"

انہوں نے ٹالا پھر پوچھنے لگیں۔ "رضوان سے کوئی ناراضی چل رہی ہے۔"

"نہیں تو کیوں۔۔۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا اور پلٹ کر رضوان کو دیکھنے لگی۔ وہ مروا کے پودے کے پاس ایک ہاتھ تنے پر ٹکائے اور دوسرے میں ڈرنک لیے زین سے بات کر رہا تھا۔

"یونہی۔۔۔ مجھے لگا تھا۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔"

رضوان نے اسے اپنی طرف دیکھتے پایا تو وہیں چلا آیا۔

"آج تو ہمیں لفٹ ہی نہیں مل رہی۔۔۔"

"جی ایسا ہی خیال میرا بھی ہے۔۔۔" زارا نے بھی جتادیا تو وہ ہنس دیا۔

"میں تو کچھ اور سوچے بیٹھا تھا مگر معلوم ہوا محترمہ ہمیں اچھا انسان ہی نہیں سمجھتیں۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا۔" اس نے پلٹ کر زین کو گھورا۔ وہ اشارے سے وہیں بلانے لگا۔

"ادھر ادھر سے معلوم پڑ ہی گیا۔"

"ادھر ادھر کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ آیئے وہاں زین بلا رہا ہے۔"

"تم چلو۔ مجھے امی کے پاس کام ہے۔"

"خیر تو ہے تائی اماں سے آج سب کو کیا کام پڑ گیا۔" وہ کھنک سی گئی تھی۔ عالیہ مما اور تائی جان سر جوڑے نجانے کون سی پلاننگ کر رہی تھیں۔

"یونہی میں سوچ رہا ہوں۔ امی کی خواہش بھی پوری کر ہی دوں۔" وہ اپنی پُر شوق جذبے لٹاتی نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے بولا۔ وہ ایک پل کو چپ

ی ہو لی پھر احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

"یہ چیٹنگ ہے رضوان۔۔۔"

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ مگر چلے گی۔۔۔ اب تمہارا کیا بھروسا کل کو مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو میرے ہی خلاف کھڑی نظر آؤ کہ موصوف اچھے انسان نہیں ہیں۔" وہ چھیڑتے ہوئے بولا تو وہ کچھ خفا سی ہو کر پلٹ گئی۔

"باقی رہے تمہارے شوق، تمہارا مقصد۔۔۔ وہ سب شادی کے بعد سہی۔"

رضوان نے کہا تو وہ سر جھٹک کر بولی تھی۔

"دیکھا جائے گا۔"

اور ان کے قریب چلی آئی۔ افتخار، عظمیٰ، انعم اور زین اپنی محفل جمائے بیٹھے تھے۔ عظمیٰ کو خاصی مشکل سے اجازت ملی تھی وہ بھی زارا کی سفارش پر۔ اول تو وہ خود ہی آنا نہ چاہتی تھی کہ وہاں افتخار ہو گا۔ مگر زارا اور انعم نے ایک نہ سنی تھی۔ اب وہ اپنی ساری کوشش خود کو بے نیاز ظاہر کرنے میں صرف کر رہی تھی اور افتخار کے لہجے کے رنگ ہی کچھ اور تھے۔ وہ غالب کا پنجابی ترجمہ سنا رہا تھا۔

میں نیا آپ تے ہے چنگا، اِیڈی چند طوک تے چنگی نہیں

کدی قسمت نال بے ہتھ توڑے ہتھ نال چھوہایاں کل نہ بنے

(اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے)

نہیں عشق ہوراں تے زور کوئی، ایسہ اگ تے نالے بھڑکی اے

لئو بھوکاں مارئیے تئیں بجھدی نئیں نال بجھایاں کل نہ بنے

(عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے)

اس سے قبل کہ وہ اگلا شعر پڑھتا انعم نے ہاتھ جوڑ لیے۔

"بس کرو افتخار خدا کے لیے۔۔۔"

"بس ایک اور۔۔۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔"

زین خاموشی سے کھڑا تھا۔ انہیں آپس میں جھگڑتا دیکھ کر اس نے کھسکنا چاہا مگر زارا سامنے آگئی۔

"کہاں۔۔۔؟"

"کہیں نہیں۔۔۔" وہ گڑبڑا سا گیا۔

"تو پھر بیٹھ جاؤ۔" زارا نے اطمینان سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"میں بس ابھی آتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔۔۔" وہ جانتی تھی زین کہاں جانا چاہتا ہے۔

زین نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"زارا آپی! اتنی بھی ظالم مت بنیں۔۔۔"

"میں اتنی ہی ظالم ہوں چھوٹے بھائی۔۔۔" اس کے اطمینان و سکون میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

"وہ آپ کو رضوان صاحب بلا رہے ہیں۔"

"وہ مجھے نہیں بلا رہے۔۔۔" وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"آپ۔۔۔" وہ بری طرح جھنجلا گیا۔ تب وہ ہنستے ہوئے ایک طرف ہو کر اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

"جاؤ۔"

"تھینک یو۔۔۔" اس نے ذرا سا سر کو خم دے کر کہا پھر تیزی سے باہر کی طرف بڑھا تو اندر آتے سلیمان سے ٹکر ہو گئی۔ سلیمان نے اسے کندھوں سے پکڑ کر روکا پھر کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کچھ کہا تھا۔

"یار! تمہارے یہ کزن بہت زبردست پرسنیلٹی رکھتے ہیں۔ بندہ خوامخواہ رعب میں آجاتا ہے۔" انعم نے متاثر کن لہجے میں کہا تھا۔ زارا پلٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔

انہوں نے کہا تھا۔

"مجھے صرف اس بات کا افسوس ہوا تھا کہ تم لوگوں نے مجھے اپنا دشمن سمجھ کر خود سے ہی کہانیاں گھڑ لیں۔ خود ہی راستہ ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک بار میرے پاس تو آتے پھر دیکھتے، رائے سلیمان تمہارے لیے کیا کرتا ہے۔ میں نے بہت چھوٹی عمر میں اس جاگیر

...ثابت کر پاؤ میرے ہاتھ کچھ بھی نہ رہتا کہ یہاں ایک دوست تو سو دشمن ہیں۔ تمہیں میں نے ہمیشہ اپنے بچوں کی نظر سے دیکھا تھا۔ جب بچے باپ کو دشمن سمجھنے لگیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے۔ لیکن قصور تم لوگوں کا نہیں۔ شاید میں ہی تمہیں وہ اعتماد نہیں دے سکا۔"

"ہاں ان کی اسی رعب داب اور بظاہر سخت گیر شخصیت نے ہمیں ان کو کبھی سمجھنے کا موقعہ نہیں دیا۔ مگر زین کو حویلی میں لا کر انہوں نے ثابت کیا ہے وہ واقعی اس جاگیر کے صحیح وارث اور اس خاندان کے سربراہ ہیں۔"

زارا آہستگی سے کہہ رہی تھی۔ تائی جان نے اسے پکارا تو وہ معذرت کر کے ان کی طرف چلی گئی۔

"کتنی شاندار حویلی ہے ان کی۔" انعم نے سر اٹھا کر اس کے در و دیوار کو دیکھا۔ پھر کھڑی ہو گئی۔ "میں ابھی آتی ہوں۔"

اسے جانے میں ایک پل نہ لگا۔ عظمٰی بڑبڑا کر چونکی تھی۔ اس سے قبل کہ اٹھتی افتخار نے بے حد سادگی سے کہا

"میں تو آپ کو کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔"

عظمٰی نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھا اور قدرے رخ بدل کر بیٹھ گئی۔ وہ بے نیازی سے ایک بازو کرسی کی پشت پر پھیلائے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔

"کہاں مر گئی ہے؟" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

افتخار نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔ وہ پزل سی بیٹھی ہاتھ مسل رہی تھی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ اپنی مونچھیں سنوارتے ہوئے وہ ہلکا سا کھنکھارا۔ عظمٰی کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ پھر بھی لگتا تھا سب کچھ کہہ گیا ہے۔

"اٹھ جاؤں یا بیٹھی رہوں۔" وہ متذبذب سی تھی۔ "نہیں وہ سمجھے گا میں پزل ہو رہی ہوں۔" اس نے دھک دھک کرتے دل کو سنبھال کر خود کو سرزنش کی۔

تب ہی اس نے یونہی بیٹھے بیٹھے پوچھا تھا۔

"اور سنائیں عظمٰی بی بی! کیا حال چال ہیں؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے لہجے میں رکھائی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"خوش باش۔"

"ظاہر ہے۔" وہ چڑ گئی۔

"ہاں ہونا بھی چاہیے۔" افتخار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"سنا ہے آپ کی منگنی ہو رہی ہے۔" اس کا لہجہ اور نگاہیں متبسم تھیں۔

عظمٰی کو تاؤ آ گیا۔

"دیکھو! میرے ساتھ زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔"

افتخار کا قہقہہ زبردست تھا۔

"ہاں بھئی، چلے گا یہی انداز چلے گا۔ میں تو سوچ رہا تھا عظمٰی بی بی کا لہجہ بدل گیا تو ہمیں یقین کیسے آئے گا کہ یہی ہماری عظمٰی ہیں۔"

"ہماری عظمٰی..." اس بے تکلفی پر وہ غش کھا کر گرنے کو تیار تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوتا کہ افتخار کو موقعہ مل جاتا مزید ہیرو بننے کا۔ سو وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

"دیکھو! میرے ساتھ اس انداز میں بات کی تو..."

"تو..." اس نے بھنوئیں اچکا کر اسے دیکھا۔

"میں انکار بھی کر سکتی ہوں۔" اس نے گویا دھمکی دی۔

"اچھا..." وہ محظوظ ہو کر مسکرایا۔ عظمٰی تیز قدموں سے پلٹی جب اس نے پکار کر پوچھا۔

"ایک بات تو بتاتی جاؤ۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی مگر پلٹی نہیں تھی۔

"اس بار تمہارے گھر آم لے کر آؤں یا اچار کا مرتبان۔"

"اس بار آپ صرف بارات لے آئیں۔" ہم تم کچھ

فاصلے سے پکاری تھی۔

"تم لوگ..." عظمٰی نے غصے سے کہنا چاہا مگر دوسرے پل اسے لگا وہ یہ مصنوعی غصہ زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکے گی۔ کیونکہ سب مسکرا رہے تھے اور وہ کھل کر ہنس رہا تھا۔ عظمٰی کو لگا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ اسے سمجھ نہ آیا وہ کہاں جا چھپے۔

♥ ♡ ♡ ♥

سارا گاؤں حیران تھا۔

گھر گھر گلی گلی، ہر چوک ہر محفل میں یہی تذکرہ تھا۔

رائے جمشید، زین العابدین، منشی بشیر علی۔

حویلی میں جشن کا سا سماں تھا اور آج گاؤں والوں کی دعوت تھی۔ دعوت عام جس میں ہر کوئی مدعو تھا۔ سب ہی گئے تھے۔ نین تارہ نے انکار کر دیا تھا۔ اکیلے جانے کی بات اور تھی مگر بھیڑ بھاڑ سے اسے اب بھی الجھن ہوتی تھی۔

"کمال ہے۔ تم مبارکباد بھی نہ دو گی انہیں۔" اسماء نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"بعد میں جا کر دے دوں گی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ مسرور سا ماما مقبول بول اٹھا۔

"ہاں... ہاں بعد میں چلی جائے گی۔ یہ تو رانی بیٹی ہے۔ اسے یوں جانا بھی نہیں چاہیے۔"

"یہ بہت اچھا ہوا۔ آمنہ آنٹی بہت خوش ہوں گی۔ ان کا بھتیجا ان کے پاس آ گیا۔ کتنی پریشان تھیں اس دن..."

ان سب کے جانے کے بعد اس نے صحن میں کھڑے ہو کر سوچا تھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

برسات آنے والی تھی اور کچے صحن کو لپائی کی ضرورت تھی۔ اسماء نے مٹی گوندھ رکھی تھی مگر دعوت کے شوق میں سب چھوڑ چھاڑ کر چلی گئی۔

"چلو نین تارہ! پہلے یہی کام نمٹاؤ۔" اس نے کمر کے گرد دوپٹہ لپیٹا اور شروع ہو گئی۔ یہ کام اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ وہاں بھی چھت کی لپائی وہی کرتی تھی۔ آدھے صحن کی لپائی ہو گئی۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں منہمک تھی۔ جب کوئی دندناتا ہوا صحن میں گھس آیا۔ ساری محنت برباد ہو گئی۔

نین تارہ نے جھنجلا کر سر اٹھایا تاکہ آنے والے کی کھنچائی کر سکے۔

مگر ساکت رہ گئی۔ جہاں تھی وہیں منجمد ہو گئی۔

وہ اس کے قریب آ کر رک گیا تھا۔

"اتنی حیرت...!" اس نے نین تارہ کی تحیر بھری آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

اسے یقین نہیں تھا کہ وہ آئے گا۔ اس نے زین العابدین کے حوالے سے کوئی خواب نہیں سجایا تھا۔ کوئی امید نہیں باندھی تھی۔ کبھی دعا نہیں کی تھی۔ اسے لگتا تھا خواب جھوٹے ہیں، امیدیں ٹوٹ جانے کے لیے اور دعا... خدا اس کی دعائیں نہیں سنتا۔ مگر وہ آ گیا تھا۔ اس کا اعتبار بن کر۔

ان دیکھے خواب یوں پورے ہوتے ہیں۔

ٹوٹ جانے والی امیدیں پھر سے بندھ جاتی ہیں۔

اور کوئی بھولی بسری دعا یوں بھی پوری ہو جاتی ہے۔

نین تارہ کا دل چاہا۔ وہ یونہی بیٹھے بیٹھے اس کے قدموں میں خاک بن کر بکھر جائے مگر زین العابدین نے ذرا سا جھک کر اسے کندھوں سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کر کے اس کے مقام کا تعین کر دیا۔

"اب اعتبار آیا..."

وہ پوچھ رہا تھا اور نین تارہ کا دل چاہا اس کے سینے پر سر رکھ کر اتنا روئے کہ سارے آنسو ختم ہو جائیں۔

کیونکہ وہ آج کے بعد رونا نہیں چاہتی تھی۔

"ساتھ چلو گی۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا چاہا۔

زین العابدین نے اس کی کلائیاں تھام لیں۔

"ہوں ہوں... بھوت بن جاؤ گی۔"

وہ جھینپ کر مسکرائی، پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ اور مسکراتی نین تارہ کیسی لگتی ہو گی۔

زین العابدین نے کئی بار سوچا تھا۔

"چلو۔" زین العابدین نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ زین نے اس کی کلائیاں چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہو کر سر تا پا اس کا جائزہ لیا پھر ناک چڑھا کر بولا۔

"یوں لے کر جاؤں گا۔"

"میں ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"پھر بھی اس حلیے میں..."

"چلیں، میں کپڑے بدل لیتی ہوں۔" وہ مزید شرمندہ ہوئی۔

"نہیں۔" وہ اب بھی مطمئن نہ ہوا تھا۔

"تو پھر..." نین تارہ اسے دیکھنے لگی۔

"یوں نہیں۔ میں تمہیں اسی طرح لے کر جاؤں گا جس طرح ہر لڑکی کا ارمان ہوتا ہے۔ چلو گی نا حویلی۔"

"حویلی..." اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ہاں حویلی۔"

وہ چکرا گئی۔ حویلی، زین العابدین، ماسے مقبول کی باتیں۔

"آ... آپ حویلی میں رہتے ہیں..." وہ اٹک سی گئی۔

"رہتا نہیں تھا۔ اب رہوں گا..." وہ کھل کر مسکرایا۔ پھر اسے بغور دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کیوں حویلی کے زین العابدین سے شادی نہیں کرو گی۔"

وہ کیا کہتی۔ گم صم کھڑی تھی۔ زندگی میں اتنی کٹھنائیاں آئی تھیں۔ اسے لگا وہ مر جائے گی۔ مگر وہ مری نہیں تھی۔ زندہ تھی۔ مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ خدا اس کے لیے اتنا بڑا انعام چھپا کر رکھے ہوئے تھا۔

اتنا سا بھی شبہ ہوتا تو کبھی خدا سے گلہ نہ کرتی۔

"اب تو انتظار کرو گی۔" وہ پوچھ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکرا کر پلٹ گیا۔ نین تارہ اس کے ساتھ چلتی دروازے تک آئی۔

"سنو! پہلا تحفہ کیا لو گی۔" وہ دروازے میں رک کر پوچھ رہا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

اس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"اچھا۔ پھر خود ہی کچھ کریں گے۔" وہ کندھے اچکا کر جانے لگا تو نین تارہ نے بے اختیار اسے پکارا۔

"سنو...!"

وہ رک گیا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ نہ محبت نہ وفا، نہ دولت نہ حویلی۔ مگر بس ایک اعتبار۔" وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

"مجھے تمہیں سب ہی کچھ دینا ہے اعتبار سمیت۔"

اب وہ اس کے کسی بھی لفظ پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتی تھی۔

وہ باہر نکل گیا تو نین تارہ دروازے میں کھڑی ہو کر اس کے قدم گننے لگی۔ وقت ان دونوں کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"وقت سے پہلے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔" یہ نین تارہ نے سیکھا تھا۔

"آپ قسمت سے بھاگ نہیں سکتے۔ زندگی میں آنے والی کٹھنائیاں سہنی پڑیں گی۔ بعض اوقات وقت کی دھند میں واقعات مبہم ہو جاتے ہیں لیکن پہلا قدم، پہلی کوشش آپ کے لیے راستے کھول دیتا ہے۔ منزل واضح کر دیتا ہے۔ بس کوشش شرط ہے۔ پہلا قدم اٹھنا چاہیے۔"

یہ زین العابدین نے سیکھا تھا۔ وقت نے ان دونوں پر ایک مہربان نگاہ ڈالی اور خاموشی سے گزر گیا۔ وہ اپنی گواہی دے چکا تھا۔

★

کیونکہ وہ آج کے بعد رونا نہیں چاہتی تھی۔

"ساتھ چلو گی۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا چاہا۔

زین العابدین نے اس کی کلائیاں تھام لیں۔

"ہوں ہوں... بھوت بن جاؤ گی۔"

وہ جھینپ کر مسکرائی، پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ اور مسکراتی نین تارہ کیسی لگتی ہو گی۔

زین العابدین نے کئی بار سوچا تھا۔

"چلو۔" زین العابدین نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ زین نے اس کی کلائیاں چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہو کر سر تا پا اس کا جائزہ لیا پھر ناک چڑھا کر بولا۔

"یوں لے کر جاؤں گا۔"

"میں ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"پھر بھی اس حلیے میں..."

"چلیں، میں کپڑے بدل لیتی ہوں۔" وہ مزید شرمندہ ہوئی۔

"نہیں۔" وہ اب بھی مطمئن نہ ہوا تھا۔

"تو پھر..." نین تارہ اسے دیکھنے لگی۔

"یوں نہیں۔ میں تمہیں اسی طرح لے کر جاؤں گا جس طرح ہر لڑکی کا ارمان ہوتا ہے۔ چلو گی نا حویلی۔"

"حویلی..." اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ہاں حویلی۔"

وہ چکرا گئی۔ حویلی، زین العابدین، ماسے مقبول کی باتیں۔

"آ... آپ حویلی میں رہتے ہیں..." وہ اٹک سی گئی۔

"رہتا نہیں تھا۔ اب رہوں گا..." وہ کھل کر مسکرایا۔ پھر اسے بغور دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کیوں حویلی کے زین العابدین سے شادی نہیں کرو گی۔"

وہ کیا کہتی۔ گم صم کھڑی تھی۔ زندگی میں اتنی کٹھنائیاں آئی تھیں۔ اسے لگا وہ مر جائے گی۔ مگر وہ مری نہیں تھی۔ زندہ تھی۔ مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ خدا اس کے لیے اتنا بڑا انعام چھپا کر رکھے ہوئے تھا۔

اتنا سا بھی شبہ ہوتا تو کبھی خدا سے گلہ نہ کرتی۔

"اب تو انتظار کرو گی۔" وہ پوچھ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکرا کر پلٹ گیا۔ نین تارہ اس کے ساتھ چلتی دروازے تک آئی۔

"سنو! پہلا تحفہ کیا لو گی۔" وہ دروازے میں رک کر پوچھ رہا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

اس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"اچھا۔ پھر خود ہی کچھ کریں گے۔" وہ کندھے اچکا کر جانے لگا تو نین تارہ نے بے اختیار اسے پکارا۔

"سنو...!"

وہ رک گیا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ نہ محبت نہ وفا، نہ دولت نہ حویلی۔ مگر بس ایک اعتبار۔" وہ سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

"مجھے تمہیں سب ہی کچھ دینا ہے اعتبار سمیت۔"

اب وہ اس کے کسی بھی لفظ پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتی تھی۔

وہ باہر نکل گیا تو نین تارہ دروازے میں کھڑی ہو کر اس کے قدم گننے لگی۔ وقت ان دونوں کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"وقت سے پہلے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔" یہ نین تارہ نے سیکھا تھا۔

"آپ قسمت سے بھاگ نہیں سکتے۔ زندگی میں آنے والی کٹھنائیاں سہنی پڑیں گی۔ بعض اوقات وقت کی دھند میں واقعات مبہم ہو جاتے ہیں لیکن پہلا قدم، پہلی کوشش آپ کے لیے راستے کھول دیتا ہے۔ منزل واضح کر دیتا ہے۔ بس کوشش شرط ہے۔ پہلا قدم اٹھنا چاہیے۔"

یہ زین العابدین نے سیکھا تھا۔ وقت نے ان دونوں پر ایک مہربان نگاہ ڈالی اور خاموشی سے گزر گیا۔ وہ اپنی گواہی دے چکا تھا۔

★

162